قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 22 ✿ شمارہ 12 ✿ اکتوبر 2012ء

ماہنامہ

کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

مصور : شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد عثمان خان	0333-2168391
	رانا محمد حسید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	فرزند علی ہاشمی	0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ✿ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

کیا ہم صرف رونے کے لیے رہ گئے ہیں؟ زلزلے، سیلاب، بم دھماکے، ٹارگٹ کلنگ، ڈرون کے ڈراؤنے حملوں پر ہم رو ہی رہے تھے کہ 11 ستمبر کی شام ایک ایسے سانحے نے جنم لے لیا جس نے پورے ملک کی آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔ وہ فیکٹریاں جو شعلوں کی آگ بجھانے کے لیے بنی تھیں انہی کے شعلوں نے تقریباً 300 ملازمین کو راکھ کر دیا، کہا یہ جا رہا ہے کہ آگ شارٹ سرکٹ سے لگی۔ اس آگ نے خاندان کے خاندان کی زندگیوں میں اندھیرا پھیلا دیا مگر سوال یہ ہے کہ صنعتوں میں الیکٹریکل آلات کی چیکنگ کے لیے جو محکمہ بنا ہے اور جن انسپکٹرز کو بھاری تنخواہوں پر ملازم رکھا گیا ہے وہ اپنا کام کیوں نہیں کرتے؟ پنجاب کے بارے میں خبر آئی کہ وہاں ایک صنعت کار کی شکایت پر تقریباً 9 سال قبل آلات کے معائنے سے انسپکٹرز کو روک دیا گیا تھا پھر انہیں دوبارہ معائنے کا نیا حکم نامہ موصول نہیں ہوا۔ وہاں انسپکٹرز دفتر میں بیٹھ کر تنخواہیں لے رہے ہیں اور فیکٹریوں میں شارٹ سرکٹس کی آگ انسانی زندگیوں کی بھینٹ لے رہی ہے مگر سندھ میں تو ایسا کوئی حکم نامہ ہی جاری نہیں ہوا۔ سننے میں یہ بھی آیا ہے کہ مذکورہ فیکٹری میں کئی سال سے کسی الیکٹریکل انسپکشن ٹیم نے جھانکنے کی ضرورت نہیں سمجھی نتیجتاً اتنا بڑا حادثہ رونما ہو گیا اس پر ہم جتنا بھی روئیں کم ہے مگر رونے کے لیے ایک اور زخم عالمی پیمانے پر بھی لگا ہے جس نے ہر اہلِ ایمان کی روح کو گھائل کر دیا ہے۔ اس زخم کا تذکرہ ہر طرف ہے اور کیوں نہ ہو اس لیے کہ یہ وار ہمارے ایمان پر ہوا ہے ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ ایسی کیا بات ہے کہ ہر تھوڑے دنوں کے بعد سیدھے سیدھے ہمارے مذہب پر حملہ ہو جاتا ہے۔ کبھی سلمان رشدی کبھی تسلیمہ نسرین کے ذریعے کتاب لکھوا کر تو کبھی کارٹون بنوا کر مگر اس بار تو ایک پوری اہانت آمیز فلم ہی بنا دی گئی جس میں امریکی فوجیوں کے لیے مخصوص بکتر بند گاڑیوں اور بھاری اسلحے جو کہ دیگر ممالک کے فوجی خواب میں بھی استعمال نہیں کر سکتے ان کا استعمال ہوا جو یقیناً پینٹا گون کی اجازت سے ہی شوٹنگ میں استعمال ہوا ہوگا۔ ہمارا سوال بس اتنا ہے کہ ایسا ہر تھوڑے دنوں بعد تسلسل سے کیوں ہو رہا ہے؟ ہمارا خیال تو یہی ہے کہ یہ سازش ہمیں رُلانے کے لیے نہیں ہمیں تباہ کرنے کے لیے ہو رہی ہے کیونکہ اس کا سیدھا اثر جذبات پر ہوتا ہے اور جذبات کا بپھرا سمندر ہماری ہی معیشت کو تباہ کرتا ہے اور ہم کمزور سے کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں، ہم خود ہی اپنی املاک کو جلاتے، معیشت کو کمزور کرتے چلے جاتے ہیں مگر کیا کریں کہ دشمن کا وار ہی ایسا اوچھا ہو رہا ہے کہ ہم رونے کے ساتھ جذباتی بلیک میلنگ کا بھی شکار ہو جاتے ہیں۔ اور اب ایک اہم بات، کہ مہنگائی ہوش رُبا ہو چکی ہے۔ مویشیوں کے چارے سے عام آدمی کے سامانِ تعیش تک، ہر شے اس کی زد میں ہے۔ ہمارے پرچوں کی اشاعت میں نیوز پرنٹ، آرٹ پیپرز، طباعت کی سیاہیاں، کمپیوٹر کے لوازم، ٹونر، ٹریسنگ پیپرز اور فلموں تک تقریباً نوے فیصد اشیا درآمد ہوتی ہیں۔ ایک طرف عالمی منڈی میں ان کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں، دوسری طرف روپے کی قدر روز بروز گر رہی ہے۔ اس دُہرے مالی دباؤ سے نکلنے کے دو ہی راستے ہیں۔ پرچوں کے صفحات دوسرے پرچوں کی طرح کم کیے جائیں یا قیمت بڑھائی جائے۔ ہمارے قارئین کی تشنگی موجودہ مواد سے بھی پوری نہیں ہوتی اس لیے۔ ہم نے انتہائی مجبور ہو کر فیصلہ کیا ہے کہ اس شمارے سے قیمت 60 روپے فی پرچہ ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے معزز قارئین ہماری مالی مجبوریوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے بحران کے حل میں تعاون فرمائیں گے۔

معراج رسول

سرگزشت

1908ء میں اس نے حیدرآباد دکن میں جنم لیا۔ مقامی روایت کے مطابق قرآن پاک کی تعلیم سے سلسلۂ تعلیم شروع ہوا۔ اس نے صرف دو سال میں قرآن شریف ختم کر لیا۔ تب اسے دنیاوی تعلیم کے لیے پرائمری اسکول میں داخل کرایا گیا، دماغ کا تیز تھا۔ پرائمری بھی اس نے امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا۔ اب اسے ہائی اسکول میں داخل کرانا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد قرعہ فال چار مینار کے قریب دارالعلوم کا نکلا، بس اسے وہاں بھیجا جانے لگا۔ جلد ہی اس نے وہاں بھی اپنی ذہانت کا سکہ جما لیا۔ اس کی ذہانت اور یادداشت کو دیکھ کر دوسرے بچے پوچھتے "تو اتنا کیسے پڑھ لیتا ہے۔" اور وہ مسکرا کر رہ جاتا۔ دارالعلوم، دربارِ نظام سے منسلک تھا، خود سرکارِ نظام سرپرستی کرتے تھے۔ اس اسکول میں عربی، فارسی، ریاضی، جنرل سائنس، تاریخ اور جغرافیے کی تعلیم دی جاتی تھی۔ رُشدیہ، منشی، مولوی، عالم، فاضل کی ڈگری ملا کرتی تھی۔ یہاں آتے ہی اس نے قابلیت کے وہ جوہر دکھائے کہ اسے وظیفے کا حقدار قرار دے دیا گیا۔ 1918ء میں اس نے رُشدیہ کا امتحان پاس کیا۔ اس نے امتحان میں اتنے اچھے نمبرز حاصل کیے تھے کہ اس کی گونج دربارِ عالیہ تک پہنچ گئی۔ اس نے فرسٹ ڈویژن میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو دارالعلوم میں بھی یونیورسٹی کی کلاسیں شروع ہو گئیں۔ اس طرح سے اسے عثمانیہ کے پہلے بیچ میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا اور 1921ء میں اس نے عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک پاس کر لیا۔ 1921ء سے 1926ء تک وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم رہا۔ یونیورسٹی کیمپس سے گھر دور تھا اس لیے اس نے رہائش ہاسٹل میں رکھی تھی۔ 1925ء میں اس نے بی اے درجہ اول کیا۔ اسی سال کانووکیشن میں اسے چھ انعامات بھی ملے۔ بی اے کرنے کے بعد اس نے ایم اے میتھمیٹکس میں داخلہ لے لیا۔ اگلے ہی روز اس کے استاد مناظر حسین گیلانی نے بتایا کہ وزیرِ خزانہ سر اکبر حیدری اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ ان سے ملنے پہنچا تو انہوں نے اول آنے کی مبارک باد دیتے ہوئے پیشکش کی کہ وہ سول سروس میں شامل ہو جائے مگر وہ راضی نہ ہوا تب اکبر حیدری نے کہا کہ سرکارِ نظام نے اول آنے والے کے لیے وظیفہ مقرر کیا ہے اگر تم چاہو تو اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت جا سکتے ہو۔ اسی دوران اس کی شادی سرکارِ نظام کے چیف سیکریٹری کاظم یار جنگ کی صاحبزادی خورشید سے ہوئی اور 1926ء میں وظیفہ کا حکم نامہ مل گیا۔ وظیفہ ملتے ہی وہ کیمبرج یونیورسٹی چلا گیا۔ وہاں سے اس نے ریاضی میں آنرز کے ساتھ ایم اے کیا۔ پھر 1928ء میں پی ایچ ڈی کرنے کے لیے لندن منتقل ہو گیا۔ پی ایچ ڈی میں داخلے سے پہلے اس نے جرمن زبان سیکھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ پروفیسر آئن اسٹائن کی زیرِ نگرانی مقالہ تیار کرے مگر وہ چھٹی پر تھے اس لیے اس نے پروفیسر ہینس برگ کے زیرِ ہدایت اپنی تھیسس مکمل کی۔ 1930ء میں جب تھیسس مکمل ہوئی تو وظیفہ کی مدت باقی تھی اس لیے اس نے پیرس جا کر پوسٹ ڈاکٹریٹ کرنے کا سوچا اور پیرس روانہ ہوا۔ سند حاصل کرنے کے بعد جون 1931ء میں پیرس سے گھر کے لیے روانہ ہو گیا اور یکم جولائی 1931ء کو وہ حیدرآباد پہنچ گیا۔ حیدرآباد پہنچتے ہی انہیں عثمانیہ یونیورسٹی میں ریاضی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر کا عہدہ دے دیا گیا۔ 1934ء میں پروفیسر کے عہدے پر تقرر کر دیا گیا۔ پھر انڈین اکیڈمی آف سائنسز بنگلور کا فاؤنڈیشن فیلو بنا دیا گیا۔ 1937ء میں انہیں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنسز کا فیلو بھی منتخب کر لیا گیا۔ حیدرآباد کے سقوط کا المیہ رونما ہوتے ہی انہوں نے پاکستان کے لیے رختِ سفر باندھ لیا اور نومبر 1949ء میں پاکستان آ گئے اور سائنس و تعلیم کے شعبے میں خدمات انجام دینے میں کوشاں ہو گئے۔ مگر اب وہ معمولی حیثیت کے نہ تھے لوگ عزت و احترام سے مخاطب کرتے۔ سندھ یونیورسٹی اور پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ قائد اعظم یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر رہے اور 12 دسمبر 1964ء سے 18 اکتوبر 1972ء تک یونیورسٹی کے لیے خدمات انجام دیں۔ 1980ء میں اسی یونیورسٹی کے پروفیسر ایمریٹس مقرر ہوئے۔ آپ کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے پاکستان اٹامک انرجی کمیشن نے آپ کو مانگ لیا اور وہ پروفیسر عبدالسلام کے ساتھ مل کر ملک کو ایٹمی قوت بنانے میں مصروف ہو گئے۔ ایسٹرو فزکس لیبارٹری کے انچارج کا عہدہ ملا ہوا تھا۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں 1960ء میں ستارۂ امتیاز، 1981ء میں ہلالِ امتیاز دیا گیا۔ یوں تو آپ نے کئی کتابیں لکھیں مگر "تصورِ زمان و مکاں" اور "داستانِ ریاضی" بہت مشہور ہوئیں۔ 1998ء کو آپ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے مگر اب بھی پروفیسر رضی الدین صدیقی ہر صاحبِ علم کے دل میں زندہ ہیں۔ □

شہرِ خیال

✉ انجم فاروق ساحلی لاہور سے رقم طراز ہیں ”امید ہے آپ اور اہلِ خانہ بخیر و عافیت ہوں گے۔ ستمبر کا سرگزشت بڑے خوبصورت اور خوش نما ٹائٹل کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔ ”خونخوار عورتیں“ دلچسپی سے بھرپور کاوش تھی۔ اولادِ چنگیز اور شوبو گیان بھی خوب تحریریں تھیں۔ ”دشمن“ اپنے سبق کے لحاظ سے اچھی منفرد تحریر تھی۔ بارہ سنگھے کے علاج کے مناظر خوب تھے۔ البتہ بارہ سنگھے کی وحشیانہ کارروائیاں قرینِ قیاس نہیں کیونکہ وہ وحشی جانوروں کی صف میں شامل نہیں۔ (بارہ سنگھا شیر سے لڑ جاتا ہے) سفیرِ موسیقی بھی اچھا رہا۔ ”شہنشاہِ جرم“ میں تمہیدی گفتگو زیادہ اور واقعاتی دلچسپی بہت کم تھی۔ غالب مختصر لیکن متاثر کن تحریر تھی۔ غالب کے فن کا اچھا احاطہ کیا گیا۔ انور سعید کا حوالہ بھی موجود تھا وہ ہمارے گھر کے بالکل سامنے رہائش پذیر ہیں، جس دن وہ گزر گئے علم کا ایک اور چراغ بجھ جائے گا۔ فلمی الف لیلہ دلچسپی سے بھرپور تھی ظلم والا بھی کے تذکروں میں کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔ آغا جی اے گل نے ہدایت کار ایم اکرم سے جو ظلم والا بھی بنوائی تھی۔ اس کے مصنف میرے والد سعید ساحلی تھے۔ کاسٹ میں مصطفیٰ قریشی اور یوسف خان نمایاں تھے۔ 1985ء میں مبارک سینما میں نمائش کے لیے پیش ہوئی تھی۔ سراب حسبِ معمول ہنگامہ خیز تھی لیکن ہنگامے عام نوعیت کے تھے۔ آپ بیتیوں میں مہمان، سوال اور پرائز بانڈ، اچھی معلوم ہوئیں۔ اس مرتبہ سرگزشت میں کافی نئے لکھنے والوں کے نام موجود تھے۔ عشق ناکام نمبر کامیابی سے ہمکنار ہوا اور آپ کی محنت نے اپنا ثمر پالیا۔ میر تقی میر کے متعلق فوراً ایک مختصر مضمون بھیجا جا رہا ہے۔ ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب محفلِ دکھ میں اپنی شان سے براجمان تھے۔“ (آپ کہانی بیان کرنے میں تھوڑی محنت کرلیا کریں تاکہ اشاعت میں تاخیر نہ ہو)

✉ احمد خان توحیدی، کراچی سے لکھتے ہیں ”سسپنس 17 اگست جمعۃ الوداع کی بابرکت شام حاضرِ جناب ہوا۔ عید کے دن تک الوداع کر دیا۔ سرگزشت کی تلاش میں منتظر آنکھیں، لاتعداد چکر، ہاکر سے رابطہ کے باوجود، ملک میں تین عید، پونے تین، روتے ہوئے گزر جاؤ، سرگزشت روپوش رہا۔ نجی کام سے یکم ستمبر صبح کینٹ اسٹیشن جانا ہوا، ہاکر بنڈل کھول رہا تھا، پہلے خریدار ہم قرار پائے۔ معراج رسول صاحب! روزے کی برکت و روحانی مسرت روزہ داروں سے پوچھیں، افطاری سے قبل چٹ کر جانے والے سیاسی جیالے ٹھہرے اور روزہ دار کو کھجور بھی نہ ملی۔ عید ملن پارٹی، میں بھی یہی ہوا کہ مقررین کی بکواس سے پہلے ہی لنچ بکس جیالے لوٹ کر لے گئے۔ ادھر سانحہ کامرہ، جدید ٹیکنالوجی سے لیس دہشت گرد۔ دوسری طرف آبائی ٹھنڈے علاقہ گلگت چیلاس میں اپنوں کے ساتھ عید کی خوشیاں منانے والوں کو لائن میں کھڑا کر کے بھون ڈالا گیا، منتظر بچے یتیم، سہاگنیں بیوہ ہو گئیں۔ بلوچستان کی حالت آپ کے سامنے ہے لرزیں! اضافہ کی صورت پیٹرول، بم ہم عوام پر گرا، لٹیرے ڈکیٹران، دشمنانِ ملک و ملت کے لیے بنایا جانے والا ڈاکٹر خان کا ایٹم بم تا حال استعمال نہ ہوا کہ تنور پر روٹیاں لگانے والے، عظیم سپوت نے سرِ فخر سے بلند کر دیا۔ موجد فنگر پرنٹ پڑھا، قاضی محمد خان سے لاعلم تھے۔ شہرِ خیال میں آئے، اختر صاحب! فرنٹ سیٹ پر، واقعی سرگزشت کی تلاش بہت اہم ہے، کاش معراج رسول وایدھی جیسے وطن کے کرتا دھرتا ہوں۔ خالد یوسفی لیے، اسٹیل مل، پی آئی اے، ریلوے... کو دیکھ کر کرپشن نام کی کیا ضرورت ہے؟ اسماعیل اجاگر چنڈی گھیپ۔ قائداعظم ناکامی کے لفظ سے آشنا نہ تھے۔ کانگریس لیڈران کا اقرار، قائداعظم جیسا ایک لیڈر بھی کانگریس میں ہوتا تو پاکستان نہ بنتا۔ رانا شاہد بورے والا۔ راجیش کھنہ کی نجی زندگی کا آفاقی صاحب کو علم ہوگا، ضرور تفصیل لکھیں۔ اسٹیل مل، پی آئی اے، ریلوے کا سربراہ معراج رسول یا ایدھی صاحب کو بنائیں۔ عالم لوہار کو اپنی شادی پر عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کو بیٹے کی شادی پر بلا چکا ہوں۔“ (براہِ کرم خط مربوط لکھیں۔ ورنہ آئندہ شاملِ اشاعت نہ ہو سکے گا)

✉ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے ”معراج انکل آپ نے صحیح کہا کہ ہم نے رمضان سے صحیح معنوں میں وہ فائدہ دنیا و آخرت حاصل نہیں کیا جو ہمیں ہمارے پیارے نبیؐ نے سکھایا ہے۔ لوڈشیڈنگ نے واقعی مت ماردی ہے۔ 24 گھنٹے میں 18 گھنٹے بجلی نہیں تو کیا خاک کاروبار چلے گا اور بل مجال ہے کہ کم آئے۔ گیس کی قیمتیں بھی آسمان تک اٹھنے لگی ہیں۔ بند میٹر پر 8 ہزار اور 9 ہزار کا بل آتا ہے۔ انکل صرف 1 ستمبر سے لے کر 4 ستمبر کے درمیان تین دھماکے پشاور میں ہوئے اور اللہ کی اشرف المخلوقات اتنی ارزاں ہے کہ ان کے بدن کا گوشت کوے کھانے لگے ہیں۔ یہ ایک دو خوشیاں اللہ نے دیں کہ ایک غریب تنور والے نے بی اے میں ٹاپ کیا اور ایک طلبہ نے تقریر میں پوری دنیا میں پہلا نمبر لیا۔ یا کراچی کے ایک میٹرک کے طالب علم نے بیالوجی میں اتنا ریسرچ کیا انہوں نے کیا کیا اس کے لیے، امریکہ نے 2 لاکھ ڈالر کا وظیفہ دے کر اپنے ملک کے لیے کامیاب ترین غلام خرید لیا۔ اب وہ اس ریسرچ کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کریں گے۔ ہائے بے وفا دوستو اب کیسے ہو۔ ہمارے نئے ساتھی اختر صاحب نے انکل کو خوب خوب مکھن لگایا حالانکہ ان کو چاہیے تھا کہ انکل کے لیے بنوں کا اوریجنل مصالحہ بھیج دیتے۔ واہ تفسیر بھائی عشق ناکام پر اتنا تفصیلی تبصرہ۔ محبت تو قربانی اور ایثار کا نام ہے، یہ تو نہیں کہ ایک سے عشق ہو گیا وہ نہ ملی تو پھر 5 عورتوں سے شادی رچالی۔ یہ کہاں کا عشق ہے۔ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے عشق کو بھی رسوا کیا اور عورتوں کی بھی تذلیل کی اگر یہ اتنا ہی سچا عاشق تھا تو مر جاتا لیکن اس کی جگہ کسی کو نہ دیتا۔ مرد نے ہمیشہ اپنی تسکین کے لیے عورت کو کھلونا بنایا ہے۔ عزیز اللہ صاحب! آپ نے بڑی حقیقت پسندی سے کام لیا ہے بھائی، اور سچ بولنے والے کسی کو زیادہ پسند نہیں آتے۔ میں محبت کی نہیں، بلکہ ریاکار عاشقوں کے خلاف ہوں۔ محبت جیسا جذبہ کم ظرفوں میں ہو ہی نہیں سکتا۔ ظہیر احمد تبسم صاحب عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے کوئی اچھا کام نہیں کیا جو آپ یوں اچھل رہے ہیں۔ معراج الدین بھائی وعلیکم السلام! چلو سدرہ بانو جی آپ کسی سے متفق ہوئی نہیں، ویسے سچ ہے آپ کا اور تفسیر بھائی کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ سعید احمد چاند صاحب! کبھی اپنی اس بہن کو بھی یاد کر لیا کرو۔ ثواب ملے گا گناہ نہیں ملتا جی، ویسے اللہ خاص کر کراچی اور پشاور کے لوگوں پر رحم کرے۔ احمد خان توحیدی صاحب آپ ہر خط میں تنخواہ نہ ملنے کا شکوہ کرتے نظر آتے ہیں تو پھر آپ کے گھر کا خرچ کیسے چلتا ہے۔ ملک جاوید محمد خان سرکانی ورانی دکھ ہوا کہ آپ B.L میں ہیں۔ مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ سوائے معراج الدین کے کسی نے مجھے یاد نہیں کیا۔ سچ کہتے ہیں آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ محمد ایاز راہی نے میرے پسندیدہ شاعر چچا غالب پر بہت منفرد اور کامیاب مختصر تبصرہ کیا، واقعی سمندر کو کوزے میں بند کیا ہے، غالب جیسا نہ پہلے کوئی تھا نہ آگے کوئی پیدا ہوگا۔ بیت بازی کے اشعار بھی بہت اچھے ہیں۔ زیادہ تر نئے لوگوں کے تھے بلکہ غلط بھی۔ میں ملک کے حالات پر اب کچھ نہیں کہوں گی کیونکہ بھینس کے آگے بین نہیں بلکہ ڈھول بجانا ہے اس لیے پہلے سچ بیانیوں پر تبصرہ کرتی ہوں، پہلی کہانی انسان جس میں مردوں کی ازلی گندی ذہنیت، یاور حیات جیسا بے غیرت اور بے ضمیر مرد ہر جگہ اپنی گندی ذہنیت کے ساتھ ہمارے معاشرے میں موجود ہے۔ مگر اس گندی مٹی میں مقبول صاحب جیسے کنول بھی ہوتے ہیں تب ہی تو زندگی رواں دواں ہے۔ لیکن تقدیر کے مالک کی بھی مرضی کہ ہمیشہ مرد کے ہاتھوں عورت کو ذلیل کیا۔ گناہ آدم نے کیا سزا حوا کی بیٹی کو مل رہی ہے۔ دوسری کہانی گلاب جو کہ طوائف کی زندگی کے بارے میں ہے۔ خوشبو ٹھیک کہتی ہے کہ مرد طوائفوں کے پاس آ کے پیسے قدموں میں ڈالتے ہیں، اپنی ہوس کی پیاس بجھا کر دن کو شریف زادے بن جاتے ہیں۔ ان مردوں کے دماغ کا خلل ہے کبھی عورت کو آسمان پر بٹھا دیتے ہیں اور کبھی وہی مرد گندی ذہنیت کو استعمال کر کے منہ کالا کر دیتے ہیں ایسے مردوں سے تو عورتیں ہزار درجے بہتر ہیں۔ اللہ ان مردوں پر اپنا کرم کرے۔ وہمی بہت زبردست اور ہمارے معاشرے کے منہ پر مضبوط طمانچہ ہے۔ مرد کچھ بھی کرے لیکن عورت کسی سے ہنس کے دو بات بھی کرلے تو کسی مرد کی بیوی نہیں بن سکتی واہ کیا انصاف ہے۔ مرد انسان ہے لیکن عورت انسان نہیں۔ اگر بیوی یا عورت خراب ہے تو پھر ماں، بہن اور بیٹی بھی خراب ہے۔ ویسے کاش اختر جیسا دوست ہر ایک کو ملے۔ وہم وہ مرض ہے کہ کسی اور کو تکلیف ملے یا نہ ملے خود وہ انسان اپنا دشمن ہوتا ہے اور آخر میں اکیلا رہ جاتا ہے یا ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اب ہر کوئی ظفر کی طرح تو خوش قسمت نہیں ہوتا کہ ہر کسی کو اختر نہیں ملتا۔ میں بھی ایک وہمی کو جانتی ہوں وہ بھی نرگسیت کے وہم میں مبتلا ہے اور میری دوستی محبت اور خلوص اس کو 7 سالوں میں نظر نہیں آیا۔ لیکن ساتھ میں بھی نہیں چھوڑ رہی، اپنا کر رہوں گی۔ مہمان میں بلوچ قوم کی مہمان نوازی دکھائی ہے۔ بلوچ قوم واقعی بہت معصوم، مہمان نواز لیکن تھوڑے سے سیدھے بھی ہیں۔ حیرت مجھے راحیلہ کے باپ پر ہے پتا نہیں ہمارے ملک میں یہ دوہری منافقت کب ختم ہوگی۔ مذہب کو موم کی ناک بنا دیا ہے۔ جو چیز فائدے میں ہے وہ ٹھیک ہے جو نہیں ہے وہ غلط ہے۔ بیٹا کچھ بھی کرے خیر ہے وہ مرد ہے۔ ”سوال“ میں وہی انسان کی پیسے کے لیے ہوس لیکن یہ کہانی پڑھ کے تو انسانیت پر سے اعتبار اٹھ گیا کوئی انسان اتنا ظالم اور بے رحم بھی ہو سکتا ہے۔ اور وہ ایسا رویہ اختیار کرتا ہے۔ اللہ ہم سب پر رحم کرے اور ہماری غلطیاں معاف کرے۔ کہیں پر انسان ظالم ہوتا ہے اور کہیں پر تقدیر کی تلوار اس تیزی سے چلتی ہے کہ انسان دہل جاتا ہے۔ عالیہ نے بالکل صحیح کہا کہ ہر پرائز بانڈ کے ساتھ ریاض جیسا مرد نہیں ملتا کہانی کچھ فلمی سی لگی لیکن اس ایک بات نے دماغ کو سوچنے پر مجبور کیا کہ ہر مرد ریاض جیسا کیوں نہیں ہوتا۔ اتنا پُرخلوص، نیک اور پیار کرنے والا۔ ”وعدہ“ محبت کی قربانی کی ایک عظیم کہانی ہے۔ عورت قربانی دے تو وہ بے وفا کہلائے۔ مرد قربانی دے تو وہ وفادار۔ محبت کی کہانی ازل سے شروع ہے اور ابد تک رہے گی۔ لیکن مرد کسی عورت کے لیے ایسی قربانی دے، آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اس کہانی میں بھی اس نے دوست کے لیے قربانی دی ہے۔ عورت اس لحاظ سے بے وقوف ہے کہ وہ ہر مرد کو سچا سمجھ کے محبت کرتی ہے۔ لیکن محبت، ایثار اور شرم و حیا جیسے رویے مرد ذات میں نہیں ہیں۔ کہانی سفید پوش پڑھ کے بہت دکھ ہوا اور تن من سے مل گئی کہ سفید پوشی کا بھرم زبان پر تالے ڈال دیتا ہے، اللہ اس حالت سے ہمیں بچائے آمین۔ ہمارے پیارے نبیؐ نے بہت مناسب اور صحیح الفاظ میں فرمایا ہے کہ ”غربت بھی تباہی ہے اور رزق کی فراوانی بھی تباہی ہے۔“ بس اللہ ہمیں حلال رزق عطا کرے اور غربت سے بچا رکھے اور ہمارے ملک کے ڈاکٹروں کو عقلِ سلیم عطا کرے۔ ”لغزش“ وہی مرد کا رونا کہ عورت نے جھکا دیا، ایک طرف کہتے ہیں کہ عورت بے وقوف ہے اس کے پاس نام کو دماغ نہیں تو پھر یہ مرد ذات کس کے ہاتھ بے وقوف بن جاتے ہیں۔ جی

ہاں' یہ غلطی سے ہوگیا ورنہ میں تو فلاں سے عشق کرتا ہوں۔ اس کے لیے جان دے سکتا ہوں۔ یہ سب مرد کے ڈھکوسلے ہیں' عورت کی تذلیل ہے، عورت کو یہ کھلونا سمجھتے ہیں، ایک عورت کو یہ تباہ کرتے ہیں، سچی محبت اور خلوص کا مذاق اڑاتے ہیں۔ زینی جیسی محبت کرنے والی کے ساتھ نہیں ٹکتے لیکن ثمینہ جیسی مکار لڑکی کے آگے جھک جاتے ہیں۔ یہ مرد حضرات واقعی محبت کرنے والی پُرخلوص اور نیک عورت کے قابل نہیں ہیں۔ ان کو تو ثمینہ جیسی عورتیں ملنا چاہیے کیونکہ عزت تو مرد کو راس نہیں آتی ہے۔ اس بار تو سچ بیانیوں نے بہت دکھی کر دیا ہے۔ پھر بھی میرے خیال میں نمبرون کہانی انسان' 2 گلاب اور نمبر 3 لغزش ہے۔ سراب بھی بہت اچھی جارہی ہے اور باقی سرگزشت ابھی پڑھا نہیں کیونکہ اب کالج کھل گیا ہے اور جاب کی ذمے داری بھی ہے ویسے میں سچ کہتی ہوں سرگزشت ایک کمپیر ہے۔ قوسِ قزح کے رنگ جیسا ہے جس میں ہر رنگ نظر آتا ہے۔"

✉ ملک جاوید محمد سرکانی، درانی کا مکتوب بوہ زئی سے "اداریہ ہمیشہ کی طرح دکھ اور تاسف کی داستان ہونے کے باوجود جب یہ پڑھا کہ تنور پر روٹیاں پکانے والے سپوت نے امتحان میں نمایاں ترین کامیابی حاصل کی اور پاکستانی طلباء تقریری مقابلے میں دنیا بھر میں اول حیثیت کے حامل ٹھہرے تو دل کو کچھ تقویت حاصل ہوئی اور حضرت علامہ کا یہ مصرعہ بے ساختہ زبان پر جاری ہوا۔ "باقی ہے ابھی رنگ میرے خونِ جگر میں" سرگزشت کے انہی صفحات پر پڑھا تھا کہ انگلیوں کے نشانات کے موجد سر فرانسس گالٹن ہیں جو چارلس ڈارون کے پھوپی زاد یا چچازاد وغیرہ تھے اگر تقی محمد خان کو اس کا موجد ٹھہرانے پر مزید خوشی اور فخر کی بات ہے۔ (ایسے بے شمار انکشاف منتظر ہیں کہ موجد کوئی نام کسی کا۔ کیونکہ ہم خود اپنوں کے کام اور نام کو یاد نہیں رکھتے۔) شہرِ خیال کے ساتھیوں سعید جائم، محمد رضا شاہ اور خالد یوسفی تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ رانا فیصل اور رانا شاہد عشق ناکام 2 اور جناب عبیداللہ بیگ صاحب پر مفصل مضمون کی فرمائش پر اتفاق ہے۔ بیگ صاحب کا خود کو آخری مغل کہنا ان کا عجز و انکسار ہے ورنہ وہ تو علمی، ادبی دنیا کے مغلِ اعظم تھے' جہانگیر اور عالمگیر میں نہیں کہوں گا کہ انہوں نے دنیائے ادب میں جہاں سازی اور جہاں بانی کی۔ روحِ مناظر کے علاوہ غالب اور اولمپکس بہترین مضمون تھے۔ اولمپکس ماہ جولائی میں شائع ہوکر الگ ہی تاثر رکھتا ہے۔ رسالہ دیر سے ملنے کی وجہ سے باقی مطالعہ نہیں کیا مگر عنوانات ان کے معلوماتی اور دلچسپ ہونے کی دلیل ہیں۔ اگر رسالہ بروقت مل جایا کرے تو شاید ہم بھی کوئی اچھا تبصرہ کرسکیں۔ (اب رسالے کی یہی تاریخیں ہوں گی) قصہ مرزا صاحباں کے حوالے سے کچھ تاریخی حیثیت کی گزارشات جناب ذوالفقار گیلانی کی خدمت میں۔ ہر پنجابی، زمیندار، کاشتکار، دیہی اور سادہ اور فطری طرزِ زندگی رکھنے والا شہری باشندہ بھی خود کو فخریہ طور پر جٹ کہلواتا ہے ورنہ کھرلوں اور سیالوں یعنی راجپوت اقوام کا جاٹوں سے کوئی قریبی نسبی رشتہ نہیں۔ پیلو شاعر کا اسلوبِ سخن ہی ایسا ہے کہ بیان کردہ واقعہ جیسے چشم دید ہو۔ پیلو شاعر نے ہمارے علاقے وادیٔ سُون سکیسر کے بارے میں بھی چھاچھی زبان میں اشعار کہے ہیں جن کا ترجمہ کچھ یوں ہے۔ "پیلو شاعر نے کوہ تلہ پر کھڑے ہوکر دیکھا آگے دریائے سندھ بہہ رہا ہے اور پیچھے دریائے ہرو۔ سُون کی زرخیز زمین پر جو کچھ کاشت کرو تو بھرپور فصل ہو اور علاقہ کھاٹری میں کچھ کاشت کرو تو کھیت کے کنارے بیٹھ کر روتے رہو۔" علاقہ کھاٹوی بلندی پر واقعہ ہونے کی وجہ سے زیادہ زرخیز نہیں تھا جبکہ علاقہ سُون تھی ہے۔ گوکہ اب کھاٹوی کے حالات بھی گزشتہ بیس پچیس سالوں میں بدل گئے ہیں۔ واقعاتی لحاظ سے مرزا کی گھوڑی بکی یا نیلی کا گورو گوبند سنگھ کی گھوڑی کی اولاد ہونا قرینِ قیاس نہیں کیونکہ قصے میں بیان کی گئی سنین کے مطابق مرزا صاحباں کا انجامی عہد 1556ء تا 1605ء ہے جبکہ گورو گوبند سنگھ کی تاریخ پیدائش 31 دسمبر 1666ء اور تاریخ وفات 6 اکتوبر 1708ء ہے۔ گیلانی صاحب اس جسارت پر معذرت چاہوں گا مگر تاریخی درستی بھی ضروری تھی' ہوسکتا ہے اس درستی سے کسی قاری کو حوالے اور استفادے میں مدد حاصل ہو۔" (بہت شکریہ کہ آپ نے معلومات فراہم کی۔ ساتھ یہ بھی بتادیں کہ رسالے کی تاریخ بدل گئی ہے۔ اب انہی تاریخوں میں رسالہ آیا کرے گا۔)

✉ رانا فیصل جاوید نے علی پور، مظفر گڑھ سے لکھا "سرگزشت کا شمارہ طویل انتظار کے بعد ملا اور اس میں اپنا خط موجود پایا تو یقین جانیے سیروں خون بڑھ گیا۔ میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ماہنامہ سرگزشت پاکستان کا واحد تحقیقی، ادبی اور تاریخی سچائیوں کا حامل رسالہ ہے۔ یہ انکل معراج جیسے محبِ وطن پاکستانی کا عوام کے لیے انمول ترین تحفہ ہے۔ حقیقتاً سرگزشت کا ہر شمارہ خاص شمارہ ہے اور بار بار پڑھنے اور دوسروں کو پڑھانے کے لائق ہے۔ میں اس ادارے کے تمام ممبران، اسٹاف کو عقیدت سے بھرپور سلام پیش کرتا ہوں (شکریہ) فہرست پر نظر دوڑائی تو جاندار تحریریں موجود پائیں۔ آغاز سراب سے کیا، واہ کیا دھماکا خیز قسط تھی۔ جو دھنائی بھارتی دہشتگردوں کی ہوئی پڑھ کر سینہ فخر سے چوڑا ہوگیا۔ پاکستانی ہونے پر مزید فخر محسوس ہوا۔ جب تک شہباز' شاکر اور کرنل جیسے جانباز سپاہی وطن کی حفاظت کے لیے موجود ہیں ہماری دھرتی ماں کو کوئی آلودہ نہیں کرسکتا۔ فلمی الف لیلہ میں آفاقی صاحب فلمی دنیا کی خبریں تو دیتے ہی ہیں ساتھ ہی کافی حد تک ہماری اصلاح بھی کرتے رہتے ہیں۔ ارے یہ کیا؟ غالب کا تذکرہ اور وہ اتنا مختصر؟ مگر بھرپور اولمپکس کا تذکرہ اس لیے اچھا نہیں لگا کہ پاکستان اس سال ہونے والے اولمپکس میں کوئی بھی میڈل نہیں جیت سکا جو ہمارے لیے باعثِ شرمندگی ہے۔ شہنشاہِ جرم میں ایک ظالم کرنل کا احوال پیش کیا گیا مگر میرے خیال میں پورا امریکی معاشرہ ہی ظالم ہے۔ اس کہانی سے ملتی جلتی امریکی مووی بھی موجود ہے۔ جس کا نام بھی غالباً "The Untouchable" تھا۔ جاپانی عورتوں نے جو ظلم امریکی فوجیوں کے ساتھ کیا وہ کم تھا۔ امریکی درندے اس سے بھی بدتر سلوک کے لائق ہیں۔ اے آر رحمان کی روداد پڑھ کر حقیقی خوشی ہوئی۔ اللہ مسلمانوں کو سلامت رکھے۔ شوبھوگیان ایک ایسے شخص کی داستان تھی جو وطن اور انسانیت کے لیے محبت لے کر پیدا ہوا اور ایسے لوگوں کے لیے میرے دل میں وسیع جگہ ہے۔ موجد نے معلومات میں اضافہ کیا۔ معراج صاحب کا اداریہ ہر ماہ کی طرح اس بار بھی سیدھا دل پر اثر انداز ہوا۔"

✉ اختر صبا کی کوٹ برانڈ وزندہ خوسے تشریف آوری "سب سے پہلے شہرِ خیال دیکھا اور شہرِ خیال میں اپنا خط دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ وہ خوشی میرا قلم تحریر کرنے سے قاصر ہے۔ خوشی کے ساتھ ساتھ کچھ اداسی بھی! اداسی اس لیے کہ جن کے نقشِ پا پر چل کر ہم نے لکھنا سیکھا وہ یعنی ڈاکٹر روبینہ شمیس انصاری، ایم اے خالق بھٹی، راجا ثاقب نواز ثاقب، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی وغیرہ نے لکھنا چھوڑ دیا۔ (یہ آپ سے کس نے کہا، سب ہی تو لکھتے رہتے ہیں) شہرِ خیال میں آئے تو تقریباً سو میں سے نوے فیصد لوگوں کا یہی کہنا کہ کیا ہٹلر جیسا شخص بھی محبت کرسکتا ہے؟ تو کیوں نہیں، مشرق کا اقبال، یونان کا سکندر، برطانیہ کا ایڈورڈ ہشتم محبت کرسکتا ہے تو جرمن کا ہٹلر کیوں نہیں کرسکتا' کیا وہ انسان نہیں؟ سکندر کی فتوحات سے تاریخ بھری پڑی ہے تو ہٹلر کی محبت سے کتابیں۔ اداریہ میں معراج رسول صاحب کی تحریر حقیقت ہے موجودہ حالات کی عکاس ہے، ہم جیسے غریب لوگوں کے لیے عید کیا اور عید کی خوشیاں کیا۔ میں بذاتِ خود چھٹیوں میں مزدوری کرتا ہوں، دوران کلاس ٹیوشن پڑھتا ہوں اور جب رات کو خود پڑھتا ہوں تو بجلی نہ ہونے کی وجہ سے لیمپ یا دیے میں پڑھتا ہوں۔ مختار آزاد کی تحریر اولادِ چنگیز پڑھی کیونکہ بچپن سے ذہن پہ جو چند اک نام نقش ہیں ان میں..... چنگیز خان کا نام سرِفہرست ہے۔ چنگیز خان (1162ء تا 1227ء) کا اصل نام تموجن تھا 1206ء میں چنگیز خان کا لقب اختیار کیا۔ والد کا نام یسوگائی خان تھا اک اندازے کے مطابق اس نے 84 لاکھ افراد کو قتل کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جس شہر سے چنگیز خان گزرتا تھا وہاں کی زمین انسانی خون سے سیراب ہوتی تھی۔ ہلاکو خان اسی چنگیز خان کے پوتے، تولائی خان کے بیٹے اور قبلائی خان کے بھائی تھے۔ سچ بیانی میں راحیلہ منصور کی تحریر "مہمان" پڑھی۔ سچ ہے کبھی کبھی محبت انسان کو ایسی سوچ پر مجبور کرتی ہے جہاں عقل کی سرحدیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ عربی ادب میں اک یہی سطر اپنی تمام تر مسرتوں سے نمایاں ہے۔ "لوگ ہر چیز سے کھیلتے ہیں مگر عشق لوگوں سے کھیلتا ہے۔" مہمان میں جس بلوچی شاعر میر گل خان نصیر کا ذکر ہے اس کی شاعری کو کلیات کی شکل میں پروفیسر غلام حسین صبا دشتیاری (جن کو یکم جون 2011ء کو اس وقت شہید کردیا گیا جب وہ یونیورسٹی سے گھر جارہے تھے) نے ترتیب دی ہے باقی تمام ڈائجسٹ زیرِ مطالعہ ہے۔"

✉ رانا محمد شاہد، بورے والا سے لکھتے ہیں "اداریے میں معراج رسول صاحب حوصلہ شکن خبروں کا ذکر کررہے تھے۔ پیٹرول کی قیمتیں 100 روپے سے تجاوز کرچکی ہیں اور مہنگائی کا ایک نہ رکنے والا طوفان شروع ہونے والا ہے۔ عوام کا احتجاج اور واویلا اب بے حس حکمرانوں کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ان حکمرانوں کے پیشِ نظر تو صرف یہ بات ہے کہ زیادہ سے زیادہ ریونیو اکٹھا کیا جائے تاکہ اپنی عیاشیوں اور سہولیات کو بڑھا سکیں۔ سدرہ بانو نے عامر خاکوانی کے کالم کا حوالہ دیا تو کاشف زبیر جیسی باہمت شخصیت کے بارے میں اگلے دن لائبریری سے کالم نکلوا کر پڑھا۔ کاشف زبیر نے معذوری کے باوجود جس طرح باہمت طریقے سے نہ صرف روزگار کمایا بلکہ کہانی کے ذریعے اپنی پہچان بھی بنائی۔ یہ جذبہ آج کے نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے ہی باہمت لوگ آج کے گئے گزرے دور میں ہم پاکستانیوں کے لیے باعثِ فخر ہیں۔ یہ پڑھ کر کاشف زبیر کی دل میں عزت اور بڑھ گئی (جی ہاں یہ ہمارے ادارے کا طرۂ امتیاز ہے کہ وہ اچھے فنکاروں کو آگے لاتا رہا ہے۔ ایک لمبی فہرست ہے جس میں بے شمار نام ہیں جنہیں اس ادارے نے تلاش کیا) برصغیر پاک و ہند کے عظیم، فقیر منش دانشور سید مناظر احسن گیلانی کی سرگزشت بہت دلچسپ تھی۔ سچ لکھا کہ ایسے کئی اہلِ علم ہوں گے جنہیں ہم نے طاقِ نسیاں پر رکھ دیا ہے۔ اولادِ چنگیز پر مختار آزاد نے ایک بہترین تحقیقی رپورٹ لکھی۔ سچ تو یہ ہے کہ جو لوگ بدلتے وقت اور حالات کے ساتھ نہیں بدلتے، ان کے حالات بھی نہیں بدلتے۔ کیا ہم نہیں جانتے کہ برصغیر پر برسوں حکومت کرنے والے مغلیہ خاندان کی اولادوں کے ساتھ کیا ہوا اور آج ان کی اولادیں کیسی کسمپرسی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ سندھ دھرتی کے عظیم انسان شوبھوگیان کی جیون کتھا اچھی لگی۔ واہ...... ہندو ہونے کی وجہ سے جب اسے ہندوستان جانے کے لیے کہا گیا تو اس کا جواب تھا۔ "یہ وطن صرف مسلمانوں کا نہیں، ہم اقلیتوں کا بھی ہے، ہم کیوں جائیں کسی غیر دیس میں۔" وطن سے محبت کرنے والے ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ (شوبھوگیان چندانی کو ہم نے اس لیے پیش کیا کہ وطن دشمن جھوٹا پروپیگنڈا کررہے ہیں کہ ہندو پاکستان سے ہندوستان منتقل ہورہے ہیں) اے آر راجپوت اور ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریریں بھی دلچسپی سے بھرپور تھیں۔ اے آر رحمان کا شمار آج کے بڑے موسیقاروں میں ہوتا ہے۔ اس کی کامیابی میں یقیناً اس کی عاجزی کا بھی ہاتھ ہے کیونکہ پھل ہمیشہ جھکی ہوئی ٹہنی پر ہی لگتا ہے۔ صائمہ اقبال کی "شہنشاہِ جرم" سسپنس اور دلچسپی لیے ہوئی تھی۔ مرزا غالب جیسے شاعر پر مختصر سی تحریر بھی دل کو بھاگئی۔ پہلے شمارہ 25 تاریخ تک مل جاتا تھا۔ آج کل 30 کو ملتا ہے۔ (اب تاریخ بدل گئی ہے) یہ منظر امام صاحب ٹی وی ڈراموں والے ہی ہیں نا؟ (جی ہاں) ایک تجویز ہے کہ بہاولپور کے تاریخی قلعے "قلعہ دراوڑ" پر بھی کوئی تفصیل و تحقیقی مضمون دیں، شکریہ۔"

✉ سہیل احمد عباسی کا خلوص نامہ پنو عاقل سکھر سے "ستمبر کا سرگزشت حسبِ معمول اپنی روایتوں کا امین تھا۔ کچھ بہنوں کی غیر حاضری کے بعد اس مرتبہ سید مناظر احسن گیلانی پر ڈاکٹر ساجد امجد کے شاندار مقالے نے قلم اٹھانے پر مجبور کردیا۔ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کے شاندار روحانی بیٹے مولانا گیلانی نے واقعی صرف دین کی خدمت کی۔ میں ان کی ایک کتاب "حضرت ابوذر غفاریؓ" کے حوالے سے آپ کو بتاؤں کہ اس کتاب کا طرزِ تحریر اس قدر بے ساختہ اور ایسی درد و محبت میں ڈوبا ہوا ہے کہ اپنا تو تجربہ ہے کہ جو بھی اس کتاب کو پڑھے گا وہ اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عاشقِ زار صحابی رضی اللہ عنہ کے حالاتِ زندگی پڑھ کر ضرور روئے گا۔ شہرِ خیال میں نوجوان تبصرہ نگار اختر صبا کا تبصرہ شاندار الفاظ پر مشتمل تھا۔ ان کو چاہیے کہ ہر ماہ تبصرہ کیا کریں۔ اس مرتبہ کے خطوط "عشق ناکام نمبر" کے تبصروں سے بھرے تھے جو کہ ہر لحاظ سے ایک بہترین نمبر تھا۔ لیکن اس میں ہماری فرمائش اور آپ کا وعدہ وہ بے کلکشمی پنڈت (نہرو کی بہن) اور سید حسین کے عشق ناکام کا حال ملتا تھا ایسا کیوں ہوا؟ (ایک لمبی بحث چھڑ جاتی پھر مکمل مواد بھی ہمیں نہیں ملا) شہرِ خیال کے خطوط میں سے خالد یوسفی، محمد

اسماعیل اچاگر، رانا فیصل، خالد حسین چنڑ، اور تنویر عباس کے خطوط بھی بہترین تھے۔ جبکہ سدرہ بانو ناگوری، سعید احمد چاند، احمد خان توحیدی اور حکیم سید محمد رضا، رانا محمد شاہد اور اعجاز حسین سنھار تو سرگزشت کے پرانے محبت کرنے والے اور شہرِ خیال کے باقاعدہ حاضرین میں سے ہیں۔ چنگیز خان کی اولاد موجودہ زمانے میں اس طرح دربدر اور خاک بسر ہے پہلی مرتبہ سنا (اللہ تعالیٰ نے چنگیز خان کی آدمی اولاد کو دینِ اسلام پر آنے کی توفیق بھی تو دے دی وہ سب مطمئن زندگی گزار رہے ہیں) معروف سندھی ادیب اور انسان دوست سماجی رہنما کا نام صحیح تلفظ کے ساتھ اس طرح لکھا جانا چاہیے تھا ''شوبھو گیا چندانی'' نہ کہ جس طرح آپ نے لکھا ہے ''شوبھو گیان'' شوبھو صاحب کی انسانیت پرستی کی داستان بہت اچھی لگی۔ (شبھ سے شوبھو نکلا ہے) مہم جوئی کی داستان ''دشمن'' بھی اچھی ہے۔ علی سفیان آفاقی صاحب کی فلمی الف لیلہ طویل ہوگئی ہے اور اب اس میں بیان شدہ باتیں پھر سے دہرائی جارہی ہیں۔ مظلوم فلسطینیوں کے کئی سلسلے سرگزشت میں چلے تھے ان میں نئے نئے موضوعات کی کافی گنجائش ہے۔ جس طرح پہلے ''مجاہد'' کا سلسلہ اور پھر کارلوس کا استاد، اور پھر کارلوس جو کہ پاپولر فرنٹ فار دی لبریشن آف فلسطین (PFLP) کا لیڈر رہا تھا وہ اس وقت فرانس میں عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہے اور اسلام قبول کرکے اپنی مسلمان وکیل سے شادی کرچکا ہے۔ میں تو سرگزشت کے پرانے فائل دیکھ رہا تھا تو اس میں 1995ء کے شمارے میں اس کی داستانِ حیات نظر آئی اور میں حیران رہ گیا کہ سرگزشت میں فلسطین کے بارے میں اس طرح مستقل سلسلے ہوتے تھے اور پھر ''پروشلم'' مجھے تو بھلائے نہیں بھولتی جو 1993ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں جو کردار بیان کیے گئے تھے انہیں میں نے وکی پیڈیا پر سرچ کیا اور ایک جہان حیرت میں ڈوب گیا کہ اپنا سرگزشت کیسی اعلیٰ تحریریں مہیا کرتا ہے۔''

✉ رانا محمد سجاد کا خط شاہ جمال مظفر گڑھ سے ''ادارے کے تمام اسٹاف اور شائقین کو عید مبارک۔ الیٹ ہے لیکن کیا کریں بہت خواہش تھی کہ شمارے میں حاضری یقینی بنائی جائے لیکن مصروفیت نے ایسا دامن پکڑا کہ غیر حاضری کا کرب سہنا پڑا۔ ماہِ مقدس کے پہلے عشرے کے اختتام سے دو دن پہلے ہی۔ ایڈ کے پیپر شروع ہوگئے جو اکیس رمضان المبارک کو ختم ہوئے۔ اعجاز حسین سنھار بھرپور تبصرے کے ساتھ آئے۔ سرگزشت کے اسیر عبدالرؤف عدم، بھئی اتنے عرصہ کہاں رہے کہ شہرِ خیال کا راستہ ہی بھول گئے اب آپ نے ہر مرتبہ حاضری کو یقینی بنانا ہے۔ خالد یوسفی کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ ایم خالق بھٹی، غلام یاسین نوناری، سدرہ بانو ناگوری کے خطوط پسند آئے۔ رانا حبیب صاحب، جناب یہ رسالہ سب کا ہے اس میں کسی سیاست کا عمل دخل نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد ہی اسیری سے نجات دلائے (آمین) منظر علی خان کا جامع تبصرہ پسند آیا۔ رانا محمد شاہد کا خوبصورت تبصرہ اپنی الگ شان دکھا رہا تھا مہوش رفیق کا تبصرہ بھی پسند آیا اب کچھ تبصرہ کہانیوں کے بارے میں شمارے کو پڑھنے کے بعد ہمیں تو یہی احساس ہوا کہ شمارے میں کافی کمی ہے۔ کیا کوئی اردو شاعر نہیں ملا تھا جو قطیفے کو ڈال دیا (بے شمار افراد کی روداد حیات چھپ چکی ہے۔ سرگزشت کی 22 جلد مکمل ہوچکی ہیں یعنی جو روداد ایک بار سرگزشت میں چھپ جاتی ہے اسے ہم دوبارہ دینے سے معذرت خواہ ہیں) عشق مسلسل، ڈیانا اور ڈاکٹر حسنات کی ایک اچھی کہانی بن سکتی تھی لیکن اندازِ تحریر نے اس کو عام بنا دیا۔ فلمی دنیا سے اگر ریکھا کے حالاتِ زیست کو اس حوالے سے موضوع بنایا جاتا جس طرح پروین بوبی کو بنایا گیا تو بہت دلچسپ تحریر سامنے آتی (ریکھا پر مفصل مضمون چھپ چکا ہے) ایک اور خاص بات کہ آشا کے قلم سے بھی کوئی تحریر ہونی چاہیے تھی، فلمی الف لیلیٰ میں... کوئی خاص بات نہیں تھی، وہی باتیں جو پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ (فلمی الف لیلیٰ اپنے نام سے ظاہر ہے کہ یہ یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے تو سلسلہ جوڑنے کے لیے واقعاتِ سرگزشت کا تذکرہ ضروری ہے) یہ تو تھا اگست کے شمارے پر تبصرہ، اب آتے ہیں ستمبر کے شمارے پر۔ یک سطی سرگزشت میں ''موجد'' تقی محمد کا تعارف ہوا۔ نگر پرنٹس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ اس کے موجد ہیں جبکہ کچھ عرصہ قبل پڑھا تھا کہ کوئی انگریز صاحب تھے۔ سرگزشت میں ہی میرا خیال ہے ذکر آیا تھا (اگر آپ بغور تاریخ کا مطالعہ کریں تو کششِ ثقل دریافت کرنے والا پیڑ پودوں میں زندگی ہے اس کا پتا لگانے والا، حساب کا کلیہ بھی مسلمانوں کا تحفہ ہے۔ مگر نام انگریزوں کا مشہور ہوا) شہرِ خیال میں دستک دی نئے ساتھی سے پہلے پہل ملاقات ہوئی۔ بھئی آپ کو بھی جشنِ آزادی اور عید مبارک، میاں پانچویں جماعت سے سرگزشت چاہنے والوں میں سے ہو اور شہرِ خیال میں حاضری اب دے رہے ہو۔ خالد یوسفی صاحب عشق کے دریا میں ڈوبنے کا اظہار کررہے تھے۔ عبداللہ بیگ کے کارناموں کے بارے میں بتا رہے تھے۔ محمد اسماعیل صاحب، فکر نہ کریں پاکستان کا مستقبل بہت شاندار ہے۔ بس ضرورت ایک اچھے رہنما کی ہے۔ رانا فیصل جاوید ہمارے شہر سے آئے اور پہلی بار شہرِ خیال میں حصہ لیا البتہ ان میں ہمت کیوں پیدا نہ ہوئی اس کا جواب ضرور دیں گے؟ اب تشریف لانے کو معمول بنالیں۔ خالد حسین چنڑ صاحب، اسی فہرست کے ایک اور ساتھی اب غیر حاضری پر کارروائی ہوگی۔ عزیز اللہ صاحب، آپ نے تو سب کو ہی اپنے قلم کی زد پر رکھ لیا۔ سدرہ بانو صاحبہ کا تبصرہ پسند آیا۔ کاشف زبیر صاحب کے بارے میں آپ نے لکھا تو بے چینی بڑھ گئی۔ اپنے فیورٹ لکھاری کے بارے میں جاننے کا بہت شوق ہے۔ آپ نے معذوری کے بارے میں بتایا، واقعی ایک ہمت کی بات ہے اپنی ذہنی صلاحیتوں سے ایک نام پیدا کرنا۔ سعید احمد چاند کرپشن کے خاتمے کے لیے آپ کی دعا قبول فرمائے اللہ تعالیٰ۔ ادارے نے تاریخ کے بارے میں بتایا کہ تاریخ میں توسیع کردی گئی ہے، ہمیں تو اب پتا چلا ہے۔ حکیم سید محمد رضا، احمد خان توحیدی کے تبصرے بھی اچھے لگے۔ محترم صدیقی صاحب کافی عرصہ بعد حاضر ہوئے خیریت تو تھی نا؟ رانا محمد شاہد راجیش کھنہ کے بارے میں بتا رہے تھے۔ اعجاز حسین سنھار بالآخر شہرِ خیال میں جگہ بنا ہی لی، حسبِ معمول تبصرہ خوبصورت تھا۔ ڈاکٹر اے ملک غالباً پہلی بار شامل ہوئے ہیں۔ آفاقی صاحب سے ہم بھی گزارش کرتے ہیں کہ وہ ان دنوں کی یاد تازہ کریں۔ ملک جاوید خان، ہمارے علاقے سے کہکشاں فیضیاب اور دوسرے ساتھی باہر رہ گئے کوئی بات نہیں، دل نہ توڑیں، اگلی بار پھر سہی۔ ساجد امجد صاحب ''روحِ مناظر'' لے کر آئے۔ مضمون پسند آیا۔ پہلی بار ان کے حوالے سے تفصیلی معلومات ملیں۔ کیسے لوگ تھے جو اپنے کارناموں کی وجہ سے زندہ و جاوید رہتے ہیں۔ شوبھو گیان چندانی ایک محبِ وطن انسان ان لوگوں سے بہت بہتر ہیں جو ذرا سی

مشکل آئے تو بریف کیس اٹھائے اس وطن سے ناتا توڑ لیتے ہیں۔ انتخابات میں جس طرح اس محبِ وطن شخص کو ہرایا گیا وہ تکلیف دہ تھا۔ ''خونخوار عورتیں'' صنفِ نازک کا یہ روپ بھی ہوسکتا ہے؟ یقین نہیں آیا اور ان کی موت بھی تکلیف دہ تھی۔ ''دشمن'' میں بالآخر انسانیت کی جیت ہوئی۔ دلچسپ تحریر تھی، منزہ الاسلام کا تذکرہ شاندار رہا فلمی الف لیلیٰ کافی مختصر رہی۔ سفیرِ موسیقی اللہ رکھا رحمٰن کی دلچسپ کتھا ہے۔ ان کے بارے میں تو پتا تھا کہ وہ ہندو سے مسلمان ہوئے ہیں لیکن تمام گھر والوں کے بارے میں پہلی بار پتا چلا۔ بہت خوشی ہوئی جہاں بہت سی باتوں کا ذکر ہوا ہے وہاں ان کی ایک فلم ''سلم ڈاگ ملینیر'' کا ذکر نہیں ہوا۔ جس پر انہیں آسکر ایوارڈ دیا گیا۔ شہنشاہِ جرم، جرم کے شہنشاہ کے بارے میں بتایا گیا۔ بالآخر اسے بے بسی کی موت کا سامنا کرنا پڑا۔ محمد ایاز راہی غالب کا تذکرہ لے کر آئے گویا سمندر کو کوزے میں بند کردیا۔ بلاشبہ غالب نے اپنی شاعری کے لیے الگ راہ اپنائی اور ایک آفاقی شاعر کہلائے۔ یہ بھی دلچسپ ماجرا ہے کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی اردو شاعری کو وہ مقام نہ دیا جتنا فارسی کو دیا۔ قدرت کے فیصلے بھی عجیب ہوتے ہیں اس آدھی شاعری نے عظمت کا تاج ان کے سر پر رکھا جس کو انہوں نے کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ ''اولمپکس'' کا تذکرہ ہوا اور ہر سال کی طرح بہت سے وعدے، بہت سے دعوے کیے گئے لیکن افسوس کوئی بھی میڈل ہاتھ نہ آیا۔''

✉ سہیل احمد کھتری کا مکتوب کراچی سے ''خونخوار عورتیں نہایت لرزہ خیز تحریر تھی۔ پڑھ کر کتنی ہی دیر خود ہمیں اپنے جسم پر چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں اور دل سے یہی دعا نکلتی رہی کہ اللہ رب العزت ہمیں ایسی اذیت سے ہمیشہ محفوظ رکھے۔ (آمین) سفیرِ موسیقی بھی اچھی تحریر تھی لیکن ادھوری محسوس ہوئی۔ مصنف نے اے آر رحمان کی موسیقی سے مرتب بہت سی فلموں کا سرے سے تذکرہ ہی نہیں کیا جن میں منی رتنم ہی کی فلم ''گرو'' بھی شامل ہے اس کے علاوہ ''یووراج'' اور ''راون'' کا ذکر کرنا بھی بھول گئے۔ اس کے علاوہ اے آر رحمان نے پچھلے سال ہیرو موٹرز کے لیے بھی ایک اشتہاری موسیقی ترتیب دی ہے جو بہت مقبول بھی ہوئی۔ محمد ایاز راہی کی مختصر تحریر ''غالب'' بھی پسند آئی جو مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع تھی۔ اب آتے ہیں سچ بیانیوں کی طرف۔ ''انسان'' اچھی تحریر تھی۔ یہ سچ بیانی فی زمانہ انسانی نفسیات کی اس خوبی پر روشنی ڈالتی نظر آئی کہ جو نہ مل سکے اسے چھین لو یا جو نہ چھین سکو اسے کسی اور کے لیے بھی نہ چھوڑو بلکہ توڑ دو۔ لہٰذا ایاد رکا عمل کوثر کے لیے اسی جذبے کی عکاسی کرتا نظر آیا۔ ''وہی'' پڑھ کر یہی سمجھ آیا کہ انسان جیسا خود ہوتا ہے سامنے دوسرے بھی ویسے ہی نظر آتے ہیں۔ ''سفید پوش'' پڑھ کر میں تو جی جان سے کانپ کر رہ گیا۔''

✉ مہوش رفیق کا مکتوب کراچی سے ''ہم تھوڑے تھوڑے خفا ہیں آپ نے جناب! ستمبر کے شمارے میں ہمیں غیر حاضر کردیا (یہ محفل 8 صفحات پر محیط ہوتی ہے اسے آپ لوگوں کے تبصرے سے ہی سجایا جاتا ہے جو خط وقت پر آتا ہے اسے ہر حال میں شامل کیا جاتا ہے) میری والدہ نے شہرِ خیال میں فرسٹ ٹائم شرکت کی تھی کم از کم ان کا ہی لیٹر شائع کردیتے، خیر ہم سرگزشت سے ناراض بھی تو نہیں رہ سکتے نا.... معراج انکل کے خیالات پڑھے واقعی انکل کچھ لوگوں کو اس ماہِ مبارک رمضان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اپنی مستی میں مست رہتے ہیں۔ کوئی چیک نہیں آتا ان کی زندگیوں میں، ہر کوئی اپنے نفع کا سوچتا ہے۔ غریب غرباء کی کسی کو پروا نہیں۔ یہ حکومت کا کام ہے کہ پورے سال نہیں تو کم از کم صرف اس ایک مہینے میں ریٹ کم کردیا کریں تاکہ غریب بھی اس ماہ کی برکتوں سے پوری طرح فیضیاب ہوسکیں۔ اس ماہ کافی دل دکھا دینے والی خبریں ہماری منتظر تھیں خاص طور پر لوڈشیڈنگ نے بہت تنگ کیا مگر اللہ تعالیٰ کی خاص کرم نوازی تھی کراچی والوں پر کہ موسم بے انتہا خوشگوار رہا۔ موجد میں تقی محمد کو پڑھا ایک گزارش ہے آپ سے کہ تقی محمد نے جو کیس حل کیے پورا ایک مضمون لکھا جائے سرگزشت میں تو مہربانی ہوگی۔ (آپ کی فرمائش نوٹ کرلی۔ جلد پوری کرنے کی کوشش ہوگی) تقی محمد واقعی بہت بہادر انسان تھے اسی لیے انہیں ''خان بہادر'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ اب آتے ہیں شہرِ خیال کے باسیوں کی طرف سب کو میرا اسلام قبول ہو۔ اس دفعہ خود کو نہ پاکر بہت مایوسی ہوئی مگر جب ہم نے قدم رکھا شہرِ خیال میں تو بہت ہی خوشی ہوئی کہ میرے تبصرے کو کافی سراہا گیا۔ سرگزشت کی شکر گزار ہوں کہ اس کے ذریعے میں اپنے جذبات، خیالات تمام ملک کے باسیوں سے شیئر کرلیتی ہوں۔ سب سے پہلے ایک نیا نام سامنے آیا اختر صبا صاحب، بہت بہترین تبصرہ لکھا۔ کرسیِ صدارت کی مبارکباد۔ خالد یوسفی صاحب کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ محمد اسماعیل اچاگر صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میرے اہم پوائنٹ کو سمجھا۔ میں آپ کے سوال کا جواب دینا چاہوں گی کہ بھانجے کی تربیت کے لیے قدم یہ اٹھایا کہ جب تک وہ لوگ کراچی میں قیام پذیر رہے (چھٹیاں گزارنے آئے ہوئے تھے ہمارے گھر کراچی مہمانوائی سے) اس وقت تک ہمارے ٹی وی پر صرف اور صرف کارٹون چینل ہی لگا رہا۔ ان کو اجازت نہیں تھی کہ وہ کوئی اور چینل دیکھ سکیں۔ بلیک لسٹ اس لیے نہیں کیا جاسکتا کہ ایسے پروگرام نیوز چینلز پر دکھائے جاتے ہیں۔ خالد حسین چنڑ شکریہ تبصرہ پسند کرنے کے لیے۔ معراج الدین بن یحییٰ آپ کا سلام قبول، سدرہ بانو کا تبصرہ کافی بہتر لگا۔ سعید احمد چاند، تبصرہ دلچسپ ماننے کے لیے نوازش۔ ابنِ مقبول جاوید احمد صاحب شکریہ بہت بہت گمبھیر مسئلے کو سمجھا آپ نے...... باقی رانا محمد فیصل جاوید، خالد حسین چنڑ، تنویر عباس، ظہیر احمد تبسم، سعید احمد چاند، حکیم سید محمد رضا شاہ، رانا محمد شاہد، احمد خان توحیدی، ابنِ مقبول جاوید، اعجاز حسین سنھار، ڈاکٹر محمد اے ملک کے تبصرے بے حد ہی دلچسپ اور بہترین تھے۔ شہرِ خیال میں کافی ساتھی غیر حاضر ملے سب کو سلام اور دعا۔''

✉ خالد یوسفی، لیہ سے رقم طراز ہیں ''فلمی الف لیلیٰ اس بار پانی کے ذکر سے شروع ہوئی، حسنِ اتفاق دیکھیے کہ وہ سطور پڑھتے ہوئے ہم خود اپنے چاروں اور پانی ہی پانی پاتے رہے، آفاقی صاحب کی یہی باتیں ہمیں بہت بھاتی ہیں، بات سے بات یوں نکالنا کہ بات واقعی بن جائے تو کوئی انہی سے سیکھے، مختلف واقعات بیان کرتے ہوئے وہ کمال کی قوتِ مشاہدہ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہم آفاقی صاحب کے دیرینہ مداح ہیں، اس پیرانہ سالی میں بھی ان کے قلم کی جولانی اور جوانی پر رشک آتا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ شہرِ خیال کے صدر دروازے پر دفعتاً ہنوں کے اختر صبا سے ملاقات ہوگئی۔ زبان سے بے ساختہ نکلا۔ واہ واہ شاباش لڑکے واہ واہ، خوبصورت تبصرے نے دل موہ لیا، وطنِ عزیز میں کہ جہاں ہر شعبۂ زندگی میں میرٹ کی پامالی عام سی

چیز ہے، کم از کم ایک جگہ ایسی ضرور ہے جہاں صرف قابلیت کا سکہ چلتا ہے اور وہ ہے سرگزشت کی محفل شہرِ خیال کی مسندِ اعلیٰ، کہ یہ کرسی ہر ماہ اسی کو نشست کا موقع دیتی ہے جو قرار واقعی حقدار ہو۔ اس بار جیسے ایک نو وارد کی پذیرائی ہوئی اس سے یقیناً یہ شکوہ حل کیا ہوگا کہ شہرِ خیال میں نئے آنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔ محفل میں اس بار عشق ناکام نمبر کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ حوصلہ افزا تبصروں اور قارئین کی ستائش نے یقیناً ادارہ کے ہر رکن کا سیروں خون بڑھا دیا ہوگا کہ محنت کا ثمر ہر تبصرے سے چھلک رہا تھا۔ (بالکل سچ ہمیں خاص خوبی کا بتا رہا ہی ہماری ستائش ہے) اس بار خطوط کی تعداد میں اضافہ بھی اس بات کا غماز تھا کہ یہ خاص نمبر بھی اپنی روایت برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔ محمد ایاز راہی، کبھی نہ جان پائیں گے کہ انہوں نے محض دو صفحات میں ہماری ذوقِ طبع کی تسکین کی خاطر مرزا غالب پر جو کچھ لکھا اس نے ہمیں کس درجہ مسرت سے سرشار کیا۔ اس تحریر دل پذیر کی تعریف کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں۔ ہم کہ خود کو غالب پسندوں کی اگلی صف میں شمار کرتے ہیں اور غالب کی شاعری سے عقیدت کی حد تک محبت ہے۔ کاشف زبیر کی سراب نے اس بار بھی اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ علمی آزمائش اور بیت بازی کے صفحات ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد پھر سے اپنی جگہ بحال نظر آئے (خاص نمبر میں مضامین زیادہ سے زیادہ آسکیں اس لیے ہر نمبر میں وہ پانچ صفحات شامل کردیے جاتے ہیں) بیت بازی کی محفل کے بھی اشعار انتخاب نگاروں کے ذوقِ سلیم کا آئینہ دار ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ سچ بیانوں کی ترتیب اور عنوانات نے اس بار متاثر کیا، پچھلی مرتبہ تمام سچ بیانوں کے عنوانات مرکب تھے یعنی عشق کے سابقے یا لاحقے کے ساتھ دو لفظوں پر مشتمل تھے لیکن آپ اس بار ذرا عنوانات کی خوبی دیکھیے، تقریباً ایک لفظی عنوانات ہیں۔ انسان، گلاب، مہمان، سوال، وعدہ، وہمی۔ اب اس سے قطع نظر اگر سچ بیانوں کا جائزہ لیں، جمیلہ یوسف کی انسان، اور منظر امام کی پیش کردہ سوال نے متاثر کیا۔ خوشبو کی سچ بیانی گلاب، عنوان کی ندرت کے علاوہ غلام قادر کی سحر بیانی لیے ہوئے تھی، پسند آئی۔ اس کے علاوہ عالیہ ریاض، شکیلہ فرقان علی، ظفری اور راحیلہ منصور کی سچ بیانوں نے بھی مایوس نہ کیا خصوصاً اختر شہاب کی سفید پوش اور ڈاکٹر احمد صدیقی کی لغزش نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا۔ مختار آزاد نے اولادِ چنگیز، ابن کبیر نے شوبھو گیان، اور ڈاکٹر عبدالرب بھٹی نے دشمن لکھ کر سرگزشت کے صفحات کو مزید روشن کیا۔ اے آر راجپوت کی خونخوار عورتیں منفرد تحریر تھی، ویسے ہمیں اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ خونخوار بلیاں خودکشی کرلیں گی۔ سید عدنان ذاکر کی سفیر موسیقی اور صائمہ اقبال کی شہنشاہ جرم بھی پسند آئیں۔ پارس حسبِ معمول مختصر مگر پُراثر کی عملی تفسیر نظر آئے۔"

✉ سدرہ بانو نے شیر شاہ کراچی سے لکھا ہے "کراچی کے حالات ایک بار پھر کشیدہ ہوگئے ہیں ہر لمحے بعد ایک نئی خبر منتظر ہوتی ہے۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق رواں سال کے 8 ماہ میں 1325 افراد سفاک درندوں کی درندگی کا شکار ہو کر اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ہم لوگوں کے دل اتنے پتھر ہوگئے ہیں کہ ایسی جان لیوا خبریں سن کر ہمیں کوئی احساس نہیں ہوتا مگر جب خود پر گزرتی ہے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ 2 ستمبر کو ایک عزیز کو اپنی دکان بند کرتے ہوئے کسی سفاک قاتل نے گولی مار کر موت کی نیند سلا دیا یہ خبر سن کر دل کو کچھ کا سا لگا۔ اس کے 3 معصوم بچے کس سے اپنے باپ کی موت کا انصاف مانگیں، کس کے ہاتھوں اپنے باپ کا لہو تلاش کریں۔ ان کی روتی ہوئی آنکھیں سراپا سوال بنی ہوئی ہیں مگر ہم میں سے شاید اس کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ شہرِ خیال میں اس بار نئے لکھاری سامنے آئے عشق ناکام نمبر کے حوالے سے بہترین تبصرے کیے گئے۔ ایک تجویز ہے کہ اگر پُراسرار اور عشق ناکام نمبر کی طرح ایک شمارہ خاص طور پر دنیا بھر کے ادیبوں کے نام کردیا جائے تو یقیناً اس شمارے کو خصوصی پذیرائی ملے گی۔ اپنے مخصوص نظریات و فلسفہ حیات پر جینے والے آدمی شوبھو گیان جسے میں گیانی کہنا پسند کروں گی کی داستانِ حیات جس میں یہ سب پوشیدہ ہے کہ آدمی وہ نہیں جو پیدا ہوا شادی کی نوکری کی بوڑھا ہوا اور مر گیا بلکہ آدمی وہ ہے جو قدم قدم اپنے آدرش نظریات اور فلسفہ جدوجہد کا اظہار کرے اور اس کی خاطر قربانیاں دے حتیٰ کہ اپنی زندگی اپنا مستقبل داؤ پر لگادے۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہماری اپنی مٹی میں ایسے ایسے نظریاتی لوگ سانس لیتے ہیں جو ٹوٹ جاتے ہیں مگر جھکتے نہیں۔ شوبھو گیان کے بعض نظریات سے اختلاف اپنی جگہ مگر بات وہی کہ کچھ کر کے ایسا جاؤ کہ بہت یاد رہو اب اس گیانی کی کیا تعریف لکھوں اس کا حق تو ابن کبیر نے بہت خوب ادا کیا ہے۔ دشمن ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر ایک عجیب تحریر تھی بارہ سنگھے اور انسان کی دشمنی اور دشمنی بھی ایسی کہ دونوں کو دشمن عزیز تھا وہ دل خوش ہوگیا ایک پرانی بات یاد آگئی کہ چاق و چوبند رہنے کے لیے پڑوس میں ایک دشمن ضروری ہے۔ سراب اس دفعہ نئے انداز نئے واقعات خاص طور پر شاکر کا کردار دل موہ لینے والا تھا۔ فلمی الف لیلیٰ میں اکمل تھک گئے ہیں یا واقعات ختم ہوگئے ہیں؟ گئے زمانے کے لوگوں کے معیار کا اندازہ ہوا کہ وہ معیار پر سمجھوتا نہیں کرتے تھے پرانی فلموں کا تذکرہ اچھا لگا۔ پہلی سچ بیانی ایک منفرد اور دلوں کو چھو جانے والی تحریر تھی یہ انسان بھی کیا عجیب چیز ہے۔ تقدیر کے ستم سے بے خبر سوچتا کیا ہے اور تقدیر پل بھر میں اس کے ارمانوں کو مٹی میں ملادیتی ہے۔ منظر امام کی ہر تحریر سبق آموز ہوتی ہے "سوال" ایک عبرت ناک تحریر ہے، خدا کو بھول کر اپنے آپ پر گھمنڈ کرنے کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔ وہمی ظفری صاحب نے اپنی روداد بیان کی۔ شک کا بیج اگر ایک بار دل میں بو دیا جائے تو بہت جلد وہ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کرلیتا ہے شکر ہے آپ کو بروقت عقل آگئی۔ ڈاکٹر احمد صدیقی کی ایک ذرا سی لغزش تاحیات ان کے لیے ایک عذاب بن گئی۔

✉ طاہر الدین بیگ کا تبصرہ میر پور خاص سے "پہلے کچھ عشق ناکام نمبر کے لیے، یہ ایک زبردست اور معلوماتی نمبر تھا اس پر بھرپور تبصرہ ہم نہیں لکھ پائے جس کا افسوس رہے گا۔ عشق ناکام میں لوک کہانیوں میں زیادہ ذکر مرزا اور صاحباں کا رہا حالانکہ سوہنی مہیوال عشق کی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش کردار ہے۔ سوہنی وہ دلیر محبوبہ تھی جو کچے مٹکے کے ذریعہ دریا عبور کرکے اپنے محبوب سے ملنے آتی تھی اور محبوب بھی خوب جس نے گوشت نہ ملنے پر اپنے گوشت کے کباب اپنی محبوبہ کو پیش کیے تھے۔ یہ بھی ایک تاریخ ہے۔ مرزا صاحباں وہ واحد عاشق اور محبوبہ تھے جو گھر سے بھاگے اور داستانِ عشق کو داغدار کرگئے ان کا تذکرہ اس قدر آخر کیوں؟ ایک اور لوک کہانی جس کے ذکر کے بغیر داستانِ عشق مکمل نہیں وہ ہے سندھ

کی مشہور لوک کہانی عمر ماروی۔ عمر سومرو عمر کوٹ کا حاکم ماروی کے عشق میں بے چین ہو کر ماروی کے گوٹھ پہنچا کہاں عمر کوٹ اور کہاں تھر اور وہ بھی اونٹ پر۔ ماروی کو اٹھالیا مگر بے حد کوشش کے بعد بھی ماروی کا دل نہیں جیت سکا۔ عزت سے اسے واپس کردیا اور ماروی نے جلتی ہوئی آگ سے گزر کر اپنے اہلِ خانہ کو اپنی پاکدامنی کا ثبوت دیا۔ اب ذکر ہو جائے فلمی الف لیلیٰ کا آفاقی صاحب کچھ غلطی کر گئے یا ہوسکتا ہے کہ کتابت کی غلطی ہو۔ ولا بھٹی پاکستان میں دو بار بنی اور دونوں بار ابورنیو پکچر کے لیے آغا جی اے گل نے اسے بنایا۔ پہلی 1956ء میں اور دوسری 1958ء میں۔ پہلی فلم کے ہدایت کار ایس ایم ڈار تھے صبیحہ اور سدھیر مرکزی کردار تھے یہ ایک سپرہٹ فلم تھی اور کبوتر والے گانے نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ دوسری ولا بھٹی کے مرکزی کردار یوسف خان اور انجمن تھے اور صبیحہ خانم کے لیے خاص طور پر کردار بنایا گیا تھا۔ اس کے ہدایت کار ایم اکرم تھے جو پنجابی فلموں کے ایک مستند اور بہترین ہدایتکار تھے۔ یہ فلم کلر میں تھی اور کبوتر والا گانا اس میں بھی موجود تھا۔ اب ہم نہیں کہہ سکتے کہ کبوتر نظر آتا تھا یا نہیں کیونکہ دونوں فلمیں ہم نے نہیں دیکھیں مگر انور کمال پاشا صاحب کا ان دونوں فلموں سے کوئی بھی کسی طرح کا تعلق نہیں تھا۔ کہانیاں اور آپ بیتیاں دونوں طرف زبردست مقابلہ ہے۔ آپ بیتیوں میں تلخ اور شیریں حقائق بیان ہوتے ہیں۔ لکھنے والوں پر یا ان کے دوستوں پر کیا گزرتی ہے وہ ہمارے لیے تحریر کرتے ہیں اور اس میں حسن سرگزشت والے شامل کرتے ہیں، اکثر آپ بیتیاں دلوں کو چھولیتی ہیں "بارش کی کرم فرمائی اور بجلی و بادلوں کی گھن گرج" اکثر ایسے ہی واقعات کو جنم دیتی ہے جیسے لغزش میں ہے، آفس کے اندر گزرے ہوئے آج اور کل کتنی کہانیوں کو جنم دیتے ہیں۔ انسان بھی ایک ایسی ہی کہانی جو طاہر اور شاہد کے کردار کے ساتھ یاد رہے جیسے انسان کو جنم دیتی ہے اور انہی کرداروں سے کوثر کا کردار بھی جنم لیتا ہے۔ راحیلہ منصور کوئٹہ سے مہمان تحریر کرتی ہیں۔ بلوچی پس منظر میں لکھی ہوئی یہ آپ بیتی بہت بھلی لگی خاص طور پر راحیلہ اور منصور کا کردار اور راحیلہ کا استقبال بلوچی انداز سے لالہ سدھیر مرحوم کی فلمیں یاد آگئیں۔ سفید پوش میں "بیٹا میں صبح سے بھوکا ہوں" یہ کہانی پڑھ کر آپ کا بھی دل ہل گیا ہوگا اگر نہیں ہلا تو اپنے دل کو ٹٹولیے۔ ابتدائی کہانیوں میں شوبھو گیان زبردست معلوماتی کہانی ہے تو دوسری طرف خونخوار عورتیں اور دشمن بارہ سنگھا پڑھ کر جو حیرت ہو جائیں اور ایک زبردست کہانی مارواڑ کے شوقین حضرات کے لیے لاجواب تحریر صائمہ اقبال کے قلم سے ایک زبردست معلوماتی ایڈونچر کہانی جس کا انجام زبردست اور نصیحت آموز ہے۔ اُن داتا طرز کی یہ کہانی اپنے اندر بہت کچھ لیے ہوئے ہے، جسے پڑھتے وقت نظر کتاب سے ہٹنے کا نام نہیں لیتی ہے۔ بے شک سرگزشت اپنے پڑھنے والوں کے لیے لاجواب اثر انگیز اور بے حد معلوماتی کہانیوں کا خزانہ پیش کرتا ہے جس کے لیے سرگزشت والے انتہائی داد و تحسین کے مستحق ہیں۔"

✉ عبدالسلام آرائیں کی بہاولنگر سے تشریف آوری "طویل انتظار کے بعد "عشق ناکام نمبر" موصول ہوا، توقعات کے عین مطابق بہت دلکش لگا۔ سوچا کہ شہرِ خیال کے دوستوں سے شناسائی کرلوں، مجبوری اور مصروفیات کے باعث میں باقاعدگی سے لکھ نہیں سکا البتہ سرگزشت سے تعلق ضرور رہتا ہے۔ (خوش آمدید) مجذوبِ عشق پڑھی نطشے کے متعلق معلومات ملی۔ پہلے ہم صرف اس فلسفی کے سیاسی افکار سے واقف تھے۔ سوزِ عشق بھی زبردست تھی۔ سراب پوری آب و تاب سے جاری ہے۔ فلمی الف لیلیٰ ٹھیک ہی ہے۔ عشق مسلسل میں ڈاکٹر حسنات خان سے ڈیانا کی محبت کا علم ہوا۔ ہم حیران ہیں کہ مغربی لوگ بھی پاکستانیوں کے دیوانے ہیں۔ ایک ایک سچ بیانی کی تعریف مشکل ہے سب ہی پسند آئیں۔ ہمارے معاشرے میں تبدیلی کی رفتار کم ہے نہ جانے یہ معاشرتی خوبی ہے یا خامی۔ ایک گزارش ہے کہ عشق ناکام نمبر کے بعد ایک شمارہ "کامیاب عشق" پہ بھی شائع کردیں۔" (آپ کی فرمائش نوٹ کرلی ہے)

✉ ایم افضل کھرل کا تجزیہ نامہ عظیم والا لاڑکانہ سے "ماہنامہ سرگزشت میرے ہاتھوں میں ہے اور اس کی تحریریں پڑھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ ہماری ثقافت کو ابھی بھی محفوظ کرنے کے لیے کام کیا جارہا ہے۔ اور تہذیب کی خاطر ہم یہ سب کچھ دیتے رہیں گے۔ آپ نے ایک ایسا قدم اٹھایا ہے جس سے نہ صرف ہمارے رسوم و رواج بلکہ ہمارے معاشرے، ہمارے آباؤ اجداد کے رواج کو بھی زوال سے بچایا جارہا ہے۔ یہ ہماری ذمہ داری بھی ہے کہ ہم اپنے تصوف کی پیروی کریں۔ اگر مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے تو میرے خیال میں آپ نے انسانیت کو وہ اصول وضوابط سکھانے کی ذمہ داری اٹھائی ہے جو اس کمپیوٹرائز دور میں تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ میں نے پڑھا ہے کہ اس جدید دور میں مصروفیت بہت زیادہ ہے جی کیا کریں؟ کیا نہ کریں تو یہ اپنی جگہ ہے کہ آپ نے جو درک اسٹارٹ کیا ہے، وہ تو آپ کے کرنے کا فرض ہے۔ آپ بہت اچھے طریقے کے ساتھ کہانیوں کو تحریر کرتے ہیں۔ میری ایک اپیل سمجھ لیں آپ یا التجا کہ آپ کہانیوں کے ساتھ یعنی ایک یا دو صفحات پر اگر ادبی صنف یعنی شاعری صنف کو زیرِ قلم لائیں تو ان تحریروں میں اور بھی جان آئے گی۔" (ہم صنفِ شاعری کی بجائے صنفِ شاعری پر تحریر دینا پسند کرتے ہیں)

تاخیر سے موصول خطوط

احمد جاسیر، لاڑکانہ۔ محمد یاسر نواز، جہلم۔ رانا حبیب الرحمن، گوجرہ ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد نذر الاسلام مہر کانی بستی کریم پور، ڈی آئی خان۔ ناصر فتح محمد، عمر کوٹ۔ خاقان خان، کوہاٹ۔ نسیم فیصل، گوجرانوالہ۔ ای میل، محمد احمد۔ احمد رشید، لالہ موسیٰ۔ رانا حبیب الرحمن (۲) گوجرہ ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ نصیر احمد، نصیر عمر کوٹ۔ ارشد جوکھیو، جوہی۔ نثار حسین، فتح پور۔ ارشاد خالق، شبیر سلطان، مظفر گڑھ۔ نیاز احسن فاروقی، طلحہ انصاری، قسیم بٹ، حیدرآباد۔ عبدالخالق نوشاد، ایبٹ آباد

ڈاکٹر ساجد امجد

وہ راہِ علم کا مسافر تھا۔ تحصیلِ علم وفروغِ ادب میں ہی اس نے زندگی کا بیشتر حصہ گزارہ۔ اقبالیات اور نظریہ پاکستان سے ٹوٹ کر محبت کی۔ جس کام میں ہاتھ ڈالا اسے لازوال کردکھایا۔ معمولی سا کیلنڈر جسے لوگ دیوار پر لگاکر درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے مگر جب اس نے کیلنڈر بنوایا تو وہ یادگار کہلایا۔ ابتدائی جماعت کی درسی کتب تیار کرائیں تو انفرادیت کے مظہر ٹھہرے۔ جو کچھ سپردِ قلم کیا وہ سند ٹھہرا مگر ہم ایسی اہم شخصیات کو بھی بھولتے جارہے ہیں۔

والد جج تھے اور مصیبت یہ کہ دیانت دار تھے۔ نہ کسی سفارش کی پروا کرتے تھے، نہ رشوت انہیں خرید سکتی تھی۔ ایسے لوگوں کے تبادلے بڑے ضروری ہوجاتے ہیں۔ جہاں کسی بڑے آدمی کے خلاف فیصلہ صادر ہوا، اس نے زور لگا کر تبادلہ کرادیا۔ یہی ان کے ساتھ ہوتا رہا۔ اس کی سزا ان کے بیٹے ممتاز حسن کو مل رہی تھی۔ اس کے بعد جب دوسرے بہن بھائی آئے تو کوچہ گردی ان کا نصیب بھی بنی۔ اسے ایک جگہ ٹک کر تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ پرائمری تعلیم مختلف دیہات میں حاصل کرتا رہا۔

گھومتے گھماتے والد کا تبادلہ امرتسر ہوا تو اس نے وہاں کے ایک اسکول میں داخلہ لے لیا۔ یہ بڑا شہر تھا۔ اس نے سوچا تھا یہاں تعلیم کے مواقع خوب ملیں گے لیکن یہاں بھی زیادہ دن رکنا نصیب نہ ہوا۔ تبادلہ جہلم ہوگیا۔ اسکول پھر بدل گیا۔ ابھی اسکول کی دیواروں سے پوری طرح آشنا نہیں ہوا تھا کہ والد کا تبادلہ پھر امرتسر ہوگیا۔ وہ خوشی سے چہکنے لگا۔ امرتسر دیکھا بھالا تھا۔ وہ دل لگا کر پڑھنے لگا۔ ذہانت خداداد تھی۔ کتابیں ازبر ہونے لگیں۔ اساتذہ کی شفقت کا حقدار بننے لگا۔ ایک روز اسکول کے اساتذہ وفد کی صورت میں جج صاحب کے پاس آئے۔

”ممتاز حسن کو پڑھنے کا شوق بھی ہے اور ذہین بھی ہے۔ ہمیں آپ سے کہنے کی ضرورت تو نہیں لیکن پھر بھی کہتے ہیں کہ اس بچے کو خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر اس پر محنت کی جائے تو یہ بڑا نام پیدا کرے گا۔“

”میں سمجھتا ہوں لیکن ملازمت کے بکھیڑے ایسے ہیں کہ میں پوری طرح اس پر توجہ نہیں دے سکتا۔ پھر بار بار کے تبادلے اس کی تعلیم پر اثر انداز ہورہے ہیں۔“

”جی ہاں، بار بار اسکول کی تبدیلی سے بچوں پر نہایت منفی اثرات ہوتے ہیں۔“

”کوشش کروں گا کہ اب تبادلہ نہ ہو، امرتسر سے یہ مانوس بھی ہے۔“

ان کے کہنے سے کیا ہوتا تھا، تبادلہ پھر ہوگیا۔ اب کی مرتبہ گوجرانوالہ جانا ہوا۔ ممتاز کو بھی مارے باندھے گوجرانوالہ جانا پڑا اور وہاں کے گورنمنٹ اسکول میں داخل ہوگیا۔

جب وہ میٹرک میں آیا تو جج صاحب کی تعیناتی دہلی میں ہوگئی۔ وہ میٹرک میں تھا۔ امتحان نزدیک تھے، اس

وقت اسے اسکول سے اٹھانا اس کے مستقبل سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ جج صاحب نے اس کے مستقبل کی خاطر ایک بڑا فیصلہ کرلیا۔ انہوں نے بیوی بچوں کو گوجرانوالہ میں چھوڑا کہ ممتاز کی تعلیم پر اثر نہ پڑے اور خود دلی چلے گئے۔ بعد میں ثابت ہوا کہ ان کا یہ فیصلہ صائب تھا۔ میٹرک کا رزلٹ آیا تو اعلیٰ کامیابی پر اسے وظیفہ ملا۔

بیٹے کے مستقبل کا سوال تھا اور جج صاحب کی تعیناتی دلی میں تھی۔ دلی بڑا شہر تھا۔ پڑھنے کے مواقع بھی زیادہ تھے۔ انہوں نے ممتاز کو دلی بلالیا اور اسٹیفن کالج میں داخلہ بھی دلا دیا۔ اس کالج کی دور دور تک دھوم مچی ہوئی تھی لیکن ممتاز کا دل یہاں نہیں لگا۔ دوسرا مرکز لاہور ہی ہوسکتا تھا۔ اس نے لاہور کے ایف سی کالج میں داخلہ لے لیا اور لاہور چلا گیا۔

اس نے یہاں آتے ہی دیکھا کہ اس کالج کی طرف سے ایک جریدہ بھی شائع ہوتا ہے۔ اس نے کالج کی لائبریری سے یہ جریدہ حاصل کیا اور اس کی ورق گردانی کرتا رہا۔ اسے ان لوگوں پر رشک آرہا تھا جن کے مضامین اس رسالے میں شائع ہوئے تھے۔ ان میں طالب علم اور اساتذہ سب شامل تھے۔

اس نے ایک ایک کرکے سب رسالے پڑھ لیے تھے۔ اب وہ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح اس کی کوئی تخلیق بھی اس رسالے کی زینت بنے۔ اس نے ابھی تک کوئی نظم یا مضمون نہیں لکھا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس جریدے میں مضامین کی اشاعت کے لیے بڑی کڑی شرائط ہیں۔ یہ مرحلہ اس وقت تک طے نہیں ہوسکتا جب تک کہ مطالعہ وسیع نہ ہو۔ اس نے اردو اور انگریزی ادب کا مطالعہ شروع کردیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ طلبہ اور اساتذہ سے بھی روابط بڑھاتا رہا جن کا تعلق اس جریدے سے تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا شمار ایسے ذہین طلبہ میں ہونے لگا جو ادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ اس کی اس دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اس کے اساتذہ نے اسے لکھنے کی طرف راغب کیا۔ وہ انگریزی کا اچھا طالب علم تھا۔ اس نے اس جریدے میں شمولیت کے لیے پہلے پہل انگریزی زبان کا سہارا لیا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اسے اپنی انگریزی پر اعتماد تھا اور یہ وجہ بھی تھی کہ اصل رسالہ تو انگریزی ہی میں شائع ہوتا تھا۔ اردو کا حصہ محض ضمیمے کے طور پر شائع ہوتا تھا۔ بعد میں اس کی تخلیقات اردو میں بھی شائع ہوئیں۔

ایف سی کالج کے زیر اہتمام شائع ہونے والے جریدے کا نام "فورمین کرسچن میگزین" تھا اور ہر ماہ شائع ہوتا تھا لیکن 1925ء میں اس کا نام "فولیو" رکھ دیا گیا اور ممتاز حسن نائب مدیر کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔

یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس اعزاز نے اسے ادبی سرگرمیوں کی طرف راغب کیا۔ لاہور میں نہ ادیبوں کی کمی تھی نہ ادبی سرگرمیوں کی۔ وہ ان اجتماعات میں بھی شریک ہونے لگا۔ انہی دنوں اسے معلوم ہوا کہ علامہ اقبال اسلامیہ کالج لاہور میں "اسلام اور جہاد" کے موضوع پر لیکچر دینے آرہے ہیں۔ وہ بھی پہنچ گیا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ اس نے اقبال کا نام نہ سنا ہو لیکن کبھی انہیں دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

اسلامیہ کالج کا حبیبیہ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ بھی جہاں اسے جگہ ملی بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اقبال اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس کا حال یہ تھا کہ اقبال کو سامنے دیکھ کر تالیاں بجانا بھول گیا تھا۔ مسلمانوں کا عظیم فلسفی اور شاعر اس کے سامنے تھا۔ پہلی نظر کے عشق والا معاملہ تھا۔ اقبال اس کے دل میں اتر گئے تھے۔ ابھی انہوں نے خطاب شروع نہیں کیا تھا لیکن وہ خود کو ڈوبتا محسوس کررہا تھا۔

خطاب شروع ہوا تو ایک ایک لفظ موتیوں میں تُل رہا تھا۔ درمیان میں وہ اپنے اشعار بھی سناتے جارہے تھے۔ وہ بیٹھا سنتا رہا لیکن حال یہ تھا کہ سن کم رہا تھا، دیکھ زیادہ رہا تھا۔

خطاب ختم ہونے کے بعد وہ اسلامیہ کالج سے باہر نکلا تو اس کے نزدیک اقبال کے سوا لاہور میں کوئی نہیں رہتا تھا۔

اس دن کے بعد سے وہ اس دُھن میں سرگرداں رہنے لگا تھا کہ کسی طرح اقبال سے شرفِ ملاقات حاصل ہو اور یہ ملاقات اتنا طول کھینچے کہ باقی عُمر اُن کے قدموں میں گزار دے۔ وہ سوچتا رہا، اتنے بڑے آدمی سے ملاقات کیسے ہو؟ کوئی سفارش کوئی واسطہ؟ اس نے بہت ہمت جمع کرکے اپنے ایک دوست نیاز احمد کو ہمراہ لیا اور اقبال سے ملاقات کے لیے پہنچ گیا۔ وہ اس وقت تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ اپنے ہوسٹل سے پیدل چلتا ہوا میکلوڈ روڈ پہنچ گیا جہاں اقبال کی قیام گاہ تھی۔ کوٹھی پر علامہ کے نام کا بورڈ آویزاں تھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ دونوں دوست اندر آگئے۔ دیکھا کہ برآمدے میں علامہ اقبال معمولی بنیان پہنے اور لنگی باندھے بیٹھے ہیں۔ حُقہ سامنے رکھا ہے اور چند احباب جو اُن کے

اردگرد بیٹھے ہیں، ان سے تبادلہ خیال کررہے ہیں۔ دونوں کی ہمت نہ ہوئی کہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں آگے بڑھ کر ان سے ملاقات کریں جبکہ کوئی شناسائی بھی نہیں تھی۔ یہ بھی مرحلہ درپیش تھا کہ وہ ملاقات کرتے بھی ہیں یا نہیں۔ آدابِ محفل کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے اجازت لے لی جائے۔ اجازت لی کس سے جائے۔ یہ دونوں دھڑکتے دلوں کے ساتھ ملازموں کے کوارٹروں کی طرف چل دیے تاکہ کسی نوکر کو وسیلہ بنایا جائے۔ ان کی نظر ایک دبلے پتلے بوڑھے شخص پر پڑی۔ اس وقت ان دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ یہی شخص اقبال کا دیرینہ ملازم علی بخش ہے۔

"دیکھو، ہم علامہ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ وہ ہمیں نہیں جانتے، تم ہمارا یہ کارڈ ان تک پہنچا دو۔ اگر وہ ملنا چاہیں گے تو ہمیں بلالیں گے ورنہ ہم چلے جائیں گے۔"

علی بخش اپنے انداز سے مسکرایا "یہاں ان تکلفات کی ضرورت نہیں۔ علامہ سامنے بیٹھے ہیں تم بھی وہاں جاکر بیٹھ جاؤ۔"

"نہیں، ہمیں ایسے اچھا نہیں لگتا۔ تم یہ کارڈ ان تک پہنچا دو اور ملاقات کی اجازت لے آؤ۔"

علی بخش نے ان کا اصرار دیکھا تو کارڈ لے کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا۔ اس کے بقول علامہ نے ملاقات کی اجازت دے دی تھی۔ وہ دونوں اس محفل میں پہنچ گئے اور اپنا تعارف کرانے کے بعد ایک طرف بیٹھ گئے۔ علامہ کچھ دیر کے توقف کے بعد پھر مصروفِ گفتگو ہوگئے۔ باتوں سے اندازہ ہوگیا کہ گفتگو وجودِ باری تعالیٰ پر ہورہی ہے۔ ممتاز حسن خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے۔

اس گفتگو کے دوران چند سوالات ممتاز کے ذہن میں آئے لیکن اس وقت کچھ کہنا مناسب نہیں تھا لیکن جب وہ لوگ اٹھ کر چلے گئے اور علامہ نے ان دونوں کی طرف توجہ کی تو ممتاز حسن کو موقع مل گیا۔

"ڈاکٹر صاحب، اگر اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"آپ ایک فلسفی ہیں۔ فلسفے کا تقاضا ہے کہ ہر بات عقلی دلیل سے ثابت کی جائے لیکن ابھی آپ وجودِ باری پر گفتگو کرتے ہوئے عقلی دلیل لانے کے بجائے خوش اعتقادی کے ساتھ اس کا ذکر کررہے تھے۔"

ممتاز حسن اپنی بات ختم کرچکا تو علامہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "میں خوش اعتقاد ہوں اور کسی دلیل کی ضرورت اس لیے نہیں سمجھتا کہ میں نے خدا کو دیکھا ہے۔ انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب وہ خدا کو دیکھ سکتا ہے لیکن یہ لمحے بہت کم نصیب ہوتے ہیں۔"

"کیا ہر شخص کے لیے خدا کا مشاہدہ ممکن ہے؟"

"یہ دروازہ کسی پر بند نہیں لیکن جو شخص مشاہدے کا طالب ہو اسے صبر اور انتظار لازم ہے۔"

یہ بات انہوں نے اتنی قطعیت کے ساتھ کی کہ ممتاز حسن اس موضوع پر مزید گفتگو نہ کرسکا۔ کوئی دوسرا موضوع چھڑ گیا۔ گفتگو کے دوران کہیں موت کا ذکر بھی آگیا۔ یہ گفتگو حیات بعد الموت کے مسئلے پر ہورہی تھی۔ جیسے ہی ممتاز حسن کے منہ سے "موت" کا لفظ نکلا علامہ نے اسے ٹوک دیا۔

"موت کا کوئی وجود نہیں، اصل حقیقت زندگی ہے موت نہیں۔"

علامہ کے دعوے میں اتنا یقین تھا کہ ممتاز حسن کو مزید گفتگو کی جرأت نہ ہوئی۔ حیات بعد الموت پر شکوک اب بھی موجود تھے لیکن علامہ تو یہ کہہ رہے تھے کہ موت ہے ہی

سوانحی خاکہ

نام...... ممتاز حسن
والد...... محمد حسن
والدہ...... سکینہ بیگم
تعلیم...... ایم۔ اے (انگریزی)
زبان آشنائی...... اردو، فارسی، انگریزی، عربی، پنجابی، فرانسیسی، جرمنی
ملازمت...... وزارت مالیات
گورنر بینک دولت پاکستان
چیئرمین مرکزی ریونیو بورڈ
چیئرمین منصوبہ بندی کمیشن
ایم۔ ڈی نیشنل بینک
سفر...... لندن، ایران، کینیڈا، امریکا، اٹلی، جرمنی، فرانس، لبنان، شام، عراق وغیرہ
سن پیدائش...... 6 اگست 1907ء بہ مقام کوٹھڑی موسیٰ خاں ضلع گجرانوالہ
وفات...... 28 اکتوبر 1974ء
تدفین...... پاپوش نگر قبرستان، کراچی

نہیں تو بعد الموت کا کیا سوال۔

وہ اپنے شکوک اپنے ساتھ لے کر اٹھ گیا۔

علامہ سے ملاقات کا نقش دل پر ایسا گہرا ہوا کہ ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہو گیا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن ان کی خدمت میں پہنچ جاتا۔ ہر ملاقات اس کے لیے یادگار بن جاتی۔ علامہ کی زبان سے بیسیوں گراں بہا نکتے ادا ہوتے، اس دوران شعر و شاعری کا دور بھی چلتا رہتا۔

ممتاز حسن فلسفیانہ ذہن رکھتا تھا لہٰذا اکثر فلسفیانہ موضوعات ہی زیر بحث رہتے۔ ایک مرتبہ انسانی جسم کی ساخت، اس کی قوتِ طبعی اور انحطاط کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ موضوعِ بحث یہ تھا کہ روح غیر فانی ہے اور جسم فانی ہے۔

علامہ نے کہا "انسانی جسم کے لیے بھی غیر فانی حیثیت اختیار کر لینا ممکن ہے۔"

ایک دن ہندو معاشرے میں ذات پات کے بندھنوں کا ذکر چھڑ گیا۔ بحث کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ ہندو سماج نے اپنے آپ کو طبقاتی امتیاز اور کم تری و برتری کے مدارج میں تقسیم کر رکھا ہے اور یہ فرسودہ روایت ابھی خاصی اصلاح کی محتاج ہے۔ علامہ نے اس خیال سے اتفاق کیا۔ دوران گفتگو انسانی ارتقا کا ذکر آیا۔ اس وقت علامہ پر خوش طبعی کی کیفیت غالب تھی۔ از راہ تفنن فرمایا "اگر غور سے دیکھیں تو ان مختلف ذاتوں کا تدریجی اقتدار ساری نوعِ انسانی کی تاریخ میں نظر آئے گا۔ ابتدائی دور میں مختلف قوموں اور قبیلوں میں ان لوگوں کی حکومت نظر آتی ہے جو دوسروں سے زیادہ دانش مند اور تجربہ کار تھے۔ سحر و طلسم کا مظاہرہ اور مذہبی رہنمائی انہی سے متعلق تھی۔ اسے برہمنوں کی حکومت کہہ لیجیے۔ اس کے بعد کئی صدیاں تاریخ میں ایسی گزریں جب تلوار چلانے والوں نے اقتدار سنبھالا۔ یہ بادشاہوں کی حکمرانی کا دور ہے جسے کھشتریوں کی حکومت کہنا مناسب ہوگا۔ اس کے بعد ہمارا اپنا زمانہ ہے اور یہ ہے ویشوں کی حکومت۔ تم دیکھو گے کہ آج کل دنیا میں تجارت اور تجارتی منافع کی اہمیت ہے۔ بڑے بڑے تاجر سیاستِ عالم پر اتنا اثر رکھتے ہیں کہ امن و جنگ کا انحصار بڑی حد تک انہی کی مرضی پر ہے۔"

ممتاز حسن نے کہا "ڈاکٹر صاحب، اگر آپ کی اس دلچسپ تقریر کو تسلیم کر لیا جائے تو آئندہ زمانے میں کس کی حکومت ہونی چاہیے۔"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "کیا آپ کے سوال کا جواب مزدور طبقہ نہیں دے رہا ہے۔"

ایک ملاقات میں ممتاز حسن نے سائنس کی اس دریافت کا ذکر کیا کہ جب بہت سے برقیے مل کر حرکت کرتے ہیں تو ان کا عمل یکساں ہوتا ہے یعنی اس عمل کے نتائج یکساں ہوتے ہیں لیکن جب..... ایک اپنی انفرادی حیثیت میں مصروف ہو تو یہ ضروری نہیں کہ یکساں حالات میں اور یکساں اسباب کے پیشِ نظر اس برقیے کا ردِ عمل یکساں ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسباب و نتائج کے جس رشتے کی بنیاد پر سائنس کا سارا کارخانہ قائم ہے خود وہ رشتہ ہی کمزور نظر آتا ہے اور کائنات کی بنیادی ساخت میں کچھ عناصر ایسے ہیں جن کے عمل کے بارے میں کوئی پیشگی اندازہ کرنا ممکن نہیں۔

علامہ نے فرمایا "اب سائنس دانوں پر وہ حقیقت منکشف ہو رہی ہے جس کو قرآن کریم نے مختصر طور پر یوں بیان کیا ہے۔

"اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔"

ایک روز اچھے اور بُرے اثرات پر بحث ہو رہی تھی۔ علامہ کا خیال تھا کہ ایک ہی چیز کا اثر مختلف چیزوں پر مختلف ہوتا ہے۔

علامہ نے فرمایا "آفتاب کی روشنی اور گرمی سے پودوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ انسانی جسم قوت اور توانائی حاصل کرتا ہے اور بوسیدہ چیزیں پہلے کی نسبت زیادہ بوسیدہ اور فاسد ہو جاتی ہیں۔ گویا جس چیز میں اچھی یا بری جو صلاحیت ہوتی ہے اس کی نشوونما ہوتی ہے اور منظرِ عام پر آ جاتی ہے۔"

علامہ نے اس سلسلے میں امام موفق نیشاپوری کی مثال پیش کی "ان کے تین اکٹھے پڑھے ہوئے شاگرد عملی زندگی میں بالکل مختلف راہوں پر نکل گئے۔ ان میں سے ایک عمر خیام، دوسرا حسن بن صباح اور تیسرا نظام الملک طوسی بنا۔"

ان ملاقاتوں نے ممتاز حسن کو اقبال کا عاشق بنا دیا۔ قلب و ذہن اس قدر متاثر ہوا کہ اپنے مزاج اور شخصیت کو علامہ کی خصوصیات کے مطابق ڈھالنے لگا۔

ان ملاقاتوں کے بعد وہ علامہ کی شاعری سے بھی متاثر ہوا۔ ان کی شاعری کا وہ گہری نظر سے مطالعہ کرنے لگا اور ایک روز ایک نظم وجود میں آ گئی جس میں اقبال کی نظموں کا سارنگ موجود تھا۔

دہر کی خوش کامیوں میں کس کو کیا ملتا نہیں

اِک مرا دل ہے کہ اس کا مدعا ملتا نہیں
راہرو ہوں زندگانی کی شبِ تاریک میں
دور ہے منزل مری اور راستہ ملتا نہیں
نقدِ جاں کی خیر مانگو مرحلِ آفاق میں
راہزن ملتے ہیں لیکن راہ نما ملتا نہیں
خوئے الفت اس جہاں کے رہنے والوں میں کہاں
بے وفا ملتے ہیں لاکھوں با وفا ملتا نہیں
ہاتھ میں لے کر چراغِ داغِ دل ڈھونڈا جہاں
جس کے دل میں درد ہو وہ آشنا ملتا نہیں
کچھ تو ہے آخر مگر کیا جانے کیا ہے زندگی
کون ہوں کیا ہوں کہاں ہوں کچھ پتا ملتا نہیں
گلشن دہرا میں ڈھونڈا کوہ و دریا میں تجھے
وائے ناکامی کہیں تیرا پتا ملتا نہیں

....

ان ملاقاتوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ممتاز حسن میں وہ قابلیت نمایاں ہو گئی جو اسے دوسرے طالب علموں سے ممتاز کرتی تھی۔ قابلیت کے وہ جوہر نمایاں ہو گئے جو محض کتابیں پڑھ لینے سے نہیں ہوتے۔ اس کی یہ قابلیت اس کے اساتذہ سے پوشیدہ نہ رہ سکی اور وہ اسے عزیز رکھنے لگے۔ وہ کالج کے جریدے کا نائب مدیر تھا، اسے مدیرِ اعلیٰ بنا دیا گیا۔

انہی دنوں ڈاکٹر ایف ایم ویلٹ نے ایک علمی و ادبی سوسائٹی بنائی۔ اس کا نام "فورمین کالج فنٹین" رکھا گیا۔ یہ سوسائٹی چونکہ پندرہ ارکان پر مشتمل تھی لہٰذا اس کا نام "فنٹین" قرار دیا۔ ان پندرہ میں ممتاز حسن بھی شامل تھا اور ہر اجلاس میں شریک ہوتا رہا اور مقالات پڑھتا رہا اور دوسرے شرکا ان مقالات پر اپنی رائے دیتے رہے جو ہمیشہ تعریفی ہوتی۔

اس نے عربی کے مضمون کے ساتھ بی اے کر لیا۔ بی اے میں اس کے مضامین فلسفہ اور عربی بھی تھے۔ اس نے فلسفہ اور عربی کے بجائے انگریزی میں داخلہ لیا۔ اس کی خواہش تھی کہ ایم اے میں فرسٹ کلاس حاصل کرے تاکہ پی ای ایس کے درجے میں کوئی ملازمت مل جائے اور تمام عمر اردو ادب کی گیسو آرائی میں گزار دے۔

اس کی قابلیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسے کالج انتظامیہ نے جز وقتی لیکچرار مقرر کر دیا۔ ساتھ ساتھ وہ ایم اے انگریزی کی تیاری بھی کرتا رہا۔

اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے لائق اساتذہ بھی نصیب

اعزازات

ستارۂ پاکستان...... 1958ء
کے سی او ایم جرمنی...... 1959ء
نشان سپاس ایران...... 1963ء
کے جی سی او ایم جرمنی...... 1968ء
گوئٹے میڈل جرمنی...... 1968ء
گولڈ میڈل آف میرٹ...... 1968ء
اعزازی ڈگری ایل ایل ڈی پنجاب یونیورسٹی...... 1968ء

ہوئے اور ایسے ہم جماعتوں کی رفاقت بھی میسر آئی جنہوں نے آگے چل کر بڑا نام پیدا کیا۔ ان میں سر عبدالقادر، ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، ڈاکٹر دین محمد تاثیر اور چودھری محمد علی جیسے نابغۂ روزگار شامل ہیں۔

1928ء میں عربی کے استاد سید مرتضیٰ ادیب پروفیسر عربی کا انتقال ہو گیا۔ ممتاز حسن کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ اس نے کالج میگزین کا پورا شمارہ مرتضیٰ ادیب کے نام کیا۔ دوسروں سے ان کے بارے میں لکھوایا اور خود بھی ایک نظم "آرام سے سوجا" اور ایک مضمون "یاد ادیب" شائع کرایا۔ یہ غالباً اس کا پہلا اردو مضمون تھا۔

1929ء میں اس نے انگریزی میں کامیابی حاصل کی لیکن وہ درجۂ اول میں کامیاب نہ ہو سکا جیسی کہ اس کی خواہش تھی بلکہ درجہ دوم حاصل کیا۔

وہ اپنے تعلیمی مراحل میں ہمیشہ وظائف اور امتیازی کامیابیاں حاصل کرتا رہا تھا۔ دیگر سرگرمیوں میں بھی ہر لحاظ سے امتیاز حاصل رہا۔

اس کی ان کامیابیوں نے اسے خاندان بھر کی آنکھوں کا تارا بنا دیا تھا۔ حسنِ اخلاق بھی ایسا تھا کہ سب اس کے گرویدہ تھے۔ اس کے ان پرستاروں میں اس کی تایازاد بہن اقبال بانو بھی تھی اور اتفاق یہ ہوا کہ تکمیلِ تعلیم کے بعد جب اس کی شادی کی فکر ہوئی تو والدین نے اقبال بانو کو اس کے لیے پسند کیا۔ دونوں کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا اس لیے محبت کا جذبہ فطری تھا۔ قدرت کے اس حسین اتفاق پر بھی وہ خوش تھا کہ بیگم بھی ملی تو اقبال۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میرے عشق کی تکمیل اب ہوئی ہے۔ اقبال میرا عشق تھا جس کی تکمیل بھی اقبال کی صورت میں ہوئی۔

شادی کے بعد ملازمت کی فکر ہوئی۔ وہ پبلک سروس

کیشن کے مقابلے میں بیٹھ گیا اور حسب توقع کامیابی حاصل کی اور انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ سروس کے لیے منتخب ہو گیا۔

ادب کا ذوق دل میں کروٹیں لے رہا تھا۔ یہ کروٹیں وہ زمانہ طالب علمی ہی سے لینے لگا تھا۔ مضامین نگاری کا آغاز کالج میگزین ہی سے ہو گیا تھا۔ اب اس نے باقاعدگی سے ادبی زندگی میں قدم رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔

اسے جو عشق اقبال سے تھا اس کا تقاضا تھا کہ اقبال کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کرے۔ اس نے ایک ادیب کی حیثیت سے اپنا پہلا مضمون ”اقبال ایک پیغمبر کی حیثیت سے“ لکھا۔ اس مقالے میں اس نے اقبال کو ایک پیغمبر کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ اقبال کے پیغام اور ان کی عملی زندگی کے بارے میں تفصیلات بیان کیں۔ اس کے بعد عشق اور عقل پر بحث کرتے ہوئے عشق کو ترجیح دی۔

”عشق کی شان اس کے مقصد کی وسعت ہے۔ ایسے وسیع عشق کی اشاعت کرنا پیغمبری ہے۔“

یہ بہت بڑی جسارت تھی کہ وہ اقبال کو پیغمبر کی حیثیت سے پیش کرے۔ اس کی وضاحت بھی ضروری تھی۔ اس نے یہ وضاحت کی۔

اقبال کو پیغمبر کہنے سے میری مراد یہ ہے کہ اقبال نے زندگی کے بنیادی حقائق کو ہمارے سامنے پیغام کی صورت میں پیش کیا اور ہمارے لیے ایک مخصوص راہِ عمل منتخب کی۔

اس نے یہی نہیں کیا بلکہ ان مخالفانہ آرا کو بھی مضمون میں پیش کیا جو ان کے مخالفین ان کے بارے میں کہتے تھے۔ ان کی تردید کی اور اقبال کو پیغام بر ثابت کیا۔ اس دکھ کا اظہار بھی کیا کہ لوگ اقبال کے پیغام سے غافل رہے۔ اس غفلت کی وجوہات بھی بیان کیں۔

اس مضمون کی ہلچل ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ رسالہ نیرنگِ خیال کا اقبال نمبر شائع ہوا۔ اس خاص نمبر میں لوگوں نے ممتاز حسن کا مضمون ”اقبال کی شاعری پر قیامِ یورپ کا اثر“ پڑھا۔

اس مضمون میں ممتاز حسن نے اقبال کے اس فکری ارتقا کا احاطہ کیا جو قیام یورپ کے زمانے میں اقبال کو نصیب ہوا۔ اس دور کو اس نے اقبال کی پیغمبرانہ شاعری کا آغاز قرار دیا کیونکہ یہی وہ دور تھا جب اقبال کے مطالعے نے انہیں تہذیب اسلام اور تہذیب مغرب کا موازنہ کرنے کا موقع فراہم کیا اور یہی وہ اثرات تھے جنہوں نے ان کی زندگی کا نصب العین متعین کیا اور اقبال ایک پیغمبر شاعر کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے۔ اس مضمون میں فکرِ اقبال کے ساتھ ساتھ اسلوبِ اقبال پر بھی بحث کی گئی تھی۔

اقبال کے عشق کا نشہ اتنی آسانی سے اترنے والا نہیں تھا۔ اس نے ایک اور مضمون ”اقبال اور فلسفۂ مغرب“ لکھ ڈالا۔ یہ مضمون انگریزی میں تھا۔

فلسفہ ممتاز حسن کا پسندیدہ موضوع رہا تھا۔ ممتاز حسن کا مطالعہ بھی بہت وسیع تھا لہٰذا یہ مضمون نہایت تفصیل سے لکھا گیا۔

ابتدا میں فلسفۂ مغرب کی تاریخ بیان کی پھر اقبال کے فلسفے کا مغربی حکما کے افکار سے موازنہ کرتے ہوئے کیٹ کے مسئلہ ایمان، شوپن ہار کے فلسفۂ حیات اور نطشے کے تصورِ انسان کامل پر بڑی مفصل بحث کی۔ اس کے بعد برگساں اور گوئٹے کا ذکر کیا جن سے اقبال بڑی مشابہت رکھتے تھے۔

آخر میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اقبال کے فلسفے کی اساس روحِ اخلاقیات اور دینِ اسلام ہے جبکہ فلسفۂ مغرب کی بنیادیں مادیت پر قائم ہیں۔

ان مضامین کی اشاعت سے اس کا شمار اقبال شناسوں میں ہونے لگا۔ یہ وہ دور تھا جب اقبال کی تفہیم پوری طرح نہ ہو سکی تھی۔ ایسے ماحول میں اقبالیات کے نئے گوشوں کی تلاش ایک محقق ہی کا کام ہو سکتا تھا۔ ممتاز حسن محقق ہونے کا ثبوت دے رہا تھا اور نشاندہی کر رہا تھا کہ اس میں ایک بڑا ادیب ہونے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہے۔

اسے ایسے اساتذہ اور احباب کی رفاقت میسر آئی جس نے اسے ابتدا ہی میں صاحبِ اسلوب بنا دیا۔ وہ عبدالحق سے بہت متاثر تھا لہٰذا اس کے اسلوب میں بھی وہی جامعیت، سنجیدگی، متانت، توازن، ایجاز و اختصار اور سادگی تھی جو اسلوب عبدالحق کی نمایاں خصوصیات تھیں۔

ممتاز حسن نے ایک حکیمانہ ذہن پایا تھا لہٰذا اس کی تحریروں میں فکر کی گہرائی، حکمت و دانش کی فراوانی اور علم، بصیرت کی جھلکیاں نظر آتی تھیں لیکن بعض...... لوگوں کو یہ گمان ہو رہا تھا کہ وہ صرف اقبال پر ہی لکھ سکتا ہے۔ یہ خیال اس نے جلد ہی غلط ثابت کر دیا۔ اس نے بعد میں متفرق نویسی کا راستہ اپنایا۔ مختلف میں اس نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا لیکن غالب حصہ اقبالیات ہی کے ذیل میں آتا ہے۔

اردو میں مضمون نگاری کا آغاز سرسید نے کیا تھا۔ پھر ان کے رفقا نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ ممتاز حسن نے بھی اس زنجیر میں ایک کڑی کا اضافہ کر دیا۔ جلد ہی اس کا نام رسالہ ’اردو‘ ہمایوں اور نیرنگِ خیال وغیرہ میں جگمگانے لگا۔ اس نے اپنے مضامین کا دائرۂ کار علمی، ادبی، تہذیبی، ثقافتی، ملی اور مذہبی موضوعات تک بڑھا دیا۔

وہ ادبی شاہراہ پر چلنے کے ساتھ ساتھ سرکاری عہدوں پر بھی قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ سروس میں آگے بڑھتے ہوئے وہ ڈپٹی کنٹرولر سندھ ہو گیا۔ وہ اس عہدے پر سب سے کم عمر مسلمان افسر تھا۔

وہ نثر نگاری کے ساتھ ساتھ شاعری کا ذوق بھی ابتدا ہی سے رکھتا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی اس نے کئی نظمیں لکھی تھیں۔ وہ خود کو شاعر منوانے پر بضد نہیں تھا لیکن اس ذوق سے دامن بھی نہیں چھڑا سکتا تھا۔

مضمون نگاری کے ساتھ ساتھ وہ چپکے چپکے نظمیں اور غزلیں بھی لکھتا رہا۔ پھر ایک نظم اس نے ”ہمایوں“ میں اشاعت کے لیے بھیج دی۔

افق پہ تاریکی چھا رہی ہے
خوشی دنیا میں آرہی ہے
شب سیاہی لا رہی ہے
پیام راحت سنا رہی ہے
وہ شور خاموش ہو چکے ہیں
فضا کی گودی میں سو چکے ہیں
مگر میرے دل میں اک محشر اٹھا رہی ہیں
کسی کی باتیں
کہاں وہ گزرے ہوئے زمانے
کہاں وہ اس دور کے فسانے
وہ داستاں ختم کی قضا نے
اب آئی ہیں کیوں مجھے ستانے
غم گزشتہ کی یاد کیسی
یہ آفت خانہ زاد کیسی
جو سو چکا غم اسے بھلا کیوں بلا رہی ہیں
کسی کی باتیں

اقبال کی شاعری کے ساتھ ساتھ وہ عصری رویوں سے بھی متاثر ہو رہا تھا۔ اس نے نظم ”آرزو“ لکھی۔ اس نظم کی دروبست معریٰ نظموں کی سی ہے۔ کہیں کہیں اندرونی قوافی بھی ملتے ہیں۔

جھولا کروں پھولوں سے
اور خشک ببولوں سے
خوشبو کو چرا لاؤں
کانٹوں کو رُلا لاؤں
دیکھا کروں نہروں کو
چھیڑا کروں لہروں کو
سوتے ہوئے سبزے کو
چپکے سے جگا جاؤں
دلگیر سے غنچوں کو

”تاثرات“

ان کی وفات سے ادب ہی کا نہیں بلکہ ملک و ملت کا بھی ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔ ان کی سیرت اور کارناموں پر روشنی ڈالنے اور ان کی وفات حسرت آیات پر اظہارِ تعزیت کرنے کے لیے جذبات کو الفاظ کا روپ نہیں دیا جاسکتا۔

(شان الحق حقی)

علم دوست، وسیع مطالعہ، اردو فارسی، انگریزی عربی پنجابی کے عالم۔ فرانسیسی اور جرمنی بھی جانتے تھے۔ اس لیے کسی مبالغے کے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہفت زبان تھے۔

(ماہر القادری)

پاکستان سے دوسرے ملکوں کے علمی، ثقافتی اور سائنسی رشتوں کو بہتر اور مضبوط بنانے کے لیے شہرت اور ذاتی تشہیر کے ذرائع سے بے تعلق رہتے ہوئے وہ اتنی گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے کہ ہمارے بڑے بڑے سفیر اور کونسلر بھی اس سے قاصر رہے۔ کوئی مورخ برطانیہ سے آئے یا فرانس سے، اسکالر جرمنی کا ہو یا اٹلی کا، امریکی دانش ور ہو یا ایرانی، ترک ادیب ہو یا مصری محقق، مسئلہ قومی ثقافت کا ہو یا ادب و شاعری کا۔ نئی تصانیف و تراجم کی بحث ہو یا مسئلہ و سائنس کی۔ راقم الحروف نے پورے گیارہ برس کے دورِ شناسائی میں جناب ممتاز حسن کو ہر ملکی و غیر ملکی ملاقاتی سے ہر موضوع اور نفسِ مضمون کے ادق اور نازک پہلو پر پوری خود اعتمادی کے ساتھ بے تکان بولتے دیکھا اور سنا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا مطالعہ وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ ہمہ جہتی نوع بہ نوع معلومات سے مزین تھا۔“

(اقبال احمد صدیقی)

چہکے سے جگا جاؤں
اور صبح کے آنے کا
پیغام سنا جاؤں
نغموں کے تلاطم سے
پُر ہو مری خاموشی
دنیا کو میں سکھلا دوں
آلامِ فراموشی
آرامِ جوانی سے
خوشیوں کی کہانی سے
الفت کے تکلم سے
شوخی کے تبسم سے
محبوب جفاؤں سے
مرغوب اداؤں سے
دامن کو میں پُر کرلوں
ان موتیوں سے بھرلوں

....

اس کے کشکولِ سخن میں غزلوں کے پھول بکھرنے لگے۔ رجحان نظموں کی طرف تھا لیکن غزل تو غزل ہے۔

محبت فاتحِ ہر دو جہاں ہوجائے گی آخر
تری فرقت وصالِ جاوداں ہوجائے گی آخر
دلِ مایوس کو مل جائیں گی کھوئی ہوئی خوشیاں
خزاں میری بہارِ بے خزاں ہوجائے گی آخر
نکل جائیں گے دل سے گردشِ ایام کے شکوے
مری تقدیر مجھ پہ مہرباں ہوجائے گی آخر
مری درماندگی نے آج تک سمجھا جسے منزل
وہ منزل گردِ راہِ کارواں ہوجائے گی آخر
چمک اٹھیں گے تارے بن کے خاکِ راہ کے ذرّے
زمیں اس رہ گزر کی آسماں ہوجائے گی آخر
کہے گا حالِ دل اپنی زبانِ حال سے شاعر
خموشی ہی مرے دل کی زباں ہوجائے گی آخر

....

حیاتِ رائگاں ہے اور میں ہوں
غمِ عمرِ رواں ہے اور میں ہوں
جوانی، عاشقی، سرمستی اور میں
فراقِ رفتگاں ہے اور میں ہوں
رواں ہے قافلہ عمرِ رواں کا
غبارِ کارواں ہے اور میں ہوں
مری تنہائیاں مجھ سے نہ پوچھو
زمیں ہے، آسماں ہے اور میں ہوں
حقیقت کیا بھی تھی اس چمن کی
قفس میں آشیاں ہے اور میں ہوں

....

سرکاری مصروفیات کے باوجود وہ تخلیقات سے دل بہلا رہا تھا۔ 1939ء میں حکومتِ ہند نے اسے انڈر سیکریٹری محکمۂ مالیات مقرر کردیا۔ پھر وہ وائسرائے ہند کی مجلسِ انتظامیہ کے رکنِ مالیات سر جیری ریسمن کا پرائیویٹ سیکریٹری مقرر کردیا گیا۔ اسی سال یعنی 1943ء میں ڈپٹی کنٹرول جنرل محکمۂ خوراک لاہور اور 1943ء ہی میں نائب مشیر مالیات لاہور محکمۂ خوراک منتخب ہوا۔

وہ وزارتِ مالیات میں ڈپٹی سیکریٹری تھا کہ فسادات کا بازار گرم ہوگیا۔ صوبہ بہار (موجودہ ہندوستان) میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کردیا۔ دہلی میں بھی حالات بگڑنے لگے۔ مسلمانوں کے خلاف اس فساد میں ہندو اور سکھ دونوں برابر کے شریک تھے۔ یہ دور بڑا نازک تھا۔ اخبارات میں ایسے مضامین شائع ہورہے تھے جو فسادات کی آگ کو مزید ہوا دے رہے تھے۔

کانگریس نے مخلوط مرکزی حکومت میں مسلم لیگ کو وزارتِ مالیات کی پیش کش کی تھی۔ اس پیش کش کے بعد قائداعظم اور دیگر رہنمائے لیگ اس پریشانی میں مبتلا ہوگئے کہ مسلم لیگ میں کوئی ماہرِ مالیات نہیں تھا اور کانگریس میں اس شعبے کا ایک سے ایک ماہر موجود تھا۔ کانگریس کا منشا یہ تھا کہ مسلمانوں کی نااہلی دنیا پر ثابت ہوجائے۔ ایسے نازک وقت میں چودھری محمد علی اور ممتاز حسن نے ہمت دکھائی۔ لیاقت علی خاں سے ملاقات کی اور انھیں وزارتِ مالیات لینے پر آمادہ کیا۔

ممتاز حسن انڈین آڈٹ اکاؤنٹ سروس کے سربرآوردہ رکن تھے۔ ماہرِ مالیات کی حیثیت سے ان کی خوب شہرت ہوچکی تھی۔ مسلمانوں میں ماہرینِ مالیات گنے چنے تھے۔ ان میں چودھری محمد علی اور ممتاز حسن کے نام غنیمت تھے۔ لیاقت علی نے ان پر بھروسا کیا اور وزارتِ مالیات لے لی۔

جب فسادات نے زور پکڑا تو کانگریس اور مسلم لیگ کی مخلوط حکومت کے اجلاس ہوئے۔ ان اجلاسوں میں اس شورش پر قابو پانے کے لیے غور ہونے لگے۔

تقسیمِ ہند کا وقت قریب آرہا تھا۔ لیاقت علی خاں اور قائداعظم کو اسی سلسلے میں لندن کا سفر درپیش تھا۔ لیاقت علی خاں ممتاز حسن کو اتنا پسند کرنے لگے تھے کہ اس سفر میں وہ انھیں اپنے پرائیویٹ سیکریٹری کے طور پر.... ساتھ لے کر گئے۔ اس سفر میں چونکہ قائداعظم بھی ساتھ تھے لہٰذا ممتاز حسن زندگی بھر اپنی قسمت پر ناز کرتے رہے کہ انھیں قائداعظم کی ہمراہی کا شرف ملا۔

ممتاز حسن تقسیمِ ہند کے وقت اثاثوں اور واجبات کی تقسیم کمیٹی کے خصوصی ممبر اور کئی ذیلی کمیٹیوں کے نگراں بھی رہے۔

قیامِ پاکستان کے وقت وہ لیاقت علی خاں کے پرائیویٹ سیکریٹری کی حیثیت سے یہاں آئے۔

تقسیمِ ہند سے قبل وزارتِ مالیات میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش رہی تھیں لہٰذا پاکستان بنتے ہی حکومتِ پاکستان نے انھیں وزارتِ مالیات میں لے لیا، وہ یہاں بہ طور جوائنٹ سیکریٹری کام کرنے لگے۔

اس کے ساتھ ہی وزارتِ دفاع کے مشیرِ مالیات اور سینٹرل بورڈ آف ریونیو کے ممبر کے فرائض انجام دیتے رہے۔

قیامِ پاکستان کے وقت ایک انارسو بیمار والی کیفیت تھی، اہل لوگوں کی قلت تھی۔ ممتاز حسن نے اس وقت پاکستان کی ترقی کے لیے خود کو وقف کردیا۔ ادیب و شاعر ہونے کی حیثیت سے جہاں وہ علم و ادب کو فروغ دینا چاہتے تھے، وہیں انھوں نے جانباز سپاہی کی طرح سرکاری مصروفیات کے محاذ پر لڑنا شروع کردیا۔ ان میں وہ بیرونی دورے بھی ہیں جو انھوں نے پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے کیے اور صعوبتیں برداشت کیں۔ دولتِ مشترکہ ڈالر کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ آئی ایم ایف اور عالمی بینک کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے۔ پاکستان زرِ مبادلہ وفد کے سینئر سرکاری ممبر کی حیثیت سے لندن کا سفر کیا۔ دولتِ مشترکہ کے وزرائے خزانہ کی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ دفاعی ساز و سامان کی خریداری کے لیے جس وفد نے یورپ، کینیڈا اور امریکا کا دورہ کیا، اس کی قیادت کی۔ دولتِ مشترکہ کے وزرائے خزانہ کی کانفرنس میں پاکستانی وفد کے ممبر بنے۔ خصوصی خدمات کے لیے اٹلی، جرمنی، انگلستان اور فرانس کا سفر کیا۔ جولائی 56ء میں ایک خصوصی مہم پر جرمنی، فرانس، انگلستان، لبنان، شام اور عراق بھی گئے۔

قاعدہ ہے کہ علوم و فنون سرکاری سرپرستی میں ترقی کرتے ہیں۔ بادشاہوں کے دور سے کر اب تک علوم و فنون نے سرکاری سرپرستی میں سفر طے کیا ہے یا کرسکتے ہیں۔ جو کام پہلے بادشاہ کرتے تھے، اب وہ بیوروکریسی کے کرنے کا ہے۔ ممتاز حسن نے اس ضرورت کو محسوس کرلیا تھا۔ وہ علم و ادب کی ترقی کو ملک کی ترقی سے تعبیر کرتے تھے۔ خود بھی شاعر و ادیب تھے اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کو اپنا فرض سمجھتے تھے۔ حکومت کی توجہ بھی اس طرف دلاتے رہے چنانچہ ان کی تحریک پر حکومت نے براڈ کاسٹنگ کمیٹی (ریڈیو، ٹیلی وژن) قائم کردی۔ اس کا چیئرمین بجا طور پر انھیں مقرر کیا۔ یہاں انھوں نے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ ایسے پروگرام مرتب کیے جو ملکی فلاح و بہبود کے ضامن ہوسکتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ تہذیبی ترقی کے بغیر ملکی ترقی ممکن نہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی تہذیبی ترقی میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔ انھوں نے فنکاروں کی دل جوئی اور دادرسی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ کوئی ان سے ملنے چلا جاتا اور معلوم ہوجاتا کہ وہ شاعر ہے تو اپنی کرسی سے کھڑے ہوکر اس سے ہاتھ ملاتے۔ وہ اگر کوئی کام لاتا تو جائز ہونے کی صورت اسے فوراً انجام دیتے۔

''ممتاز حسن بڑے مہربان اور انتہائی مشفق شخص تھے۔ کوئی بھی مسئلہ ہو، کسی قسم کی بھی مشکل ہو، جو ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تپاک سے ملتے، حال احوال دریافت کرتے، مسئلہ سنتے اور حل بتاتے۔ نہ کبھی چہرے پر شکن ابھری، نہ قلتِ وقت کا عذر کرکے ٹالا، پلاننگ کمیشن کا آفس ہو، سینٹرل بینک کا دفتر ہو یا ان کا گھر ہو، ہر جگہ ان کا رویہ یکساں رہتا۔ ان کی یہ شفقت صرف قریبی دوستوں کے لیے مخصوص نہ تھی بلکہ ہر شخص جاننے والا ہو یا انجان لیکن

علم مسلمان کی دولت ہے۔ دنیا کے کسی مذہب یا نظامِ فکر نے حصولِ علم پر اتنا زور نہیں دیا جتنا اسلام نے۔ زمانہ ماقبل اسلام کو کفر کا زمانہ نہیں کہا گیا بلکہ اسے زمانۂ جاہلیت کے نام سے پکارا گیا۔ اسلام کے سب سے بڑے دشمن کو ابوالکفر کی بجائے ابوجہل کہا گیا۔ خدا نے جب آدم کو پیدا کیا تو سب سے پہلے اسے اسمائے اشیا کا علم دیا گیا۔ حضور خاتم النبیین پر جب وحی اتری تو اس کا پہلا لفظ تھا۔ ''اقرا'' یعنی پڑھ قرآن میں ایک قول کے مطابق لفظ ''علم'' یا اس کے مشتقات چار سو سے زیادہ مرتبہ آئے ہیں۔''
(اقتباس: مسلمانوں کی علمی روایت)

جھولی بھر سکتا تھا۔"
(حسین شاہ راشدی)

خدمتِ خلق کے اس جذبے ہی کا اثر تھا کہ تکبر، غرور یا نمائش کبھی مزاج کا حصہ نہ بن سکے حالانکہ جب کوئی آدمی کسی بڑے عہدے پر پہنچ جاتا ہے تو یہ چیزیں خود بخود طبیعت میں شامل ہو جاتی ہیں۔

ان کی سادگی کا ایک عجیب واقعہ ان کے ایک دوست نے لکھا ہے۔

"جب میں ان کے گھر پہنچا تو موصوف اوپر کی منزل پر آرام فرما رہے تھے۔ ملازم نے بتایا کہ صاحب آپ کو وہیں بلا رہے ہیں۔ بالا خانے کی سیڑھیاں طے کرنے کے دوران میرے ذہن میں یہ خیال گردش کر رہا تھا کہ ایک بہت بڑے بینک کے سربراہ (ان دنوں وہ نیشنل بینک کے منیجنگ ڈائریکٹر تھے) کی حیثیت سے ان کی خواب گاہ یقیناً جنت کا نمونہ ہوگی۔ ہر طرف تصوراتی ماحول کارفرما ہوگا۔ رنگا رنگ فضا، ہوشربا مناظر، جھاڑ فانوس، جام و مینا۔ یہی سب باتیں سوچتا ہوا میں ان کے بیڈ روم میں داخل ہوا۔ ایک لمحے کے لیے میں جامد و ساکت رہ گیا۔ تصوراتی ماحول کا عشرِ عشیر بھی وہاں ہویدا نہ تھا۔ اس خواب گاہ میں تو ہر جانب کتابوں کا انبار تھا۔ صوفے پر، میز پر، کرسیوں پر حتیٰ کہ بستر پر کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا یہ خواب گاہ نہیں لائبریری ہے اور یہاں غلطی سے مسہری بچھا دی گئی ہے مگر اعتبار کرنا ہی پڑا۔ وہ خود لنگی اور ہاف قمیص پہنے بینک کی موٹی سی فائل کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ میں نے غور سے دیکھا، قمیص کی چھوٹی سی آستین پر پیوند لگا ہوا تھا اور مسہری کے قریب ایک نیچ کی معمولی سی چپل پڑی تھی۔

اس فقیر منش عظیم دانش ور اور اعلیٰ ترین افسر کی بے نیازی و سادگی کا ایک واقعہ اور بھی قابلِ سماعت ہے۔ اس کے راوی حسین شاہ راشدی ہیں۔

"جن دنوں وہ فنانس سیکریٹری تھے۔ باہر کے کچھ لوگ آئے جنہیں آثارِ قدیمہ سے انس تھا۔ ممتاز حسن نے ان کو مکلی (ٹھٹھہ) کے تاریخی قبرستان دکھانے کا پروگرام بنایا۔ میرے چچا محترم پیر حسام الدین راشدی کے وہ بھائیوں سے بھی عزیز دوست اور محسن تھے۔ وہ صبح کو ان کو گھر لینے آئے۔ ڈارک براؤن رنگ کی کاڈرائے کپڑے کی ڈھیلی ڈھالی پتلون، جسم پر قمیص، اس پر "بو" ٹائی۔ پیر میں چمڑے کی پشاوری چپل، ہاتھ میں کریم کلر کا کوٹ تھامے ہوئے پہنچے۔ ازراہِ شفقت انہوں نے مجھے بھی ساتھ لیا۔ جب گاڑی شہر سے نکل کر شاہراہ پر آئی تو انہوں نے بے نیازی سے کوٹ کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر کھڑکی سے باہر لہرانا شروع کیا۔ میں متعجب کہ یہ کیا ماجرا ہے مگر بہت جلد یہ راز کھلا کہ ٹھنڈا کوٹ ان کے پاس ایک ہی ہے جو کثرتِ استعمال سے میلا ہو گیا تھا۔ باہر کے مہمانوں کے ساتھ بغیر کوٹ اور ٹائی کے ملنا معیوب تھا لہٰذا انہوں نے کوٹ گھر پر ہی دھلوایا۔ روانگی تک خشک نہیں ہوا تھا چنانچہ اس کو ساتھ لیتے آئے کہ مکلی تک پہنچتے پہنچتے سکھا لیں گے۔ سفر کے دوران وہ مختلف موضوعات پر گفتگو بھی کرتے رہے۔ منزلِ مقصود آئی تو کوٹ بھی پہننے کے قابل ہو چکا تھا۔ وہ گاڑی سے اترے، کوٹ پہنا اور مہمانوں کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے۔"

بات یہ ہے کہ اگر رشوت اور کرپشن کی آمدنی نہ ہو تو بڑے سے بڑے افسر کی زندگی ایسی ہی گزرتی جیسی ممتاز حسن گزار رہے تھے یا اس سے کچھ بہتر ہو سکتی ہے۔ وہ شاہانہ زندگی نہیں ہو سکتی جو آج کل نظر آتی ہے۔ آدمی صرف تنخواہ کے پیسوں میں یہ ٹھاٹ باٹ کیسے کر سکتا ہے؟

خدمتِ خلق کا حال بھی یہی تھا۔ یہی حسین شاہ راشدی لکھتے ہیں۔

"وہ جن دنوں نیشنل بینک کے منیجنگ ڈائریکٹر تھے، ہمارے ایک ملازم کا بیٹا میٹرک میں پڑھ رہا تھا مگر غربت کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس نے مجھے بینک میں بجے والے کی ملازمت دلوانے کے لیے کہا۔ میں ممتاز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے ان کو بتایا کہ لڑکا میٹرک تک تو کھینچ تان کر پہنچ گیا ہے مگر ملازمت نہ ملی تو ممکن ہے وسائل کی کمی کی وجہ سے تعلیم ترک کر دے۔ وہ بہت متاثر ہوئے۔ لڑکے کو اندر بلا کر کرسی پر بٹھایا اور ہنس کر اس سے باتیں شروع کیں اور بجے والے کا آرڈر دے دیا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے لڑکے کی ہمت بندھائی اور وعدہ کیا کہ اگر لڑکے نے لگن سے مزید تعلیم حاصل کی تو اسے ہر امتحان میں کامیابی کے بعد ملازمت میں ترقی دیں گے چنانچہ یہی ہوا۔ لڑکا میٹرک کا امتحان پاس کر کے ان کے پاس گیا تو انہوں نے سرٹیفکیٹ دیکھنے کے بعد اسے فوراً کلرکی کا آرڈر دے دیا۔ اگلے سال جب اس نے دوسرا امتحان پاس کیا تو مزید ترقی ملی۔ یہاں تک کہ وہ افسر بن گیا۔"

1959ء میں ان کی زندگی ایک المناک حادثے سے دوچار ہوئی۔ "اولاد کا دکھ صاحبِ اولاد سے پوچھو۔"

ممتاز حسن کو اسی دکھ کا سامنا ہوا۔ ان کی بیٹی رفعت سلطانہ نہایت ذہین تھی۔ اس نے ایم اے تاریخ درجہ اول میں وظیفے کے ساتھ پاس کیا تھا کہ عین عالمِ شباب میں اس کا انتقال ہو گیا۔ ممتاز حسن درد مند دل رکھتے تھے۔ دوسروں کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتے تھے۔ یہ تو پھر بیٹی کا دکھ تھا، نہ جانے کیسے سہار گئے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ کچھ کھوئے کھوئے سے رہنے لگے ہیں۔ پھر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ مشیتِ ایزدی میں کسی کو دخل نہیں۔ کتابوں سے عشق تھا۔ کتابیں ہی بہترین تحفہ تھا۔ انہوں نے بیٹی کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے "رفعت سلطانہ میموریل کولیکشن" کے نام سے پنجاب پبلک لائبریری میں ایک شعبہ قائم کیا۔ اس میں ہزاروں کتابیں رکھیں اور اس اہتمام کے ساتھ کہ ہر کتاب پر اپنے قلم سے مرحومہ کا نام لکھا۔

رفعت میموریل ٹرسٹ قائم کیا۔ جب تک زندہ رہے اپنی آمدنی کا بڑا حصہ اس ٹرسٹ کی نذر کرتے رہے۔

مرنے والے کی یاد میں ایک ایسی یادگار قائم کرنا جس سے سارا عالم استفادہ کر سکے بلاشبہ ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔

بیورو کریسی سے ہٹ کر بھی ان کی خدمات قابلِ قدر ہیں جو علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کے فروغ کا باعث بنیں۔ ان خدمات کا تعلق صحافت اور ریڈیائی نشریات سے ہے۔

ریڈیو سے ان کا تعلق قیامِ پاکستان سے قبل بھی رہا تھا اور پاکستان آنے کے بعد بھی انہوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ مختلف پروگراموں میں متعدد تقریریں کیں اور علم و ادب کے فروغ میں حصہ لیا۔ کئی مستقل پروگرام بھی کیے جیسے "قرآن حکیم اور ہماری زندگی۔" اسی طرح ایک پروگرام "دانش کدہ" میں ماڈریٹر کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ یہ سلسلہ یہیں تک نہیں تھا بلکہ بی بی سی، ریڈیو ایران، ریڈیو جرمنی، ریڈیو آسٹریلیا اور ریڈیو امریکا سے بھی تقاریر نشر ہوئیں۔ جب ٹی وی آ گیا تو ٹی وی پر بھی جلوہ افروز ہونے لگے۔

صحافت سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ زمانہ طالب علمی میں بھی کئی رسائل سے وابستہ رہے تھے۔ مارننگ نیوز، پاکستان ٹائمز، مشرق اور اخبار خواتین کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے قابلِ قدر صحافتی خدمات انجام دیں اور چیئرمین نیشنل پریس ٹرسٹ بھی رہے۔

کراچی اور لاہور یونیورسٹی سے بھی منسلک رہے اور

فہرست مضامین و مقالات

مختلف حیثیتوں میں ان جامعات کی خدمت کرتے رہے۔

کراچی یونیورسٹی میں اعزازی پروفیسر اقتصادیات کی حیثیت سے کام کیا۔ اکاڈمک کونسل اور فنانس کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں بھی سنڈیکیٹ اور فنانس کمیٹی کے ممبر رہے۔

دراصل ان حیرت انگیز کاموں کے پیچھے ان کی اپنے ملک سے والہانہ محبت تھی۔ وہ کہہ چکے تھے کہ تہذیب و ثقافت کے فروغ میں ملکی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ اس لیے وہ علم و تہذیب کے فروغ کے لیے ہمہ وقت معروفِ عمل تھے۔

ملک سے محبت کا جذبہ ان کے پیمانہ عمل سے بار بار چھلکتا تھا۔ جب وہ نیشنل بینک کی ملازمت میں آئے تو پاکستانیوں کے دلوں میں پاکستان کی محبت اجاگر کرنے کے لیے بینک کی طرف سے پہلی بار کیلنڈر شائع کیے۔ ان کیلنڈروں میں پاکستان کے مختلف مقامات کی تصویریں تھیں جو تفصیلی تعارف کے ساتھ شائع کی گئی تھیں۔ یہ تفصیلات خود ان کی تحریر کردہ تھیں جو تاریخ پاکستان سے ان کی گہری واقفیت کا بین ثبوت تھیں۔

جن دنوں وہ ان کیلنڈروں کی اشاعت میں مشغول تھے، ان کی محنت اور سرگرمی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ تفصیلات کے لیے کتابوں کی چھان بین میں معروف رہتے۔ جس کے بارے میں سن لیتے کہ اسے

تاریخ میں دلچسپی ہے اس کے پاس خود چل کر جاتے اور معلومات جمع کرتے۔

یہ کیلنڈر اتنے معلومات افزا ثابت ہوئے کہ تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر گئے۔ بعد ازاں انہیں کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ پھر یہ کیلنڈر محض کیلنڈر نہیں رہے بلکہ ممتاز حسن کی تحقیقی تصنیف بن گئے۔

پاکستان سے عشق ہو اور اسلامی اقدار سے محبت نہ ہو، یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ وہ ایک سچے مسلمان تھے اور اسلامی روایات سے شغف رکھتے تھے۔ اسلام کو روشن خیالی اور رواداری کا مذہب سمجھتے تھے۔ تعصب سے پاک لیکن اپنے عقیدے پر پختہ۔ وہ سرکاری کاموں میں بھی جہاں کہیں الجھتے اسلامی اصول وقوانین اور احادیث نبویؐ سے اس مسئلے کا حل ڈھونڈتے۔

اسلامی اصولوں کے ساتھ ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انہیں گہری عقیدت اور والہانہ شیفتگی تھی۔

ان میں یہ اوصاف یقیناً ان کے خاندانی ماحول کا نتیجہ تھے۔ انہوں نے ایک مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کے بزرگوں میں پیری مریدی کا سلسلہ چلتا رہا تھا۔ ان کے بزرگوں میں کچھ نام ایسے بھی تھے، جنہوں نے خود کو تبلیغ اسلام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ گاؤں گاؤں قریہ قریہ گھوم کر لوگوں کو دینِ اسلام کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کی ان مذہبی خدمات کے صلے میں شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی طرف سے "شیخ" کا خطاب ملا تھا۔ ان کے خاندان میں یہ روایت بھی عام تھی کہ ان کے بزرگ محمد بن قاسم کی فوج کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ علم و فضل میں بھی اس خاندان کا بڑا نام تھا۔ فارسی کے نامور شاعر محمد افضل اسی خاندان کے فرد تھے۔ ممتاز حسن کے دادا شیخ غلام محمد کی فارسی مثنوی بھی بہت مشہور تھی جو صوفیانہ موضوعات پر لکھی گئی تھی۔

ممتاز حسن کی انسان دوستی، سادگی، خدمتِ خلق اور شائستگی انہی خاندانی اثرات کا نتیجہ تھی۔ ان کی ان خوبیوں کے معترف ان کے احباب بھی تھے اور قدرت بھی ان سے ایک بڑا کام لینا چاہتی تھی۔ محمد یعقوب ہاشمی جب آزاد کشمیر میں سیکریٹری تعلیمات مقرر ہوئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ بچوں کی ذہنی تبدیلی کے لیے نصاب کی تبدیلی ضروری ہے۔ ایسی نصابی کتابیں لکھوائی جائیں جن کے ذریعے بچوں کو توحید و رسالت کے علاوہ نظریۂ جہاد، نظریۂ پاکستان اور کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی اہمیت سے روشناس کرایا جائے۔ اُن کی نظر ممتاز حسن پر پڑی۔ وہ کراچی آئے، بعض لوگوں سے تذکرہ کیا۔ کچھ لوگوں نے مخالفت کی کہ ممتاز حسن اس کام کے لیے قطعی موزوں نہیں کیونکہ وہ بھی بیورو کریسی کا ایک پرزہ ہیں۔ وہ کیا رہنمائی کریں گے۔ ایسا نصاب ترتیب دیں گے جس میں مغرب ہی مغرب ہوگا۔

شام کو ہمدرد کی تقریب تھی۔ معلوم ہوا ممتاز حسن بھی اس میں شریک ہوں گے۔ یعقوب ہاشمی بھی وہاں پہنچ گئے اور ممتاز حسن سے ملاقات کی۔ اپنا مقصد ظاہر کیا تو وہ بے حد متاثر ہوئے لیکن یہاں بات کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔

"اس بارے میں میرے واضح نظریات ہیں۔ شاید میری تجاویز سے آپ کو فائدہ ہو۔ کل چار بجے مجھ سے ملیے۔ پھر باتیں ہوں گی۔"

تقریب ختم ہوئی تو ممتاز حسن نے خود یاددہانی کرائی کہ کل چار بجے میں آپ کا انتظار کروں گا۔ یعقوب ہاشمی وعدہ کر کے چلے آئے۔

دوسرے روز ملاقات ہوئی تو ممتاز حسن نے خود گفتگو کا آغاز کیا۔

"آپ بتائیے کہ ہمارے کردار کی پستی اور خاص طور پر نئی نسل کی بے راہ روی کی توجیہہ آپ کیا کرتے ہیں تاکہ انہی خطوط پر کام کیا جائے۔"

"اس کی بہت سی وجوہات ہوسکتی ہیں۔" یعقوب ہاشمی نے کہا۔

"نہیں" ممتاز حسن نے نہایت قطعیت کے ساتھ کہا۔ "اس کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ قوم حضور ختمی مرتبت کی سیرتِ اقدس سے دور ہوگئی ہے۔ جب تک بذریعہ نصاب قوم کو اس طرف نہیں لایا جائے گا یہ قوم فلاح کی راہ نہیں پاسکے گی۔"

"اس کا طریقہ کیا ہوگا؟" یعقوب ہاشمی نے پوچھا۔

"چھوٹی کلاسوں کی اردو کتابوں میں صرف آسان اور سہل نعتیں دیجیے۔ یہ نعتیں بچوں کو غیر شعوری طور پر حفظ ہوتی جائیں گی۔ بڑی جماعتوں کے نصاب کی کتابوں میں حضور کریم ﷺ کی سیرت کی جھلکیاں، مختلف واقعات، غزوات، ارشادات بیان کیجیے تاکہ طلبا کے ذہن پر سیرتِ اقدس کے نقوش ثبت ہوتے جائیں مگر یاد رکھیے زبان صاف اور سادہ ہو۔"

یعقوب ہاشمی نے اپنی مجبوری ظاہر کی "ممتاز صاحب، اعلیٰ نعتوں کا مجموعہ میری نظر سے تو گزرا نہیں، اگر آپ مرتب فرمادیں۔"

"میں اس کا اہل تو نہیں لیکن یہ سعادت ہاتھ سے جانے بھی نہیں دوں گا۔ آپ فکر نہ کریں، میں کل ہی سے اس پر کام شروع کردوں گا۔"

انہوں نے واقعی دوسرے دن سے کام شروع کر دیا۔ ان دوستوں سے رابطہ کیا جو اس کام میں ان کا ہاتھ بٹا سکتے تھے۔ مختلف دواوین جمع کیے۔ رسائل اور اخبارات مہیا کیے۔ انہوں نے نہ صرف مسلمان شعرا کو در خورِ اعتنا سمجھا بلکہ ہندو اور سکھ شعرا کے کلام کو بھی مدِ نظر رکھا۔

ان دواوین کے مطالعہ کے بعد انہوں نے شدت سے کمی محسوس کی اور وہ یہ کہ "نعت" کا مفہوم کسی کے ذہن میں بھی واضح نہیں۔ مختلف لوگوں نے نعت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ادھورا سا ہے۔ وہ کئی دن سوچتے رہے اور پھر اس نتیجے پر پہنچے کہ اس انتخابِ نعت سے پہلے ایک مقدمہ تحریر کیا جائے جس میں "نعت" کی تعریف بیان کی جائے اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ اس مقدمے میں نعت کے لیے جو پیمانے مقرر کردیے جائیں گے، انتخاب اسی کے مطابق کرنے میں آسانی ہوجائے گی۔ انہوں نے قلم سنبھالا اور لکھنے بیٹھ گئے۔

"میرے نزدیک ہر وہ شعر نعت ہے جس کا تاثر ہمیں حضورؐ کی ذاتِ گرامی سے قریب لائے۔ جس میں حضورؐ کی مدح ہو یا حضورؐ سے خطاب کیا جائے۔ صحیح معنوں میں نعت وہ ہے جس میں محض پیکرِ نبوت کے صوری محاسن سے لگاؤ کے بجائے مقصدِ نبوت سے دل بستگی پائی جائے۔ جس میں رسالت مآبؐ سے صرف رسمی عقیدت کا اظہار نہ ہو بلکہ حضورؐ کی شخصیت سے ایک قلبی تعلق موجود ہو۔ وہ مدح یا خطاب بالواسطہ یا بلا واسطہ اور وہ شعر نظم ہو یا غزل، قصیدہ ہو یا مثنوی یا مسدس، اس سے نعت کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا البتہ نعتیہ کلام کی دنیوی قدر و قیمت کا دار و مدار اس کے نفسِ مضمون پر ہے۔ اگر اس کا مقصد ذاتِ رسالتؐ کی حقیقی عظمت کو واضح کرنا ہے تو وہ صحیح طور پر نعت کہلانے کا مستحق ہے۔"

ممتاز حسن کی منتخب کردہ یہ تعریف ان سے پہلے کی گئی تمام تعریفوں سے وسیع اور وقیع تھی اور نعت کے تمام ممکنہ مفاہیم کو اپنے دائرے میں لے گئی تھی۔ ان کے بیان کردہ اصول کے مطابق غزوات،، بعثت، فرمودات، مکتوبات، احادیث نعت کے ذیل میں آجاتی تھیں۔

غزل

تیرے حُسن کو دل زُبا کردیا
مرے دل نے کیا جانے کیا کر دیا

بہت بے تکلف تھا تیرا مزاج
تجھے ناز سے آشنا کردیا

تیرے اِک تبسم نے جانِ جہاں
محبت کو لا انتہا کر دیا

قیامت تھی تیری وہ وحشی نظر
میرا زہد جس نے ریا کردیا

کبھی سوچتا ہوں تیرے عشق نے
میں کیا تھا مجھے کیا سے کیا کردیا

اس مقدمے میں انہوں نے کچھ ایسی نعتوں کی بھی نشان دہی کی جو حدِ ادب سے تجاوز کرتی ہیں اور جوشِ عقیدت میں کہیں سے کہیں نکل جاتی ہیں۔

انہوں نے اس کا تقاضا بھی کیا کہ نعت لکھتے وقت عبد اور معبود کے فرق کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔ کوئی ایسی صفت نہ لکھی جائے جو بندے اور خدا کا فرق ہی مٹادے۔

"نعتِ رسولؐ کی بنیاد یا تو عشقِ ذات پر یا اوصاف صفات پر رکھنی چاہیے تاکہ حضورؐ کی شخصیت اور کردار کی خصوصیت ایک مثالی حیثیت سے ہمارے لیے مشعلِ راہ بن جائے۔"

"خلوص اور سادگی نعت کا اصلی جوہر ہے۔ ایسی صفت گری نہ ہو جو مفاہیم کو مبہم بنادے۔"

اس مقدمے میں انہوں نے نعت کی تاریخ بھی بیان کی اور اعلیٰ نعت گو شعرا کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ان میں محمد علی جوہر، محسن کاکوروی، حسرت موہانی، حفیظ جالندھری وغیرہ کے اسمائے گرامی تھے۔

فارسی شعرا کے نعتیہ کلام کا تفصیلی تذکرہ کیا۔ اقبال کی فارسی شاعری بھی زیرِ بحث آئی۔

یہ مقدمہ ایسا وقیع، منفرد اور پُرتاثیر ثابت ہوا کہ اصل کتاب سے پہلے ہی لوگوں کی سماعتوں تک پہنچا اور داد و تحسین کا حقدار بنا۔

اس مقدمے کی تکمیل کے بعد وہ نعتوں کے انتخاب کی طرف متوجہ ہوئے اور جو نعتیں اس مقدمے کی میزان پر پوری اترتی تھیں انہیں شامل کرتے چلے گئے۔

نعت گو شعرا کے اس نعتیہ کلام کا انتخاب کیا جو واقعی سراپا انتخاب تھا۔ ان کی ذہنی کسوٹی پر 132 شعرا کا کلام پورا اتر سکا۔ یہ خیال رکھا کہ یہ صرف وہ نعتیں ہوں جو مذہبی اور ادبی نقطۂ نظر سے لائقِ ستائش ہوں۔

☆☆☆

ممتاز حسن کو تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی۔ آثارِ قدیمہ سے تو خاص شغف تھا۔ ان کی تصنیف INQUEST OF DEBUL اس دلچسپی کا ثبوت ہے۔

سندھ سے وہ والہانہ محبت کرتے تھے۔ ایک زمانے میں وہ ملازمت کے سلسلے میں سندھ میں رہے تھے۔ یہ ان کی زندگی کا ایک مختلف ہی روپ تھا کہ وہ آثارِ قدیمہ سے دلچسپی رکھتے تھے۔ مکلی کے تاریخی مزاروں اور مقبروں کو محفوظ کرنے کے کام کی ابتدا انہوں نے کی۔ بھنبھور میں کھدائی کی پہلی کدال انہوں نے چلائی جو آگے چل کر دیبل مندر اور برصغیر کی پہلی مسجد کے نشانات ظاہر ہونے پر منتج ہوئی۔ موئن جو ڈارو میں سیاحوں کی سہولت کا انتظام انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے سندھ کے قیام کے زمانے میں فارسی کتابوں کے مخطوطے جو دیمک بنتے جا رہے تھے ان کو مرتب کرنے اور چھپوانے کے لیے سندھی ادبی بورڈ کو گرانٹ دی۔ ان کی کوششوں سے ان لکھاریوں کا نایاب ذخیرہ ضائع ہونے سے بچ گیا۔ ان کے اس خلوص کا اعتراف اہلِ سندھ نے فراخ دلی سے کیا۔

پیر حسام الدین راشدی نے لکھا ہے۔ ”یہ سال 1958ء کی بات ہے اور مارچ کی 2 تاریخ تھی۔ ہمیں بھنبھور جانا تھا۔ بھنبھور کو اب تو غالباً سب ہی جانتے ہیں لیکن اس وقت سوائے ایک مخصوص حلقے کے کسی کی بھی اس طرف توجہ نہ تھی اور نہ ہی اس کی خبر تھی۔ آج اس کی کھدائی کا افتتاح ہونے والا تھا۔ کھدائی کا افتتاح خود ممتاز حسن صاحب نے زمین پر پہلا پھاوڑا چلا کے کیا۔ اس سے پہلے کہ اس قدیم تاریخی دفینے کے سینے میں شگاف کیا جائے۔ ہم نے بڑے خلوص کے ساتھ دعا مانگی۔“

☆☆☆

ہمہ جہت مصروفیات نے انہیں شاعری سے دور کر دیا تھا لیکن حقیقی شاعر کوئی شاعری سے باز آتا ہے۔ وہ اب بھی کبھی کبھی غزل یا نظم کے دروازے پر دستک دے لیا کرتے تھے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی جا رہی تھی وہ اقبال کے رنگ کی شاعری سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ اب ان کی شاعری کا رنگ یہ ہو گیا تھا۔

میں زیرِ فلک مہر و وفا ڈھونڈ رہا ہوں
خود مجھ کو تعجب ہے کہ کیا ڈھونڈ رہا ہوں
بنیادِ جہاں کی ہے فقط کذب و ریا پر
میں ہوں کہ یہاں صدق و صفا ڈھونڈ رہا ہوں

اقبال کے حوالے سے انہیں جرمن شاعر گوئٹے سے بھی عقیدت تھی۔ ممتاز حسن کو جرمن زبان پر عبور حاصل تھا لہٰذا انہوں نے ایک منفرد کام یہ کیا کہ گوئٹے کی نظموں کا ترجمہ کرنے بیٹھ گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب جرمنی سے براہِ راست اردو میں ترجمہ کر رہے تھے۔ اس سے پہلے انگریزی ترجموں کا اردو ترجمہ ہوتا رہا تھا۔ یوں بھی جرمنی کی بہت کم نظموں کا اردو میں ترجمہ ہوا تھا۔

انہوں نے ترجمے کے لیے جو چار نظمیں منتخب کیں وہ جمالیاتی اور رومانوی انداز میں لکھی گئی تھیں۔ انہوں نے ان نظموں کا بڑی خوبصورتی سے ترجمہ کیا۔ انہیں چونکہ جرمن زبان پر عبور تھا اس لیے اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے وہ سلاست اور روانی برقرار رہی جو اچھے ترجمے میں ہونی چاہیے۔ یہ ترجمے اتنے شاندار ثابت ہوئے کہ طبع زاد نظموں کا گمان ہوتا تھا۔ یہ ترجمہ نثری ترجمہ تھا لیکن طبع زاد نظموں کا گمان ہوتا تھا۔

اب تو یہ عالم ہے کہ ہر صبح ہر شام
لحظہ بہ لحظہ نظر بہ نظر نفس بہ نفس، کلمہ بہ کلمہ
میری محبت آئینہ دار ہے تیری محبت کی
برسوں کی فراوانی سے مخمور
اور شادمانی و کامرانی سے مخمور
تو میرے نغموں کی خلشِ پنہاں سے آشنا ہے
کاش مجھ کو یوسف کی سی دل آویزی نصیب ہو
جو تیرے حسن کی تعریف ہو سکتی ہے

کیا سچ مچ یہ کبھی ہوا اے میرے ستاروں کی ملکہ
جسے میں دوبارہ اپنے سینے سے لگا رہا ہوں
آہ اے جدائی کی رات کیا تھی۔ کس قدر عمیق
کیسے درد و کرب سے لبریز۔
ہاں یہ کبھی ہوا اے میری مسرتوں کی آئینہ دار
میری محبوبہ جاں نواز

جب مجھے وہ صدمے یاد آتے ہیں جو فرقت میں مجھ
پر گزرے ہیں
تو ان کے تصور سے میں آج بھی لبریز ہو جاتا ہوں

....

جب اقبال کا صد سالہ یوم ولادت منانے کے لیے کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس کمیٹی نے طے کیا کہ اقبال کی جتنی نظموں کا وہ انگریزی میں ترجمہ کر سکتے ہیں کرلیں۔

وہ ان نظموں کے ترجمے میں مصروف ہو گئے۔

یہ تو رہیں ان کی ذاتی مصروفیات۔ اس کے علاوہ بے شمار اداروں کے مدرس، صدر اور فعال رکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔ ترقی اردو بورڈ کے صدر تھے۔ بورڈ کے تحت شائع ہونے والا رسالہ "اردو نامہ" ان کی زیرِ نگرانی شائع ہوتا تھا۔ انجمن ترقی اردو کے مجلس نظماء کے رکنِ اعلیٰ تھے۔ اقبال اکیڈمی کے تو بانی ہی وہ تھے۔ اس اکیڈمی کے تحت کئی مفید کام کیے۔ ان کی کوشش رہی کہ اقبال کی تصانیف اور اقبالیات پر دیگر کتابیں ہر چھوٹی بڑی لائبریری میں پہنچائی جائیں۔

جن علمی و سماجی اداروں کی سربراہی اور معاونت کے فرائض انجام دیتے رہے ان میں غالب لائبریری، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، ایوانِ ادب، بہادر یار جنگ اکادمی، نیشنل میوزیم آف پاکستان، گوئٹے انسٹی ٹیوٹ، اسلامیہ کالج اور دوسرے کئی ادارے شامل تھے۔

رائٹرز گلڈ کی کئی انعامی کمیٹیوں کے صدر رہے۔ اس سلسلے میں انہیں بے شمار کتابیں مطالعہ کرنا پڑتی تھیں۔ وہ ایک ایک کتاب کا دیانت داری سے مطالعہ کرتے تھے۔

اتنے اداروں کے سرپرست ہونے کی حیثیت سے روزانہ ہی اجلاسوں میں شرکت کرنا پڑتی تھی۔ تقریبات کی صدارت کے لیے مجبور کیا جاتا تھا اور ان کی مروت کسی کو انکار کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ یہ مشقت ضرور تھی لیکن اردو کے فروغ کے لیے انہیں ہر مشقت قبول تھی۔

اس سلسلے میں نور الصباح بیگم ایک واقعہ لکھتی ہیں۔

میں نے کہا "ممتاز صاحب گیارہ جنوری کو میرے گھر مشاعرہ ہے۔ اس کی صدارت کرنے کی زحمت آپ کو دینا چاہ رہی ہوں۔" ہماری ان سے بے تکلفی تو نہ تھی۔ ان کو دیکھ کر یہ خیال دل میں آ گیا تھا۔ انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھا اور فقیرانہ ہمارے سامنے جھک گئے اور بولے "آپ کا حکم ہو اور مجھے انحراف کی مجال ہو، یہ ممکن ہی نہیں۔"

میں تو حیران رہ گئی۔ لوگ کیا کیا بہانے کرتے ہیں اور کس کس طرح صدارت کے لیے بلانا پڑتا ہے اور یہ ممتاز حسن کیسے آدمی ہیں کہ مجھ سے کہہ رہے ہیں "آپ کا حکم۔"

ماہر القادری نے اسی لیے لکھا تھا۔

"ممتاز حسن شعر و ادب کے حلقوں میں مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ سیکڑوں ادبی مذاکروں، علمی جلسوں، سیمیناروں اور مشاعروں میں ... صدارت یا مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے رونق بخشی۔"

ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے خود کو کراچی کی سڑکوں، محفلوں اور دوستوں کے حوالے کر دیا تھا۔ کبھی کسی سیمینار کی صدارت کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں۔ کبھی کسی مشاعرے میں جانا ہے۔ کبھی معلوم ہوا کہ کوئی صاحب اقبال پر کتاب لکھ رہے ہیں اس کی حوصلہ افزائی کے لیے جانا ہے۔ کبھی کوئی کتاب موصول ہوئی ہے کہ اسے پڑھ کر "پیش لفظ" تحریر فرما دیجیے۔ تھکے ہارے آتے ہیں۔ ایک ہی نشست میں کتاب ختم کرلی پھر پیش لفظ لکھنے بیٹھ گئے۔ پھر کہیں جا کر سونے کو ملا۔ صبح ہوتے ہی پھر اٹھ بیٹھے۔ شام کو پھر کہیں جانا ہے۔

بیوی سے محبت تو مثالی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ پڑھنے لکھنے کے کاموں میں مشغول ہو کر بیوی بچوں کی طرف سے غافل ہو جاتے۔

شادی کے چالیس سال گزر جانے کے بعد بھی شادی کی سالگرہ پابندی سے مناتے تھے۔ 1973ء میں شادی کی سالگرہ قریب تھی اور بیوی بیماری کی وجہ سے اسپتال میں داخل تھیں۔ انہیں ان دنوں کوئی اور فکر نہیں تھی بس ایک فکر تھی کہ 19 دسمبر سے قبل بیوی اسپتال سے گھر آ جائیں تاکہ سالگرہ منائی جا سکے۔

"بھئی وہ ہماری بیوی ہے۔ ہم سے محبت کرتی ہے، سالگرہ ہمارے ساتھ ہی منائے گی۔"

"دیکھ لینا 29 دسمبر سے پہلے گھر آ جائے گی۔"

"اسے صحت یاب ہونے کی خود جلدی ہو گی۔ اس میں ڈاکٹروں کا کیا کمال۔"

"میں ابھی اس کے پاس سے ہو کر آ رہا ہوں۔ طبیعت اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ انشاء اللہ جلدی گھر آ جائے گی۔"

یہ باتیں وہ اکثر دوستوں سے کرتے رہتے تھے۔ بیوی کی حالت واقعی ایسی نہیں تھی کہ انہیں تشویش ہوتی لیکن ہوا یہ کہ سالگرہ میں تین دن باقی رہ گئے تھے کہ وہ رحلت کر گئیں۔

ممتاز حسن کی عادت تھی کہ اپنا دکھ دوسروں پر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ زوجہ کا انتقال معمولی حادثہ نہیں تھا لیکن انہوں نے خود پر قابو پا لیا۔ جب جواں سال بیٹی کا انتقال ہوا تھا اس وقت بھی انہوں نے کمالِ ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس وقت بھی وہ بظاہر ساکت تھے لیکن لگتا تھا ان کا غم ان کے اندر اتر گیا ہے۔ وہ بری طرح بجھنے لگے تھے۔ ان کی آنکھوں میں غم کی پرچھائیاں صاف نظر آنے لگی تھیں۔ ایسی عمارت نظر آتے تھے جس کی دیواریں گر چکی ہیں۔

دوستوں کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ سنبھل جائیں گے لیکن اس حادثے نے ان کے ذہن کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ اس کا اثر ان کے حافظے پر پڑنے لگا تھا۔ ان کا حافظہ قابلِ رشک تھا لیکن اب یہ حال ہو گیا تھا کہ کوئی چیز کہیں رکھ کر بھول جاتے اور پھر گھنٹوں اسے تلاش کرتے رہتے۔ ایسی باتیں ان کی زبان سے ادا ہونے لگی تھیں جن سے مایوسی جھلکتی تھی۔

ایسی باتیں کرنے لگے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خود کو تسلی دینے کے سوا کچھ نہیں کر رہے ہیں۔

"وہ مجھے تنہا چھوڑ گئی ہیں، یہ غم اپنی جگہ ہے لیکن میں سمجھتا ہوں اچھا ہوا وہ پہلے چلی گئیں۔ اب تو مجھے تکلیف ہے، میرے جانے کے بعد ان کو ہوتی اور میرے لیے اس کا تصور بھی گوارا نہیں۔ خدا کا شکر ہے انہوں نے بیوگی کے دن نہیں دیکھے۔"

اپنے دوست مجاہد حسین کو ایک خط میں لکھا۔

"میری بیوی کا انتقال پچھلے دسمبر میں ہوا۔ اس وقت تک میری جو روحانی اور ذہنی کیفیت ہے اسے آپ سمجھ سکتے ہیں اور آپ کی جو کیفیت ہے میں سمجھ سکتا ہوں۔"

وہ میری چچازاد تھیں۔ بچپن اکٹھا گزرا۔ ایک ہی گھر میں پڑھے، کھیلے اور لڑے جھگڑے اور پھر جب یہ معلوم ہوا کہ ہم دونوں کی شادی طے ہو گئی ہے تو اسے نہ انہوں نے ناپسند کیا اور نہ میں نے۔ تقریباً زندگی کے 65 برس اکٹھے گزرے۔ جو گھر انہوں نے بنایا وہاں دنیا کی ہوا و ہوس، بغض و حسد اور فساد کو جگہ نہ تھی۔ گھر پہنچ کر محسوس ہوتا تھا قلعہ بند ہو گیا ہوں۔

اب اگر کوئی اطمینان ہے تو یہ کہ اگر ان کی جگہ میں چلا جاتا تو کیا بیوگی کا تصور میرے لیے قابلِ قبول ہوتا۔ وہ سہاگن تھیں اور سہاگن گئیں۔ اب زندگی کیسے گزرے گی؟ کوشش کر رہا ہوں کہ اپنے آپ کو مصروف رکھوں۔ میرا ارادہ ہے کہ ان پر کچھ لکھوں۔"

انہوں نے اپنی مصروفیت کے دو بہانے نکال لیے۔ بیوی کے متعلق اپنے تاثرات لکھنے شروع کیے دوسرے یہ کہ اپنے بکھرے ہوئے مضامین کو یکجا کرنا شروع کیا تاکہ انہیں کتابی شکل میں شائع کیا جا سکے۔

یہ مسودات کچھ اس طرح بن گئے۔

1۔ اردو نگارشات کا مجموعہ
2۔ پنجاب یونیورسٹی میں دیے گئے اقبال پر لیکچرز کا مجموعہ
3۔ چند جرمن گیتوں کا اردو اور انگریزی ترجمہ
4۔ گوئٹے کو خراجِ عقیدت (اس کی بعض تحریروں اور تقریروں کے تراجم کے ساتھ)
5۔ مضمون، اردو ادب پر انگریزی اثرات
6۔ مضمون، فٹز جیرالڈ اور عمر خیام۔

اتنی مصروفیات کے بعد بھی وقت گزرنے میں نہیں آتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ مصروف رہنے کے لیے لاکالج میں داخلہ لے لیا۔ باقاعدگی سے کالج جانے لگے۔ اس عمر میں اور کالج؟

"پڑھ رہا ہوں تاکہ مصروف رہوں۔"

کبھی اردو بورڈ جا نکلتے۔ واپسی میں بیوی کی قبر پر حاضری دیتے۔ کبھی انجمن چلے جاتے۔ کبھی گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کا چکر لگاتے جس کے ایک حصے میں انہوں نے بیوی کی یاد میں کتب خانہ قائم کر دیا تھا۔

ابھی بیوی کے انتقال کو سال بھی پورا نہیں ہوا تھا، صرف دس ماہ گزرے تھے کہ 28 اکتوبر کی صبح کو ان کی طبیعت خراب ہوئی۔ سینے میں درد اور جلن محسوس کر رہے تھے۔ اپنے بھائی ڈاکٹر مشتاق حسن کو بلوایا۔ انہوں نے معائنہ کیا۔ تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ انہوں نے صرف آرام کا مشورہ دیا۔ دوپہر تک طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی۔ اتنی ٹھیک کہ معمول کے مطابق دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران انہیں یاد آیا کہ جسٹس نور العارفین کی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنی ہے۔ ڈائری دیکھی تو ایک اور تقریب بھی نکل آئی۔ نیشنل سینٹر کے زیرِ اہتمام "یوم امام بخاری" کی تقریب تھی جس میں انہیں خطاب بھی کرنا تھا۔ انہیں کسی ایک جگہ کا انتخاب کرنا تھا۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی ورنہ دونوں جگہوں کی شرکت ہو جاتی۔ یہی مناسب سمجھا کہ

یومِ امام بخاری میں شرکت کرلی جائے اور جسٹس صاحب سے معذرت کرلی جائے۔ مروت سے بعید جانا کہ ٹیلی فون پر معذرت کی جائے۔ بہتر یہ ہوگا کہ ان کے گھر جاکر معذرت کی جائے۔ اس طرح ایک قسم کی شرکت بھی ہوجائے گی اور معذرت بھی کرلوں گا۔ انہوں نے ڈرائیور سے کہا ''گاڑی نکالے اور جسٹس نور العارفین کے گھر پہنچ گئے۔ ہشاش بشاش تھے۔ یہ ذکر تک نہیں کیا کہ صبح سینے میں تکلیف ہوئی تھی۔ بس اتنا کہا کہ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ رات کو زیادہ دیر جاگ نہیں سکوں گا نیشنل سینٹر میں تقریب بھی ہے۔ دلہن کے لیے تحفہ ساتھ لے کر گئے تھے وہ ان کے حوالے کیا۔ کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ ایک مرتبہ پھر معذرت کی اور مکان سے باہر نکل آئے۔ جسٹس صاحب انہیں رخصت کرنے باہر تک آئے تھے۔ جب وہ اپنی کار میں بیٹھنے لگے تو دل کا دورہ پڑا۔ دونوں ہاتھوں سے دل تھام لیا اور لڑکھڑا کر گرنے لگے تھے کہ ڈرائیور نے تھام لیا۔ بہ مشکل گاڑی میں ڈالا۔ جناح اسپتال کے شعبۂ امراضِ قلب لایا گیا۔

جتنی جلدی پہنچایا جاسکتا تھا پہنچایا لیکن دیر ہوگئی تھی۔ دل نے راستے ہی میں کہیں ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ڈاکٹروں نے ان کی موت کی تصدیق کردی۔ جس نے زندگی بھر دوسروں کی خدمت کی تھی کسی سے خدمت لیے بغیر روانہ ہوگیا۔ خالقِ حقیقی نے یاد کیا اور وہ چند گھنٹوں میں حاضر ہوگیا۔ اس نے تو ڈاکٹروں کی خدمت بھی قبول نہیں کی۔

جمیل الدین عالی نے ایک واقعہ سنایا۔

''کہا کرتے تھے، میں نے اللہ تعالیٰ کو ایک معاہدہ پیش کیا ہے کہ مجھے اکیسویں صدی کا طلوع دکھا دیجیے یہ صدی دانش مندانہ اور انقلابی مہمات کے لیے ایک حیرت انگیز صدی گزری ہے۔ میں اگلی صدی کا مزہ تو نہیں لے سکوں گا لیکن اس کی پہلی جھلک ضرور دیکھ لینا چاہتا ہوں۔ ارے بھئی، اگر جیتا رہا تو صرف ترانوے برس کا ہوں گا۔

ایک بار میں نے پوچھا، وہ معاہدہ کس منزل میں ہے۔ فرمایا میں نے دستخط کردیے ہیں۔ میں نے پوچھا، اللہ میاں کے دستخط بھی آئے یا نہیں۔ بولے، انہوں نے دستخط نہیں کیے۔''

28 اکتوبر 1974ء کی سہ پہر کو انتقال ہوا اور اگلے دن کی شام ان کی رہائش گاہ پر مولانا احتشام الحق تھانوی کی امامت میں نماز جنازہ پڑھادی گئی۔

ان کی مقبولیت کا اندازہ جسے اب تک نہیں تھا اسے اب ہوگیا۔ مرحوم کے رشتہ داروں، دوستوں، عمائدینِ شہر اور ممتاز تاجروں کے علاوہ وفاقی مذہبی وزیر مولانا کوثر نیازی، اعلیٰ حکام اور گورنرِ سندھ کے نمائندے نے شرکت کی۔ صحافیوں اور اخباری فوٹو گرافروں کا ہجوم تھا۔

اس متاعِ بے بدل کا جنازہ اٹھایا گیا تو کہرام بپا ہوگیا۔ اس جنازے کو پاپوش نگر کے قبرستان پہنچایا گیا جہاں ان کی اہلیہ کے پہلو میں انہیں بھی سلا دیا گیا۔

اداروں کا سرپرست چلا گیا تھا۔ تمام علمی، ادبی اور ثقافتی اداروں میں تعزیتی اجلاس منعقد ہوئے۔

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو، گورنر سندھ بیگم رعنا لیاقت علی، صدرِ پاکستان اور دیگر حکام بالا نے اس ممتاز عالم کے لیے تعزیتی پیغام ارسال کیے۔

کوئی روزنامہ ایسا نہیں تھا جس نے پیغامات، اداریے، مضامین شائع نہ کیے۔

پاکستان کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں نے نثر و نظم میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

چھڑے جب ذکر ممتاز حسن کا
تو ان کو نکتہ سنج راز لکھیے
کبھی دردآشنائے خطۂ پاک
کبھی ایران کا دم ساز لکھیے
کبھی نغمہ گرِ لاہور کہیے
کبھی دانش ورِ شیراز لکھیے
ادب آموزِ علم و فضل کہیے
ہمہ دانِ نیاز و ناز لکھیے
کبھی سرمایۂ انجام کہیے
کبھی پیرایۂ آغاز لکھیے
رئیس اس بندۂ فقر آشنا کو
ہمہ عظمت ہمہ اعزاز لکھیے
سخنداں عالم ممتاز کا سال
سخنداں عالم ممتاز لکھیے

ماخذات

ممتاز حسن احوال و آثار، فوزانہ، ناہید گیلانی، روزگار فقیر۔ سید وحید الدین فقیر۔

مختار آزاد

کہانی کے تانے بانے بُننا اتنا آسان نہیں یہی اندازِ پیشکش منصف کو ہر دل عزیز بناتا ہے۔ زیرِ نظر واقعہ اپنے اندر گہرائی وگیرائی کے علاوہ اندازِ بیاں کی انفرادیت سموئے ہوئے ہے ایسا دلچسپ انداز وہ بھی تاریخی شواہد کے بیان پر بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ یقیناہر قاری کو یہ اپنے سحر میں گرفتار کیے رکھے گا۔

[illegible] پہلی ایک دلچسپ روداد

اُس دن کئی روز کی برف باری کے بعد سلسلہ کچھ تھما تھا۔ برطانیہ میں دسمبر کی یخ بستہ سردی اور برف باری کے دوران کم از کم میرے کرنے کا کوئی اور خاص کام تو تھا نہیں۔ ''کیا خیال ہے۔۔۔ شکار پہ چلیں۔'' ناشتے کے بعد میں نے کافی پیتے ہوئے پاپا سے کہا۔

''بہت خوب۔'' انہوں نے اخبار پر سے نظریں اٹھاتے ہوئے بڑے جوش سے جواب دیا۔

''تو بس پھر تیاری کریں۔'' یہ کہتے ہوئے میں اٹھ

کھڑا ہوا۔

مجھے اور پاپا کو سردیوں میں جنگلی خرگوشوں کا شکار کرنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ پاپا بھی شکار کے بہت شوقین تھے۔ ویسے تو پاپا کی عمر اسی برس کے قریب ہے مگر ان کی صحت بہت اچھی ہے۔ بہ مشکل ساٹھ برس کے لگتے ہیں۔ وہ اس عمر میں بھی جوانوں کی طرح چست اور مستعد نظر آتے ہیں۔ گھڑ سواری اور شکار کی بات ہو تو وہ اس کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ میں بھی اُن دنوں چھٹی پر تھا۔ کئی روز سے اتنی سردی پڑ رہی تھی کہ گھر سے نکلنے کو تو چھوڑو، آتشدان کے سامنے سے بھی اٹھنا محال تھا۔ سردی تو اُس روز بھی بہت تھی مگر ایک بات اچھی تھی کہ برف گرنا بند ہو چکی تھی۔ اب ہم جنگل میں آسانی سے خرگوشوں کا پیچھا کر سکتے تھے۔ اسی لیے مجھے شکار کی سوجھی تھی۔

پاپا اور میرے شوق ملتے جلتے تھے۔ ہم دونوں کو جنگل بہت پسند تھا۔ شکار بھی مشترک شوق تھا۔ گھڑ سواری بھی قدرِ مشترک تھی۔ انہوں نے گھوڑوں کی فارمنگ شروع کی تھی میں نے بڑے ہو کر اس کام کو سنبھالا۔ وہ محکمۂ جنگلات سے بطور چیف رینجر ریٹائر ہوئے تھے، میں ڈپٹی چیف کے عہدے پہ بھرتی ہوا تھا۔ سچ پوچھو تو ہم میں باپ بیٹے سے زیادہ دوستی کا رشتہ تھا۔ دس سال پہلے مما کا انتقال ہوا تھا، تب سے تو ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہو چکے تھے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی شکار کی۔ پاپا نے جیسے ہی ہامی بھری، میں نے اپنی بیوی ایلی کو کافی کا تھرمس تیار کرنے کا حکم دیا۔ پاپا بندوق اور کارتوس سنبھالنے لگے اور میں اصطبل کی طرف نکل گیا۔ آدھے گھنٹے میں تفریحی شکار کی مکمل تیاری ہو چکی تھی۔

سچ پوچھو تو مجھے شکار کا شوق تو تھا مگر جنون نہیں۔ اصل بات یہ تھی میں کئی روز سے گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہو چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پاپا بھی ایسا ہی سوچ رہے ہوں گے۔ اب اس قیامت کی سردی اور برف باری میں کہاں نکل کر جاتے؟ ویسے بھی ہم جس فارم ہاؤس میں رہتے تھے، اُس سے قریب ترین ہمسائے کا گھر بھی تین میل سے کچھ زیادہ فاصلے پر تھا۔ ہمارا گھر کاؤنٹی کا سب سے آخری گھر تھا۔ اس کے بعد جنگل شروع ہو جاتا تھا۔

میرے والدین فطرت کے عاشق تھے۔ ویسے بھی میرے دادا سے لے کر مجھ تک، سب نے محکمۂ جنگلات میں ہی خدمات انجام دی تھیں۔ ہمیں شہروں سے زیادہ جنگل اور اُن کی خاموشی پسند تھی۔ جنگل اور فطرت سے عشق ہمارے جین میں داخل ہو کر وجود کا حصہ بن چکا تھا۔ ہمارے زمانے میں تو اب شکار کوئی پسندیدہ شغل رہا نہیں۔ دنیا میں تیزی سے ختم ہوتی جنگلی حیات اور ان کے تحفظ کے لیے انسانی جدوجہد نے دنیا میں جنگلی حیات کے شکار کو اب نیا رخ دے دیا ہے۔ لوگ اب نیشنل پارکوں میں جا کر دوربین سے دیکھ کر انہیں خوش ہوتے ہیں اور کیمروں سے تصویریں کھینچ کر البم سجاتے ہیں۔ اب چیتل، ہرن اور تیندوے کو مار کر ان کے مردہ جسم پر پاؤں اور اپنے کندھے پر بندوق رکھ کر یادگاری تصویریں اتروانے کا زمانہ کب کا بیت چکا۔ اب شکار کیے جانوروں کے بھس بھرے جسم اور ان کے سروں کی ٹرافی بنا کر دیوار پر سجانے کا زمانہ بھی نہیں رہا۔ پہلے جانوروں کی کھال کھینچی جاتی تھی بھس بھرنے کے لیے مگر اب تو زندہ جانوروں کی کھینچی گئی تصویروں نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مدتوں پہلے میں نے بھی شکار چھوڑ دیا تھا۔ ویسے بھی ہمارا سب سے بڑا شکار لومڑیوں کا ہی ہوتا تھا۔ اب تو بس کبھی کبھار جنگلی خرگوش کے شکار کا بہانہ بنا کر دو چار فائر کر کے، اپنی یادگار بندوقوں کی نالوں کو زنگ لگنے سے بچا لیتے ہیں۔ یہ شکار تو ایک بہانہ ہے لہو گرم رکھنے کا۔ اُس روز بھی کچھ یہی قصہ تھا۔

ہمارے گھر کے پچھواڑے پہاڑوں میں گھرا بہت دلکش جنگل تھا۔ جنگل کے بیچوں بیچ سے ندی گزر رہی تھی۔ آبشاریں تھیں، جھرنے تھے اور ایک جھیل بھی تھی لیکن برطانیہ کے اس دور دراز علاقے میں سردی اتنی شدید پڑتی تھی کہ دسمبر اور جنوری میں تو جھیل اور ندی خود برف بن جاتی تھیں۔ ایک بار پاپا نے برف بنی جھیل پر ایک سیاہ جنگلی خرگوش کو نشانہ بنایا تھا۔ وہ برف کی جھیل پر بالکل صاف نشانہ تھا۔ ویسے بھی اُس جنگل میں خرگوش اور لومڑیاں بہت تھیں مگر میں اور پاپا صرف جنگلی خرگوش کا شکار کرتے تھے۔ پاپا کو سخت سردیوں میں اُس کی یخنی اور گوشت کا شوربہ بہت پسند تھا۔

”سردیوں میں اس کا گوشت جسم کو بہت زیادہ حرارت پہنچاتا ہے۔“ وہ جب بھی خرگوش کو کامیابی سے نشانہ بناتے، ہمیشہ یہی بات کہتے تھے۔ اب تو جہاں وہ بندوق تان کر خرگوش کا نشانہ باندھتے، میں سمجھ جاتا کہ گولی چلانے کے بعد جو وہ بات سب سے پہلے کہیں گے، کیا ہوگی۔ یہی کہ خرگوش کا گوشت... اب کیا دُہرانا، آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔

ہاں تو میں پاپا کی بات کر رہا تھا۔ نہیں ٹھہریے، میں آپ کو شروع سے قصہ سناتا ہوں۔

میرے دادا تاجِ برطانیہ کے راج کے آخری تیس چالیس سالوں میں ہندوستان گئے تھے۔ وہ شاہی حکومت کے ملازم تھے اور ان کا تعلق فوج سے تھا۔ اُس وقت ان کی عمر بھی چوبیس پچیس برس ہوگی۔ ہندوستان میں انہیں شہروں کی انتظامی ذمے داریاں سونپی گئی تھیں۔ انہیں جنگل، شکار اور گھومنے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے اپنے حکام سے درخواست کی کہ ان کا تبادلہ محکمۂ جنگلات میں کر دیا جائے، سرکار نے درخواست مان لی۔ یوں وہ ہندوستان کی کئی ریاستوں میں جنگلات کے انتظامی اُمور کی دیکھ بھال سے منسلک رہے۔ پاپا بتاتے ہیں کہ سچ تو یہ ہے کہ وہ ڈیوٹی سے زیادہ شکار میں مصروف رہتے تھے۔ ویسے بھی وہ جنگلات کے افسر تھے اور جنگل میں ہی زیادہ تر اپنا وقت گزارتے تھے۔ اب جنگل میں بیٹھے افسر سے شہری دفتر میں بیٹھا اعلیٰ افسر کیا بازپرس کرتا، یوں اُن کی زندگی مزے سے کٹتی رہی۔ تقسیمِ ہند سے کچھ پہلے وہ ریٹائر ہو گئے مگر پھر بھی ہندوستان سے نہ لوٹے۔ اُن کی آخری پوسٹنگ نینی تال میں ہوئی تھی۔ وہی نینی تال جس کے لیے ہندوستان میں کہاوت مشہور ہے کہ ”تالوں میں نینی تال، باقی سب تلیّا“ یہ کہاوت مجھے پاپا نے بتائی تھی۔

تقسیمِ ہند کے بعد انگریز تو برطانیہ لوٹنے لگے مگر دادا کا دل نہیں مانا کہ وہ یہاں سے جائیں۔ تقسیمِ ہند کے وقت اُن کی ریٹائرمنٹ کو کئی سال گزر چکے تھے۔ دادا، دادی اور میرے پاپا... تینوں نینی تال کے ایک بہت پُرفضا مقام پر بہت خوبصورت کاٹیج میں رہتے تھے۔ میرے پاپا کی پیدائش بھی ہندوستان میں ہوئی تھی۔ وہ بہت اچھی اور روانی سے ہندی اردو بولتے تھے۔ تقسیم کے وقت وہ خاصے سمجھ دار تھے۔ انہیں بھی اپنے والد کی طرح شکار اور جنگلوں سے عشق تھا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد دادا نے ٹمبر کا کام شروع کر دیا تھا۔ جس سے انہوں نے اچھی خاصی دولت بھی کمائی تھی۔ وہ جنگلات سے عمارتی لکڑی کی کٹائی کے سرکاری ٹھیکے دار تھے۔

ہمارے گھر میں اب بھی کئی البم موجود ہیں۔ اگرچہ بلیک اینڈ وائٹ تصویریں زرد ہو چکی ہیں مگر ان کی اہمیت ہرگز کم نہیں ہوئی۔ ان تصویروں میں دادا، دادی اور پاپا کی درجنوں یادگاری تصویریں ہیں۔ زیادہ تر تصویریں دادا کی ہیں، وہ بھی شکار کھیلتے ہوئے یا پھر جنگلوں میں شکار کے انتظار میں خیمہ زن ہو کر وقت گزاری کرتے ہوئے لمحات کی۔

مجھے یاد ہے۔ اس وقت میں گیارہ بارہ سال کا تھا، جب پاپا نے ایک تصویر مجھے دکھائی تھی۔ دادا کے علاوہ اُس تصویر میں کچھ اور لوگ بھی تھے۔ ”یہ ہیں جم کاربٹ......“ انہوں نے ایک چہرے پر انگلی رکھ کر نشاندہی کی۔ ”یہ تمہارے دادا کے دوست تھے۔ انہوں نے کئی بار اکٹھے شکار کھیلا تھا۔ بہت بڑے شکاری تھے ہندوستان کے۔ آج بھی برطانیہ اور ہندوستان میں اُن کے شکار کے قصے بہت مشہور ہیں۔ اپنے شکاری قصوں پر انہوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں، جو دنیا بھر میں مشہور ہوئیں۔“

مجھے آج بھی یاد ہے کہ میں نے ہُوں ہاں کر کے گول مول جواب دیا تھا مگر ”جم کاربٹ......“ یہ نام میرے ذہن میں نقش ہو گیا تھا۔ جب عملی زندگی میں آیا اور کتابیں پڑھنا شروع کیں تو مجھے لائبریری جانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ گھر میں جم کاربٹ کی لکھی ہوئی تقریباً تمام کتابیں موجود تھیں۔ اُن کتابوں کو پڑھ کر مجھے جم صاحب کے شکاری قصوں سے اچھی خاصی واقفیت ہو گئی مگر اس سے زیادہ دلچسپی اور لگاؤ ہندوستان کی جنگلی حیات سے ہو گیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے گھر میں اکثر ہندوستان کے مختلف جنگلی جانوروں، اُن کے شکار اور نینی تال کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ نینی تال اس لیے بھی ہمارے گھر میں زیادہ یاد کیا جاتا تھا کہ دادا اور دادی کا انتقال وہیں ہوا تھا ایک ٹریفک حادثے میں۔ اُن کی جیپ ایک جنگل سے لوٹتے ہوئے، پہاڑی ڈھلوان پر ٹائی راڈ کھلنے کے باعث لڑھک کر کھائی میں جا گری تھی۔ دونوں کی قبریں بھی وہیں ہیں گورا قبرستان میں۔ یہ بات مجھے پاپا نے بتائی تھی۔

دادا، دادی کی موت کے وقت پاپا کی عمر سترہ اٹھارہ برس ہوگی۔ اب ان کے لیے وہاں رہنا مشکل تھا، وہ برطانیہ لوٹ آئے اور اپنے چچا کے پاس رہنے لگے۔ آتے ہوئے وہ سب کچھ ہندوستان میں چھوڑ آئے تھے لیکن اپنے پاپا کی کتابیں، تصویریں، شکاری بندوقیں اور دولت...... نہایت حفاظت سے لے آئے تھے۔ انہیں، دولت کے سوا باقی دوسری چیزیں اپنی جان سے زیادہ پیاری تھیں۔ چونکہ اُن کی عمر کا بڑا حصہ ہندوستان میں گزرا تھا اس لیے وہ برطانیہ کی

شہری زندگی کے ماحول سے خود کو ہم آہنگ کرنے میں بڑی مشکل محسوس کر رہے تھے۔ آخر انہوں نے محکمۂ جنگلات میں بطور رینجر نوکری کرلی اور پھر ریٹائرمنٹ سے کافی پہلے اسی محکمے کے ایک اعلیٰ افسر بن گئے۔ انہیں برطانیہ کی شہری زندگی کبھی پسند نہیں آئی۔ اس لیے وہ ہمیشہ جنگل سے قریب رہتے تھے۔ انہوں نے شادی بھی اپنے جیسی لڑکی سے کی تھی۔ وہ محکمے کے ایک افسر کی بیٹی تھی۔ اس کے دادا بھی ہندوستان میں خدمات انجام دے چکے تھے۔ انہیں بھی جنگل اور خاموش زندگی پسند تھی۔ یوں جب میں پیدا ہوا تو جنگل، فارم ہاؤس اور ممی پاپا...... ساتھ میں شکار، گھوڑے اور بندوق کی وراثت۔ اوپر سے یہ کہ مجھے خود جنگلات کے محکمے میں ڈپٹی چیف رینجرز کی نوکری مل گئی تھی۔ اب اگر اس پس منظر میں پرورش پانے والا لہو گرم رکھنے کے لیے شکار کا بہانہ نہ بنائے تو کیا پب میں جا کر وقت گزارے گا۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی جنگلی خرگوش کے شکار کی۔

اُس دن خوش قسمتی ہمارے ساتھ تھی۔ ہم نے دو گھنٹے میں تین خرگوش شکار کیے۔ اس کے بعد درختوں کے ایک جھنڈ میں، صاف ستھری جگہ دیکھ کر ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ میں نے خشک ٹہنیاں جمع کرکے آگ جلائی۔ تھرماس سے کافی اُنڈیلی اور لگ بھگ آدھ گھنٹے تک ہم دونوں نے جنگل میں اپنے کامیاب شکار کا جشن منایا۔

میں اور پاپا سردیوں میں اکثر و بیشتر شکار کے لیے نکلتے تھے مگر نہ جانے اُس دن کیا بات تھی کہ ہم دونوں کو ہی بہت مزہ آرہا تھا۔

"اب چلیں۔" کافی ختم کرنے کے بعد میں نے کہا۔

"ارے اتنی جلدی کیا ہے، بیٹھو کچھ دیر اور۔" میں کھڑا ہو رہا تھا جب انہوں نے مجھے ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آج اچھا لگ رہا ہے۔" انہوں نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو تھرماس میں کافی بچی ہے۔"

"ہاں......کافی بہت ہے۔" میں نے تھرماس کا ڈھکن کھول کر اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

"چلو......ایک ایک کپ اور کافی ہو جائے۔" انہوں نے خالی کپ میری طرف بڑھایا۔

میں نے کچھ اور لکڑیاں ڈالیں، الاؤ اور تیزی سے بھڑکنے لگا۔ اُس وقت پاپا کافی مختلف لگ رہے تھے۔ اُن کے چہرے پر سوچ کی لکیریں گہری ہو گئی تھیں مگر اُن کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اُن کی سوچ پریشان کُن نہیں ہے۔ اُن کے چہرے پر مسرت نظر آرہی تھی۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ ٹھنڈ بہت تھی مگر الاؤ کی وجہ سے کم از کم مجھے تو زیادہ سردی نہیں لگ رہی تھی۔ ہمارے اطراف بہت خوشگوار حدت پھیلی ہوئی تھی۔ پاپا درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں پائپ سُلگ رہا تھا۔ وہ سیب کی مہک والا تمبا کو استعمال کرتے تھے۔ اُس وقت جنگل میں سیبوں کی پھیلتی ہوئی ہلکی ہلکی مہک بہت ہی بھلی محسوس ہو رہی تھی۔

"تمہیں معلوم ہے یہ جنگل ہمارے لیے کتنے اہم ہیں؟" آخر انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنی خاموشی توڑی۔

میں نے یہ سن کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہ جنگل ... سائنس دانوں، ماہرین ماحولیات، کارخانہ داروں، سیاحوں، عام انسانوں اور جنگلی جانوروں کے لیے مختلف حیثیت رکھتے ہیں مگر میرے لیے......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ "جنگل میری یادیں ہیں، میری وہ یادیں جن میں پاپا، مما اور خالص زندگی پوشیدہ ہے۔ میں جنگلوں کا باسی تھا اور اب تک ہوں۔ لگتا ہے کہ میرا دل بھی ایک گھنا جنگل ہے اور میں اب تک اُس میں گھوم رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ رکے اور کچھ دیر بعد بولے۔ "اسی لیے میں ورڈز ورتھ کو پڑھتا ہوں۔ اس کی شاعری میں فطرت ہے۔ فطرت سے محبت کو انسانی زندگی سے نکال دو تو صرف تصنع بچتا ہے جو اب ہمیں ہر طرف نظر آتا ہے۔" اُن کا لہجہ گمبھیر تھا۔ میں بھی اُن کی باتیں بڑے غور سے سُن رہا تھا۔ "جنگل میں انسان اور جانور، چاہے شکار ہوں یا شکاری، دونوں اپنی اپنی اصل فطرت اور جبلت کے ساتھ آمنے سامنے ہوتے ہیں۔" انہوں نے برف پر رکھے ہوئے، شکار کیے گئے خرگوشوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"آج آپ بہت جذباتی ہو رہے ہیں۔" وہ رک کر پائپ سلگا رہے تھے، تب میں نے مسکرا کر کہا۔

"آج مجھے نینی تال بہت یاد آرہا ہے۔"

"اوہ......میں سمجھ گیا۔" عمر زیادہ ہو جائے تو انسان کے پاس ماضی پرستی کے سوا، کرنے کا کوئی اور کام تو بچتا نہیں ہے۔ اُن کی پیدائش اور لڑکپن کا سارا زمانہ ویسے بھی نینی تال اور اُس کے جنگلوں میں گزرا تھا۔ ہم نسلاً انگریز تھے لیکن پیدائشی لحاظ سے پاپا نے ہندوستان کی زمین پر جنم لیا تھا۔ تبھی تو اس سے اُن کا پیدائشی رشتہ تھا۔ کہتے ہیں کہ انسان بوڑھا ہو جائے تو محبوب اور جائے پیدائش کی یادیں دل میں سر اٹھانے لگتی ہیں۔ پاپا کے ساتھ بھی شاید یہی کچھ ہو رہا تھا۔ اُس سہ پہر وہ خاصے جذباتی نظر آرہے تھے۔ نینی تال کے ذکر پر اُن کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نظر آرہی تھی۔ وہ سرشاری کے عالم میں تھے۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس وقت وہ اپنے خیالوں میں کہیں اور پہنچے ہوئے تھے۔

"پاپا......آپ آخری بار نینی تال کب گئے تھے؟" میں نے سوال کیا۔

"وہاں سے آنے کے بعد کبھی نہیں گیا۔" انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر اب جانا چاہتا ہوں۔"

"میں بھی جانا چاہتا ہوں مگر گھر۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ایلی پریشان ہو رہی ہوگی۔"

"ہاں چلو۔" وہ بھی اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر آگئے۔ ہم نے سامان سمیٹا، درخت کے تنے سے بندھی گھوڑوں کی لگامیں کھولیں اور سوار ہو کر گھر کو چل دیے۔ تقریباً سارا دن تھمے رہنے کے بعد برف باری کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔ نرم برف میں گھوڑوں کے سم دھنسے جا رہے تھے۔ وہ ڈُلکی چال چلتے ہوئے جنگل سے باہر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

گھر پہنچے تو واقعی ایلی بہت پریشان تھی۔ ہم لگ بھگ سارا دن گزار کر لوٹے تھے مگر جب اس نے خرگوش دیکھے تو مسکرا دی۔ ٹھنڈ بہت تھی۔ بچے چھوٹے تھے۔ اس معاملے میں وہ پاپا سے متفق تھی کہ خرگوش کا گوشت سردیوں میں ٹھنڈ سے بچاتا ہے۔ پاپا تو لوٹتے ہی خرگوشوں کی کھال اتارنے اور گوشت کی بوٹیاں بنانے میں لگ گئے اور میں منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلنے چل دیا۔

"واقعی تازہ گوشت کا ذائقہ ہی بہت مختلف ہوتا ہے۔ کچھ تمہارے ہاتھ کی بھی لذت شامل ہو گئی ہے۔ لطف دوبالا ہو گیا۔" ڈنر کرتے ہوئے میں نے گوشت اور ایلی، دونوں کی..... تعریف کر دی۔ یخنی اور گوشت کا مصالحہ دار شوربہ بہت عمدہ تھا۔ بھنی ہوئی بوٹیاں بھی تھیں۔ باہر برف گر رہی تھی لیکن کمرے میں روشن آتشدان اور پُرتکلف ڈنر نے ساری سردی دور بھگا دی تھی۔

ڈنر کے بعد ہم لیونگ میں بیٹھ گئے۔ ایلی کافی بنا لائی تھی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں ٹی وی پر موسم کی خبریں سُن رہا تھا۔ مزید برف باری کی پیشگوئی تھی۔ "پاپا موسم بہار میں نینی تال کا موسم کیسا ہوتا ہے؟"

"نینی تال" اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتے ایلی نے حیرت سے کہا۔ "ڈامی، تمہارا مطلب ہندوستان سے ہے؟"

"ہاں ..." میں نے مسکرا کر کہا اور پاپا کی طرف دیکھا اور پھر اپنا سوال دُہرایا۔ "آپ نے بتایا نہیں وہاں کیسا موسم ہوتا ہے بہار کے دنوں میں؟"

"بہت خوبصورت، سرسبز گھاس والے میدان، جنگلی پھولوں سے لدی جھاڑیاں مگر......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ "یہ تو پچاس ساٹھ برس پہلے کی بات ہے۔ اب پتا نہیں کیسا ہوتا ہوگا؟"

"تو کیا خیال ہے، چل کر نہ دیکھیں کہ اب وہاں موسم بہار کیسا ہوتا ہے۔" میں نے تجویز دی۔

"کیا کہا تم نے......" پاپا چونک گئے۔ انہوں نے ایسے کہا کہ جیسے ان کے کانوں نے جو سُنا ہے، وہ اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ ہم سب نینی تال جائیں۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ "وہاں دادا، دادی کی قبریں ہیں اور پھر آپ کا تو لڑکپن بھی وہیں گزرا ہے۔ بڑے قصے سنے ہیں آپ سے اُس جگہ کے۔ چلو چل کر دیکھ بھی لیں۔"

"سوری......" میں ایسے ایڈونچر میں شریک نہیں ہونا چاہوں گی۔" ایلی نے فوراً ہاتھ اٹھاتے ہوئے انکار کر دیا۔ وہ فطرتاً تنہائی پسند تھی۔ اسے تو کہیں آنے جانے کا سن کر ہی ہول اٹھنے لگتا تھا۔ سفر سے اُس کی جان نکلتی تھی اور یہ تو پھر بھی طویل سفر تھا، ایک سے دوسرے ملک کا سفر۔ اس نے خود کو اس معاملے سے علیحدہ کر لیا تھا۔

"کوئی بات نہیں......" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "صرف میں اور پاپا چلے جائیں گے۔"

"کیوں پاپا، چل رہے ہیں نا ہم دونوں اس موسم بہار میں؟" وہ خاموش بیٹھے تھے۔ میں نے کہا تو وہ چونک گئے۔

"بالکل، سو فیصد تیار ہوں۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

دو ہفتے بعد کرسمس تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم مارچ کے وسط میں ہندوستان جائیں گے۔ پروگرام کے

مطابق کرسمس کی چھٹیاں ختم ہونے کے بعد میں اپنا اور پاپا کا پاسپورٹ بنواتا۔ دفتر سے دو ہفتے کی چھٹی لیتا۔ مجھے نینی تال یا ہندوستان دیکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ ہمارا گھرانا روایت پسند تھا۔ اُس روز جب میں نے پاپا سے پوچھا تھا کہ آخری بار وہ کب نینی تال گئے تھے تو انہوں نے جواب میں کہا تھا "کبھی نہیں۔" اُس وقت مجھے لگا کہ اُن کے جواب میں ایک حسرت پوشیدہ تھی۔ مجھے ایسے لگا کہ جیسے کہنا چاہتے ہوں کہ "اب جاؤں گا" مگر کہہ نہ سکے۔ بس اُسی لمحے، میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ عمر کے اس آخری حصے میں شاید یہ پاپا کی سب سے بڑی خواہش ہوگی، میں اسے بہت جلد پورا کروں گا۔ اُس شام ڈنر کے بعد میں نے نینی تال کا تذکرہ بھی جان بوجھ کر کیا تھا تاکہ وہ خوش ہوجائیں کہ ہم جانے والے ہیں۔ میرا ارادہ مارچ کے وسط میں جانے کا تھا۔ ابھی دسمبر کا وسط چل رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب اگلے تین مہینے پاپا یہ سوچ سوچ کر بہت خوش رہیں گے کہ وہ اپنی جنم بھومی کو دیکھنے کے لیے جانے والے ہیں۔

جنوری کے آخر تک ہم دونوں کے پاسپورٹ بن گئے تھے۔ فروری کے شروع میں ٹورسٹ ویزا بھی مل گیا۔ پندرہ مارچ سے میری دو ہفتے کی چھٹیاں بھی بمع تنخواہ منظور ہوگئی تھیں۔ ویسے روپے پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ہم دونوں کی تیاری ہر لحاظ سے مکمل تھی۔

میں نے ایک مہنگا ڈیجیٹل کیمرا بھی خرید لیا تھا تاکہ عمدہ تصاویر بنا سکوں۔ ویسے سچ تو یہ ہے کہ مجھے اور پاپا کو قدرتی مناظر کی فوٹوگرافی کا بہت شوق تھا۔ ویسے یہ شوق مجھے اُن سے ہی ورثے میں ملا تھا۔ پروگرام کے مطابق ہم برٹش ائرویز کی پرواز سے دہلی پہنچتے۔ دو دن وہاں رکتے۔ تاج محل کی سیر کرتے اور پھر نینی تال کو چل دیتے۔ وہاں سے سیدھے دہلی اور پھر واپس اپنے وطن لوٹ آتے۔ ہمارا پروگرام ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ دہلی میں ایک ٹور آپریٹر کے ذریعے نینی تال میں ہفتہ بھر کے قیام کے لیے ریسٹ ہاؤس بھی بک کروالیا تھا۔ پاپا بھی اپنی تیاروں میں مگن تھے۔ انہوں نے جم کاربٹ کی کئی کتابیں، نینی تال کی پرانی تصاویر پر مبنی البم بھی سامان میں رکھ لیے۔ "میں چاہتا ہوں کہ تمہیں پورا نینی تال گھماؤں۔" اُس دن البم سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ "ان تصویروں سے تم سمجھ سکو گے کہ میرے زمانے اور آج کے شہر میں کیا کچھ بدل چکا ہے۔"

"مگر یہ کتابیں....؟"

"اب ہر وقت تو گھومتے پھرتے نہیں رہیں گے نا۔" انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ویسے بھی ان کتابوں میں کئی قصے نینی تال کے ہیں وہ وہاں بیٹھ کر پڑھوں گا تو زیادہ لطف آئے گا۔"

جب سے ہم نے تفریحی سفر کا فیصلہ کیا تھا، تب سے پاپا کا جوش و خروش دیکھنے والا تھا۔ وہ بہت خوش نظر آرہے تھے۔ میں نے انٹرنیٹ سے بہت ساری معلومات اکٹھی کرلی تھیں۔ پاپا کے لیے تو وہ علاقہ دیکھا بھالا تھا مگر میں نے پڑھ پڑھ کر اتنی معلومات حاصل کرلی تھیں کہ اب صرف اُس علاقے کو دیکھنا باقی تھا۔ ویسے میں بھی بہت خوش تھا۔ زندگی میں پہلی بار غیر ملکی سفر پر جارہا تھا۔

آخر وہ دن آ گیا۔ ہم دونوں باپ بیٹا لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ سے مقامی وقت کے مطابق رات کے آٹھ بجے ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے۔ جب جہاز نے ٹیک آف کیا، اُس وقت پاپا کی حالت دیدنی تھی۔ اُن کے چہرہ معصوم بچے کی طرح کھلا ہوا تھا۔ کئی بار میں نے اُن کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ وہ خوشی کے آنسو تھے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد اپنی جائے پیدائش اور بچپن کے شہر کو دیکھنے کی خوشی میں وہ آنسو اُن کی آنکھوں سے چھلک رہے تھے۔ البتہ اُن کے برعکس میرے جذبات صرف تجسس پر مبنی تھے۔ زندگی میں پہلی بار اتنی طویل پرواز، پہلی بار غیر ملکی اور وہ بھی انجان سرزمین کا سفر، جس پر کبھی میرے دادا، دادی رہا کرتے تھے اور بس!

☆☆☆

انگریزوں نے ہندوستان پر کافی عرصے حکومت کی تھی۔ اس دوران انہوں نے اپنے تئیں اس ملک کی جغرافیائی اصلاحات جیسا کام بھی کیا۔ انہوں نے مغل دور کی صوبائی حدبندیوں کو ازسرنو تشکیل دیا تھا۔ انگریزوں کے دور میں نینی تال 'صوبہ جات متحدہ' کا حصہ تھا۔ ہوا یہ تھا کہ انہوں نے ہندوستان کے وسیع ترین علاقے کو ملا کر یہ نام دے دیا تھا۔

انگریزوں کا بنایا ہوا یہ صوبہ وسیع جنگلات، متعدد چھوٹے بڑے دریاؤں، ندی نالوں، پہاڑی تفریحی مقامات، سرسبز میدانوں اور جنگلی حیات کی وجہ سے ایک خاص شہرت رکھتا تھا۔ نینی تال بہت خوبصورت پہاڑی گھاٹیوں، جھیلوں، گھنے جنگلوں، سرسبز چراگاہوں اور دلکش

میدانی علاقے پر مشتمل ہے۔ یہ اسی صوبے کا ایک چھوٹا سا مگر بہت خوبصورت حصہ تھا۔

آزادیٔ ہند کے بعد حکومتِ ہندوستان نے جہاں اور صوبوں کے نام تبدیل کیے تو اس صوبے کو بھی نیا نام ملا۔ آج ہم انگریزوں کے 'صوبہ جات متحدہ' کو 'اُتر پردیش' کے نام سے جانتے ہیں، جسے مختصراً یو پی کہا جاتا ہے۔

اُتر پردیش میں ایک مشہور پہاڑی تفریح گاہ واقع ہے۔ اس شہر کو دنیا نینی تال کے نام سے جانتی ہے۔ انگریز دورِ حکومت سے لے کر 1999ء تک، اس پہاڑی شہر کو صوبے کا گرمائی دارالحکومت رہنے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ یہ ہمارے وہاں سے لوٹنے کے بہت بعد کی بات ہے۔ جب حکومت نے نینی تال کو ضلع کا درجہ دے کر نوتشکیل صوبے اتر آنچل میں شامل کردیا تھا۔

نینی تال کو اپنے حسین قدرتی مناظر، مسحورکن برفانی چوٹیوں اور دلفریب جھیلوں کی وجہ سے خاص شہرت حاصل ہے۔ جھیلوں کی وجہ سے نینی تال کو 'ساٹھ جھیلوں کا ضلع' بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں واقع چند مشہور جھیلوں میں نوکچیا تال، سات تال، ملی تال، نینی تال، تلی تال، سوکھا تال، کھریا تال وغیرہ شامل ہیں۔

نینی تال سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ بلند ہے۔ یہاں نہایت دلکش قدرتی جنگلات واقع ہیں، جہاں کبھی شیر، چیتا، تیندوا، ہاتھی، ریچھ، لنگور، چرخ، بھیڑیے، جنگلی کتے، بارہ سنگھا، کاکڑ، چوسنگی، چیتل، پاڑے، ماؤس، سانبھر، جنگلی گائے، نیل گائے اور متعدد دیگر اقسام کی جنگلی حیات وافر تعداد میں پائی جاتی تھی۔

یہاں کے جنگلوں، پہاڑوں، جھیلوں اور میدانی علاقوں میں جو پرندے پائے جاتے تھے، ان میں کالیج، مرغ زریں، مرغ سیمی، منال، چکور، رام تیتر، مور، پہاڑی کبوتر، جنگلی کبوترے، زمردی فاختہ، ہریل، جنگلی مرغ، سرخاب، قازیں، پپیہے، جل مرغی، گھڑیال، مگرمچھ اور متعدد اقسام کی مچھلیاں شامل ہیں۔

راج کے دورِ حکومت میں یہ علاقہ راجاؤں، مہاراجاؤں، نوابین، رؤسا اور انگریز عملداروں کی گرمائی موسم میں پہاڑی تفریح گاہ کے ساتھ ساتھ شکارگاہ بھی ہوتی تھی۔ یہاں وہ گرمی کی شدت سے بچنے کے ساتھ ساتھ شکار سے دل بھی بہلایا کرتے تھے۔ ان کے جنگلوں کی دولت ملک میں عمارتی لکڑی کی بڑی ضروریات پورا کرتی تھی۔

میرے دادا رچرڈ جیمز برطانوی دورِ حکومت کے بعد جب ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو انہوں نے گزر معاش کے لیے جنگلاتی لکڑی کی ٹھیکیداری شروع کردی تھی۔ خاصے پیسے کمائے تھے انہوں نے اس کام میں۔ پاپا بتاتے ہیں کہ وہ امیروں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے، مگر یہ بہت پہلے کی بات ہے، میرے باپ اور دادا کے زمانے کی۔ جب میں نینی تال پہنچا تو یہ تذکرہ ماضی کا حصہ بن کر تاریخ میں محفوظ ہوچکا تھا...... میں جس نینی تال کو دیکھنے پہنچا، وہ اب یوپی کا موسم گرما کا صدر مقام نہیں بلکہ ایک پہاڑی شہر تھا البتہ اُس کے شاندار ماضی کی کچھ جھلک اب بھی موجود تھی۔

جھیلیں تھیں مگر اُن میں سے اکثر جھیلیں آلودہ ہوکر اپنا حُسن کھو چکی تھیں، جنگل تھے لیکن گھنے نہیں بلکہ چھدرے چھدرے سے۔ درختوں کی بے دریغ کٹائی نے جنگلی حیات کے قدرتی مسکن تباہ و برباد کردیے تھے۔ میں نے یہاں آنے سے پہلے جم کاربٹ کی کتابوں میں جن جانوروں کی ان جنگلوں میں موجودگی کے بارے میں پڑھا تھا، یہاں لوگوں سے مل کر پتا چلا کہ اُن میں سے کئی اقسام تو عشروں پہلے ہی نینی تال کے جنگلوں سے معدوم ہوچکی ہیں۔ البتہ بعض انواع اب بھی اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہیں...... بڑھتی آبادی، کٹتے جنگل، کاشت کے لیے مزید زمین کا حصول، شہری گنداب...... جنگلی حیات کی معدومی اور جھیلوں کے شہر کی آب گاہوں کی تباہی کے ایک نہیں کئی اسباب تھے۔ یہ سب اسباب ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے تھے، جن کا سرا انسان کی لالچ، بڑھتی آبادی اور قدرتی ماحول کی بقا سے صرفِ نظر کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔

نینی تال کے کئی پہاڑوں کی برف سے ڈھکی چوٹیاں بھی سیاحوں کے لیے بہت خاص مقام رکھتی ہیں۔ یہ بات میں انٹرنیٹ پر پڑھ چکا تھا اور پاپا سے بھی اس کے قصے سنے تھے۔ ان چوٹیوں میں چائنا پیک، ٹفن ٹاپ، اسنو فال، کیمل بیک اور کِل بری وغیرہ شامل ہیں۔ دس دن کے قیام میں اُن سب چوٹیوں کا نظارہ ہمارے پروگرام کا حصہ تھا۔

ہم شام کے وقت نینی تال پہنچے تھے۔ یہاں پہنچ کر پاپا بہت خوش تھے۔ ہم عیسائیوں کے قبرستان بھی گئے جہاں سنگی چبوترے بنی دادا، دادی کی قبریں اب تک موجود تھیں۔ البتہ اُن کے اردگرد جھاڑیاں بہت زیادہ تھیں۔ ہم نے ایک دن مزدور لگا کر انہیں صاف کروایا اور قبروں کی مرمت بھی کروائی۔ یہاں پہنچ کر پاپا بہت دکھی ہوئے تھے۔ اُس شام

وہ خاصے چُپ چُپ تھے۔ ظاہر ہے نصف صدی بعد اُن قبروں کو دیکھ کر انہیں اس بڑھاپے میں اپنا بچپن اور والدین تو بہت شدت سے یاد آئے ہوں گے۔

پاپا کے لیے یہ شہر کیسا تھا، دل کی بات تو وہی بہتر لکھ سکتے تھے مگر برطانیہ سے باہر کی دنیا میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ میرے لیے تو پہاڑی لوگ بہت دلچسپ تھے۔ ویسے جن دنوں ہم یہاں پہنچے موسم بہار شروع ہو چکا تھا۔ میں نے کئی ایسے جوڑے دیکھے جو ہنی مون منانے آئے ہوئے تھے۔ شاید بہار میں شادی خوشگوار تجربہ ہوتی ہوگی۔ خیر میری شادی تو جون کے موسم میں ہوئی تھی اور اب وہ بھی بہت پرانی بات ہوگی۔

نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا لیکن پاپا کو ایک، ایک جگہ یاد تھی۔ خیر انہیں کوئی شناسا تو نہیں مل سکا اور نہ ہی انہوں نے اس بارے میں کوئی سنجیدہ کوشش کی، البتہ مقامات موجود تھے لیکن وہ افسردہ تھے۔ کہتے تھے کہ ”یہاں کا وہ حُسن تو اُجڑ ہی گیا جو میں نے دیکھا تھا۔“ ہم نے کئی دن گھومتے پھرتے گزارے۔ میرے لیے وہ آنے والی زندگی کے یادگار دن بنتے مگر پاپا اپنی پچھلی زندگی جی رہے تھے۔

نینی تال میں سات دن گزر چکے تھے۔ اُس رات میں اپنے لیپ ٹاپ پر وہ تصویریں پاپا کو دکھا رہا تھا جو میں نے اپنے نئے ڈیجیٹل کیمرے سے کھینچی تھیں۔ ہم بیڈ پر بیٹھے ہوئے تھے اور ہمارے گرد بلیک اینڈ وائٹ تصویروں کے وہ البم بکھرے ہوئے تھے جو پاپا ساتھ لائے تھے۔ وہ اکثر مجھے روکتے، البم میں تصویر دیکھتے اور پھر لیپ ٹاپ مانیٹر پہ تصویر دیکھ کر اُس کا موازنہ کرنے لگتے۔ سچ ہے بہت فرق پڑ چکا تھا۔ کئی ایسے علاقے تھے جہاں پاپا کے بقول پہلے جنگل تھے مگر اب وہاں بستیاں آباد تھیں۔

دو روز پہلے ہم بھابھر کے جنگلات اور ہمالیہ کی ترائی والے علاقے کی طرف گئے تھے۔ بڑا دلکش نظارہ تھا وہ۔ کہتے ہیں کہ وہ نظارے نینی تال کے دلکش اور قابلِ دید نظاروں میں سے دو چار ہیں۔ ویسے جو جنگل بچے ہیں، موجودہ نسل کے لیے تو وہ بھی دیکھنے کے لائق ہیں مگر پاپا جیسے لوگوں کے لیے افسوس کا سبب۔ ویسے پاپا جیسے لوگ اب کتنے ہوں گے یہاں۔ حکومت نے نینی تال کی دلکشی اور جنگلوں کی جنگلی حیات کو برقرار رکھنے کے لیے اب کچھ قدرتی علاقوں پر مشتمل نیشنل پارک قائم کر دیے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر زندگی میں پھر کبھی پچاس سال بعد یہاں آنے کا موقع ملا تو کیا وہ سب کچھ جو میں دیکھا ہے، ویسا ہی ہوگا۔ پاپا کی باتیں سن کر تو یقین ہے ہرگز نہیں ہوگا، البتہ یہ ممکن ہے کہ شاید نیشنل پارک والا علاقہ ویسا ہی ہو۔ سچ پوچھو تو یقین اس پر بھی نہیں۔ ایک عرب کی آبادی سے تجاوز کرتا ہندوستان آنے والی نصف صدی میں اپنی عوام کی ضروریات پوری کرے گا یا قدرتی ماحول کو بچائے گا۔ ویسے میں نینی تال کے جس بھی مقامی بوڑھے سے ملا، اُس کا یہی کہنا تھا کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے باعث زمین کی قلت ہو رہی ہے۔ ممکن ہے کہ نصف صدی بعد نینی تال بھی ہو، لوگ بھی ہوں مگر اس کا وہ قدرتی حُسن دیکھنے کو شاید نہ ملے، جو پہلے ہی نصف صدی میں بہت ماند پڑ گیا ہے۔ البتہ یہ طے ہے نینی تال کی پہچان، ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے کی چوٹیاں ضرور ہوں گی مگر بڑھتے درجۂ حرارت اور عالمی موسمیاتی تغیرات کے باعث اُن پر پڑی برف غائب ہونے کا سو فیصد خدشہ ہے۔

☆☆☆

ہماری واپسی میں تین دن باقی رہ گئے تھے۔ اُس دن ہفتہ تھا۔ پاپا نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم کہیں نہیں جائیں گے بلکہ گیسٹ ہاؤس میں آرام کرتے ہوئے پورا دن گزاریں گے۔ صبح کے ساڑھے نو بجے تھے، جب ہم گیسٹ ہاؤس کے لان میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہ بہت دلکش مقام پر واقع تھا۔ یہاں سے اطراف کا منظر، سڑک، آتے جاتے لوگ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

ہم نے چائے منگوائی۔ پاپا اپنے ساتھ دو تین کتابیں بھی لے آئے تھے۔ نینی تال میں اُن دنوں رات کو موسم بہت سرد ہو جاتا تھا مگر دن بہت خوشگوار تھا۔ ہم نے ہلکی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ کھلی کھلی دھوپ بہت مزہ دے رہی تھی۔ برطانیہ میں ایسا چمکدار سورج تو بہت کم نکلتا ہے۔ یہاں دیکھ تو بہت مزہ آیا۔ فوراً وہ برف باری والا دن یاد آ گیا، جب اس سفر کے خیال نے جنم لیا تھا۔

پاپا کے سامنے میز پر دو تین کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ جم کاربٹ کی مختلف کتابیں تھیں۔ پاپا نے ایک کتاب اٹھائی اور ورق گردانی شروع کر دی۔ کہیں کہیں وہ رک کر مجھے اقتباس بھی سنا رہے تھے۔ یہ اقتباس بھی نینی تال سے متعلق تھے۔

انگریز راج کا نینی تال جم کاربٹ کی کتابوں میں موجود ہے۔ فرق یہ ہے کہ جم کاربٹ کا نینی تال جنگلی حیات کی دولت سے مالا مال تھا لیکن آج کے نینی تال میں جنگلی حیاتیاتی انواع کی صرف داستانیں ہیں۔ جس کے ذمّے دار بھی انسان ہی ہیں۔

”ارے یہ لو......“ انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی کتاب میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ قصہ پڑھو، بہت مزہ آئے گا۔“

”اوہنی بس۔“ میں نے کتاب لے کر اس کا نام پڑھا اور وہ صفحہ نشانی کے واسطے موڑ دیا، جس پر پاپا نے انگلی رکھ کر کتاب میری طرف بڑھائی تھی۔ ”کمرے میں لیٹ کر دوپہر کو پڑھوں گا آرام سے۔“ چائے آ گئی تھی۔ ویٹر کو دیکھ کر میں نے کتاب میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

دوپہر ہم نے ڈائننگ ہال میں لنچ کیا اور آرام کے لیے کمرے میں لوٹ آئے۔ ’اوہنی بس‘ میرے کمرے میں تھی۔ سہ پہر کے تین بجے میں سو کر اٹھا، چائے منگوائی اور تازہ دم ہو کر کتاب اٹھالی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر نہ پڑھی اور ڈنر پر پاپا نے پوچھ لیا تو جھوٹ بولنا پڑے گا۔

’اوہنی بس‘ جم کاربٹ کے شکار کے مختلف چھوٹے بڑے قصوں پر مشتمل کتاب ہے مگر جس کہانی کی طرف پاپا نے اشارہ کیا تھا، وہ شکار کا نہیں بلکہ نینی تال اور اس کے جنگلوں سے جڑا ایک دلچسپ، پُراسرار اور تحیر انگیز مگر سچا قصہ ہے۔ مجھے یہ کہانی پڑھ کر اس لیے بہت مزہ آیا کہ میں خود اس شہر میں تھا مگر پڑھنے کے بعد مجھے یقین تھا کہ یہ قصہ اب صرف کتاب میں ہی باقی رہ گیا ہوگا۔ شاید ہی کسی مقامی شخص کی یادداشت میں یہ موجود ہو۔

جم کاربٹ نینی تال کے اس قصے کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

”نینی تال میں داخلے کے تین راستے ہیں۔ پہلا راستہ کاٹھ گودام سے نینی تال جاتا ہے۔ دوسرا راستہ چھوٹی ہلدوانی یا کالا ڈھونگی سے نینی تال کو جاتا ہے۔ تیسرا راستہ رتی گھاٹ سے رانی کھیت کو جاتا ہے اور ٹی بی اسپتال کے سامنے سے نینی تال مڑ جاتا ہے۔ اس سڑک پر ایک جگہ رتی گھاٹ واقع ہے۔

اُن دنوں رتی گھاٹ کے سامنے سڑک کی کشادگی اور پختگی کا کام جاری تھی۔ ایک دن سڑک بنانے والے مزدور اور کاریگر معمول کے مطابق اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے کہ اچانک انہیں انسان نما جانور دکھائی دیا۔ یہ جنگل کے سڑک والے حصے کی طرف تھا اور سڑک کنارے لگے درختوں سے گرے ہوئے پھل اٹھا اٹھا کر کھا رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی سنسنی پھیل گئی۔ کچھ تو ڈر کے مارے اِدھر اُدھر چھپ گئے مگر چند جوان جی دار مزدوروں نے ہمت کی۔ وہ اس کی طرف دوڑے اور اس کے گرد گھیرا باندھ لیا۔

قریب پہنچ کر جب اُن لوگوں نے غور سے مشاہدہ کیا تو حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ عجیب الخلقت شے دراصل ایک برہنہ لڑکی تھی۔ مزدوروں کے شور کرنے اور قریب آنے پر وہ گھبرا گئی اور چاروں ہاتھ پاؤں کے بل دوڑتی ہوئے قریب کی گھنی جھاڑی میں روپوش ہو گئی۔ مزدوروں نے جھاڑی کو گھیرے میں لے لیا اور شور مچا مچا کر اس مخلوق کو جھاڑی سے باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگے، جس پر وہ ہاتھ پاؤں کے بل، کسی جانور کی طرح دوڑتی اور منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکالتے ہوئے تیزی سے باہر نکلی مگر چاروں طرف لوگوں کو دیکھ کر رک گئی۔ اس کے بھاگ نکلنے کا ہر راستہ بند ہو چکا تھا۔

مزدوروں نے تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اس کو قابو میں کر لیا اور ہاتھ پاؤں باندھ کر، ایک بڑی سی ٹوکری میں ڈال کر نینی تال کے مرکزی اسپتال ’کرو سٹھ ویٹ‘ کی طرف لے چلے۔ جس ٹوکری میں انہوں نے اُسے لادا تھا، وہ پہاڑی مزدور سامان لانے لے جانے کے لیے اپنی کمر پر باندھتے تھے، جسے مقامی بولی میں ’کانڈی‘ کہتے ہیں۔ اسپتال پہنچ کر انہوں نے اسے ڈاکٹروں کے حوالے کر دیا۔ ڈاکٹر بھی عجیب الخلقت انسان نما جانور دیکھ کر حیران تھے۔

جم کاربٹ نے قصے میں آگے چل کر لکھا ہے۔

”میں نے یہ خبر موکھا گھاٹ میں قیام کے دوران ایک اخبار میں پڑھی تھی۔ جہاں میں اس وقت اپنی ملازمت کے سلسلے میں رہائش پذیر تھا۔ اس عجیب الخلقت جان دار کے متعلق طرح طرح کی خبریں اخبارات کی زینت بنی ہوئی تھیں۔ البتہ زیادہ تر لوگ اس بات پر متفق تھے کہ وہ عجیب الخلقت جان دار ایک بھیڑیے کا بچہ ہے۔ غرضیکہ اس حوالے سے طرح طرح کی قیاس آرائیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نینی تال سے کافی دور تھا لیکن اس واقعے نے میرے تجسس کو بیدار کر دیا تھا۔ مجھے بھی شوق چڑھا کہ اس کی اصل کہانی معلوم کی جائے۔“

جم مزید لکھتے ہیں:

”واقعے کے پیچھے پوشیدہ اصل حقائق جاننے اور خبرات میں بیان کردہ خبروں کی تصدیق کے لیے میں

نے اپنے ایک دوست لاری کو ٹیلی گرام بھیجا۔ وہ ایک پیشہ ور فوٹو گرافر تھا اور نینی تال میں ہی رہتا تھا۔ میں نے اسے لکھا تھا کہ وہ خود کروستھ ویٹ اسپتال جا کر اخبارات میں شائع شدہ خبروں کی تصدیق کرے اور اس جان دار کی تصاویر بنا کر مجھے موکھا گاٹ، بنگال کے پتے پر بھجوا دے۔ ٹیلی گرام ملنے کے بعد میری ہدایات کے عین مطابق لاری نے کروستھ ویٹ اسپتال کا دورہ کیا۔ وہ جنگلی لڑکی بدستور وہیں رکھی گئی تھی مگر کوشش کے باوجود لاری اس کی کوئی تصویر حاصل نہیں کرسکا۔ ہوا یہ تھا کہ جس جگہ اُسے رکھا گیا تھا وہ ایک اسٹور روم تھا، جہاں رسی کے بنڈل، بڑے بڑے لکڑی کے بکسے اور اسی طرح کا دوسرا کاٹھ کباڑ موجود تھا۔ وہ اس ڈھیر کے پیچھے چھپ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے وہ باہر نکلی۔ لاری کے مطابق اس نے خود اُسے دیکھا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ فوٹو کھینچتا، وہ دوبارہ چھپ گئی۔"

جم کاربٹ لکھتے ہیں کہ "لاری نے سارا احوال ایک خط میں تفصیل سے لکھ کر مجھے بھیج دیا۔ مجھے اس جنگلی لڑکی کا پس منظر جاننے میں بہت دلچسپی تھی۔ کئی ہفتوں تک وہ اخبارات کی خبروں میں چھائی رہی۔ طرح طرح کی باتیں چھپ رہی تھیں۔ کچھ لکھ رہے تھے کہ وہ کسی بھیڑیے کی انسان نما اولاد ہے۔ کچھ کا خیال تھا کہ وہ انسان نما بندر ہے۔ طرح طرح کی خبریں گرم تھیں۔"

جم کاربٹ کے مطابق "کچھ عرصے کے بعد میں واپس اپنے گھر نینی تال گیا جہاں پر مجھے انگلستان کی ایک تنظیم کی جانب سے ارسال کردہ ایک خط موصول ہوا۔ یہ خط تنظیم کے صدر بجی فلیڈر فلائیر نے حکومت ہند کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔ بجی بلیڈر فلائیر جنگ عظیم دوم کے دوران ڈائریکٹر جنرل سپلائی محکمہ جنگ، ہندوستان سے وابستہ رہ چکا تھا۔ وہ آئی سی ایس افسر تھا اور کئی مرتبہ موکھا گاٹ، مغربی بنگال میں مجھ سے ملاقات کر چکا تھا۔ اس نے اپنے خط میں مجھ سے لکھا تھا "کیا میں اس جنگلی لڑکی، جسے رتی گھاٹ، نینی تال کے نواح سے پکڑا گیا تھا اور جسے بھیڑیے یا بندر کا بچہ کہا جا رہا ہے، سے متعلق مکمل معلومات اس کو فراہم کرسکتا ہوں؟"

خط موصول ہونے کے بعد میں (جم کاربٹ) نے اپنے پرانے دوست موتی سنگھ کو اس حوالے سے تفصیلی حالات جاننے کے لیے نینی تال روانہ کیا۔ موتی سنگھ سے میری ملاقات بیس سال قبل موکھا گھاٹ میں ہی ہوئی تھی، تب سے ہمارے درمیان دوستی کا رشتہ قائم تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ رتی گھاٹ کے قرب و جوار میں دس، دس میل اندر جا کر وہاں موجود گاؤں اور دیہات کے لوگوں سے اس حوالے سے معلومات حاصل کرے۔ ان سے دریافت کیا جائے کہ کیا ان کے گاؤں یا دیہات سے کم و بیش بارہ، تیرہ سال پہلے کوئی انسانی بچہ لاپتا ہوا تھا۔

موتی سنگھ نے قریہ قریہ، گاؤں گاؤں جا کر معلومات حاصل کیں مگر کسی جگہ سے موتی سنگھ کو کسی بھی بچے کی گمشدگی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ موتی سنگھ اس مہم میں ناکام ہونے کے بعد تحصیل دار کے دفتر جا پہنچا۔ بچوں کی گمشدگی سے متعلق تحصیل دار کی مدد سے پندرہ سال پرانے کاغذات کی چھان بین کے باوجود بھی کسی بچے کی گمشدگی کی کوئی اطلاع ریکارڈ میں نہ مل سکی۔ یہاں سے کوئی سراغ نہ ملنے کے بعد موتی سنگھ کروستھ ویٹ اسپتال جا پہنچا، جہاں پر اس جنگلی لڑکی کو داخل کیا گیا تھا۔

جم کاربٹ کا کہنا ہے کہ اسپتال کی انچارج ڈاکٹر مشرا سے ہمارے پرانے مراسم تھے۔ موتی سنگھ نے میرا حوالہ دیتے ہوئے اپنے وہاں آنے کا مقصد بیان کیا کہ وہ جم کاربٹ کی ہدایت پر اس جنگلی لڑکی کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر مشرا نے اس کو اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ ڈاکٹر نے اُس کمرے کی دیکھ بھال کرنے والی خاتون اور نرس کو بھی اپنے ساتھ موتی سنگھ کی مدد کے لیے تیار کر لیا تھا، جہاں اُس عجیب الخلقت جان دار کو رکھا گیا تھا۔ ان تینوں خواتین کے بیانات اور اسپتال کے ریکارڈ کے جانچنے سے جو معلومات حاصل ہوئیں، وہ کچھ یوں تھیں۔

15 جولائی 1916ء ایک جنگلی لڑکی کو اسپتال میں داخل کیا گیا۔ اسپتال رجسٹر میں اس کی عمر چودہ سال اور، نام کی جگہ گونگی درج تھا۔ اسپتال کے عملے کے مطابق جب اسے یہاں لایا گیا تھا تو وہ اس وقت رسیوں سے جکڑی ہوئی تھی اور اس کو ایک گاڑی میں ڈال کر لایا گیا تھا۔ پولیس اور لوگوں کا بڑا ہجوم اسے لے کر یہاں پہنچا تھا۔ لوگوں کے اس بڑے ہجوم سے جنگلی لڑکی بے حد خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ جیسے ہی اس کو رسیوں کی بندش سے آزاد کیا گیا تو اس نے ایک نرس کو کاٹ لیا۔ اس کے وحشیانہ رویے سے خوف زدہ ہو کر انہوں نے اسے اپنے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کیا تو وہ لڑکی چاروں ہاتھ پاؤں کے بل... دوڑتی ہوئی سامنے واقع اسٹور

روم کی طرف بھاگی۔ اسٹور کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ اس کے اندر گھس گئی اور ایک کونے میں دُبک کر بیٹھ گئی۔

ڈاکٹر مشرا اسپتال کی نرس اور کمرے کی صفائی کرنے والی ان تینوں خواتین کا کہنا ہے کہ وہ جنگلی لڑکی قطعی گونگی ہے اور کچھ بول نہیں سکتی۔ اس کی عمر چودہ سال کے قریب تھی اور جسمانی لحاظ سے وہ مکمل صحت مند لڑکی تھی۔ اس کے جسم سے آثار بلوغت نمایاں تھے اور یہ کہ اس کا جسم انتہائی گندہ تھا۔ اس کا پورا جسم گھنے بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ سر کے بال چھوٹے اور اُلجھے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں کے ناخن بڑھ کر پنجوں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ اس کے کندھوں کے اوپر اور جسم کے مختلف حصوں پر تازہ اور پرانے گھروٹوں کے واضح نشانات موجود تھے۔ وہ کسی بھی کھانے کی چیز اٹھانے کے لیے صرف اپنے دانتوں سے مدد لیتی تھی۔ جب اسے پکڑ کر زبردستی کپڑے پہنانے کی کوشش کی تو اس نے غصے کا اظہار کیا اور کپڑوں کو دانتوں سے پکڑ کر اپنے سے دور کر دیا۔ وہ لکڑی اور رسیوں کے ایک بڑے بنڈل کو، جو کہ کمرے کے درمیان رکھا ہوا تھا، کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئی۔ وہ کسی بھی پکی ہوئی چیز کو کم ناپسند نہیں کرتی ہے، البتہ کچی چیزوں جیسے کہ کچا گوشت اور سبزیاں وغیرہ ہی کھاتی ہے۔ جب اس پر خوشی کی کیفیت طاری ہوتی تو ایسا لگتا تھا کہ وہ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کچھ بول نہیں سکتی تھی۔ اس کے منہ سے غوں غاں جیسی آوازیں نکلتی تھیں اور وہ چاروں ہاتھ پاؤں کے بل کمرے میں چکر لگاتی ہے۔ اس کے کمرے میں کھانے کے لیے جو چیزیں ڈالی جاتی تھیں، ان کو وہ منہ سے اٹھاتی تھی اور اپنی پناہ گاہ کے ایک کونے میں جمع کرتی تھی، اُس کے بعد اسے وقفے وقفے سے کھاتی تھی۔

جس کمرے میں اسے رکھا گیا تھا، وہاں بہت غلاظت پھیلی ہوئی تھی۔ غلاظت اور گندگی کے درمیان وہ چاروں ہاتھ پاؤں کی مدد سے گھومتی رہتی تھی۔ وہ ویران ماحول پسند کرتی تھی اور انسانوں سے دور بھاگتی تھی۔ جس کمرے میں اسے رکھا گیا تھا، جب صفائی کی غرض سے اس کمرے کو دھویا جانے لگا تو وہ بے قرار جانور کی طرح اِدھر اُدھر دوڑتے بھاگنے لگی۔ کمرے میں کوئی پناہ کی جگہ نہ پا کر وہ برآمدے میں آ گئی جو کہ اسٹور روم سے متصل تھا۔ وہاں دالان میں رسیوں کا ایک بڑا بنڈل رکھا ہوا تھا وہ اس بنڈل کو دھکیلنے کی کوشش کرتی رہی اور اس کے گرد دیوانہ وار چکر لگاتی رہی اور اپنی جدوجہد میں ناکام ہو کر دالان کے اونچے ستون پر نہایت آسانی سے چڑھ کر اس کے اوپری حصے سے چمٹ گئی۔ وہ اس وقت تک ستون سے چمٹی رہی جب تک اس کے کمرے کی صفائی ہوتی رہی۔ صفائی کے بعد بھی کچھ دیر ستون سے چمٹی رہی پھر خود ہی واپس نیچے آ گئی۔

ڈاکٹر مشرا، نرس اور روم اٹینڈنٹ کو یقین کی حد تک گمان ہے کہ وہ ایک پہاڑی لڑکی تھی۔ ان تینوں خواتین کا کہنا ہے کہ اس کی جسمانی ساخت، رنگ و روپ اور حرکات و سکنات اس کے پہاڑی ہونے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس کے اندر تمام تر حیوانی حسیات تھیں جو ممکن ہے کہ جنگل میں جانوروں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے پیدا ہوگئی تھیں۔ اس کی دماغی حالت بالکل ٹھیک تھی اور ایک ذہین لڑکی محسوس ہوتی تھی۔ اُسے اسپتال والوں نے 'گونگی' کا نام دے دیا تھا۔

گونگی نے کروستھ اسپتال میں اپنی زندگی کے آخری چند دنوں میں نرس اور روم اٹینڈنٹ کے قریب آنے پر مزاحمت ختم کر دی تھی۔ شاید وہ اُن سے مانوس ہو چکی تھی۔ اس نے علاج میں بھی کسی قسم کی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اس کا سر دھوتے، نہلاتے، ناخن کاٹتے اور بالوں میں کنگھا کرتے

ضمیر

خدا ہمیں بیدار بخت اور بیدار ضمیر بنائے۔ مردہ ضمیروں نے ہمیں پہلے ہی بہت نقصان پہنچایا ہے۔ مردہ ضمیر وہ ہے جو ملک و قوم کے نقصان کی پروا کیے بغیر اپنی منفعت کی فکر کرے۔ اگر معاشرے میں باضمیر پیدا ہوگئے تو بے ضمیر ویسے ہی روپوش ہو جائیں گے۔ حق آئے گا اور باطل جائے گا۔ ضمیر کی آواز خلاؤں میں موجود رہتی ہے۔ ہم کثیر المقصدیت کا شکار ہیں۔ ہم ایک سے زیادہ زندگیاں رکھتے ہیں۔ ہم ایک سے زائد اموات کا ذائقہ چکھیں گے۔ ضمیر کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ضمیر کی آواز کا یہی پیغام ہے کہ یہ ظاہری شان و شوکت واہمہ ہے۔ لباس کے اندر ہر آدمی ایک ہی آدمی ہے اور وہ وقت دور نہیں ہے جب یہ وقت ختم ہو جائے گا۔ ضمیر کے باغی خاک ہو جائیں گے اور ضمیر کی آواز پر چلنے والے کامران و سرفراز ہو جائیں گے۔

اقتباس: حرف حرف حقیقت از واصف علی واصف

مرسلہ: ملک ثاقب شاد تنولی، ایبٹ آباد

پر بھی اُس نے کوئی مزاحمت یا غصہ نہیں دکھایا۔ اس نے صفائی کرنے والی عورتوں پر پہلے کی طرح حملہ کرنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ نہلانے اور صفائی کے پورے عمل کے دوران وہ مجموعی طور پُرسکون رہی۔ البتہ جب اسے ڈھیلی ڈھالی فراک پہنانے کی کوشش کی گئی تو اس نے لباس کو دانتوں سے پکڑ کر دور کر دیا تھا۔ بستر اور کمبل کے ساتھ بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

اسپتال عملے کے مطابق وہ جب تک یہاں رہی، کمرے کے کونے میں رسیوں کے بنڈل اور لکڑی تختوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھی رہتی تھی۔ جب وہ خوشی کا اظہار کرنا چاہتی تو منہ سے ’’گوانگ گوانگ‘‘ کی آوازیں نکالتی تھی: کبھی تیز اور کبھی بہت ہلکی آوازیں۔

دو ہفتوں بعد ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ یہ ذہنی مریضہ ہے۔ آخر گوگی کو 25 جولائی 1916ء کو کچھ محافظوں کی نگرانی میں بریلی کے پاگل خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ اُن دنوں سخت گرمیاں تھیں اور نینی تال کے مقابلے میں بریلی بہت ہی گرم علاقہ تھا۔ بریلی منتقل کیے جانے کے چند روز بعد اسے لو لگ گئی اور وہ اپنی پُراسرار کہانی سمیت دنیا سے چلی گئی۔

جم کاربٹ نے لکھا ہے کہ ’’گوگی کی موت کے بعد چند روز تک اخبارات میں اُس کا بہت چرچا رہا مگر پھر اخباروں کی تازہ خبروں کے ڈھیر میں دب کر وہ بھی ماضی کا حصہ بن گئی۔ رفتہ رفتہ یہ واقعہ بھی لوگوں کی یادداشت سے محو ہوتا گیا۔ جن مزدوروں نے اُسے پکڑا تھا، اُن کا تعلق مختلف علاقوں سے تھا۔ وہ سڑک بنانے کے لیے یہاں آئے تھے۔ سڑک بن گئی تو وہ بھی سب بکھر گئے۔ وہ عجیب الخلقت لڑکی تھی یا انسان نما پُراسرار جانور؟...... کسی نے اس کی حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کی۔ کوئی تحقیق نہیں کی گئی۔ پُراسرار قصوں والے ہندوستان میں حقائق سے زیادہ کہانی کو اہمیت دی جاتی ہے۔ گوگی بھی گمنام قصہ بن گئی تھی۔ بس! لے دے کر اُس گورے نے انگلینڈ سے ایک خط لکھا اور یوں اس قصے کا ایک مختصر خاکہ میں نے لکھ دیا جو ابھی آپ نے پڑھا ہے۔‘‘

جم کے مطابق گوگی کی موت کے بعد چند مہینوں تک اُس کا قصہ نجی محفلوں میں ہوتا رہا۔ سفید فاموں کا کہنا تھا کہ وہ ایک بھیڑیے کا بچہ تھی۔ میں یہ بات نہیں مانتا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ گوگی ایک انسانی بچہ تھی، جیسا کہ ڈاکٹر مشرا نے کہا تھا تو سوال اٹھتا ہے کہ وہ کون تھی، کہاں رہتی تھی اور کس طرح وہ اس جنگلی پن کا شکار ہوئی تھی؟ گوگی کی جنگل سے آمد اور اس کا پکڑے جانا، نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کے لیے حیرت اور دلچسپی کا باعث تھا مگر افسوس کے اس کا پس منظر جاننے کے لیے سنجیدہ تحقیق نہیں کی گئی۔

جم کا کہنا تھا ’’جو سفید فام اسے بھیڑیے یا بندر کا بچہ کہتے تھے، اپنی بات کے ثبوت میں اُن کا دعویٰ تھا کہ وہ کسی بھی چیز کو کھانے کے لیے ہاتھوں کے بجائے صرف منہ استعمال کرتی تھی اور ہر خام چیز کو جانوروں کی طرح کھاتی تھی۔ میرے خیال میں یہ دلیل بے بنیاد تھی۔ جہاں سے گوگی کو پکڑا گیا تھا وہاں سے سو میل دور تک بھیڑیوں اور بندروں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس وقت بھی اور اب بھی میرا کہنا یہ تھا کہ ایسا کوئی واقعہ یا ثبوت موجود نہیں کہ بھیڑیا قریب کی کسی انسانی بستی سے، کسی انسانی بچے کو اٹھا کر لے گیا ہو۔

جم کاربٹ کے بہ قول ’’بھیڑیوں کا انسانی بچے اٹھا کر لے جانے کے واقعات میں نے ہندوستان میں اکثر سنے ہیں لیکن بھیڑیوں کے غول میں کبھی انسان یا اس سے مشابہت رکھنے والا کوئی بچہ نہیں دیکھا گیا اور نہ ہی ایسا کوئی ثبوت موجود ہے کہ مادہ بھیڑیے نے کسی انسانی بچے کی اپنے دودھ پہ پرورش کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر میں بھیڑیے کے ہاتھوں انسانی بچے کی پرورش کی بے سروپا کہانی پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں۔‘‘

کہانیاں مشہور ہیں کہ جم کاربٹ کی زندگی والے ہندوستان کے جنگلات میں رہنے والے بھیڑیے اکثر بھوک سے بے حال ہو کر، قریب کی کسی بستی سے انسانی بچے کو اٹھالے جانے میں کامیاب ہو جاتے تھے مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ انسانی بچے کو پالنے یا پرورش کرنے کے لیے اٹھالے جاتے تھے۔ بھیڑیا ایک وحشی گوشت خور درندہ ہے اور یہ بات اس کی جبلت کے خلاف ہے کہ وہ کسی انسانی بچے کی پرورش کرے۔ اس کے علاوہ بھیڑیے کی خوراک پر نوزائیدہ بچہ کس طرح زندہ رہ سکتا ہے۔ جم کاربٹ کے بہ قول غریب، ان پڑھ، بے سمجھ دیہاتی بچے کی گمشدگی کا الزام ہمیشہ بھیڑیے کے سر منڈھ دیتے ہیں۔ اس ضمن میں صرف ایک سچ ہے اور یہ کہ اگر بچہ بھیڑیے نے اٹھایا ہے تو صرف کھانے کے لیے نہ کہ پالنے کے لیے۔ میں اس طرح کے قصوں کو اہمیت دینے پر تو تیار نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بھیڑیے کے تیز نکیلے خوفناک دانتوں کی گرفت میں آنے کے بعد وہ بچہ، جو بھیڑیے کا شکار بنا ہو، وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

’’گوگی‘‘ کی کہانی میں جم کاربٹ نے ہندوستانی بھیڑیے کا بھی نقشہ کھینچا ہے۔ بطور ریفر مجھے وہ بہت دلچسپ لگا۔ وہ لکھتے ہیں:

’’ہندوستانی بھیڑیا، سائز میں گیدڑ سے کچھ زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ اس کی جسامت کی بنیاد پر بھی میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ بھیڑیا گھر کی چار پانچ فٹ اونچی باڑ یا دیوار عبور کر کے گھر میں داخل ہو اور بچہ لے کر اسی طرح فرار ہو جائے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکے۔ ہندوستان میں بھیڑیے کے بارے میں بچے لے جانے کے قصے عام ہیں۔ ہندوستانی بھیڑیوں کے مقابلے میں روس اور کینیڈا کے بھیڑیے قد آور، جسیم، زیادہ طاقتور اور وحشی ہوتے ہیں مگر ان تمام باتوں کے باوجود ان ملکوں میں بھی کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ نہ ہی ایسی کوئی کہانی سننے کو ملی کہ بھیڑیا پالنے کے لیے کسی انسانی بچے کو اٹھا کر ساتھ لے گیا ہو۔‘‘

’’گوگی، انسان تھی یا جانور؟‘‘ جم کاربٹ نے اس پر بھی دلچسپ بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’سوتی سنگھ کی تحقیق اور کروستھ ویٹ اسپتال کے ریکارڈ کی جانچ پڑتال کو مدنظر رکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس حوالے سے کئی سوالات ہیں جو ایک لمبی بحث ہے۔ البتہ یہ طے ہے کہ گوگی کا واقعہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کا سیا حیران کر دینے والا مگر تحقیق طلب واقعہ ہے۔ افسوس یہ کہ تحقیق نہیں کی جا سکی۔ گوگی کا انسانوں سے دہشت زدہ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اس نے اپنی مختصر زندگی میں کبھی کوئی انسان نہیں دیکھا ہوگا۔ اسی لیے جب اسے پکڑا گیا تو اس نے انسان کو بھی کسی قبیل کا جانور تصور کیا ہوگا۔ اگر ڈاکٹروں کے مطابق اس کی عمر چودہ سال تھی تو یہ عرصہ اس نے انسانوں سے بالکل دور بسر کیا ہوگا۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ بھیڑیوں یا بندروں کے ساتھ رہی ہوگی۔ اگر وہ بھیڑیوں اور بندروں کے غول کے ساتھ رہتی تھی تو اس نے یقینی طور پر انسان کو بھی ضرور دیکھا ہوتا۔ وہ ان سے خوف زدہ نہیں ہوتی۔ یہ دونوں جانور وہ ہیں جن کا انسانوں سے اکثر آمنا سامنا ہوتا ہے۔ ویسے بھی یہ جانور آبادیوں کے قریب ہی رہتے ہیں۔ مگر جہاں سے گوگی کو پکڑا گیا تھا، وہاں سے سو میل دور تک بھیڑیوں اور بندروں کی موجودگی کا کوئی ثبوت ہی نہیں ملا۔‘‘

’’گوگی کون تھی؟‘‘ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے جم کاربٹ لکھتے ہیں ’’مزدوروں کے جس گروہ نے اسے پکڑا تھا، انہوں نے از خود ہی گوگی کی شناخت کے بارے میں یہ بات طے کر لی کہ وہ انسان ہے۔ یہی بات مجھے بتائی گئی تھی کہ وہ ایک پہاڑی لڑکی تھی۔ اسپتال کے عملے نے بھی گوگی کو بحیثیت انسان کے شناخت کیا تھا۔ اسپتال کی انچارج ڈاکٹر مشرا اور عملے کے بقول گوگی صرف خام اشیا یعنی کچا گوشت، کچی سبزیاں اور جنگلی پھل شوق سے کھاتی تھی۔ ریچھ بھی کچا گوشت، پھل اور کچی سبزیاں شوق سے کھاتے ہیں۔ ہاں، جنگلی کتے صرف خام گوشت کھاتے ہیں۔ گوگی کو جس علاقے سے پکڑا گیا تھا وہاں کے جنگلات میں ریچھ اور جنگلی کتے بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اگر وہ انسان تھی تو ممکن ہے کہ شیر خواری میں وہ جانوروں کے ہتھے چڑھ گئی یا بچپن میں وہ جنگل میں راستہ کھو گئی ہو۔ ممکن ہے کہ وہ وحشی ریچھوں اور جنگلی کتوں کے درمیان رہی ہو۔ ویسے وہ سرد ماحول کی عادی تھی، اسی لیے جب اسے بریلی بھیجا گیا تو وہ گرمی کی شدت برداشت نہیں کر سکی اور مر گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کی پوری عمر ٹھنڈے علاقے میں گزری تھی۔ ویسے گوگی کو پاگل خانے کے بجائے چڑیا گھر بھیج دیا جاتا تو زیادہ مناسب رہتا، جہاں پر وہ جنگل جیسے آزاد ماحول اور جنگلی جانوروں کے درمیان رہ سکتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ چڑیا گھر کے جانوروں سے بالکل مختلف دکھائی دیتی مگر اس کے باوجود وہ ان کے درمیان با آسانی زندہ رہ سکتی تھی۔ وہ جنگل اور جنگلی جانوروں کے ماحول میں رہنے کی عادی تھی۔ میرے خیال میں وہ ریچھوں کے ساتھ پروان چڑھی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات ریچھوں کی طرح تھیں۔ ریچھ اپنا زیادہ تر وقت درختوں پر گزارنا پسند کرتے ہیں اور گوگی بھی ریچھوں کی طرح بغیر کسی سہارے کے نہایت آسانی سے لکڑی کے اونچے ستون پر چڑھ جاتی تھی۔ اسے ستون پر چڑھنا پسند تھا۔ وہ ریچھوں کی طرح اپنی خوراک ایک جگہ جمع کرتی، پھر اسے کھاتی تھی، وہ بھی بالکل ریچھوں کے انداز میں۔ جس طرح ریچھ کچے گوشت پھل اور سبزیاں کھاتے ہیں، گوگی بھی اسی طرح کھاتی تھی۔ جہاں تک گوگی کے جسم پر کھرونچوں کے نشانات کا تعلق ہے تو وہ نشانات درختوں پر چڑھتے اترتے وقت خاردار جھاڑیوں کی رگڑ کے ہو سکتے ہیں۔‘‘

جم کاربٹ نے اس تناظر میں ایک چھوٹا سا واقعہ بھی آگے چل کر بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’ہندوستان میں ہمالیہ کے ریچھوں کے حوالے سے یہ بات مشہور ہے کہ وہ عورتوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں اور

اُن کی خوب خاطر تواضع کے بعد انہیں جنسی زیادتی کا نشانہ بنا کر زندہ چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے ایسے کئی قصے سنے تھے۔ جن دنوں گوگی کا واقعہ ہوا، اس کے کچھ عرصے بعد میں ایک فارسٹ گارڈ نے نینی تال میں افواہ پھیلائی تھی کہ اس نے ایک لڑکی کو ریچھ کی طرح ہاتھ پاؤں کے بل پہ چلتے دیکھا ہے، جسے ایک دوسرے فارسٹ افسر نے گولی ماردی تھی۔ یہ سننے کے بعد جب میں نے متعلقہ افسر سے رابطہ کیا اور اس سے خبر کے بارے میں پوچھا تو اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا کہ جہاں سے گوگی کو پکڑا گیا تھا، اس جگہ سے کافی فاصلے پر ایک ریچھ سو رہا تھا جو کہ میری گولی کا نشانہ بن گیا۔ اس نے بتایا کہ اس ریچھ کے ساتھ نہ تو کوئی عورت تھی اور نہ ہی انسانی بچہ۔"

تو جناب جم کاربٹ کے دنوں میں نینی تال میں افواہ سازی کا یہ حال بھی تھا۔

جم کاربٹ نے اپنے اس دلچسپ قصے کا اختتام صرف سوالوں پر کیا تھا، وہ لکھتے ہیں:

"گوگی کون تھی، وہ کیسے جنگل پہنچی، وہ کس طرح جانوروں کے درمیان چودہ سال جنگل میں بسر کرتی رہی ——؟ یہ ایک راز تھا، راز رہا اور اب اس کے بعد یہ ہمیشہ راز ہی رہے گا۔"

☆☆☆

جم کاربٹ کی 'گوگی' میرے لیے بہت دلچسپ قصہ ثابت ہوئی۔ اُس سہ پہر اس قصے نے چھٹی کا لطف بڑھا دیا تھا۔ شام کو موسم خنک تھا۔ میں اور پاپا شام کی چائے پینے کے لیے ڈائننگ ہال میں بیٹھے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ پوچھتے میں بول اٹھا۔ "گوگی کا راز تو نینی تال کی تاریخ میں دفن ہو گیا ہوگا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے پڑھ لی۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"بالکل پڑھ لی، بڑا مزیدار قصہ تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"ہمیں تیسرے دن صبح سویرے یہاں سے نکلنا ہے۔ پرسوں شاپنگ کریں گے اور بچا صرف کل کا دن۔" انہوں نے کہنا شروع کیا مگر میں نے قطع کلامی کی۔

"آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟"

"کل صبح ہم چلیں گے اور رتی گھاٹ کا پتا چلا کر وہ جگہ ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے جہاں سے مزدوروں نے گوگی کو پکڑا تھا۔" انہوں نے جواب دیا۔

"ارے واہ۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "مگر ایک مشکل ہے؟" میرا لہجہ استفساریہ تھا۔

"کیا مشکل ہے۔" انہوں نے پوچھا۔

"پتا نہیں، اب وہ جگہ کیسی ہو، ہم اسے ڈھونڈ بھی پاتے ہیں یا نہیں؟"

"یہی تو دیکھنے اور مزہ لینے کی بات ہے۔" انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

دوسرے دن ہم ناشتے سے فارغ ہو کر ٹیکسی لے کر نکل گئے۔ جم کاربٹ کی کہانی پڑھ کر میرے تخیل میں اُس وقت کے نینی تال کا جو منظر اُبھرا تھا، وہ نینی تال مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ کافی تلاش کے بعد ہم نے ایسی جگہ ڈھونڈ ہی لی تھی جہاں شاید 1916ء میں سڑک بنانے والے مزدور کام کر رہے تھے۔ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے مگر اُس قصے میں جو نقشہ بیان کیا گیا، اُس کی بنیاد پر ممکنہ جگہ وہی لگی تھی۔ سڑک کے ساتھ ڈھلوان تھی۔ کبھی وہاں جنگل ہوتا ہوگا مگر اب ایک بڑا سا ہوٹل، مارکیٹ اور کچھ کاٹیج نظر آرہے تھے۔ جم نے نینی تال میں داخلی راستوں کے تین نام دیے تھے مگر اب سب کچھ بدل گیا۔ زمین کی صورت ہی نہیں، مقامات کے نام بھی تبدیل ہو گئے ہیں۔

ہم یہاں تاریخ کی کھوج کرنے تو آئے نہیں تھے کہ گڑے مُردے اکھاڑتے۔ اس لیے جو سمجھ سکے، اُسی پر خوش تھے۔ ہم دوپہر تک گھومتے پھرتے رہے۔ اس دوران کئی بار گوگی کا تذکرہ لبوں پر آیا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ بھوک لگ رہی تھی۔ تھکن بھی ہو چلی تھی۔ اس لیے اپنے تئیں گوگی کے پکڑے جانے کے مقام کو دریافت کر کے واپس گیسٹ ہاؤس لوٹ آئے۔

تیسرے دن صبح سویرے ہم دہلی کے لیے روانہ ہو رہے تھے، جہاں سے اُسی شام ہمیں لندن کے لیے روانہ ہونا تھا۔ نینی تال کی سیاحت، پاپا کی خوشی اور جم کاربٹ کا قصہ اس سفر کا حاصل تھا۔

نینی تال کو چھوڑتے ہوئے پاپا کی آنکھیں نم تھیں اور میری آنکھوں سے خوشی جھلک رہی تھی۔ دو ہفتے تک اپنی پیاری بیوی ایلی اور بچوں سے دور رہنے کے بعد میں اپنے گھر جا رہا تھا۔

☐

ابن کبیر

وہ قلم سے روزی کمانے کی فکر میں تھا۔ اس نے ایک ناول تحریر کیا اور اسے لے کر پبلشر کے پاس پہنچا۔ پبلشر نے مسودہ پڑھ کر واپس کرتے ہوئے اسے مشورہ دیا کہ وہ کوئی اور کام کرے مگر اس نے عزم کرلیا تھا کہ وہ اسی شعبہ میں نام پیدا کرے گا۔ ایک کے بعد ایک اس نے کئی ناشروں سے رابطہ کیا اور سب کا کہنا یہی تھا کہ وہ ناول نگاری سے نابلد ہے۔ تنگ آکر اس نے بالکل الگ انداز کا ایک ناول لکھا اور منتیں کرکے شائع کرایا مگر جب وہ ناول کتب فروشوں کے پاس پہنچا تو لوگ اسے خریدنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ پہلا ناول ہی اتنی بڑی تعداد میں بکا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی کیونکہ اس نے ناول نگاری میں ایک نئے طرز کی بنیاد رکھی تھی۔ آج بھی لوگ اس کے پرانے ناولوں کو خریدنا خوش ذوقی سمجھتے ہیں۔

[illegible] ناول نگاری کی بنیاد رکھنے والے مصنف کا احوالِ زیست

وہ سردی سے ٹھٹھر رہا تھا اور معدے میں بھوک رینگ رہی تھی۔ نقاہت کا شکنجہ کستا جا رہا تھا اور سڑک تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ سفر کبھی تمام نہیں ہوگا۔

اُس نے نظریں اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا جہاں دبیز بادل چھائے ہوئے تھے۔

"کیا آسمان برسنے کو ہے؟" اندیشوں نے دل دہلا دیا لیکن اُس نے فوراً ہی سر جھٹک دیا۔ "مجھے چلتے

"رہتا ہوگا، یہی زندہ رہنے کا اکلوتا امکان ہے۔" اس نے رفتار بڑھا کر دی۔

وہ مصائب میں گھرا ایک خستہ حال نوجوان تھا۔ چند گھنٹوں قبل وہ ایک چھوٹے سے کارخانے میں معمولی تنخواہ پر ملازم تھا لیکن آج صبح بیدار ہونے کے بعد جب اُسے علم ہوا کہ کارخانے میں کمانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے تو وہ یاسیت کے زیرِ اثر آ گیا اور بے سروسامانی کے ساتھ اُس لاحاصل زندگی کو چھوڑ کر کارخانے سے نکل پڑا۔

اُس کی منزل کاؤنٹی سسکس کا علاقہ اپ پارک تھا جہاں اُس کی شفیق ماں ایک جاگیردار کے ہاں ملازم تھی۔ وہ اس سے ملنے کے لیے چل پڑا تھا۔ اسے میلوں کا فاصلہ پیدل طے کرنا تھا۔

سناٹے میں ڈوبی سڑک پر یکدم اُسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اُس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ ایک نحیف سا کتا تھا جو شاید روٹی کے چند ٹکڑوں کی امید پر اُس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

یکبارگی بے بسی نے نوجوان پر یلغار کر دی۔ تلخ شب و روز سے جنم لینے والے کریہہ مناظر ذہن کے پردے پر چلنے لگے اور صدمے سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ چلتا رہا، اپنے رنج و آلام کے بارے میں سوچتا ہوا، اپنی قسمت پر ماتم کرتا ہوا۔

اپنی بے رنگ زندگی کی بابت میں سوچتے سوچتے اس کا ذہن چارلس ڈکنز کے ناول "آلیور ٹوئسٹ" کی جانب چلا گیا جس کے مرکزی کردار کو غموں میں ڈوبے بچپن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نوجوان اپنے مصائب کا آلیور کی مشکلات سے موازنہ کرنے لگا۔ یوں وہ تخیل کی دنیا میں نکل گیا۔

اب مناظر بدل رہے تھے، کردار گفتگو کر رہے تھے، کہانی آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک اسے ٹھوکر لگی اور وہ تخیل سے حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا اور یہ جان کر حیران رہ گیا کہ اپنے خیالات میں مگن وہ ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کر چکا ہے۔ اِس دوران اُسے تھکن، بھوک اور نقاہت کا قطعی احساس نہیں ہوا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کتا اُس کی خاموشی سے مایوس ہو کر جا چکا تھا۔

وہ مسکرا دیا۔ پہلی بار اُسے تخیل کی قوت کا ادراک ہوا تھا۔

اب وہ آگے بڑھ رہا تھا، اُن کہانیوں کے ساتھ جو وہ رات رات بھر پڑھا کرتا، اُن کرداروں کی معیت میں جو اُسے سپنے دیکھنے کی تحریک دیتے۔

گو کہ میلوں کا سفر باقی تھا لیکن تخیل سے پھوٹتی روشنی اُسے توانائی فراہم کر رہی تھی۔ اِسی توانائی کے طفیل وہ مستقبل قریب میں ادب کے افق پر چمکنے والا تھا لیکن یہ تو بعد کی بات تھی، اُس وقت تو وہ فقط ایک خستہ حال نوجوان تھا۔

اُس کا نام ہربرٹ تھا... آج دنیا اُسے مشہور مصنف ایچ جی ویلز کے نام سے جانتی ہے۔

☆☆☆

21 ستمبر 1866 کی رات جب تاریک، سیلن زدہ کمرے میں ہربرٹ کی پہلی قلقاری گونجی، شہر یاسیت کی سیاہی میں ڈوبا تھا!

لندن کے جنوب مشرقی علاقے بروملی کے لیے وہ سال خاصا درشت ثابت ہوا تھا۔ آغاز ہی میں اقتصادی بحران نے شہر کو لپیٹ میں لے لیا تھا جسے سیاسی انتشار نے مہمیز کیا تھا اور یوں کاروباری سرگرمیاں دھیرے دھیرے دم توڑنے لگی تھیں۔ رہی سہی کسر موسلا دھار بارشوں نے پوری کر دی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جوزف ویلز نے نومولود کو دیکھ کر اُس طرز پُرمسرت کا اظہار نہیں کیا جیسے ایک باپ کو کرنا چاہیے۔

پیشہ ورانہ سفر میں ناکامیوں کے پے در پے حملوں نے جوزف کو گھائل کر دیا تھا۔ کسی زمانے میں وہ مالی کی حیثیت سے بلدیاتی ادارے سے منسلک تھا، تاہم ہاتھ ہمیشہ تنگ ہی رہتا، سو اس نے ملازمت ترک کر کے اپنی دکان کھول لی لیکن آمدنی میں کچھ خاص اضافہ نہیں ہوا۔ وہ ایک پیشہ ور کرکٹر بھی تھا۔ اس میدان میں اپنا نام پیدا کرنا چاہتا تھا لیکن معاشی مسائل اور گھریلو ذمے داری کی وجہ سے کبھی اپنی حقیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ نہیں کر سکا۔

ہربرٹ، جوزف ویلز کی چوتھی اور آخری اولاد تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ جوزف اُسے دنیا میں لانا ہی نہیں چاہتا تھا لیکن اس کی بیوی سارہ نیل کی ضد نے اُسے مجبور کر دیا، بچہ دنیا میں آ ہی گیا جو خاصا کمزور تھا۔ ہربرٹ کی پیدائش سے چند برس قبل سارہ نے ایک بچی کو جنم دیا تھا جو گرتی صحت کے ہاتھوں پیدا ہونے کے کچھ عرصے بعد زندگی کی بازی ہار گئی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نومولود کا ہر طریقے سے خیال رکھتی۔

دنیائے ادب کو آج سارہ نیل کا ممنون ہونا چاہیے کیونکہ اس تاریک رات پیدا ہونے والے بچے نے آنے والے برسوں میں درجنوں شہرۂ آفاق ناول رقم کیے اور دنیائے ادب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔

☆☆☆

47 ہائی اسٹریٹ پر واقع اُس چھوٹے سے مکان کو مکان کہنا عجیب معلوم ہوتا ہے۔ وہ تو ایک دڑبا تھا۔ گھر کے مکینوں کو فقط ایک کمرا میسر تھا، دوسرے کمرے میں جوزف نے دکان کر رکھی تھی جو لاکھ جتن کرنے کے باوجود چلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

مکان کا باورچی خانہ ایک گھٹے ہوئے تہ خانے میں تھا، جہاں تاریکی کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔ تہ خانے میں روشنی کی آمد کا فقط ایک ذریعہ تھا۔ یہ ایک روشن دان تھا جو باہر فٹ پاتھ پر کھلتا۔ تہ خانے میں بیٹھا شخص روشن دان سے فٹ پاتھ پر چلنے والوں کے فقط پیر ہی دیکھ سکتا تھا۔

وہاں ایک خستہ حال میز بھی تھی جس کے گرد بیٹھ کر یہ دکھی خاندان کھانا کھاتا۔

جوزف کا زیادہ وقت دکان پر گزرتا۔ کینٹ کاؤنٹی کرکٹ ٹیم کے لیے کھیلنے سے تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی لیکن میچ مہینے میں ایک آدھ بار ہی ہوتے۔ اور اِس برس تو ویسے بھی بارشوں کی وجہ سے میدان سونے پڑے تھے۔ اس بستی میں مقیم دیگر گھرانے بھی کم و بیش ویلز خاندان جیسے مسائل ہی سے دوچار تھے۔

ہربرٹ کی زندگی کسی طور عام بچوں سے مختلف نہیں تھی جو اکثر غذا کی کمی کی شکایت کرتے، کرسمس پر نئے ملبوسات کا تقاضا کرتے، کھلونوں کی ضد کرتے۔ شعور کی آنکھ کھولنے کے بعد اس نے اپنے اردگرد غربت ہی دیکھی۔ اس کی ماں ایک خوبرو عورت تھی لیکن مسائل کی پرچھائیوں نے اُسے نحیف بنا دیا تھا لیکن محبت کی قوت اُسے متحرک رکھتی۔ اُسے اپنی اولاد سے بہت پیار تھا، خصوصاً ننھے ہربرٹ سے جسے وہ پیار سے برٹی کہا کرتی۔

سارہ ایک سگھڑ، شفیق اور کفایت شعار عورت تھی۔ محدود وسائل کے باوجود وہ اپنے بچوں کی خوشیاں پوری کرنے کی بھرپور کوشش کرتی۔

جب تک ہربرٹ کو بڑے بھائیوں کی طرح محلے کی گلیوں میں کھیلنے کی اجازت نہیں ملی، وہ اپنی ماں کے ساتھ اس سیلن زدہ تہ خانے میں وقت گزارتا، جہاں بیٹھ کر وہ روشن دان پر نظریں لگائے آنے جانے والوں کے پیروں کو گھورتا رہتا۔ جلد ہی ننھے ہربرٹ میں جوتوں میں فرق کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ وہ پیر دیکھ کر اندازہ لگا لیتا کہ گزرنے والا شخص کس قد کاٹھ کا ہے، تیم شحیم ہے یا نحیف، خوش خوراک ہے یا فاقہ زدہ۔ وہ جوتوں کو دیکھ کر بڑبڑاتا رہتا۔ "یہ کسی موٹے آدمی کے جوتے ہیں... اوہ، ضرور یہ بہت لمبا ہوگا... غریب معلوم ہوتا ہے، بے چارہ ... ارے نئی جوڑی ہے، آج ہی خریدی ہوگی!"

☆☆☆

کہتے ہیں حادثات انسان کی زندگی بدل دیتے ہیں۔ یہ بات ہربرٹ کی زندگی پر صادق آتی ہے۔ یہ ایک حادثہ ہی تو تھا جس نے اُسے اُس سنہری راہ پر ڈال دیا، جس کے اختتام پر دولت اور شہرت منتظر تھی۔

یہ 1874 کا ذکر ہے۔ آٹھ سالہ ہربرٹ کو اب باہر کھیلنے کی اجازت مل گئی تھی جہاں ہر شخص اُس سے بہت ہی محبت سے پیش آتا اور اِسی محبت کی وجہ سے وہ اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔

اُس روز محلے کا ایک لڑکا جونی اُسے گود میں اٹھا کر ہوا میں اچھال رہا تھا۔ دراز قد اور مضبوط کاندھوں کا مالک جونی ماضی میں ایسا کئی بار کر چکا تھا۔ جب بھی وہ ہربرٹ کو ہوا میں اچھالتا، وہ خوف زدہ ہونے کے بجائے خوشی سے قہقہے لگاتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جونی اُسے بہ حفاظت تھام لے گا لیکن اُس روز... ایسا نہیں ہو سکا۔ جونی ہربرٹ کو سنبھالنے میں ناکام رہا اور وہ معصوم اس بری طرح زمین سے ٹکرایا کہ ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ درد اتنا شدید تھا کہ ہربرٹ بے ہوش ہو گیا۔

جونی نے فوراً اُسے اٹھایا اور جوزف کے گھر کی جانب دوڑ پڑا۔ جب سارہ نے اپنے بیٹے کو اِس حال میں دیکھا، وہ حواس باختہ ہو گئی۔

"خود کو سنبھالو!" جوزف چلایا۔ ننھا ہربرٹ اس کی گود میں تھا۔ "میں اسپتال جا رہا ہوں!"

ہربرٹ جلد ہوش میں آ گیا۔ اب اُسے لامتناہی درد سہنا تھا۔ ایسا درد، جسے برداشت کرنے کا آٹھ سالہ بچہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اگلے کئی ماہ مسلسل عذاب میں گزرے۔ اس کی ٹانگ پر پلستر چڑھا تھا جس نے اُسے دوسروں کا محتاج بنا دیا۔ وہ سارا سارا دن بستر پر پڑا رہتا۔

چند ہفتوں بعد اس کی ٹانگ کا دوبارہ معائنہ کیا گیا جس کے نتائج نے جوزف اور سارہ کو گہرا صدمہ پہنچایا۔ دراصل ابتدائی علاج میں ڈاکٹر اس کی ہڈی بٹھانے میں ناکام رہے تھے۔ اب انہیں ایک اور کوشش کرنی تھی اور یہ کوشش عذاب ناک تھی۔

اُس اداس دوپہر ننھے ہربرٹ کی چیخیں آپریشن تھیٹر

کے باہر کھڑی اُس کی ماں کے لیے سوہانِ روح ثابت ہوئیں۔ اُس کی بگڑتی حالت دیکھ کر جوزف نے اُسے گھر بھجوادیا۔

خوش قسمتی سے اس بار ہڈی اپنی جگہ بیٹھ گئی لیکن آٹھ سالہ ہربرٹ کی تکالیف ختم نہیں ہوئیں۔ اُسے پورا ایک برس بستر پر گزارنا پڑا۔

وہ اکتاہٹ سے بھرپور دن تھے۔ بستر پر پڑے پڑے وہ بیزار ہوگیا۔

اس مسئلے کا حل اُس کے باپ نے نکالا۔ جب جوزف نے دیکھا کہ دوستوں سے محروم ہربرٹ ہر گزرتے دن کے ساتھ بوریت کا شکار ہوتا جارہا ہے تو وہ قریبی لائبریری گیا اور اس کے لیے چند کتابیں لے آیا۔

ہربرٹ کو کتابوں کی صورت نئے دوست مل گئے۔ چند ہی روز میں وہ کتابوں کے عشق میں گرفتار ہوگیا۔ اب اس کے سامنے نئی دنیا تھی، ایک دنیا جو تخیل کی قوت پر قائم تھی۔ وہ گھنٹوں مطالعے میں غرق رہتا۔ ہر کردار کو جیتا جاگتا محسوس کرتا اور وہ اپنی حدیں... بھول کبھی نئے تجربات سے گزرتا۔

وہ پورا برس ہربرٹ نے کتابیں پڑھتے گزارا۔ اس دوران ایسے لمحات بھی آتے، جب وہ مسلسل مطالعے سے اوب جاتا، تب وہ کتاب ایک جانب رکھتا اور آنکھیں بند کرکے اپنے تخیل کو آزاد چھوڑتا دیتا جو ایک نئی دنیا کی جانب دوڑ پڑتا جہاں ہربرٹ اپنی ننھی منی خواہشات کو نمو پاتے دیکھتا۔

☆☆☆

جس دن اس نے پلستر سے آزادی اور بستر سے نجات حاصل کی، وہ مسرت کے ناقابلِ بیان تجربے سے گزرا۔

اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے بعد اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور عہد کیا کہ اب وہ زندگی کا ہر لمحہ بھرپور انداز میں جیے گا۔ اس نے کتابوں سے رشتہ منقطع نہیں کیا۔ یہ کتابیں ہی تو تھیں جو تنہائی کی ساتھی بنیں۔

بے شک اس کے ماں باپ غریب تھے لیکن وہ تعلیم کی اہمیت سے واقف تھے۔ خصوصاً ہربرٹ کے معاملے میں وہ خاصے جذباتی واقع ہوئے تھے۔

"برٹی لکھنے پڑھنے کا شوق رکھتا ہے، میری خواہش ہے کہ ہم اُس کا داخلہ کسی اچھے اسکول میں کروائیں۔" ایک روز سارہ نے کہا۔

"تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔" جوزف مسکرایا۔

جس روز ہربرٹ نے تھامس مورلز کمرشل اکیڈمی میں قدم رکھا، اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس ادارے میں اسے نئے تجربات سے رُوبرو ہونے کا موقع ملے گا۔

یہ نجی اسکول تھامس مورلز نامی ایک شخص نے 1849 میں قائم کیا تھا۔ وہاں تجارتی مفادات کو پیشِ نظر رکھا جاتا، اساتذہ کو معمولی تنخواہ دی جاتی۔ تدریسی طریقہ بھی ٹھہراؤ کا شکار تھا، نصاب محدود تھا۔

اسکول کے ماحول سے ہم آہنگ ہونا ہربرٹ کے لیے آسان نہیں تھا لیکن اسے احساس تھا کہ وہ ایک غریب ماں باپ کا بیٹا ہے، اُسے جو ہے، جیسا ہے کی بنیاد پر قبول کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ نصاب اور تدریسی طریقے سے غیر مطمئن ہونے کے باوجود وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا تاہم 1880 میں اسے وہ ادارہ چھوڑنا پڑا جس کا سبب بگڑتے ہوئے معاشی حالات تھے۔

یوں تو مسائل بے حساب سایے برسوں سے دہلیز پر لہرا

رہے تھے لیکن اب حالات انتہائی گمبھیر ہوگئے تھے۔ دراصل 1877 میں اُس کے باپ کو ایک خوفناک حادثے سے گزرنا پڑا۔ اس کی ٹانگ میں فریکچر ہوگیا۔ یہ ایک بھاری صدمہ تھا۔ دکان سے تو معمولی آمدنی ہوتی تھی، گزربسر کرکٹ میچز کی مد میں ملنے والی فیس ہی سے ہوتی اور اب یہ ممکن نہیں رہا تھا، جوزف کرکٹ کے لیے "ان فٹ" قرار دیا جاچکا تھا۔

جلد ہی نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔ حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے مجبوراً جوزف کے تینوں بیٹوں نے قبل از وقت عملی زندگی میں قدم رکھ دیا۔

اسے حالات کا جبر ہی کہا جاسکتا ہے کہ تیرہ سالہ ہربرٹ اسکول سے نکلا اور سید ھا پردے تیار کرنے والے چھوٹے سے کارخانے میں ایک عارضی ملازم کی حیثیت سے داخل ہوگیا۔ گھر سے میلوں دور واقع اس کارخانے میں ہر دن تلخیوں سے بھرپور تھا۔ زندگی اپنی معنویت کھو چکی تھی کہ اب وہ ایک ملازم تھا جسے علی الصباح بیدار ہونا پڑتا۔ پہلے کارخانے کی صفائی کرتا، آگ جلاتا، تب کہیں جاکر اسے سخت روٹی کے چند ٹکڑے شکم میں اتارنے کی اجازت ملتی۔

صحت کے مسائل سے دوچار ہربرٹ لگ بھگ چودہ گھنٹے کام کرتا۔ رات ہوتی تو زمین پر چادر بچھا کر سو جاتا۔

اس سرد فرش پر سونا کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ ہربرٹ کو یہ دکھ بھی تھا کہ اب اُسے کتابیں پڑھنے کا موقع نہیں ملتا لیکن اس کا تخیل آزاد تھا، جب بھی حالات کی تلخی حد سے تجاوز کر جاتی، وہ تخیل کے زرخیز میدان میں اتر جاتا۔ کارخانے کے اذیت ناک ماحول کو قابلِ برداشت بنانے کا بھی ایک طریقہ تھا۔

اس ملازمت کے توسط سے ہربرٹ تنگ و تاریک، غلیظ کارخانوں کے ماحول سے آشنا ہوا، بعد کے برسوں میں اس نے ان ہی تجربات کو اپنے ناول "The Wheels of Chance" اور "Kipps" میں بڑی مہارت سے برتا۔

ہربرٹ نے تین برس کارخانے کے مالک کی جھڑکیاں سنتے گزارے۔ پھر ایک روز جب وہ صفائی کا کام نمٹا کر ناشتا کرنے بیٹھا تھا، کارخانے کا مالک کف اڑاتا ہوا اس کے سر پر آن کھڑا ہوا۔ اس سے قبل کہ ہربرٹ کچھ سمجھ پاتا، اس درشت انسان نے اس کے چہرے پر ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے اُسے برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔

"تم انتہائی نکمے ہو، یہاں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں، دفع ہوجاؤ۔" اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی جو اسے ہربرٹ کے تکیے کے نیچے سے ملی تھی اور اسی کتاب نے اسے آگ بگولا کردیا تھا۔

کارخانے سے نکلتے ہوئے ہربرٹ کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

☆☆☆

ایک جانب جہاں ہربرٹ پر بے روزگاری کی اُفتاد ٹوٹ پڑی تھی، وہیں اس کے ماں باپ کے رشتے میں بھی ایک خلیج آگئی تھی، جس کی بنیادی وجہ بڑھتے مسائل اور فاقوں کی ریل پیل تھی۔
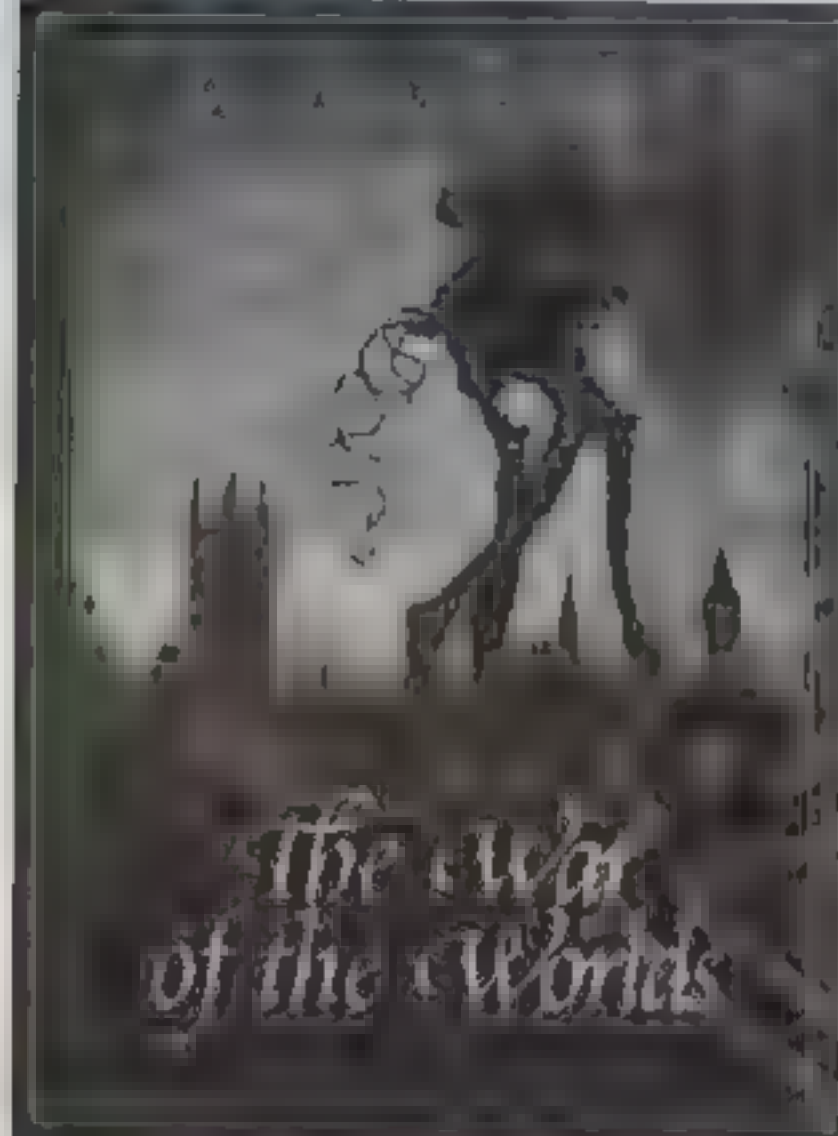
شادی سے قبل خوبرو سارہ ایک گھریلو ملازمہ تھی۔ بعد میں خاندانی ذمے داریوں کے باعث اس نے ملازمت ترک کردی، تاہم حالات کے جبر نے اسے ایک بار پھر عملی زندگی کی بھٹی میں جھونک دیا۔ اس نے سسکس کے ایک کاؤنٹ کے ہاں ملازمت کرلی، جو اُسے اپنے شوہر اور بچوں سے بہت دُور لے گئی۔

جس شخص کے ہاں وہ ملازمہ ہوئی تھی، اُس نے واضح کردیا تھا کہ اگر ملازمت درکار ہے تو اپنے خاندان کو بھول جاؤ۔

"میں تمہارے خاندان کی رہائش کا انتظام نہیں کرسکتا۔" اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "اور ویسے بھی ہم

کیتھولک ہیں، جب کہ تمہارا شوہر ایک آزاد خیال، مذہب سے بیزار شخص ہے۔ میں اس بدمعاش کو یہاں قدم رکھنے کی کبھی اجازت نہیں دوں گا۔“

”مجھے یہ شرط قبول ہے۔“ حالات کی ستائی سارہ بہ مشکل اپنے آنسو ضبط کر سکی۔

یہ ایک بڑا سانحہ تھا۔ ماں سے دوری ہربرٹ کے لیے عذاب ثابت ہوئی۔ گھر اُسے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا۔

وہ اکثر پیدل اپنی ماں سے ملنے سسکس چلا جاتا۔ وہیں پہلی بار اُسے اونچے طبقے کی طرزِ معاشرت سے رُوبرو ہونے کا اتفاق ہوا۔ ہربرٹ کے پاس نہ مناسب لباس تھا نہ اچھے جوتے، یہی سبب ہے کہ وہاں اُسے شدید شرمندگی اور احساسِ کمتری کا سامنا کرنا پڑتا۔

جس طرح سسکس جانا مشکل تھا، اسی طرح وہاں سے لوٹنا بھی ایک عذاب تھا کیونکہ ماں کو دیکھ کر دل میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا، لیکن ملاقات مختصر ہوتی، بالآخر اُسے نم آنکھوں کے ساتھ لوٹنا پڑتا۔

درزی کے پیشے میں ناکامی کے بعد اُس نے ایک کیمسٹ کے ہاں ملازمت کر لی لیکن یہاں بھی ناکامی اس کا مقدر بنی۔ فقط ایک ماہ بعد اسے دھکے دے کر نکال دیا گیا۔

اس سانحے کے چند روز بعد جب وہ اپنی ماں سے ملا تو اس کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ شفیق سارہ کو اپنے بیٹے کے کرب کا احساس تھا لیکن وہ مجبور تھی۔ ماسوائے اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے وہ کچھ نہیں کر سکی۔

”مشکل وقت گزر جاتا ہے ہربرٹ، لیکن باہمت لوگ باقی رہتے ہیں!“ اس نے اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”زندگی تلخ ہے، اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو جدوجہد ہی واحد راستہ ہے!“

ہربرٹ نے نظر اٹھا کر اپنی ماں کی جانب دیکھا جس کی نم آنکھوں میں محبت دمک رہی تھی۔

”میں نے تمہارے لیے ایک تحفہ لیا تھا۔“ سارہ میز کی جانب بڑھی، جہاں ایک کتاب رکھی تھی۔ ”یہ لو، اور یاد رکھو... تمہیں زندہ رہنا ہے!“ یہ کہتے ہوئے سارہ نے چند سکے ہربرٹ کی جیب میں ڈال دیے۔

آنسو پونچھتے ہوئے ہربرٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ عرصے بے کار رہنے کے بعد اُسے ایک اور کارخانے میں ملازمت مل گئی۔ کارخانے کا مالک کڑی محنت کا متقاضی تھا۔ اس پر مستزاد تنخواہ انتہائی کم تھی، لیکن اُسے اپنا پیٹ پالنا تھا۔

اس کارخانے میں قنوطیت کا راج تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہاں اسے ایک دن کی بھی خوشی نصیب نہیں ہوئی۔ اپنا غم غلط کرنے کے لیے اس نے کتابوں پر تکیہ کیا۔ اپنی مختصر سی تنخواہ سے چند سکے بچا کر وہ لائبریری سے کتابیں لے آتا، جب بھی وقت میسر ہوتا، کتابوں کے اوراق میں گم ہو جاتا جہاں خوابوں کی دنیا منتظر ہوتی۔ یوں تو وہ تمام ادیبوں کو شوق سے پڑھتا لیکن 1820 میں پیدا ہونے والے برطانوی فلسفی ہربرٹ اسپنسر کا وہ مداح تھا۔ افلاطون اور سر تھامس مور کی کتابیں بھی بڑی توجہ سے پڑھا کرتا جو اس میں ادیب بننے کی جوت جگا تیں لیکن یہ اتنا سہل نہیں تھا۔ حالات اتنے دُرشت تھے کہ سپنے موم کی طرح پگھل جاتے۔

اور پھر ایک روز... مظلوم ہربرٹ پر حالات کا آسیب غالب آ گیا۔ بیزاری کا دریا امڈ آیا، یاسیت اتنی گہری ہو گئی کہ کتابیں بے معنی لگنے لگیں۔

وہ گہرے صدمے میں تھا۔ اُس نے اپنے سابق اسکول ٹیچر جیری کروز کو رنج و الم سے بھرا ایک خط لکھا۔ خط پوسٹ کرتے ہوئے اسے قطعی امید نہیں تھی کہ اس کا کبھی جواب آئے گا لیکن ہربرٹ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب چند روز بعد ڈاکیا اس کا نام پکارتے ہوئے کارخانے آن پہنچا۔ خط وصول کرتے وقت وہ غیر یقینی کیفیت میں تھا۔

توقع کے برخلاف اس کے استاد نے قنوطیت بھرے خط کا جواب رجائیت سے دیا تھا۔ شاگرد کی صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے عزم و ہمت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنے کی نصیحت کی تھی اور یقین دلایا تھا کہ وہ اس کی مدد کرنے کی بھرپور کوشش کرے گا۔

”ہم کیوں گرتے ہیں ہربرٹ، تاکہ ہم کھڑے ہونے کا ہنر سیکھ سکیں۔ خود پر بھروسا رکھو میرے بچے، حالات ضرور بدلیں گے!“

اِن الفاظ نے اسے حوصلہ دیا۔ مایوسی سے دامن چھڑا کر ایک بار پھر وہ جدوجہد میں جت گیا۔ پھر گھنٹوں مزدوری کرنے لگا، چند سکے بچا کر لائبریری سے کتابیں لانے لگا، تاہم حالات مزید امتحان لینا چاہتے تھے۔

☆☆☆

موسم سرما کا آغاز ہوتے ہی بیماریوں میں گھرے ہربرٹ کی ہمت ٹوٹنے لگی۔

اُس برس اتنی سردی پڑی کہ ماضی کے تمام ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ گرم کپڑوں سے محروم ہربرٹ دانت کے اوقات میں تو کسی نہ کسی طرح خود کو گرم رکھنے کا سامان کر لیتا لیکن... ناکافی غذا شکم میں اتارنے کے بعد جب وہ تھکا ہارا بستر پر گرتا تو رات کے سناٹے میں سکون روٹھ جاتا، نیند کی دیوی منہ پھیر لیتی اور وہ رات بھر، کمبل سے محروم سردی سے کپکپاتا رہتا۔ کبھی کبھار تو یوں لگتا جیسے اس کی روح پرواز کرنے کو ہے۔

تنہائی نے اسے دُکھ کے کہرے میں دھکیل دیا۔ اُسے اس تاریک کارخانے میں ملازمت کرتے دو برس ہو گئے تھے اور اب وہ اس قدر اکتا گیا تھا کہ اس زندگی سے نجات کے لیے خودکشی کرنے کو بھی تیار تھا۔

اور پھر... ایک صبح جب اُس کی آنکھ کھلی، وہ یہ جان کر لرز گیا کہ کارخانے میں کھانے کے لیے ایک دانہ بھی نہیں۔

”دودھ پھٹ چکا ہے۔“ ایک ساتھی نے اپنی نحیف سی آواز میں اُسے اطلاع دی۔ ”مالک کا کہنا ہے کہ ناشتے کا انتظام دوپہر سے پہلے ممکن نہیں!“

ہربرٹ نے نظر اٹھا کر اپنے ساتھی کو دیکھا جسے غذا کی قلت نے ہڈیوں کا ڈھانچا بنا دیا تھا، اس کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔

مایوسی اتنی قوی تھی کہ ہربرٹ اٹھا اور کچھ کھائے پیے بغیر کارخانے سے نکل گیا۔ اُس روز کپکپاتے ہوئے اس نے پندرہ میل کا طویل سفر پیدل، خالی پیٹ طے کیا۔

جب سارہ نے ہربرٹ کو اس حالت میں دیکھا، اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ تیزی سے اٹھی اور اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ہربرٹ بھی زار و قطار رونے لگا۔

”بس... اب میں یہ زندگی نہیں گزار سکتا۔“ اُس نے ہچکیوں کے دوران کہا۔ ”اس سے تو بہتر ہے کہ میں جان دے دوں!“

”ایسا سوچنا بھی نہیں!“ سارہ کی آواز رُندھ گئی۔ ”کیا تم اپنی ماں کو بھول گئے جس کے لیے تم ہی جینے کی امید ہو۔ حوصلہ رکھو!“

اگلے چند روز خستہ حال ہربرٹ نے سسکس میں گزارے۔ سارہ نے کسی نہ کسی طرح کاؤنٹ سے اسے وہاں رکھنے کی اجازت لے لی۔

گو کہ 1879 کا آغاز انتہائی کٹھن تھا لیکن اکتوبر میں ہربرٹ کو ایک خوش خبری ملی۔

سارہ کا ایک دُور پرے کا رشتے دار آرتھر ولیز شعبۂ تدریس سے وابستہ ایک شفیق اور دردمند انسان تھا۔ اس نے سارہ کی بپتا سننے کے بعد وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر صورت اُس کی مدد کرے گا اور اُس نے اپنا وعدہ نبھایا۔

''تمہارے لیے ملازمت کا انتظام ہوگیا ہے۔'' ایک شام سارہ نے ہربرٹ کو مطلع کیا، جو ایک کتاب میں گم تھا۔

''واقعی!'' وہ خوشی سے اچھل پڑا لیکن فوراً ہی ماضی کی تلخ یادوں نے اس نے پر یلغار کردی۔ ''کس قسم کی ملازمت ہے؟'' لہجہ جتا رہا تھا۔

''اچھی ملازمت ہے۔ ویلز سے دو میل دور ایک گاؤں ہے، ووکی۔ وہاں کے ایک اسکول میں تمہیں کم سن طلبا کا نگران مقرر کیا گیا ہے۔'' سارہ نے ایک رقعہ اس کے سامنے لہرایا۔ ''تمہیں خود کو اچھا نگران اور قابل استاد ثابت کرنا ہوگا بیٹے۔'' ماں کی آنکھیں دمک رہی تھیں۔

''ایسا ہی ہوگا!'' نوجوان کے لہجے میں عزم تھا۔

بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوسکا۔ وہ اُس موقع سے فائدہ اٹھانے میں یکسر ناکام رہا۔ فقط ایک ماہ بعد ہی وہ غیر ذمے داری اور غفلت برتنے کے الزامات کی زد میں آگیا۔ تعلیمی اسناد سے محرومی نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ اُسے برخاست کردیا گیا۔

آنے والے دنوں میں اُس نے چند چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں۔ کبھی کسی کیمسٹ کا اسسٹنٹ بن گیا، کبھی اخبار بیچنے لگا، کبھی چوکیدار ہوگیا، تاہم وہ خوش تھا کیونکہ ماضی کے برعکس اُسے مطالعے کی آزادی حاصل تھی۔ اس عرصے میں وہ مڈہرسٹ گرامر اسکول سے بھی وابستہ رہا۔ یہ وابستگی سودمند ثابت ہوئی۔ 1883 میں ہربرٹ کو اس درس گاہ کی جانب سے ملازمت کی پیش کش کردی گئی۔ گو کہ تنخواہ زیادہ نہیں تھی لیکن سہولت یہ تھی کہ وہ ملازمت کے دوران اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا تھا۔ وہ بہ خوشی اس ادارے کا حصہ بن گیا۔

حالات بدلنے والے تھے!

☆☆☆

اُس کے ہاتھ میں ایک خط تھا اور وہ خوشی سے لرز رہا تھا۔ یہ خط لندن کے مشہور زمانہ ''نارمل اسکول آف سائنس'' کی جانب سے روانہ کیا گیا تھا جس کی انتظامیہ اسے اسکالرشپ دینے کے لیے تیار تھی۔

''کیا بدقسمتی کا سیاہ دور ختم ہوگیا؟'' ہربرٹ نے خود سے سوال کیا۔

اس نے وقت ضائع نہیں کیا، والدین سے اجازت لے کر فوراً ہی مرکزی لندن کی جانب روانہ ہوگیا جہاں نئے تجربات منتظر تھے۔

نارمل اسکول آف سائنس کا شمار ملک کی بڑی درس گاہوں میں ہوتا تھا۔ سائنس کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے کئی افراد وہاں سے تعلیم حاصل کرچکے تھے۔

اسکول کا علم دوست اور صحت مند ماحول ہربرٹ کی ذہنی نشوونما کے لیے سودمند ثابت ہوا۔ وہیں اُسے تھامس ہنری جیسے جید استاد کی سرپرستی میسر آئی جس نے اس کی ذہنی آب یاری کی۔

ہربرٹ اپنی قسمت پر رشک کیا کرتا تھا۔ ''میں واقعی خوش قسمت ہوں۔'' وہ اکثر خود سے کہتا۔

اور یہ سچ ہی تھا۔ ماضی میں لاحاصل ملازمتیں کرنے والے ہربرٹ کو اسکول سے ہر ہفتے ایکس شلنگ بہ طور وظیفہ ملا کرتے اور یہ رقم نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے کئی خاندانوں کی ہفتہ وار آمدن سے زیادہ تھی۔

ہربرٹ اس رقم کو بہت احتیاط سے خرچ کرتا۔ وہ اسراف کے خلاف تھا جس کا سبب اس کا تلخ ماضی تھا، سو وہ بُرے دنوں کے لیے کچھ پیسے بچا لیتا۔

☆☆☆

کیا اس اسکول نے ہربرٹ کو بدل دیا؟

اس سوال کا جواب یقینی طور پر اثبات میں ہے۔ وہ نہ صرف ایک قابل طالب علم، بلکہ ایک شعلہ بیاں مقرر بھی تھا۔ اسکول میں ہونے والے تقریری مقابلوں میں وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا۔ دراصل غربت سے اٹھ کر آنے والا ہربرٹ معاشرے میں بہتری کا خواہاں تھا۔ ابتدا میں اُسے افلاطون کے ''جمہوریہ'' میں پیش کردہ نظریات نے متاثر کیا، اُس نے مختلف تقریروں میں ان کا حوالہ بھی دیا، لیکن جلد ہی وہ سوشل ازم کی جانب مائل ہوگیا۔ تقاریر میں بھی سرخ آہنگ در آیا۔ سوشلسٹ نظریات رکھنے والوں میں مقبول ہونے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔

لکھنے کا شوق بھی حقیقی معنی میں یہیں پروان چڑھا۔ اسکول کے زمانے میں ہربرٹ نے ''سائنس اسکول جرنل'' کی بنیاد رکھی جس میں وہ ادب اور معاشرے کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کرتا۔ اُس کی تحریروں میں فکشن کا رنگ بھی نظر آتا۔

اُسی جرنل میں اُس کی ایک کہانی The Chronic Argonauts کے عنوان سے شائع ہوئی جس نے مستقبل میں ایک بیسٹ سیلر ناول کو جنم دیا۔

ہربرٹ کو زندگی میں ان گنت مسائل درپیش رہے۔ غربت، گرتی صحت، والدین سے دوری... الغرض وہ ہمیشہ مشکلات میں گھرا رہا لیکن خوش قسمتی سے اس دوران وہ کتابوں سے دور نہیں ہوا، مطالعے کو اس نے حرزِ جاں بنائے رکھا۔

اسی مشق نے لکھنے کی جوت جگائی۔ بالآخر ایک روز اُس نے قلم تھام لیا۔ یوں ایک ایسے سفر کا آغاز ہوا جس کے نتیجے میں قارئین کو بہترین سائنسی ادب میسر آیا، لیکن یہ سب اتنا سہل نہیں تھا۔ اُسے دشوار گزار گھاٹیاں عبور کرنا پڑیں۔

ماجرا کچھ یوں ہے کہ جونہی اُس نے لکھنے کا آغاز کیا، چاروں طرف سے تنقید شروع ہوگئی۔ ساتھی طلبا اس مشق کو لاحاصل تصور کرتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے۔ ''کوا چلے ہنس کی چال اپنی بھی بھول جائے۔ تم لکھاری نہیں ہو، وقت ضائع مت کرو!''

تاہم وہ وقت ضائع کرنے کے لیے تیار تھا۔ اُس نے تنقیدی حملوں سے خود کو محفوظ رکھا، اپنے گرد خاموشی کی دیوار کھڑی کرلی اور لکھتا رہا۔ جب اس مشق نے اُسے سماجی سرگرمیوں سے دور کردیا تو دوست ناصح بن گئے۔ ''بھائی، برطانیہ لکھاریوں سے بھرا پڑا ہے، تمہارے لیے جگہ بنانا مشکل ہوگا!'' ایک ہم جماعت نے اُسے سمجھایا۔ جواباً ہربرٹ خاموش رہا، بس مسکراہٹ ہونٹوں پر کھیلتی رہی۔ اُس نے ناپسندیدہ باتوں پر مسکرانے کا ہنر سیکھ لیا تھا۔

جلد ہی اُسے احساس ہوگیا کہ ہوسٹل کا ماحول لکھنے کے لیے سازگار نہیں، سو اس نے لائبریریوں کا رخ کیا۔

ہربرٹ نے اپنے پسندیدہ ادیبوں کے نظریات کو جدید انداز میں پیش کرنے کی سعی کی۔ ان کا اسلوب اپنایا۔ جب پہلی کتاب مکمل ہوئی، وہ مسرت سے لرز رہا تھا لیکن جلد ہی اُسے اکتاہٹ نے آلیا۔ دراصل منصوبے کی تکمیل کے بعد وہ ایک صحت مند مصروفیت سے محروم ہوگیا تھا اور تفکرات منہ کھولے کھڑے تھے۔

''اگر خود کو غموں سے محفوظ رکھنا ہے، تو خود کو مصروف رکھنا ہوگا!'' اس نے خود سے کہا اور اگلے ہی روز ایک اور منصوبے پر کام شروع کردیا۔ ایک بار پھر وہ اپنے پیش رو ادیبوں کے خیالات کو نئے ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوشش میں جتا تھا۔

اپنی ابتدائی تخلیقات کی بابت وہ خاصا پُرامید تھا لیکن اُس وقت ہربرٹ کی امیدیں خاک میں مل گئیں، جب لندن کے ناشروں نے اُسے ٹکا سا جواب دے دیا۔ کوئی اُس کا ناول چھاپنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''نوجوان، یہ سب تو پرانی باتیں ہیں!'' ایک ناشر نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''بھائی، تم فقط فرسودہ کہانیاں دہرا رہے ہو۔ میں تمہارا ناول شائع نہیں کرسکتا۔'' دوسرے نے مسودہ واپس کرتے ہوئے کہا۔

وہ مشکل دن تھے۔ وہ مسودہ اٹھائے اشاعت گھروں کے چکر لگاتا رہا۔ ناشر اُسے مسودہ چھوڑ جانے کا کہتے اور جب وہ ہفتوں بعد رابطہ کرتا تو اُن کا جواب نفی میں ہوتا۔

بڑے ناشروں سے مایوس ہو کر اُس نے چھوٹے پیمانے پر کتابیں چھاپنے والے اداروں سے رابطہ کیا لیکن انہیں بھی ہربرٹ کی تحریروں میں جان نظر نہیں آئی۔ البتہ ایک ناشر نے اُسے سودمند مشورے سے ضرور نوازا۔

''کیا تم سچ سننے کو تیار ہو ہربرٹ؟'' پختہ عمر ناشر نے اُس سے سوال کیا۔

''جی جناب میں بالکل تیار ہوں۔'' ہربرٹ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''تم سائنس کے طالب علم رہے ہو؟'' ناشر نے سگریٹ جلائی اور اُسے چائے کا مگ اٹھانے کا اشارہ کیا۔

''بالکل جناب!'' ہربرٹ نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

''سائنس کے استاد بھی ہو؟'' ناشر نے گہرا کش لیا۔

''اِس بار بھی آپ درست ہیں۔''

''تو نوجوان، سائنسی نظریات و خیالات کو اپنے اسلوب میں، اپنے تخیل کی مدد سے برتو۔ قارئین کو مستقبل کے بارے میں بتاؤ، جو انہیں تجسس سے بھر دے۔'' بوڑھے نے ایک اور کش لیا۔

''میں سن رہا ہوں جناب۔'' ہربرٹ نے کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''جو تم سے پہلے گزرے، جن کے تم مداح ہو، انہیں بھول جاؤ، یکسر۔ لکھتے وقت انہیں، ان کے خیالات نظریات سب کو نظرانداز کردو۔ پڑھنے والوں کو ایک اور ڈکنز، ایک اور ٹالسٹائی نہیں چاہیے۔ وہ تو تمہیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ مجھے بتاؤ، کیا تم انہیں ایک نئی، ناممکن کہانی سنا سکتے ہو؟''

چند لمحات اُس چھوٹے سے دفتر میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر ہربرٹ کی آواز گونجی۔ ''میں انہیں ایک انوکھی دنیا کی کہانی سنا سکتا ہوں جناب!''

''تب تو مستقبل تمہارا ہے۔'' بوڑھے ناشر نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ ''جو تم اب تک لکھ چکے ہو، اسے ردی کی ٹوکری کی نذر کردو۔ ایک نئی کہانی لکھو، مستقبل کے بارے میں، سمجھ گئے۔ ہاں، یاد آیا۔ میں نے تمہاری کہانی "The Chronic Argonauts" پڑھی ہے، جس میں تم

نے وقت میں سفر کا خیال پیش کیا تھا، اُسے ناول کے لیے کیوں نہیں برتتے؟"

"سمجھ گیا جناب، بہت بہت شکریہ!" ہربرٹ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے مسودہ اٹھایا اور ناشر کے دفتر سے باہر آگیا۔ وہ ایک مشکل فیصلہ کرچکا تھا، اب تک پرانی تخلیقات کو ضائع کرنے کا فیصلہ، تاکہ ایک نئے سفر کا آغاز کیا جاسکے۔

☆☆☆

وہ ایک نئے آغاز کا آرزومند تھا، لیکن زندگی کے ارادے تو یکسر مختلف تھے۔

1887 کے موسم سرما میں یہ خبر اس پر بجلی بن کر گری کہ وہ اسکالرشپ سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ غریب ہربرٹ کی زندگی پر سرکاری وظیفے سے محرومی نے انتہائی منفی اثرات مرتب کیے، اُسے اسکول چھوڑنا پڑا۔

گوکہ وہ قابل طالب علم تھا، حیاتیات اور طبیعیات کے مضامین پر خوب گرفت تھی، لیکن ارضیات کا مضمون اسے پسند نہیں تھا۔ اس میں اس کی دلچسپی اتنی گھٹ گئی کہ آخری برس وہ ارضیات میں فیل ہوگیا۔ وظیفہ بھی ہاتھ سے گیا۔ اب نہ سر پر چھت تھی، نہ جیب میں پیسے۔ چند دنوں میں ہوسٹل چھوڑنے کا نوٹس بھی مل گیا۔

"میری غفلت نے مجھ پر کاری وار کیا۔" پُرنم آنکھوں کے ساتھ ہوسٹل چھوڑتے ہوئے یہ الفاظ ہربرٹ کی زبان سے ادا ہوئے۔ زندگی اُسے تاریک نظر آرہی تھی۔

"اب میں کہاں جاؤں گا؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ وہ لندن نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور ویسے بھی اس عمر میں آنسو بہاتے ہوئے والدین کے پاس جانا کسی طور مناسب نہیں تھا۔

وہ رات اس نے ایک سستے سرائے میں گزاری۔ چھت میسر آئی تو ٹھنڈے ذہن کے ساتھ مستقبل کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُسے یقین تھا کہ کسی نہ کسی درس گاہ میں اُسے سائنس ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت مل جائے گی لیکن اس میں تھوڑا وقت لگ سکتا تھا اور اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ زیادہ عرصے سرائے کا کرایہ ادا کرسکے۔

مشکل کی اس گھڑی میں ہربرٹ کی خالہ میری نیل نے اس کے سر پر دست شفقت رکھا اور اسے اپنے ہاں رہنے کی جگہ دی۔ جب ٹھکانا مل گیا تو وہ ملازمت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

اس عرصے میں وہ ادبی اور سماجی تقریبات میں پابندی سے شرکت کرتا رہا۔ ترقی پسند نظریات میں بھی پختگی آتی گئی۔

جلد ہی اُسے شہری حکومت کے ایک ادارے میں ملازمت مل گئی۔ کچھ عرصے ایک اسکول میں بھی پڑھایا لیکن وہ مطمئن نہیں تھا۔ آگے بڑھنے، کچھ کر گزرنے کی خواہش اُسے بے چین رکھتی۔ وہ نظام تعلیم، طریقۂ تدریس میں بہتری کا خواہاں تھا۔ یہی سوچ اُسے دی کالج آف ٹیچرز لے گئی جہاں سے اس نے ڈپلوما کیا۔ وہ رکا نہیں آگے بڑھتا رہا۔ 1890 میں اس نے یونیورسٹی آف لندن کے ایکسٹرنل پروگرام سے حیاتیات کے مضمون میں بیچلرز کی ڈگری حاصل کرلی اور اسی برس اُسے ہنری ہاؤس اسکول میں ملازمت مل گئی۔

اب اس کے پاس اچھی ڈگری تھی، ملازمت تھی، مشکل دور تمام ہوچکا تھا۔ اب وہ دیگر نوجوانوں کے مانند عشق لڑانے کے لیے تیار تھا۔

اسے خوش قسمتی کہا جائے یا بدقسمتی کہ پہلے ہی عشق کا اختتام شادی پر ہوا۔ جس پری وش کی زلف کا وہ اسیر ہوا، اس کا نام اسبیل تھا، اسبیل میری۔ اس کی خالہ زاد!

1891 میں اس کی اسبیل سے شادی ہوگئی۔ گوکہ اس کی خالہ میری ابتدا میں اس رشتے کے سخت خلاف تھی لیکن اپنی بیٹی کی ضد کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔

شادی کے ابتدائی چند ماہ انتہائی خوش گوار گزرے لیکن جلد مسائل کی دھوپ اس رشتے کے آنگن میں اتر آئی۔ اسبیل ایک گھریلو لڑکی تھی، جب کہ ہربرٹ کے سر میں آوارگی کا سودا سمایا تھا۔ دن کے ابتدائی حصے میں تدریسی سرگرمی اُسے گھر سے باہر رکھتی، بعد میں سماجی و ادبی معاملات اُسے الجھائے رکھتے۔ اسی باعث وہ اکثر گھر سے غائب رہتا۔

اس غفلت کے باعث میاں بیوی کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا۔ 1894 میں یہ خلیج اتنی بڑھ گئی کہ ہربرٹ دیگر عورتوں میں دلچسپی لینے لگا جن میں اس کی ایک طالبہ کیتھرین روبرز بھی شامل تھی۔

کیتھرین ایک خوبرو لیکن بدقسمت لڑکی تھی۔ وہ صحت کے شدید مسائل سے دوچار تھی۔ کچھ یہی حال ہربرٹ کا بھی تھا جو ایک مرض سے نکلتا تو دوسرے کے شکنجے میں آجاتا۔

کیتھرین سے ملنے کے بعد یکدم اس کے اندر کا آرٹسٹ جاگ اٹھا۔ اسکول کے زمانے میں ڈرائنگ ہربرٹ کا پسندیدہ مضمون تھا، گوکہ بعد کے برسوں میں وہ کبھی اس جانب توجہ نہیں دے سکا لیکن کیتھرین کی زلف کا اسیر ہونے کے بعد وہ پھر اسکیچ بنانے لگا۔

ڈائری لکھنے کا عادی تو وہ برسوں سے تھا لیکن ڈھیرے ڈھیرے پنسل سے بنائے جانے والے باتصویر اسکیچ الفاظ کی جگہ لینے لگے۔ اکثر وہ سماجی موضوعات کو لکیروں کی صورت بیان کرتا۔ کبھی کبھار ایسے اسکیچ بھی بن جاتے جو اس کی ازدواجی زندگی، بیوی سے دوری اور ایک دوشیزہ میں بڑھتی دلچسپی کو ظاہر کرتے۔ یہ شوق چند عرصے قائم رہا لیکن پھر لکھنے پڑھنے کے عمل نے اندر کے آرٹسٹ کو خاموش کردیا۔

البتہ کیتھرین اور ہربرٹ میں گفتگو جاری رہی۔ جلد ہی ان کے دلوں میں انسیت در آئی جسے محبت میں تبدیل ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ 1894 میں ان کا عشق انتہا پر پہنچ گیا۔ ہربرٹ نے اپنی بیوی اسبیل کو طلاق دے دی۔

چند ماہ بعد وہ اور کیتھرین شادی کے بندھن میں بندھ گئے، اس یقین کے ساتھ کہ ایک خوش گوار ازدواجی مستقبل اُن کا منتظر ہے... لیکن وہ غلط تھے۔

☆☆☆

عشق لڑانے کے ساتھ ساتھ ہربرٹ نے لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ معاشی ضروریات کے پیش نظر اس نے غیرنصابی کتابیں تصنیف کیں۔ کیتھرین سے شادی سے قبل اس کی دو کتابیں شائع ہوچکی تھیں جن کا اُسے معقول معاوضہ ملا، تاہم اس کی دلچسپیوں کا محور فکشن کا میدان تھا۔ اس کے ذہن میں بوڑھے ناشر کی نصیحت تھی۔ سائنسی نظریات، جدید تحقیقات سامنے تھیں، دیگر ادیبوں کے اثر سے وہ نکل چکا تھا اور تخیل سرپٹ دوڑنے کو تیار تھا۔

تخیل کی سحرانگیز قوت نے اُسے مستقبل کو سمجھنے کے خبط میں مبتلا ایک برطانوی سائنس داں کے قالب میں ڈھال دیا جو "وقت" کا سفر کرنے کی آرزو میں سلگ رہا تھا۔ اس خواہش کے نتیجے میں ایک مشین نے جنم لیا جو وقت کی چادر میں چھید کرنے کی قوت رکھتی تھی اور اپنے سوار کو ایک زمانے سے دوسرے زمانے میں چھلانگ لگانے کی قوت عطا کرتی تھی۔

وہ سائنس کا استاد تھا پھر تخلیقی و تخیلاتی قوت اپنے عروج پر تھی، سو زمانوں میں بکھری الوکھی کہانی آگے بڑھتی رہی۔ چونکہ وہ معاشرے میں اصلاح کا آرزومند ایک سوشلسٹ تھا، اس لیے ناول فقط سائنسی مزاج اور تفریحی ذائقے تک محدود نہیں رہا، کہانی میں استحصالی نظام، طبقاتی تفریق کی بھی بھرپور نشان دہی کی گئی۔

یہ ناول ختم کرتے ہی عادتاً اس نے دوسرے منصوبے پر کام شروع کردیا۔ اس دوران پہلے ناول کی نوک پلک سنوارتا رہا۔ اس عمل میں کم و بیش ڈھائی ماہ لگ گئے۔

جب وہ ناول کا مسودہ لے کر شہر کے ایک بڑے ناشر کے دفتر میں داخل ہورہا تھا، دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

ناشر نے حسب عادت بے دلی سے مسودہ چھوڑ جانے کا مشورہ دیا۔ دفتر سے نکلتے وقت وہ طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا تھا۔ خدشات نے اس وقت تک ہربرٹ کا ساتھ نہیں چھوڑا، جب تک ناشر کا خصوصی اہل کار اس کے دروازے پر نہیں پہنچ گیا۔

"مسٹر جونز آپ سے فوری ملنا چاہتے ہیں؟" اہل کار کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"خیریت؟" ہربرٹ کے لہجے سے گھبراہٹ عیاں تھی۔

"نہیں جناب، خیریت کہاں... وہ تو سخت اضطراب میں ہیں، جس کا سبب آپ کا مسودہ ہے۔" اہل کار کے چہرے پر شرارت تھی۔ چند لمحے وہ ہربرٹ کے تذبذب سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر قہقہہ لگایا۔ "مسٹر ویلز، آپ کی محنت رنگ لے آئی۔ مسٹر جونز گزشتہ دو رات سے سو نہیں سکے۔ آپ کے ناول نے انہیں اپنے شکنجے میں لے رکھا ہے۔"

یہ سن کر ہربرٹ کی جان میں جان آئی۔ وہ فوراً اہل کار کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگیا۔

ناشر بڑی گرمجوشی سے ملا۔ "شان دار نوجوان... مجھے فخر ہے کہ میں تمہارا پہلا ناول شائع کروں گا۔"

ہربرٹ کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی۔

1895 کے اوائل میں "دی ٹائم مشین" نامی وہ شہرۂ آفاق ناول شائع ہوا، جو راتوں رات ہربرٹ کو شہرت کی بلندیوں پر لے گیا۔ آج ناقدین ادب متفق ہیں کہ اسی ناول نے جدید سائنسی ادب کی بنیاد رکھی۔ "ٹائم مشین" کی اصطلاح اتنی مقبول ہوئی کہ زبان زد خاص و عام ہوگئی۔ آنے والے برسوں میں اس ناول پر دو فلمیں بنیں، ریڈیو نے اس پر پروگرام پیش کیے، اس پر مبنی ٹی وی سیریل نے کامیابی کے ریکارڈ توڑ دیے۔

سچ تو یہ ہے کہ "دی ٹائم مشین" ہربرٹ کے عروج کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔

☆☆☆

ناول کا اُسے اچھا معاوضہ ملا۔ ناشر اگلے ناول کے لیے بھی ایڈوانس رقم دے چکا تھا، سو اس کے پاس معقول رقم تھی اور یہ پہلا موقع تھا جب وہ زندگی اپنی مرضی سے گزار سکتا تھا۔

پہلی خواہش ایک کشادہ، روشن گھر تعمیر کرنے کی تھی۔ اور یہ آرزو قابل فہم تھی۔ ہربرٹ نے اپنا بچپن تاریک،

چھوٹے سے مکان میں بسر کیا تھا، بعد میں وہ گندے کارخانوں کے ٹھنڈے فرش پر طویل راتیں گزارنے کے کرب سے گزرا، ایسے میں ایک گھر تعمیر کرنے کی خواہش بڑی حد تک فطری تھی۔

چونکہ صحت نہیں سنبھلی تھی، اس لیے معالجین کے مشورے پر اُس نے کینٹ کاؤنٹی کے سرسبز علاقے فوک اسٹون کا رخ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ناول سے حاصل ہونے والی آمدنی اور تھوڑا قرضہ لے کر اس نے وہاں درختوں میں گھرا ایک حسین گھر تعمیر کیا۔ اگلے چند برس وہ وہیں رہا۔

ناشر ہربرٹ کے دوسرے ناول کی اشاعت کے حوالے سے خاصا پُرجوش تھا۔ ناول تو وہ "دی ٹائم مشین" کی اشاعت سے قبل ہی مکمل کر چکا تھا لیکن اُسے منظرِ عام پر لانے کے سلسلے میں وہ تھوڑا متذبذب تھا۔

"کیا یہ جلد بازی نہیں ہوگی؟" اس نے ناشر سے سوال کیا۔ "ابھی پہلے ناول کی اشاعت کو چند ہی ماہ گزرے ہیں۔"

"نوجوان، میں مارکیٹ کو تم سے بہتر سمجھتا ہوں۔" مسٹر جونز کے چہرے پر کاروباری مسکراہٹ تھی۔ "تم تخلیقی شعبہ سنبھالو، میں تجارتی معاملات سنبھالتا ہوں۔"

"مجھے ایک ہفتہ دیں!" یہ ہربرٹ کے الفاظ تھے۔

گھر لوٹنے کے بعد وہ اُس ناول کا مسودہ لے کر بیٹھ گیا، جو فینٹسی کا ایک بھرپور تجربہ تھا، ایسی فینٹسی جو جدید لندن میں جنم لیتی ہے۔

دراصل یہ ایک فرشتے کی کہانی تھی جو ایک ہفتہ جنوبی لندن میں گزارتا ہے اور اس دوران عجیب و غریب تجربات سے گزرتا ہے۔

چند روز بعد "دی ونڈرفل وزٹ" کا مسودہ ناشر کی میز پر تھا۔

مسٹر جونز نے اس کی اشاعت کے معاملے میں اتنی تیزی دکھائی کہ ہربرٹ حیران رہ گیا۔ دراصل چالاک ناشر کو بہ خوبی اندازہ تھا کہ اس وقت قارئین "دی ٹائم مشین" کے سحر میں گرفتار ہیں، ایسے میں جس کتاب کے ٹائٹل پر بہ طور مصنف ایچ جی ویلز کا نام درج ہوگا، وہ ہاتھوں ہاتھ بکے گی۔ اور یہی ہوا۔ 245 صفحات کے اس ناول نے قارئین کو دیوانہ بنا دیا۔

یہ ناقدین میں بھی زیرِ بحث آیا۔ کسی نے اُسے حیران کن قرار دیا، کسی نے بارہ مسالوں کا مجموعہ۔ کسی نے اسے فینٹسی کا عروج گردانا، کسی نے مزاح کے ساتھ معاشرے کے مُتعفن کی نشان دہی کرنے کی کامیاب کوشش۔

جہاں ستائش ہوئی، وہاں تنقید بھی ہوئی، لیکن محرومیوں اور ناکامیوں کے تلخ ذائقے سے آشنا ہربرٹ کے لیے تنقید پریشان کن ثابت نہیں ہوئی۔

وہ تو اُس وقت ساتویں آسمان پر پرواز کر رہا تھا۔

☆☆☆

"اگلے ناول کا مسودہ کب پہنچا رہے ہو نوجوان؟"

ناشر کے منہ سے ادا ہونے والے یہ الفاظ سن کر ہربرٹ بھونچکا رہ گیا۔ چائے کا کپ ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ اُس نے حیران ہو کر ناشر کی جانب دیکھا، جو کھڑکی میں کھڑا سگار پی رہا تھا۔

"جناب اتنی جلدی کیا ہے ابھی تو...!" چہرے پر استعجاب تھا۔

"ذرا اِدھر آؤ ہربرٹ!" مسٹر جونز نے اُسے کھڑکی کے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ وہ کرسی سے اٹھا اور ناشر کے پہلو میں جا کھڑا ہوا۔

کھڑکی کے باہر دسمبر کی دھوپ پھیلی تھی۔ سڑکوں پر خاصی گہما گہمی تھی۔ اُس سال موسمِ سرما پوری قوت سے شہر پر حملہ آور ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ شہری سورج غروب ہونے سے قبل ہی اپنی تمام مصروفیات نمٹا لیتے۔

ناشر نے گہرا سانس لیا۔ "کبھی تم نے سوچا، موسمِ سرما کی دوپہر اتنی مصروف کیوں ہوتی ہے؟"

ہربرٹ خاموش رہا۔ ناشر نے گفتگو کا سرا آگے بڑھایا "اِس کا سبب یہ ہے موسمِ سرما میں ہر شخص کی کوشش ہوتی ہے کہ جتنی بھی دھوپ میسر ہو، اُس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا لیا جائے، کیونکہ سورج غروب ہوتے ہی ٹھنڈ بڑھ جائے گی اور اُس گھڑی گھر کی دہلیز عبور کرنا زیادہ خوش گوار ثابت نہیں ہوگا۔"

تجربہ کار ناشر مڑا اور متذبذب ہربرٹ کے کاندھے پر اپنا بھاری ہاتھ رکھتے ہوئے گویا ہوا۔ "شہرت موسمِ سرما کی دھوپ کے مانند ہے، اس سے جتنا فائدہ اٹھا سکتے ہو اٹھا لو۔ اور پھر تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ اچھا معاوضہ مل رہا ہے۔ ہر ادبی تقریب میں تمہارا کام موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔ اگر کہو تو میں تمہارا معاوضہ بڑھانے کے لیے تیار ہوں۔" اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"بات یہ نہیں ہے۔" ہربرٹ نے گہرا سانس سینے میں اتارا۔ "دراصل ابھی میرے پاس کوئی ناول نہیں ہے، میں ایک اور منصوبے پر کام کر رہا ہوں، لیکن وہ..."

"کیا تمہارے پاس کچھ کہانیاں ہیں؟" ناشر کی آنکھیں اُس پر ٹکی تھیں۔

"اوہ... کہانیاں... ہاں، گزشتہ چند برسوں کے دوران میں نے چند کہانیاں لکھی تھیں، مگر میں نہیں سمجھتا کہ یہ وقت ان کی اشاعت کے مناسب ہے۔"

"یہ تمہارا دردِ سر نہیں۔" ناشر مسکرایا۔ "مسودے مجھے پہنچا دو۔"

1895 کے آخر میں ایچ جی ویلز کی کہانیوں کا مجموعہ "The Stolen Bacillus and Other Incidents" لندن کے کتاب گھروں کی زینت بن چکا تھا۔

ناشر سچ ہی کہتا تھا، قارئین اُس کے سحر میں مبتلا تھے۔ کتاب بڑی تعداد میں فروخت ہوئی، تاہم ہربرٹ مطمئن نہیں تھا۔

"کیا ہی بہتر ہوتا کہ ہم تھوڑا انتظار کر لیتے۔" ایک روز اس نے اپنی بیوی کیتھرین سے کہا۔ لہجے سے مایوسی عیاں تھی۔

"تم ایسا کیوں سوچتے ہو جان؟" کیتھرین نے بازو اُس کی گردن میں حائل کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری تینوں کتابیں پسند کی گئی ہیں۔ اچھی آمدنی ہوئی۔ زندگی میں پہلی بار تم معاشی مسائل سے آزاد ہوئے ہو، اپنے خاندان کی خوش اسلوبی سے کفالت کر سکتے ہو۔ کیا یہ تمہارا خواب نہیں تھا؟"

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔" ہربرٹ نے دھیرے سے کہا۔ اس کی نظریں آسمان پہ دمکتے ستاروں پر ٹکی تھیں اور اُس وقت وہ اپنے اگلے ناول کی بابت سوچ رہا تھا۔

اگلے دن اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ چند لمحات خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مراقبہ کر رہا ہو۔

آدھے گھنٹے بعد جب اس نے آنکھ کھولی، وہ ہربرٹ جارج ویلز نہیں تھا... تخیل کی قوت نے اُسے ایڈورڈ نامی ایک شخص کے قالب میں ڈھال دیا تھا، جسے سمندری سفر کے درمیان پیش آنے والا ایک حادثہ ویران جزیرے پر لا پھینکتا ہے۔

ہربرٹ کا تخیل پرواز کر رہا تھا... اب وہ ایک جزیرے پر تھا، ایک شاطر سائنس دان ڈاکٹر موریو کے سامنے... جو جانوروں پر ہولناک تجربے کر کے ان کی ہیئت بدل رہا ہے!

کچھ دیر بعد وہ قلم لے کر بیٹھ گیا۔ اب وہ تخیل سے کشید کردہ تجربہ سپردِ قلم کر رہا تھا۔

وہ شام ڈھلے کمرے سے برآمد ہوا۔ چہرے سے تھکن عیاں تھی، لیکن اگلی صبح وہ پھر اسی کمرے میں تھا، سر جھکائے تخیل کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔

اور یوں اُس کا اگلا ناول The Island of Doctor Moreau تخلیق ہوا۔

کیا یہ ناول بیسٹ سیلر ثابت ہوا؟ اِس بابت سوچنے کی ضرورت نہیں۔ ہربرٹ کا نام بکتا تھا۔ قارئین اُس کے دیوانے تھے، تاہم وہ اپنی شہرت سے فائدہ اٹھانے والوں میں سے نہیں تھا، سستا ادب تخلیق کرنے کا مخالف تھا۔ بے شک یہ ناول سائنس فکشن کی فہرست میں رکھا گیا، لیکن اس میں فلسفیانہ اور سماجی رنگ بھی تھا، خصوصاً ڈارون کے فلسفے اور اس سے وابستہ نظریات ناول میں بڑی پختگی سے زیرِ بحث آئے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اُس زمانے کے ایک بڑے نقاد نے لکھا۔

"ویلز سائنس فکشن ادب کے وسیلے معاشرے کی صورت گری کا فریضہ انجام دے رہا ہے!"

اِس منفرد ناول کو آنے والے برسوں میں پانچ مرتبہ فلم کے قالب میں ڈھالا گیا۔

☆☆☆

شہر ایک وبا کی لپیٹ میں تھا، ایسی وبا جس نے امیر غریب، چھوٹے بڑے، مرد و زن ہر ایک کو گرفت میں لے رکھا تھا۔ اور یہ تھی سائیکلنگ کی وبا!

دراصل ذاتی سائیکل نے ایک جنون کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اُس زمانے میں ہلکی اور تیز رفتار سائیکلیں پہلی بار فروخت کے لیے رکھی گئی تھیں اور لندن کا ہر چھوٹا بڑا سائیکل خریدنے کی خواہش میں سلگ رہا تھا۔ چونکہ موٹر بائیک یا گاڑی عام نہیں تھی، اس لیے سائیکل کو بڑی سہولت تصور کیا جاتا تھا، سو جونہی قیمتیں کم ہوئیں، ہر شخص انہیں خریدنے کو دوڑ پڑا۔ یہاں تک کہ سائیکل ساز اداروں کے لیے آرڈر پورے کرنا مشکل ہو گیا۔

اِس وبا کے اثرات نے ہربرٹ کو بھی متاثر کیا، لیکن فقط تخلیقی سطح پر۔ صحت کے مسائل اُسے سائیکل چلانے کی آزادی دینے کے لیے تیار نہیں تھے، تو اس نے اِس دیوانگی پر ایک ناول لکھنے کا سوچ لیا لیکن سائنسی ناول نہیں، بلکہ ایک مزاحیہ ناول۔ گوکہ ناشر نے خبردار کیا تھا کہ وہ مزاحیہ ناول لکھ کر خطرہ مول رہا ہے، لیکن ہربرٹ نے اس کی ایک نہیں سنی اور "The Wheels of Chance" نامی ناول لکھ ڈالا، جو ایک ایسے مایوس درزی کی کہانی بیان کرتا ہے، جو

مسائل میں گھرا ہونے کے باوجود ایک سائیکل کا مالک ہے۔ اور چھٹیوں پر سائیکل پر سوار ہو کر برطانیہ کے جنوبی حصے کی جانب نکل جاتا ہے۔

ناشر کے اندیشوں کے برعکس اس کاوش کو بہت سراہا گیا۔ ناقدین نے اُسے جیروم کے چند برس قبل شائع ہونے والے مشہور ناول "تھری مین ان دی بوٹ" کا ہم پلّہ قرار دیا۔

دیگر ادیبوں کے برعکس، جو خود کو عقل کل سمجھتے ہیں اور اپنا موازنہ اپنے ہم عصروں سے پسند نہیں کرتے، ہربرٹ نے اس موازنے پر مسرت کا اظہار کیا۔ دراصل وہ خود بھی "تھری مین ان دی بوٹ" کا دیوانہ تھا، تاہم "The Wheels of Chance" لکھتے ہوئے اُس نے ماضی والی غلطی نہیں دہرائی اور خود کو کلی طور پر جیروم کے اثر سے محفوظ رکھا۔

تخلیقی سفر جاری رہا۔ مارچ 1897 میں اُس کی کہانیوں کا ایک مجموعہ "The Plattner Story and Others" کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ اس نے اپنے ایک دوست میکنم کے اصرار پر شائع کیا تھا۔

اُس کتاب کی کتنی پذیرائی ہوئی، اُس کی ہربرٹ کو پروا نہیں تھی، اس کی توجہ تو اگلے ناول پر مرکوز تھی۔

"اگر میں کسی طرح غائب ہو جاؤں، تو زندگی کتنی عجیب ہوگی؟" یہ سوال بچپن میں اُس کے ذہن میں کوندا کرتا تھا۔ کم سنی کی اسی عجیب و غریب سوچ کو سپردِ قلم کرنے کے لیے وہ تخیل کی دنیا میں "غائب" ہو گیا!

☆☆☆

جو نہی وہ پُر اسرار شخص مغربی سسکس کے گاؤں لپنگ کی سرائے میں داخل ہوا، وہاں سراسیمگی پھیل گئی۔ اجنبی نے لمبا کوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ ہاتھوں پر دستانے، سر پر بڑا سا ہیٹ تھا۔ چہرے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، آنکھیں ایک بڑے سے چشمے کے پیچھے چھپی تھیں۔ اجنبی نے اپنا نام گریفن بتایا... اور ہربرٹ کا اگلا ناول "The Invisible Man" اسی پُراسرار شخص کی کہانی بیان کرتا تھا۔

دراصل یہ ایک خبطی سائنس داں کی کہانی تھی جو تجربات کرتے کرتے ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اُس کا جسم روشنی جذب یا خارج کرنے کی ضرورت سے آزاد ہو کر دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے وہ شخص خود کو دوبارہ ظاہر کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

ہربرٹ نے اس عجیب و غریب ناول میں انسان میں چھپے شیطان کو بڑی خوبصورتی سے سپردِ قلم کیا، جو طاقت حاصل کرتے ہی دیوانہ ہو جاتا ہے اور آخر کار اپنی دیوانگی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔

ماضی میں تحریر کردہ اپنے شہرۂ آفاق ناولوں میں ہربرٹ نے کہانی صیغہ واحد متکلم میں بیان کی تھی، جب کہ مذکورہ ناول میں اُس نے کہانی تیسرے شخص کی آنکھ سے بیان کرنے کا کامیاب تجربہ کیا۔

ناول کے ردِعمل کی بابت غور کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کہتے ہیں، اُسے جس شخص نے پڑھا، وہ انگشت بدنداں رہ گیا، حیرت کے بے انتہا سمندر میں اتر گیا اور جب حقیقت کی دنیا میں لوٹا تو اُس کا سر ایچ جی ویلز کی عظمت کے سامنے جھک چکا تھا۔ اس ناول کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1897 میں شائع ہونے والے اس انوکھے ناول پر اس کثرت سے فلمیں بنیں کہ اُن کا شمار تقریباً ناممکن ہے۔ دنیا کے ہر کونے میں ہدایت کاروں نے اسے اپنی ثقافت کے مطابق فلمی پردے پر پیش کیا۔

برطانیہ کے شہری تو پہلے ہی ہربرٹ کے سحر میں تھے لیکن اس ناول کی اشاعت نے اُس کی شہرت کو سرحدوں سے ماوراء کر دیا، مداحوں کی تعداد میں یکدم اضافہ ہو گیا اور اُس پر نوٹوں کی بارش ہونے لگی۔

پوری قوت سے پرواز کرتی اس کی مقبولیت خوابوں کی سرزمین امریکا تک بھی جا پہنچی، جہاں چند برس بعد ایچ جی ویلز کے تخیل کی جست ایک عجیب و غریب واقعہ جنم دینے والی تھی۔

ایک ایسا واقعہ جس نے تاریخ پر اَن مٹ نقوش چھوڑے!!

☆☆☆

فاقے کرنے والے محرومیوں کے شکار ہربرٹ کو آج ہر سہولت میسر تھی۔ اس کے پاس ایک کشادہ گھر تھا، ایک حسین بیوی تھی، محبت کرنے والے اہلِ خانہ تھے، اس سے بڑھ کر ڈھیر ساری دولت تھی۔ اب وہ اپنی ہر خواہش پوری کرسکتا تھا لیکن ایک مسئلہ تاحال اسے درپیش تھا، صحت کے مسائل اُس کے لیے وبالِ جان بنے ہوئے تھے۔

ہربرٹ کو اکثر اس نجومی کی بات یاد آتی جس نے چھ برس کی عمر میں اس کا ہاتھ دیکھ کر اس کے شان دار مستقبل کی پیش گوئی کرتے ہوئے کہا تھا۔ "پوری دنیا تمہارے تخیل کے سحر میں مبتلا ہو جائے گی۔" تاہم اس خوش خبری کے ساتھ متنبہ بھی کیا تھا۔ "اور صحت کے مسائل زندگی بھر تمہارا محاصرہ کیے رکھیں گے!"

کبھی کبھار گرتی صحت اُس پر قنوطیت طاری کر دیتی۔ کیتھرین کی صحت بھی اچھی نہیں تھی جس کے باعث یاسیت گہری ہو جاتی۔

اِن ہی پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ کثرت سے لکھتا رہا۔ ایک برس میں اُس کی تین تین کتابیں منظرِ عام پر آئیں، جن کی تشہیر کے لیے اسے سیکڑوں تقریبات میں شرکت کرنا پڑی۔ گھنٹوں لیکچر دینے پڑے لیکن وہ خوش تھا کیونکہ ان سرگرمیوں کے طفیل اس کا ذہن منفی باتوں کے حصار سے آزاد رہتا۔

جہاں تک قارئین کا تعلق ہے، وہ اُس کے دیوانے تھے، البتہ ناقدین کا ایک طبقہ اس سے نالاں نظر آتا تھا۔ اِس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ تو اس کے ناولوں کے سائنسی موضوعات تھے۔ وہ نقاد جو کلاسیکی مسائل، مثلاً غربت و امارت، ظالم و مظلوم کے گرد بُنے جانے والے فکشن ہی کو ادبِ عالیہ خیال کرتے تھے، وہ اکثر ادبی محافل میں اس کی مخالفت کرتے نظر آتے۔

کوئی اُس پر قارئین کو خوابوں کی دنیا میں دھکیلنے کا الزام عائد کرتا، کوئی سستے خواب بیچنے والا مداری کہہ کر پھبتی کستا۔

دوسرا سبب زود نویسی تھی۔

ایک مخالف کہتا۔ "ایک برس میں تین کتابیں... خدا کی پناہ! جب آپ اتنا لکھیں گے تو معیار کا خدا ہی حافظ!"

دوسرا مخالف لقمہ لگاتا۔ "جناب، میں نے اُن کے ناشر کے منہ سے سنا ہے کہ مسٹر ویلز ایک برس میں پانچ ناول لکھ لیتے ہیں۔"

"بس جناب، اب یہی جنس بکتی ہے۔" تیسرا سگار کا کش لیتے ہوئے کہتا۔

اس کے سیاسی نظریات بھی مغرب کے لیے قابلِ قبول نہیں تھے۔ وہ سوشلسٹ تھا اور اپنے ناولوں میں اِن نظریات کا برملا اظہار کیا کرتا۔ طبقاتی نظام پر گہری ضرب لگاتا جو مخالفین کو کھلتی۔

یوں تو ہربرٹ الزامات اور تنقید کی پروا نہیں کرتا تھا لیکن اسے احساس تھا کہ وہ کثرت سے لکھ رہا ہے۔

"اگر اسی رفتار سے کتابیں شائع ہوتی رہیں تو قارئین اوب جائیں گے۔ ناولوں کی اشاعت میں وقفہ ضروری ہے۔" ایک روز اُس نے اپنے ناشر سے کہا۔

"نوجوان میری بات سنو..." ناشر نے استہزائیہ لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔

"آپ میری بات سنیں مسٹر جونز۔" ہربرٹ نے بات کاٹ دی۔ "اگلے ناول کی اِس برس اشاعت کا کوئی امکان نہیں اور اگر آپ کو میری یہ شرط قبول نہیں تو میں کوئی اور ناشر ڈھونڈ لیتا ہوں۔"

"ارے... آپ تو ناراض ہو گئے مسٹر ویلز۔" چالاک ناشر فوراً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "ہمارا آپ کا رشتہ شرائط سے ماوراء ہے۔ اب ناراضی کو چھوڑیں، لیجیے چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

☆☆☆

بقول شخصے، خبروں کی زندگی انتہائی مختصر ہوتی ہے!

یہ بات سو فیصد دُرست نہیں۔ کم از کم 30 اکتوبر 1938 کو امریکی ریڈیو CBS سے "ہیلوئن" کی خصوصی نشریات کے دوران نیوز بلیٹن کی طرز پر تیار کردہ 60 منٹ کے پروگرام پر تو قطعی صادق نہیں آتی۔

اُس پروگرام کا ہدایت کار اور صدا کار اورسن ویلز نامی ایک نابغۂ روزگار تھا۔ وہی اورسن ویلز جس نے 1941 میں "سٹیزن کین" نامی ایک شاہ کار فلم تخلیق کی، جس کا شمار ناقدینِ فن تاریخ کی بہترین فلموں میں کرتے ہیں، لیکن اُس روز... اورسن کے ارادے مختلف تھے۔

ساٹھ منٹ پر محیط اس پروگرام کا آغاز ایک بریکنگ نیوز کے طور پر ہوا۔ اس روز ریڈیو سے موسم اور ملکی حالات کے بارے میں روایتی پروگرام پیش کیے جا رہے تھے پھر اچانک نشریات درمیان میں روک دی گئیں۔ چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد نیوز کاسٹر کی گھبراہٹ اور فکر میں ڈوبی آواز سامعین کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ابھی ابھی اطلاع آئی ہے کہ مریخ سے آنے والی مخلوق نے زمین پر حملہ کر دیا ہے!"

یہ جملہ سامعین پر بجلی بن کر گرا۔ وہ خوف اور تجسس میں گھر گئے۔

ریڈیو نے مزید خوفناک خبریں نشر کیں۔

"میسلنڈر تما جہازوں میں سوار اس مخلوق نے نیوجرسی کو اپنا نشانہ بنایا ہے، وہ عجیب و غریب ہتھیاروں سے لیس ہیں، جس سے تباہ کن لیزر خارج ہو رہے ہیں اور..."

وقفے وقفے سے اس نوع کی ہیبت ناک خبریں نشر ہوتی رہیں۔ اس دوران اورسن اور دیگر افراد کی اندیشوں سے لبریز آوازیں بھی سنائی دیں، جو اپنے سامعین کو اس عجیب و غریب مخلوق کے خوفناک حملے اور متوقع تباہ کاری سے مطلع کرتے رہے۔

ان پُراسرار خبروں نے ملک میں سنسنی پھیلا دی،

خصوصاً نیوجرسی کے باسی شدید خوف میں مبتلا ہو گئے۔ ہزاروں شہری کام کاج چھوڑ کر گھروں کی جانب دوڑ پڑے، مقامی پولیس متحرک ہو گئی۔

افراتفری میں اُس وقت کچھ کمی واقع ہوئی، جب ریڈیو سے واضح کیا گیا کہ نیوز بلیٹن کے طرز پر پیش کیا جانے والا یہ پروگرام دراصل چالیس برس قبل تحریر کردہ ایک سائنس فکشن ناول کی ڈرامائی تشکیل ہے، جو "ہیلوئن" کی خصوصی نشریات کے تحت پیش کیا جا رہا ہے۔

اس وضاحت سے خوف میں کمی ضرور واقع ہوئی لیکن اس وقت تک نیوجرسی میں حالات بگڑ چکے تھے۔

اُس روز نوجوان اورسن نے برسوں قبل منصۂ شہود پر آنے والے جس ناول کو ڈرامے کی صورت پیش کیا تھا، وہ کسی اور کا نہیں، ایچ جی ویلز ہی کا تحریر کردہ ناول "دی وار آف دی ورلڈز" تھا، جو 1898 میں منظرِ عام پر آیا تھا۔

اسے ویلز کے تخیل کی قوت ہی کہا جا سکتا ہے کہ اشاعت کی چار دہائیوں بعد بھی اس کا ناول امریکی عوام میں سراسیمگی پھیلانے میں کامیاب رہا۔

"دی وار آف دی ورلڈز" کو ناقدینِ ادب ہربرٹ جارج ویلز کا اہم ترین ناول قرار دیتے ہیں۔ دو حصوں میں شائع ہونے والی اس کتاب کا شمار اُن اوّلین تحریروں میں ہوتا ہے، جن میں پہلی بار انسان اور بیرونی دنیا سے آنے والی مخلوقات کے درمیان جنگ کی منظرکشی کی گئی۔ یہ ناول جدید لندن کی کہانی بیان کرتا ہے، جس پر خلائی مخلوق نے حملہ کر دیا ہے۔

ہربرٹ کی اس تخلیق میں فلسفیانہ پیچیدگیوں، عمرانی مسائل، نظریۂ ارتقا، نوآبادیاتی اور سرمایہ دارانہ نظام کا بڑی مہارت سے احاطہ کیا گیا تھا۔ یہ اتنا مقبول ہوا کہ اگلے دو برسوں میں فقط برطانیہ میں اس کی طرز پر بیس سے زائد ناول لکھے گئے۔ دنیا کے دیگر حصوں میں بھی اس تھیم کو اپنایا گیا، تاہم کوئی مصنف تخیل کی اس سطح پر نہیں پہنچ سکا جس تک رسائی کی ہربرٹ صلاحیت رکھتا تھا۔ اس ناول پر بنی فلمز، ریڈیو اور ٹی وی پروگرامز کی مجموعی تعداد سیکڑوں میں ہوگی۔

سچ تو یہ ہے کہ اس ناول نے ہربرٹ کو اپنے عہد کا بااثر اور مقبول ترین مصنف بنا دیا۔ آج "دی وار آف دی ورلڈز" کا شمار تاریخِ ادب کے دس بڑے ناولوں میں ہوتا ہے۔ دورِ جدید کے قارئین اس ادبی تخلیق سے ٹھیک اُسی مانند حظ اٹھاتے ہیں جیسے اب سے 114 سال قبل اسے پہلی بار پڑھنے والوں نے اٹھایا تھا۔

☆☆☆

1900 میں ہربرٹ کو ایک خوشخبری ملی۔ کیتھرین حاملہ تھی!

وہ بے حد مسرور تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ برسوں سے اس خبر کا منتظر تھا۔ باقی خوشیاں تو قدرت نے اُس کے قدموں میں ڈھیر کر دی تھیں۔ وہ بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ دولت کی بھی ریل پیل تھی، ایسے میں اُسے فقط باپ بننے کی خواہش ستاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کیتھرین نے اُسے یہ اطلاع دی، اس نے اپنی بیوی کو بانہوں میں بھر لیا۔

اس نے اپنی مصروفیات محدود کر دیں۔ بیوی کا خیال رکھنے لگا۔ یوں برسوں بعد اس کے دن گھر کی چار دیواری میں گزرنے لگے۔

اگلے برس ماہ جولائی میں کیتھرین نے ایک بیٹے کو جنم دیا جس کا نام جارج فلپ تجویز کیا گیا۔

اب گھر میں قلقاریاں گونجا کرتیں جو اس کی سماعتوں میں رس گھولتیں۔ جونہی وہ لکھنے سے فراغت پاتا، اپنے بیٹے کو گود میں اٹھا لیتا۔ البتہ نئی مصروفیات نے اس کے تخیل کی جست کو محدود نہیں کیا۔ وہ کل کی طرح آج بھی مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت سے مالا مال تھا، جس کا سب سے بڑا ثبوت اسی برس شائع ہونے والا اُس کا انوکھا ناول "The First Men in the Moon" تھا، جو دو ایسے افراد کی کہانی بیان کرتا ہے، جن کا چاند کے سفر کے دوران انتہائی تہذیب اور ترقی یافتہ مخلوق سے سامنا ہوتا ہے۔

آج کے برعکس اس زمانے میں زمین کے باسیوں کے لیے چاند اسرار کا منبع تھا۔ یہی سبب ہے کہ ناول کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ قارئین نے ہربرٹ کی تخلیقی آنکھ کے سہارے چاند کا سفر کیا۔

ہربرٹ کی پیش کردہ صورتِ حال کو حقیقت کا روپ اختیار کرنے میں 68 برس لگے جب نیل آرم اسٹرنگ نے چاند پر قدم رکھا۔

☆☆☆

ہربرٹ نے اپنی صلاحیتوں کو فقط تخلیقی ادب تک محدود نہیں رکھا۔ اس عرصے میں اس نے سائنسی، عمرانی اور سماجی موضوعات پر کئی مضامین لکھے جو نہ صرف مقبول ہوئے بلکہ متنازعہ بھی ٹھہرے۔ وہ کتابوں پر تبصرے بھی لکھتا رہا، جو "سنڈے ریویو" کے عنوان سے شائع ہوتے۔

ہربرٹ کے تبصرے دنیائے ادب میں اپنی جگہ بنانے کی جدوجہد میں مصروف ادیبوں کے لیے خصوصی اہمیت

کے حامل تھے۔ ظاہری بات ہے، جب عہد کا بااثر ترین ادیب آپ کی کتاب پر رائے دے اور اگر وہ مثبت ہو تو آپ کی کامیابی یقینی ہے۔ جن ادیبوں کی شہرت کو اُس کے تبصروں نے چار چاند لگائے، اُن میں جیمز جوائس قابلِ ذکر ہے۔

ہربرٹ کی وہ کتب جنہیں نقادین نان فکشن کی فہرست میں رکھتے ہیں، اُن میں 1901 میں شائع ہونے والی "Anticipations" اہم ترین تصور کی جاتی ہے جس کا شمار اُس دہائی کی بیسٹ سیلرز میں ہوتا ہے۔

یہ کتاب اُس نے اپنے عزیز دوست میلکم مور کے مشورے پر لکھی۔ جس نے ایک خوشگوار شام لندن کے ایک باغ میں چہل قدمی کرتے ہوئے اُسے کچھ یوں مخاطب کیا تھا:

"لوگ کہتے ہیں کہ ایچ جی ویلز مستقبل میں جھانک سکتا ہے، کیا یہ درست ہے ہربرٹ؟"

"یہ لوگوں کی محبت ہے، اس کے سوا میں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔" ہربرٹ خوشدلی سے مسکرایا۔

"تم کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہو دوست۔" میلکم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم اپنے تخیل کی قوت اور سائنسی تجزیے کی بنیاد پر پیش گوئیاں کرنے کی انوکھی صلاحیت رکھتے ہو!"

"تم نے تو مجھے نجومی بنا دیا۔" ہربرٹ نے قہقہہ لگایا۔

"میں بہت سنجیدہ ہوں۔" میلکم نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ دونوں ٹھہر گئے۔ چند لمحات خاموشی چھائی رہی، پھر میلکم کے لب وا ہوئے۔ "میں چاہتا ہوں کہ تم مستقبل کی بابت ایک کتاب لکھو، لوگوں کو بتاؤ کہ تم مستقبل کو کس طرح دیکھتے ہو۔ میرا یقین کرو، ساری دنیا آنے والا کل تمہاری تخلیقی آنکھ سے دیکھنا چاہتی ہے۔"

مشورہ ہربرٹ کے دل کو لگا لیکن یہ آسان کام نہیں تھا۔ فکشن میں تجربات کی آزادی ہوتی ہے لیکن اس طرز کی سنجیدہ کتاب تخلیق کرنا ایک دشوار مرحلہ تھا۔

"یہ بے حد مشکل کام ہے۔" ہربرٹ نے گہرا سانس لیا۔ "لیکن میں اسے ممکن کر دکھاؤں گا۔"

اور اس نے ایسا ہی کیا، Anticipations کی صورت، جو سائنسی تجزیوں اور مستقبل کی پیش گوئیوں پر مبنی ایک حیران کن کتاب تھی۔ آنے والے برسوں میں اس کتاب کی اہمیت دوچند ہو گئی کیونکہ اس کی بیشتر پیش گوئیاں درست ثابت ہوئیں۔

ہربرٹ نے مستقبل میں جدید شہروں، نئے مواصلاتی نظام، نقل و حمل کے جدید ذرائع کے استعمال کی پیش گوئی کی۔

دنیا میں یکساں معاشی نظام کے اطلاق کا اشارہ کیا۔ گلوبل ولیج کے امکانات اور ریاستوں کے درمیان جنم لینے والے عسکری تنازعات کی بھی نشان دہی کی۔ ساتھ ہی مستقبل میں خواتین کے بڑھتے اثر، حقوقِ نسواں کے لیے شروع کی جانے والی جدوجہد کی عکاسی کی۔

سیاسی محاذ پر اُس نے سوشلسٹ نظریات کی ترجمانی کی تھی۔ اس زمانے میں وہ برطانیہ میں سرگرم فیبین سوسائٹی کا فعال رکن تھا۔ یہ تنظیم سوشل ازم کی ترویج کے لیے کام کر رہی تھی۔ گو کہ آنے والے برسوں میں وہ اس سوسائٹی سے علیحدہ ہو گیا لیکن اس نے سوشلسٹ نظریات کی تبلیغ جاری رکھی۔

☆☆☆

ہربرٹ ایک آزاد منش آدمی تھا۔ وہ فرد کی آزادی کا علم بردار تھا اور جسمانی تعلقات میں شادی یا دیگر سماجی قیود کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ اس کی ازدواجی زندگی کبھی خوشگوار نہیں رہی۔ ایک شوہر، ایک باپ کی حیثیت سے وہ ناکام آدمی ثابت ہوا۔ پہلے بیٹے کی پیدائش کے بعد چند ماہ تو اس نے گھر میں گزارے لیکن پھر ادبی اور سماجی سرگرمیوں کے بڑھتے اثر نے اسے گھر سے بے پروا کر دیا۔

1903 میں اس کے ہاں دوسرے بیٹے کی پیدائش ہوئی جس کا نام فرینک رچرڈ تجویز کیا گیا۔ بے شک وہ ایک خوشگوار لمحہ تھا، ہربرٹ نے باقاعدہ جشن منایا لیکن پہلے بیٹے کی پیدائش کے موقع پر اس میں جو تبدیلیاں نظر آئی تھیں، اس بار اُن کی رمق بھی دکھائی نہیں دی۔

اس نے گھر سے باہر وقت گزارنے کا سلسلہ جاری رکھا جہاں اس نے کئی عشق لڑائے۔ اِس عرصے میں اس کے دو مزید ناول منظرِ عام پر آئے۔ گو کہ دونوں ہی ناول وہ ادبی حیثیت حاصل نہیں کر سکے جو ہربرٹ کے ناولوں کے حصے میں آیا کرتی تھی لیکن اس ناکامی نے اُس کی شہرت پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا۔

اور پھر ان دنوں اس کے ذہن میں ایک خاص منصوبہ کلبلا رہا تھا۔ وہ ایک یتیم بچے کی کہانی بیان کرنے کی جستجو میں تھا، جسے انتہائی تلخ بچپن گزارنا پڑا، ٹھیک اُس کے مانند... اور پھر اچانک اُس کی زندگی یکدم بدل گئی۔

یہ ناول "Kipps" کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا۔ ناول کے مرکزی کردار کی زندگی بڑی حد تک ہربرٹ سے مشابہ تھی۔ ناول تخلیق کرتے وقت اُس نے اپنی کم سنی کے تلخ تجربات بڑی مہارت سے برتے، یوں کتاب میں حقیقت در آئی۔

اِس ناول نے جھنڈا گاڑ دیا۔ ایک چوٹی کا نقاد جو ماضی میں ہربرٹ پر طنز کے نشتر برسایا کرتا تھا، اپنے مضمون میں "Kipps" کو ماسٹر پیس قرار دے بیٹھا۔ دیگر نے بھی اُسے سراہا۔ جب ایک تقریب میں صحافیوں نے اِس ناول کے حوالے سے ملنے والے مثبت ردِ عمل کی بابت ہربرٹ سے سوال کیا تو اس نے مسکرا کر کہا۔ ''میں قارئین و نقادین کا ممنون ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اِسے اپنی بہترین کاوش تصور کرتا ہوں۔''

ہربرٹ دُرست تھا، یہ واقعی اس کی بہترین کاوش تھی گو کہ اس کے حصے میں ''دی ٹائم مشین'' اور ''دی وار آف دی ورلڈز'' جیسی شہرت نہیں آئی، لیکن ادبِ عالیہ پڑھنے والوں نے اُسے شاہکار قرار دیا۔

☆☆☆

ایک کے بعد ایک شاہکار تخلیق کرنے والا، تخیل کا مسافر، عہد کا سب سے بڑا ناول نگار ایچ جی ویلز ازدواجی محاذ پر ایک ناکام شخص تھا۔

وہ گھر سے، اپنی بیوی سے اتنا دور تھا کہ دونوں الگ الگ دنیاؤں کے باسی معلوم ہوتے۔ گو کہ یہ شادی کیتھرین کی موت تک قائم رہی لیکن اِس پورے عرصے میں اداسی نے اس عورت کے دل میں ڈیرے ڈالے رکھے۔

آوارگی کے خبط میں جتلا ہربرٹ نے کئی عورتوں سے عشق لڑائے۔ کئی معاشقے تو اتنے زوردار تھے کہ پورے ملک میں اُن کی بازگشت سنی گئی۔ اُس زمانے میں وہ جن عورتوں کے ساتھ نظر آیا، اُن میں معروف امریکی سماجی کارکن مارگریٹ سینگر بھی شامل تھی۔ بعد کے برسوں میں وہ ایک ادیبہ اڑجا ارنم کے ساتھ تواتر سے دیکھا گیا۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ اُس نے عشق اور تخلیق کے درمیان ہمیشہ توازن قائم رکھا۔ کتابیں تواتر سے شائع ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ ایمبر ریوِلس جیسی دوشیزہ کی محبت بھی اُسے قلم سے دُور نہیں کر سکی۔

مستقبل میں ایک سماجی کارکن کے طور پر اپنی پہچان بنانے والی تہذیب یافتہ ایمبر، ہربرٹ کے ایک دوست ولیم کی بیٹی تھی۔ ولیم سے ہربرٹ کی ملاقات فیبین سوسائٹی کی سرگرمیوں میں ہوئی۔ وہ اُس تنظیم سے تو دور ہو گیا لیکن خود کو ایمبر سے دُور نہیں کر سکا اور اُس پری وش کی محبت میں تمام حدود عبور کر گیا۔ اس بے لگام محبت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایمبر حاملہ ہو گئی۔

ہربرٹ اپنے کیے پر نادم تھا اور تلافی کے طور پر کیتھرین کو طلاق دے کر ایمبر کو اپنانے کے لیے تیار تھا۔ ویسے بھی وہ کیتھرین سے اوب چکا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ ہم ایک ساتھ، ایک گھر میں زندگی گزاریں۔'' ایک روز اس نے حاملہ ایمبر کا ہاتھ تھام کر کہا۔

ایمبر اس کے خلاف تھی۔ ''نہیں ہربرٹ۔'' اُس نے دھیرے سے کہا۔ ''میں نہیں چاہتی کہ مجھ پر ایک عورت کا گھر توڑنے کا الزام لگے۔ میری درخواست ہے کہ تم اِس انتہائی فیصلے سے باز رہو۔''

ہربرٹ باقی کی زندگی ایمبر کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا لیکن وہ اُسے راضی کرنے میں ناکام رہا جس کا اُسے دکھ تھا۔

1909 میں ایمبر نے ہربرٹ کی بیٹی اینا کو جنم دیا۔ گو کہ بچی کی پرورش ہربرٹ سے بھرپور وقت کا تقاضا کرتی تھی لیکن دونوں کی ملاقاتیں جاری رہیں۔ اُن کے رومان میں اُس وقت تک کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، جب تک رابیکا ویسٹ نامی ایک نوخیز ادیبہ نے ہربرٹ کی زندگی میں قدم نہیں رکھ دیا۔

ہربرٹ اور رابیکا کی پہلی ملاقات 1913 میں ہوئی تھی۔ ادبی دوستی اور تخلیقی سرگرمیاں انہیں قریب لے آئیں۔ جلد ہی دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے۔ گو کہ... ان کی عمروں میں خاصا فرق تھا لیکن محبت عمر کہاں دیکھتی ہے۔

ہربرٹ نے اُسے ٹوٹ کر چاہا۔ رابیکا بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس محبت کی نشانی نے 1914 میں ایک بیٹے انتھونی ویسٹ کی صورت دنیا میں جنم لیا۔

ہربرٹ نے رابیکا کو بھی شادی کی پیش کش کی تھی، لیکن اُس نے ایمبر کے مانند انکار کر دیا۔ البتہ اُس کے انکار کرنے کی وجہ مختلف تھی۔

''پیارے ہربرٹ، بے شک ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن بہتر ہے کہ ہم شادی کے بندھن سے خود کو آزاد رکھیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ''ہم دونوں آزاد منش ہیں۔ بہتر ہے آزاد زندگی گزاریں۔''

''اگر ایسا ہے، تو ایسا ہی سہی۔'' ہربرٹ نے دھیرے سے کہا۔

☆☆☆

''کیا ایچ جی ویلز لکھتے لکھتے تھک گیا ہے؟ اس کی تخلیقی قوت ماند پڑ گئی؟ کیا وہ مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت کھو چکا ہے؟''

یہ سوالات نہ تو ہربرٹ کے مداحوں کے ذہن میں پیدا ہوئے، نہ ہی نقادین نے ان کی بابت غور کیا، کیونکہ ہربرٹ انوکھے، عجیب و غریب ناول تخلیق کرنے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھا۔ اور دلچسپ امر یہ ہے کہ زود نویسی کے باوجود اُس نے کبھی معیار پر سمجھوتا نہیں کیا۔ ماضی کے برعکس اب وہ سائنسی ادب تک محدود نہیں تھا۔ سماجی موضوعات پر لکھنے کا آغاز تو اُس نے "Kipps" سے کر دیا تھا، بعد میں بھی تجربات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس نے خالصتاً تخیلاتی یا تمثیلی ناول بھی لکھے۔ "A Modern Utopia" اِس سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ "In the Days of the Comet" اس ضمن میں دوسرا ناول تھا۔ دونوں ہی کو سراہا گیا۔

بعد کے برسوں میں اس نے سماجی مزاح نگاری کا بھی کامیاب تجربہ کیا۔ 1916 میں شائع ہونے والا "Mr Britling Sees It Through" اس کی بہترین مثال تصور کیا جاتا ہے۔ اس ناول کو جنگِ عظیم اول کے دوران تخلیق کردہ بہترین ناول قرار دیا گیا۔ نامور روسی ادیب میکسم گورکی نے اِسے دورانِ جنگ مغرب کی بہترین ادبی کاوش کہہ کر پکارا اور ہربرٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی کتاب حقیقی معنوں میں انسانیت کی ترجمان ہے۔''

ستائش کے ساتھ ساتھ ناول کے عوض ہربرٹ کو اچھا خاصا معاوضہ بھی ملا۔ امریکی ناشر نے اِس کے حقوق حاصل کرنے کے لیے بیس ہزار پونڈز جیسی خطیر رقم ادا کی۔

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مذکورہ ناول میں ہربرٹ نے مستقبل کی جنگوں میں ایک مہلک ہتھیار کے استعمال کی پیش گوئی کی تھی جو اُس کی موت سے کچھ عرصہ قبل جنگِ عظیم دوم میں ہیروشیما پر گرائے جانے والے ایٹم بم کی صورت پوری ہوئی۔

جب یہ سانحہ رونما ہوا، ہربرٹ نے گہرے دُکھ کا اظہار کیا۔ ''حقیقی دنیا کی تباہ کاری، تخیل کی تباہ کاری سے کتنی مختلف ہوتی ہے!''

☆☆☆

گو کہ "Anticipations" کی اشاعت کے بعد اُس نے فکشن کے ساتھ ساتھ نان فکشن کے میدان میں بھی اپنی دھاک بٹھا دی تھی لیکن قارئین کی بڑی تعداد یہی سوچتی تھی کہ اس کا اصل میدان فکشن ہے جہاں وہ ایک فسوں گر کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اسے نان فکشن میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

جب یہ باتیں ہربرٹ کے کانوں میں پڑتیں، وہ مسکرا

گردہ جاتا۔ اُس نے کبھی ان تبصروں کا جواب نہیں دیا، اُس کا کام ہی اُس کا جواب تھا۔

ان دنوں وہ جس منصوبے پر کام کر رہا تھا، اُس کی اثر انگیزی نے ہربرٹ کو ایک مورخ بنا دیا تھا۔ تخیل اُسے وقت سے ماوراء لے گیا، ایک بار پھر وہ زمانوں کی سیر کر رہا تھا وہاں رونما ہونے والے واقعات کا شاہد بن رہا تھا۔

1920 میں یہ منصوبہ تکمیل کو پہنچا اور جادوئی اسلوب میں تحریر کردہ وہ کتاب منظرِ عام پر آگئی جس نے مخالفین کے منہ بند کر دیے۔

تین جلدوں پر مشتمل اس کی کتاب "The Outline of History" انتہائی اثر انگیز ثابت ہوئی۔ اس نے فروخت کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔

ایک مورخ کے نقطۂ نگاہ سے تخیل کے مسافر ایچ جی ویلز نے اس کتاب کا آغاز قبل از تاریخ سے کیا۔ کتاب کا اختتام پہلی جنگِ عظیم پر ہوتا ہے۔ اس نے یہ پیش گوئی بھی کی کہ جلد ایک اور بڑی جنگ کا آغاز ہوگا جس میں لاکھوں ہلاکتیں ہوں گی۔

ساتھ ہی اُس نے کہا۔ "عالم گیریت کے لیے لا جنگ قانون اپنایا جائے گا... ہر شخص کی نگرانی ہوگی... انسانیت کی بھلائی کے لیے پوری دنیا پر ایک نظام کی حکومت لازمی ہو جائے گی..."

کتاب کی افتتاحی تقریب میں جب اس سے سوال ہوا کہ کیا وہ مستقبل میں ایک مصلح کی حیثیت سے فقط نظری محاذ تک محدود رہے گا تو اس نے جواب دیا۔ "نہیں، جلد آپ مجھے عملی محاذ پر دیکھیں گے!"

وہ حقیقتاً عملی میدان میں اتر آیا۔ اس نے دنیا بھر کے دورے کیے اور مختلف پلیٹ فارم سے اپنے سیاسی نظریات کی ترویج شروع کر دی۔ امریکا اور یورپ کی اہم درس گاہوں میں لیکچر دیے۔

وہ سوشل ازم کا حامی تھا اور 1917 میں روس کی شکل میں دنیا کے نقشے پر ایک سوشلسٹ ریاست ابھر آئی تھی جو تیزی سے اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہی تھی۔

ہربرٹ روس کے نظامِ حکومت میں خصوصی دلچسپی لے رہا تھا۔ 1920 میں اُس نے روس کا دورہ کیا جہاں اُس کی لینن اور ٹراٹسکی سے طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ لوٹنے کے بعد وہ بڑی شدت سے سوشلسٹ نظام کی حمایت کرنے لگا جسے بنیاد بنا کر اُس پر خاصی تنقید کی گئی۔

ایک برطانوی سیاست دان نے الزام عائد کیا کہ وہ عوام کو انقلابی فکر میں مبتلا کرنے کی تباہ کن کوشش کر رہا ہے۔

"برطانیہ کے حالات روس سے یکسر مختلف ہیں، یہاں کسی سوشلسٹ انقلاب کی گنجائش نہیں۔ اگر مسٹر ویلز تبدیلی چاہتے ہیں اور ان میں ہمت ہے تو انتخابات میں حصہ لیں۔" سیاست دان کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

جونہی یہ بیان اخبارات کی زینت بنا، صحافی ہربرٹ کی جانب دوڑ پڑے۔

"کیا آپ کو چیلنج قبول ہے مسٹر ویلز؟ کیا آپ انتخابات میں حصہ لیں گے؟" صحافیوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

اس کا جواب اثبات میں تھا۔ "ہاں، میں انتخابات میں حصہ لوں گا۔"

"آپ کس پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑیں گے؟" ایک صحافی نے سوال کیا۔

"ابھی میں نے اس بارے میں فیصلہ نہیں کیا۔" ہربرٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ ہربرٹ لیبر پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے والا تھا جسے بائیں بازو کی جماعت تصور کیا جاتا تھا۔

اگلے برس عہد کے سب سے بااثر ادیب نے عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا۔ وہ 1922 اور 1923 میں لندن یونیورسٹی کے حلقے سے جنرل الیکشن میں کھڑا ہوا، تاہم دونوں ہی بار اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ان ناکامیوں، لیبر پارٹی کے بدلتے نظریات اور اپنے عزیز دوست ولیم ہیکسلی کی موت کے بعد وہ انتخابی سیاست سے مایوس نظر آنے لگا اور جلد کنارہ کش ہو گیا۔

اس وقت تک اسٹالن روس میں برسرِ اقتدار آچکا تھا جس کی بابت ہربرٹ کی رائے زیادہ مثبت نہیں تھی۔ وہ اُسے ایک رجعت پسند سوشلسٹ تصور کرتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اُسے اسٹالن کے اقدامات میں ایک حقیقی یک قطبی نظامِ حکومت کے قیام کا امکان نظر آنے لگا۔

یہی فکر روس کے سفر کا موجب بنی جہاں اس کی اسٹالن سے ملاقات ہوئی۔ برطانیہ لوٹنے کے بعد اس نے روس کے مردِ آہن کے بارے میں اپنے تاثرات یوں بیان کیے:

"میں نے اسٹالن جیسا سچا، مخلص اور کھرا انسان نہیں دیکھا۔"

جب ایک سیمینار میں اس سے اسٹالن کے آمرانہ اقدامات کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا۔ "اسٹالن کو آمر قرار دینا درست نہیں۔ مغرب میں اُس کی منفی تصویر پیش کی جا رہی ہے۔"

سیاسی نظریات کے ساتھ ساتھ اس کے مذہبی نظریات بھی خاصے متنازع رہے۔ اس نے اپنی کتاب "God the Invisible King" میں خدا کا ایک ایسا تصور پیش کیا جو رائج تصورات سے خاصا مختلف تھا۔ توقع کے عین مطابق کلیسا نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

☆☆☆

1927 ہربرٹ کے لیے انتہائی کرب ناک ثابت ہوا۔

اس کی شریکِ حیات کیتھرین دنیا سے رخصت ہو گئی۔ گو کہ وہ کافی عرصے سے بیمار تھی اور اس کی موت متوقع تھی، لیکن اس سانحے نے اُسے گہرے صدمے سے دوچار کر دیا۔ تنہائی نے اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ غم غلط کرنے کے لیے اس نے شراب کا سہارا لیا لیکن یہ کوشش لاحاصل رہی۔

"کیا میں کیتھرین سے اتنی محبت کرتا تھا؟" اُس نے خود سے سوال کیا۔

اُسے وہ دن یاد تھا جب سائنس کی کلاس میں کیتھرین سے اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

"وہ پتلی دبلی اور کمزور ہونے کے باوجود بلا کی حسین تھی۔" ہربرٹ خود کلامی کے عمل سے گزر رہا تھا۔ "پہلی ہی ملاقات میں اس نے میرا دل جیت لیا تھا۔"

آنکھوں کے سامنے حسین مناظر گھوم رہے تھے... وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے سرسبز درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھے رہتے ہیں، دریا کی سیر کو جایا کرتے ہیں اور پھر... یکدم اس کا سر گھومنے لگا۔ حسین مناظر کھو گئے۔ اب بے رنگ کریہہ تصویریں آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھیں۔

وہ اداس، تنہائی کی شکار کیتھرین کو دیکھ سکتا تھا جو زندگی کے آخری برسوں میں اُس کی توجہ کو ترستی رہی۔ جس نے شوہر کی بے وفائی اور عدم توجہی کے باوجود ہمیشہ اُسے ٹوٹ کر چاہا۔ اُس کی ضروریات کا خیال رکھا... لیکن ان خدمات کا صلہ اُسے اداس، تنہا راتوں کی صورت ملا جنھوں نے اُسے توڑ دیا۔

تخیل کا مسافر ماضی کا سفر کر رہا ہے، ہر خطا اس کے سامنے تھی... آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن اب یہ مشق لاحاصل تھی، وقت گزر چکا تھا۔

"مجھے معاف کر دینا کیتھرین!" اس نے دھیرے سے کہا لیکن سینے کا بوجھ کم نہیں ہوا، وہ کچھ اور بڑھ گیا۔

☆☆☆

کیا ہربرٹ کمیونزم کے گورکھ دھندے میں اُلجھ کر رہ گیا تھا؟

اس کا جواب نفی میں تھا، ایک جانب جہاں وہ روس جیسی سوشلسٹ ریاست کے دورے کر رہا تھا، وہیں اس نے سرمایہ دارانہ نظام کا مرکز تصور کیے جانے والے امریکا کے بھی بکثرت دورے کیے، تاہم اس کے مقاصد سیاسی نہیں بلکہ ادبی و تخلیقی تھے!

گو کہ اپنی شریکِ حیات کی موت نے اسے توڑ دیا تھا لیکن اس نے کسی نہ کسی صورت ادبی سفر جاری رکھا۔ ناولوں کی اشاعت میں کمی واقع نہیں ہوئی۔

ہالی ووڈ اُس کے ناولوں کو فلمی قالب میں ڈھالنے کا شدید خواہش مند تھا۔ بھاری معاوضہ دینے کے لیے بھی تیار تھا۔ اسی ضمن میں اس نے امریکا کا دورہ کیا۔

1933 میں اُس کا ناول "The Shape of Things to Come" منظرِ عام پر آیا جسے برطانیہ سے زیادہ امریکا میں پسند کیا گیا۔ ہالی ووڈ نے اس میں خصوصی دلچسپی لی۔ اس ناول پر مبنی فلم "Things to Come" کے نام سے سینما کی زینت بنی اور ناظرین کو اس تاریک مستقبل میں لے گئی جہاں دنیا ایک اور جنگِ عظیم میں داخل ہو گئی تھی۔

اسی عرصے میں ہربرٹ کی امریکی صدر سمیت دنیا کی کئی قد آور سیاسی و عسکری شخصیات سے ملاقات ہوئی جن کی اکثریت اس کی مداح تھی۔ کئی نے تو مستقبل میں جھانکنے کی حیران کن قابلیت کے پیشِ نظر اس سے مشورے بھی کیے۔ ایسی ہی ایک ملاقات کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ "شاید یہ مجھے نجومی سمجھ بیٹھے ہیں!"

☆☆☆

ممکن ہے کیتھرین کی روح نے اسے معاف کر دیا ہو لیکن نقاد اُس کی خطاؤں کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ آخر کے برسوں میں اس کی ادبی تحریروں میں در آنے والے نظریات کے غالب اثر کو نہ صرف مخالفین نے تنقید کا نشانہ بنایا بلکہ مداحوں نے بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔

معروف برطانوی ادیب جی کے چیسٹرٹن یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ ویلز بھٹک چکا ہے:

"مسٹر ویلز ایک پیدائشی داستان گو ہیں، تاہم انھوں

نے اپنی یہ خداداد صلاحیت مقصدیت کے لیے فروخت کر دی ہے!"

تنقید کے ساتھ ساتھ امراض بھی عود کر آئے۔ ذیابیطس جیسے موذی مرض نے اس پر حملہ کر دیا، تاہم ہربرٹ نے اسے کمزوری بنانے کے بجائے اپنی قوت بنایا اور "Diabetes UK" نامی ایک فلاحی تنظیم کی بنیاد رکھی۔

یوں تو وہ ہزاروں انٹرویوز دے چکا تھا، سیکڑوں مایہ ناز شخصیات سے ملاقات کر چکا تھا لیکن 28 اکتوبر 1940 کو امریکی ریڈیو کے لیے اورسن ویلز کو دیے جانے والے انٹرویو میں وہ خاصا پُرجوش نظر آیا۔ یاد رہے کہ یہ وہی نوجوان تھا جس نے ہربرٹ کے ناول "دی وار آف دی ورلڈز" میں پیش کردہ خیال کو برتتے ہوئے دو برس قبل، یعنی 1938 میں ریڈیو سے نشر ہونے والے پروگرام کے ذریعے امریکا میں سنسنی پھیلا دی تھی۔

"میں تمہاری اس حرکت سے حیران رہ گیا نوجوان۔" بوڑھے ہربرٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے خوشی ہے کہ تمہاری اس کوشش سے چالیس برس قبل لکھے ہوئے میرے ناول کی فروخت میں یکدم اضافہ ہو گیا، کیا تمہیں اس میں سے کمیشن چاہیے؟"

اس جملے پر اورسن ویلز نے زوردار قہقہہ لگایا۔

☆☆☆

جوں جوں عمر بڑھ رہی تھی، وہ فعال ہوتا جا رہا تھا۔ معالجین اس امر پر حیران تھے کہ زندگی بھر مختلف امراض کا شکار رہنے والے ہربرٹ کی صحت ضعیفی کی آمد کے ساتھ سنبھلتی جا رہی ہے۔

لکھنے کے عشق نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ توانا ہوتا گیا۔ اب اس کا ذہن روشن تھا۔ وہ آدھی رات کو اٹھ کر بیٹھ جاتا اور لکھنا شروع کر دیتا۔

تخلیقی عمل کے لیے اب وہ پُرسکون ماحول کا متقاضی نہیں تھا۔ جہاں چاہتا، جن حالات میں چاہتا، قلم سنبھال لیتا۔ گاڑی میں سفر کرتے ہوئے، ٹی وی دیکھتے ہوئے، ساحل کی نم ریت پر بیٹھ کر بھی اس کا قلم چلتا رہتا۔ ناشران تحریروں کے.... منہ مانگے دام ادا کرتے۔ وہ اپنے عہد کا مہنگا ترین مصنف تھا۔

دوستوں کے حلقے میں بھی یکدم اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ اکثر دعوتوں میں نظر آتا۔ خود بھی دعوتوں کا اہتمام کرتا۔

ایک روز اس کے پرانے رفیق میکنم نے اس کی فعالیت اور توانائی کا راز دریافت کیا، تو اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اس نے مجھے معاف کر دیا میکنم!"

"کس نے؟" بوڑھے دوست کے چہرے پر حیرت تھی۔

"اسی عورت نے جسے میں نے بہت دُکھ دیے۔" ہربرٹ نے ساحل کو گھورتے ہوئے کہا۔ "کیا تم یقین کرو گے، ایک ایسا وقت بھی آیا تھا، جب میں لکھنے سے معذور ہو گیا تھا، ٹوٹ گیا تھا۔ اور اس احساس تلے میری ہڈیاں چیخ رہی تھیں کہ میں نے اس عورت کے ساتھ بہت ظلم کیا۔ میں ہر رات رو رو کر اس سے معافی مانگتا تھا اور پھر ایک رات مجھے یوں لگا، جیسے وہ میرے سامنے..." یہاں پہنچ کر وہ خاموش ہو گیا۔

چند ساعت خاموشی چھائی رہی۔ پھر ہربرٹ کی آواز گونجی۔ "لگتا ہے، جلد اس سے ملاقات ہوگی۔ میرے جانے کا وقت بھی قریب آ گیا ہے۔"

"کیا بکواس ہے۔" میکنم کے لہجے میں ناراضی تھی۔ "تم تو دن بہ دن جوان ہوتے جا رہے ہو، موت تم سے کوسوں دور ہے۔"

"دوست، تم مجھے غلط ٹھہرا رہے ہو؟" ہربرٹ کے چہرے پر اداس مسکراہٹ تھی۔ "تم ہی تو کہتے تھے کہ میں مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔"

میکنم نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ سورج تیزی سے ڈوب رہا تھا۔

ہربرٹ کی سیکڑوں پیش گوئیوں کی طرح 13 اگست 1946 کو یہ پیش گوئی بھی درست ثابت ہوئی۔ وہ ریجنٹ پارک کے مکان میں مردہ پایا گیا۔

اس کی موت نے دنیا بھر میں پھیلے ادب کے لاکھوں قارئین کو گہرے غم سے دوچار کر دیا۔

ایچ جی ویلز کو زود نویسی کا الزام دینے والے مخالفین بھی موت کے بعد اسے خراج تحسین پیش کرتے نظر آئے۔ "اس نے کبھی معیار پر سمجھوتا نہیں کیا۔"

اس کے سیاسی نظریات کو تنقید کا نشانہ بنانے والوں کا سر بھی جھک گیا۔ "وہ درست ہی تو کہتا تھا!"

سائنسی ادب کے بانی کی لاش اس کی وصیت کے مطابق شعلوں کے حوالے کر دی گئی اور اس کی راکھ سمندر میں بہا دی گئی۔ یوں ہربرٹ المعروف ایچ جی ویلز کا سفرِ حیات تمام ہوا، لیکن وہ اپنی ناقابلِ یقین تحریروں کی صورت زندہ رہا۔

فساد

صائمہ اقبال

کب کون سی غلطی ایک بڑے فساد کی وجہ بن جائے، کسے خبر۔ اس ریفری نے بھی کب سوچا تھا کہ اس کی ایک چھوٹی سی غلطی دنیائے فٹ بال میں ایک بڑے فساد کا سبب بن جائے گی جس میں ایک بڑی تعداد میں لوگ جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ اسپتال زخمیوں سے بھر جائیں گے مگر عجیب بات یہ تھی کہ وہ دونوں نوجوان جنہوں نے فساد کو ہوا دی تھی وہ پولیس کا گھیرا توڑ کر بہ حفاظت اپنے اپنے گھر پہنچ گئے۔

جونہی سورج کی کرنیں افق پر نمودار ہوئیں پیرو کا مرکزی شہر جاگ اٹھا!

لیما کے باسیوں نے نیند کو الوداع کہہ، انگڑائی لی اور بستر چھوڑ دیا۔ توانائی ان کے رگ و پے میں دوڑ رہی تھی اور وہ پُریقین تھے کہ آج کا دن یادگار ثابت ہوگا۔

اٹھارہ سالہ فرانسسکو پیریز نے بھی سستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ماں کی پکار سنتے ہی وہ چھلانگ مار کر کھڑا ہو گیا اور غسل خانے کی جانب دوڑ پڑا۔ اس کی پھرتی بلاجواز نہیں تھی،

گزشتہ کئی ہفتوں سے وہ اسی دن کا تو انتظار کر رہا تھا۔

اگیتا نے فوراً ہی گرما گرم ناشتا میز پر چن دیا۔ وہ جانتی تھی کہ فٹبال کے عشق میں مبتلا اُس کا بیٹا آج گھر میں نہیں ٹکے گا۔ جب فرانسکو میز پر پہنچا، اُس کا باپ البرٹو پیریز وہاں موجود تھا اور عینک لگائے اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر فرانسکو نے اپنی ماں کو بوسا دیا اور دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔

"اپنا خیال رکھنا فرانسکو!" باپ نے اخبار سے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ وہ ایک طبیب تھا اور اِس بات پر قطعی خوش نہیں تھا کہ اُس کا اکلوتا بیٹا خاندانی پیشہ اپنانے کے بجائے ایک فٹبالر بننا چاہتا ہے۔

البرٹو نے بات جاری رکھی۔ "لیما پر آج دیوانگی طاری ہے، خود کو اس کے حوالے کرنے سے اجتناب برتنا!"

"اور جلدی لوٹ آنا بیٹا۔" اگیتا کی آنکھوں میں ممتا کی چمک تھی۔

"جی ضرور، آپ بے فکر رہیں۔" فرانسکو کا لہجہ مودبانہ تھا۔ "الوداع!"

گھر سے نکلتے ہی اُس کی نظر بوڑھے مارکیز پر پڑی، جو گھر سے ملحقہ مطب میں ملازم تھا اور اُس وقت مطب کھول رہا تھا۔

"کیسے ہو نوجوان؟" مارکیز نے بہ آواز بلند فرانسکو کو مخاطب کیا۔

"بہترین۔ آپ سنائیں مسٹر مارکیز!" وہ مسکرایا۔

"ہمیشہ کی طرح صحت مند۔" بوڑھے نے قہقہہ لگایا۔ "تمہاری تیاریاں پوری ہیں؟"

"جی ہاں!" نوجوان کا چہرہ دمک رہا تھا۔

"خوب! میری نیک تمنائیں تمہارے اور پیرو کے ساتھ ہیں، الوداع!" بوڑھے نے ہاتھ ہلایا۔

اب فرانسکو سڑک پر تھا اور تیزی سے مرکزی فرنیچر مارکیٹ کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں گیبر اُس کا منتظر تھا۔

اُس نے نظریں گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ دن پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ بازار کھل چکے تھے۔ چائے خانوں پر رش تھا اور سڑک پر خاصی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔

فرانسکو اِس گہما گہمی کا سبب جانتا تھا۔ اُسے اِس بات کا بھی علم تھا کہ ہر چہرے پر سجی مسکراہٹ کے پیچھے اضطراب کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ وہ خود بھی کم و بیش اِن ہی احساسات سے دوچار تھا اور اِس متضاد کیفیت کا سبب چند گھنٹوں بعد شروع ہونے والا وہ فٹبال مقابلہ تھا جس نے پورے پیرو میں سنسنی پھیلا رکھی تھی۔

24 مئی 1964 کے روز لیما کے نیشنل اسٹیڈیم میں پیرو اور ارجنٹینا کے درمیان کھیلا جانے والا وہ میچ خصوصی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ فاتح ٹھہرائی جانے والی ٹیم ٹوکیو اولمپکس کے لیے کوالیفائی کر جاتی۔ یہی سبب تھا کہ پورے پیرو کی نظریں نیشنل اسٹیڈیم پر لگی تھیں۔ وہ تمام ہوٹل اور چائے خانے جہاں ریڈیو سیٹ موجود تھے، پوری طرح بھر چکے تھے۔

البتہ فرانسکو اور گیبر نے کسی ہوٹل کا رخ نہیں کیا۔ انہیں اِس کی ضرورت نہیں تھی۔ جیبوں میں میچ کے ٹکٹ جو موجود تھے۔ فرنیچر مارکیٹ میں ملنے کے بعد اب وہ تیزی سے اسٹیڈیم کی جانب بڑھ رہے تھے۔ فرانسکو نے گلے میں پیرو کا جھنڈا باندھ رکھا تھا، بینرز اور پوسٹرز گیبر کے ہاتھوں میں تھے۔

گو کہ میچ کے باقاعدہ آغاز میں پورا گھنٹا باقی تھا لیکن اسٹیڈیم میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ 47 ہزار دیوانوں کی موجودگی میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پورا شہر اسٹیڈیم پر چڑھ دوڑا ہو۔

تماشائیوں نے پیرو کے جھنڈے تھام رکھے تھے۔ وہ ہم آواز ہو کر قومی گیت گا رہے تھے۔ کئی من چلوں نے اپنے چہرے پینٹ کرا رکھے تھے۔ گیبر اور چند نوجوان گروہ کی صورت میں روایتی رقص کر رہے تھے۔

فرانسکو ہوا میں تیرتی توانائی محسوس کر سکتا تھا جس نے اسٹیڈیم کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اُسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ یہی توانائی چند گھنٹوں بعد تباہی میں تبدیل ہو جائے گی۔

جیسے ہی پیرو اور ارجنٹینا کے کھلاڑیوں نے میدان میں قدم رکھا، جذبات کا طوفان امڈ آیا۔ ولولہ انگیز گیتوں کی جگہ شور و غل نے لے لی۔ دوسری جانب ریڈیو سیٹ کے گرد گھیرا ڈالے لاکھوں سامعین کی دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔

یوروگوائے سے تعلق رکھنے والے ریفری انجل پازوس کے سیٹی بجاتے ہی فٹبال کو ٹھوکر لگائی گئی اور 90 منٹوں پر محیط اُس مقابلے کا آغاز ہو گیا، جس کے اختتام پر فٹبال کی تاریخ کے بدترین المیے نے جنم لیا!

☆☆☆

بے شک تماشائی جوش اور ولولے سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ اپنی ٹیم کو فاتح دیکھنے کی خواہش میں سُلگ رہے تھے، تاہم انہوں نے نظم و ضبط قائم رکھا۔ ماحول پر چھائی

دیوانگی کے باوجود وہ اپنی نشستوں پر موجود رہے۔ وہ میزبان تھے اور مہمان ٹیم پر اچھا تاثر چھوڑنا چاہتے تھے، تاہم یہ نہیں جانتے تھے کہ ایک حادثہ دھیرے دھیرے اُن کی جانب بڑھ رہا ہے۔

اگرچہ دونوں ٹیمیں ہم پلہ تھیں، لیکن میچ کے دوسرے ہاف میں ارجنٹینا کے کھلاڑیوں کی ایک کامیاب کوشش نے پیرو کی دفاعی دیوار توڑ کر گیند جیت میں پہنچا دی اور مہمان ٹیم نے ایک صفر کی برتری حاصل کر لی۔

مخالف ٹیم کاری حملہ کر چکی تھی اور تماشائیوں کے لیے وہ لمحہ کسی صدمے سے کم نہیں تھا۔ وہی اسٹیڈیم جہاں چند ساعت قبل کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، ارجنٹینا کے گول کے بعد اب مکمل سناٹا تھا۔ پیرو کے حامیوں کی امید دم توڑ رہی تھی... سپنے بکھر رہے تھے۔

اچانک مایوسی کی اُس چپ میں ایک پُر جوش نعرہ بلند ہوا۔ "آگے بڑھو ساتھیو، ہم تمہارے ساتھ ہیں!"

سب نے اُس اسٹینڈ کی سمت دیکھا جہاں سے آواز بلند ہوئی تھی۔ نعرہ لگانے والا ایک نوجوان تھا جس نے پیرو کا جھنڈا مفلر کی طرز پر گلے پر باندھ رکھا تھا۔

"آگے بڑھو..." فرانسکو نے مکّا ہوا میں لہرایا۔ "ہم تمہارے ساتھ ہیں!"

اُس کے جذبے نے مایوسی کی دیوار میں دراڑ ڈال دی۔

ایک انکلوژر سے آواز آئی۔ "ہاں، ابھی مقابلہ باقی ہے۔"

ایک اور تماشائی کھڑا ہو گیا۔ "کاری حملہ کرو!"

ایک نوجوان چلّایا۔ "ہمیں ٹوکیو جانا ہے، آگے بڑھو!"

واقعی مقابلہ باقی تھا۔ پیرو کے کھلاڑیوں نے پھر صف بندی کی۔ گیند کو ٹھوکر لگا کر مقابلے کا آغاز کیا گیا۔ ارجنٹینا کی ٹیم کو صورتِ حال کا ادراک تھا' سو اُس کے کھلاڑی فوراً دفاع پر چلے گئے اور اپنے گول کے نزدیک پوزیشنیں سنبھال لیں۔ وہ ایک صفر کی برتری حاصل کر چکے تھے اور کھیل کے اختتام تک اس برتری کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

ارجنٹینا کی دفاعی حکمتِ عملی نے پیرو کی ٹیم کو کھل کر کھیلنے کا موقع دیا۔ اب گیند اُن کے پیروں میں تھی۔ کھلاڑی تیزی سے ایک دوسرے کو پاس کر رہے تھے اور مخالف ٹیم کی دفاعی لائن توڑنے میں جُتے تھے، پر یہ آسان نہیں تھا۔ ارجنٹینا کا دفاع مشہور تھا۔

اپنی ٹیم کو متحرک دیکھ کر تماشائیوں کی امید عود کر آئی۔ اُنہوں نے نشستیں چھوڑ دیں اور کھڑے ہو کر کھلاڑیوں کی ہمت بڑھانے لگے... وہ ایک بار پھر ہم آواز ہو کر ملی نغمے گا رہے تھے، جھنڈے لہرا رہے تھے، رقص کر رہے تھے۔

چوراہوں، سڑکوں اور ہوٹلوں میں ریڈیو سیٹ کے گرد بیٹھے سامعین بھی جو چند لمحات قبل مایوسی میں گھرے تھے، اب لیما کے ہر دل عزیز صداکار پیدیرو کی پُر جوش آواز کے سہارے امید کی طرف پلٹ چکے تھے۔ پیدیرو اپنے مخصوص انداز میں میچ کی تفصیلات اُن تک پہنچا رہا تھا، میزبان ٹیم کے حملوں کی بابت آگاہ کر رہا تھا، سامعین کی ہمت بڑھا رہا تھا۔ "سامعین، پیرو کی ٹیم میچ پر چھائی ہوئی ہے... فارورڈز مخالف ٹیم کے گول کی جانب تیزی سے بڑھتے ہوئے... خوبصورت پاس... اور ایک شاندار حملہ... اوہ، گیند گول پوسٹ کے بے حد نزدیک سے گزر گئی... ایک اچھی کوشش تھی۔"

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ارجنٹینا کے کھلاڑی شدید دباؤ محسوس کر رہے تھے۔ وہ ہر صورت اپنی برتری برقرار رکھنا چاہتے تھے، دوسری جانب مخالف ٹیم تابڑ توڑ حملے کر رہی تھی۔

☆☆☆

کھیل اختتامی لمحات میں داخل ہو چکا تھا۔ ریڈیو سامعین پیدیرو کی آواز کا ارتعاش محسوس کر سکتے تھے۔ دوسری جانب اسٹیڈیم میں موجود تماشائی بھی مضطرب تھے۔ کسی کے لبوں پر دعا تھی، کوئی جذبات کی شدت سے لرز رہا تھا، پھر بھی کوئی شخص بھی امید کا دامن چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر پیرو کی ٹیم گول کرنے میں کامیاب ہو گئی تو کھیل "ایکسٹرا ٹائم" میں داخل ہو جائے گا، جہاں فتح کے مواقع وسیع ہوں گے کیونکہ ارجنٹینا کے کھلاڑی نفسیاتی طور پر دفاع پر چلے گئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُنھوں نے اپنی ٹیم کی حوصلہ افزائی جاری رکھی۔

"ابھی مقابلہ باقی ہے... کاری حملہ کرو... ہمیں ٹوکیو جانا ہے!" یہ نعرے ماحول میں گردش کر رہے تھے۔

میچ ختم ہونے میں فقط چند منٹ رہ گئے۔ تماشائیوں کے نعرے آہستہ آہستہ دم توڑنے لگے۔ شکست کے اندیشے نے ہونٹ سی دیے، خاموشی کا آسیب ماحول پر چھانے لگا جس سے نبرد آزما ہونے کے لیے پیرو کے حامیوں نے دعا کا ہتھیار استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

اب وہ چُپ تھے اور زیرِ لب دعائیں پڑھ رہے تھے۔

میچ میں تماشائیوں کی امید اور توجہ کا مرکز پیرو کا مشہور کھلاڑی لوبوٹون تھا جو مخالف ٹیم کی گول پوسٹ پر کئی [illegible] کر

چکا تھا۔

لوبوٹون مشکل حالات میں ناممکن گول اسکور کرنے کا ماہر تصور کیا جاتا تھا۔ ماضی میں اس نے کئی تناؤ بھرے مقابلوں میں پیرو کو فتح دلائی تھی، یہی وجہ ہے کہ شائقین اُس کے دلدادہ تھے۔

فرانسکو بھی اس کا مداح تھا، اسے اپنا آئیڈیل تصور کرتا تھا اور میچ کے اختتامی لمحات میں اُس کی نظریں لوبوٹون ہی پر مرکوز تھیں۔

''تم کرسکتے ہو لوبوٹون، مجھے یقین ہے!'' اس نے دھیرے سے کہا۔

اور... لوبوٹون نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ وہ واقعی پھرتیلا اور چالاک تھا۔ میچ کے اختتام سے چند سیکنڈ قبل اُس نے کمالِ مہارت سے گیند ارجنٹینا کے گول پوسٹ میں پہنچا دی۔ میچ برابر ہوگیا!

وہ لمحہ ناقابلِ یقین تھا۔ جونہی گیند نیٹ میں پہنچی، مسرت کی پُرزور قوت نے اسٹیڈیم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہوا کے دوش پر سفر کرتی پیدرو کی آواز نے شہر میں موجود لاکھوں افراد کو فرطِ جذبات سے بھر دیا۔

اسکورر بھی فوراً حرکت میں آگیا۔ اسکور بورڈ پر پیرو کے آگے سے ''صفر'' کا ہندسہ ہٹا کر ''ایک'' کا ہندسہ لگا دیا گیا۔

اسٹیڈیم میں جشن کا سماں تھا۔ مسرور تماشائی ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے، اُن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

انبساط کی اُس کیفیت میں وہ یہ دیکھ ہی نہیں سکے کہ پیرو کے کھلاڑیوں نے ریفری کو گھیر رکھا ہے۔ انہیں احساس ہی نہیں ہوا کہ میدان میں ایک واقعہ رونما ہوچکا ہے۔

تماشائیوں کے مانند ریڈیو سامعین کو گول کی خوشخبری سنانے والے پیدرو کو بھی یہ سمجھنے میں پورا ڈیڑھ منٹ لگا کہ پیرو کے کھلاڑی جشن منانے کے بجائے آخر کس بات پر ریفری سے اُلجھ رہے ہیں۔

واقعہ کچھ یوں تھا کہ یوروگوائے سے تعلق رکھنے والے ریفری اینجل پازوس نے گول کو ''فاؤل'' قرار دیتے ہوئے رد کردیا تھا۔ ارجنٹینا کی برتری تاحال برقرار تھی اور میچ کا اختتام آن پہنچا تھا۔

☆☆☆

تماشائیوں پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ وہ اس پر یقین کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے کہ گول رد کیا جاچکا ہے۔ استعجاب کے زیرِ اثر وہ پلکیں جھپک رہے تھے، ایک دوسرے سے سوال کررہے تھے۔

''آخر ہوا کیا ہے؟'' گیبز نے فرانسکو سے پوچھا جو پورا معاملہ سمجھ چکا تھا اور اب سر تھامے بیٹھا تھا۔

''یہ اسکورر نے دوبارہ صفر کا ہندسہ کیوں لگا دیا ہے؟'' گیبز کے لہجے میں اضطراب تھا۔

''ریفری نے گول خارج کردیا ہے۔'' فرانسکو نے دھیرے سے کہا۔

''کیا؟'' گیبز کی آنکھوں میں غیر یقینی تھی۔ اُس نے میدان کی جانب دیکھا جہاں پیرو کے کھلاڑیوں کی حرکت سے خفگی عیاں تھی۔ وہ مشتعل معلوم ہوتے تھے۔ دوسری جانب مہمان ٹیم کے چہروں سے اطمینان جھلک رہا تھا۔

اسکور بورڈ پر پیرو کے آگے ''صفر'' کا ہندسہ 47 ہزار تماشائیوں کا منہ چڑا رہا تھا۔ ٹوکیو جانے کا سپنا بکھر چکا تھا۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔'' گیبز نے دھیرے سے کہا۔ مگر یکدم وہ پھٹ پڑا۔ ''یہ دھوکا ہے۔ ریفری جانب دار ہے۔ وہ اُن سے ملا ہوا ہے!'' وہ دیوانہ وار چیخ رہا تھا۔

''ہاں، یہ بے ایمانی ہے۔'' ایک نوجوان نے نعرہ اُڑاتے ہوئے اُس کا ساتھ دیا۔

''ہم یہ فیصلہ ماننے کو تیار نہیں!'' ساتھ والے اسٹینڈ سے ایک ناراض آواز آئی۔

''میچ دوبارہ ہونا چاہیے۔'' ایک احتجاجی مطالبہ سامنے آیا۔

''اس بدمعاش ریفری کو سبق سکھانا پڑے گا۔'' ایک نوجوان دہاڑا اور یوں ایک پُرتشدد منصوبہ بنتا جانے لگا۔

اُن بھری ہوئی غصہ ور آوازوں کو یکجا ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا کہ شکست کے احساس نے تماشائیوں کو آگ بگولا کردیا تھا۔ جلد ہی ہر انکلوژر سے احتجاجی نعرے بلند ہونے لگے۔ تماشائی خالی بوتلیں اور کوڑا کرکٹ میدان میں پھینکنے لگے۔

حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے ریفری نے میچ روک دیا۔ اسٹیڈیم انتظامیہ کو بھی بگڑتی ہوئی صورتِ حال کا ادراک ہوگیا۔ اُنہوں نے کھلاڑیوں کو ڈریسنگ روم پہنچانا شروع کر دیا اور یوں میدان دھیرے دھیرے خالی ہونے لگا۔

میچ کا خاتمہ اب یقینی تھا۔ اسکور بورڈ حتمی نتیجے کا اعلان کررہا تھا۔ ریڈیو صداکار بھی سامعین کو بری خبر سنا چکا تھا لیکن غصیل تماشائی اسٹیڈیم سے رخصت ہونے کی بابت نہیں سوچ رہے تھے۔ وہ وہیں تھے، اُن کی نظریں ریفری پر ٹکی تھیں جو تاحال میدان میں موجود تھا۔

اشتعال کا بھوت غالب آنے کو تھا!!

☆☆☆

ماہرین متفق ہیں کہ ہجوم کی نفسیات بے حد عجیب اور پُرقوت ہوتی ہے۔ مجمع میں خیال تیزی سے حرکت کرتا ہے، پلوں میں ایک انسان سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں منتقل ہوجاتا ہے اور چند ہی منٹوں میں پورے گروہ کو ''ہپناٹائز'' کردیتا ہے۔ اور اگر خیال تخریبی ہو تو بربادی جنم لیتی ہے۔

24 مئی 1964 کو بھی کچھ ایسا ہی ہوا! وہاں 47 ہزار تماشائی موجود تھے، ایک پوری فوج۔ ہر شخص غصے سے سُلگ رہا تھا، ناراض تھا۔ ریفری کو مغلظات سے نواز رہا تھا، صلواتیں سنا رہا تھا۔

دوسری جانب ریفری خود کو صورتِ حال سے لاتعلق ظاہر کرتے ہوئے، میدان میں کھڑا انتظامیہ سے کسی معاملے پر بحث کررہا تھا۔ گو کہ اُسے اندازہ تھا کہ اُس کی موجودگی تماشائیوں کو کھل رہی ہے لیکن یہ علم نہیں تھا کہ جلد یہ غصہ تخریبی رنگ اختیار کرنے والا ہے۔

یہ پلوں کا معاملہ تھا۔ اشتعال ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے انسان میں سرایت کر گیا اور یوں وہاں موجود ہزاروں افراد نے آتش گیر مادے کی شکل اختیار کرلی۔ اب دھماکے کے لیے فقط ایک چنگاری کی ضرورت تھی، اور پھر یہ واقعہ بھی رونما ہوگیا۔

وہ ایک جوشیلا نوجوان تھا جو غصے سے بھر چکا تھا۔ جب صورتِ حال اُس کی برداشت سے باہر ہوگئی، اُس نے نعرہ لگایا اور بازو لہراتا ہوا اسٹینڈ کے اگلے حصے میں لگے حفاظتی جنگلے پر چڑھ گیا۔

اس عمل نے تماشائیوں کو مبہوت کردیا۔ وہ پلکیں جھپکے بغیر اُسے تک رہے تھے۔ نوجوان نے لمحوں میں جنگلا عبور کرلیا۔ جونہی اُس کے قدموں نے زمین کو چھوا، اسٹیڈیم میں ایک شور بلند ہوا۔

نوجوان نے فوراً ہی اُس سمت دوڑ لگا دی جہاں ریفری کھڑا تھا۔

جوشیلا نوجوان تیزی سے ریفری کی جانب بڑھ رہا تھا، اُس کے پیچھے جوش میں بھری آوازیں تھیں جو اُسے تقویت دے رہی تھیں۔

اس بے پناہ شور نے سیکیورٹی اہل کاروں کو چوکنا کردیا لیکن جتنی دیر میں وہ حرکت میں آتے نوجوان ریفری تک پہنچ چکا تھا جو قطعی توقع نہیں کررہا تھا کہ ایک ناراض تماشائی اس کی درگت بنانے کا ارادہ کیے بیٹھا ہے۔

پہلے نوجوان نے ریفری کے پیٹ میں گھونسا رسید کیا۔ ریفری دوہرا ہوگیا۔ پھر چھلانگ لگا کر اپنی کہنی اس کی کمر پر دے ماری۔ اگلے ہی لمحے ریفری زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔

اس اچانک حملے نے ریفری کے ارد گرد کھڑے افراد کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ جیسے ہی انہیں حالات کی نزاکت کا ادراک ہوا، وہ اسے روکنے کے لیے دوڑ پڑے لیکن اس وقت تک نوجوان ریفری کی پسلیوں میں کئی لاتیں رسید کرچکا تھا۔

جونہی پولیس اہل کاروں نے نوجوان کے گرد گھیرا ڈالا، ایک نیا تماشا شروع ہوگیا۔

وہ اُس کے گرد دائرہ بناتے، اُس پر چھلانگ لگاتے لیکن وہ بڑی مہارت سے انہیں چکما دے کر نکل جاتا۔ تماشائی اس کھیل سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ وہ نوجوان کے ساتھ تھے اور پولیس اہل کاروں پر پھبتیاں کس رہے تھے۔

جب نوجوان قابو میں نہیں آیا تو اسٹیڈیم کے دوسرے کونے سے مزید پولیس اہل کار میدان میں داخل ہوگئے۔ ان کے ساتھ کتے بھی تھے۔ اب نوجوان کا مقابلہ چالیس پولیس اہل کاروں اور ان کے تربیت یافتہ کتوں سے تھا۔ اس نے اپنے مخالفین سے بچنے کی بھرپور کوشش کی لیکن گھیرا مضبوط تھا، پولیس نے جلد اس پر قابو پالیا اور ایک اہل کار نے آگے بڑھ کر اُسے بالوں سے پکڑ لیا۔

''ارے یہ تو ہازی ہے، ہمارے ملازم مارکیز کا بیٹا!'' فرانسکو چلایا۔

''کیا!'' گیبز کے لہجے میں حیرت تھی۔ ہازی، گیبز کے بچپن کا دوست تھا۔ ''لیکن اس نے تو کہا تھا کہ وہ آج کا میچ دیکھنے نہیں آسکتا۔''

''لیکن وہ یہاں موجود ہے۔'' فرانسکو کے لہجے میں اضطراب تھا۔

میدان میں حالات بدل رہے تھے۔ چند منٹ پہلے جو نوجوان پولیس اہل کاروں کو گھنگی کا ناچ نچا رہا تھا، اب مکّوں اور لاتوں کی زد میں تھا اور تماشائیوں کے جذبات میں اشتعال انگڑائی لے رہا تھا۔

دوسری جانب غصے کا سیاہ بادل شہر میں بھی داخل ہوگیا تھا جہاں ہر شخص ریڈیو سیٹ سے لگا بیٹھا تھا۔

☆☆☆

ہازی نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ پولیس اہل کاروں کے گھونسوں نے اُسے زمین پر گرا دیا اور اس

بے کرتے ہی تماشائیوں کے نعروں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔
فرانسکو نے پلٹ کر دیکھا۔ اُسے اسٹینڈ کے اوپری حصے میں احتجاجی قوت حرکت کرتی محسوس ہوئی۔ پلوں میں اُس نے اندازہ لگالیا کہ ہجوم دیوانہ ہوگیا ہے، میدان میں اترنا چاہتا ہے۔
"ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔" اُس نے گیچر کو مخاطب کیا لیکن... گیچر وہاں نہیں تھا۔ اُس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ گیچر کو تلاش کرنا چنداں مشکل ثابت نہیں ہوا۔ وہ بہ آسانی نظر آگیا، کیونکہ وہ تیزی سے حفاظتی جنگلے پر چڑھ رہا تھا۔
"گیچر... روک جاؤ!" فرانسکو چلایا لیکن اس کی آواز وہاں تک نہیں پہنچ سکی۔
دوسری جانب اب پولیس اہل کار زخمی ہازی کو کالر سے پکڑ کر بے دردی سے گھسیٹ رہے تھے۔ یہ منظر تابوت کی آخری کیل ثابت ہوا۔
"رُک جاؤ بدمعاشو!" یہ گیچر کی آواز تھی جو حفاظتی جنگلا عبور کر کے میدان میں داخل ہو چکا تھا اور پولیس اہل کاروں کی سمت بڑھ رہا تھا۔
گیچر کے میدان میں داخل ہوتے ہی وہاں موجود ہزاروں تماشائیوں کے کانوں میں پُراسرار سرگوشیاں ہونے لگیں کہ وہ بھی ایسا کر سکتے ہیں، بلکہ انہیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔
لوگ لاشعوری طور پر حفاظتی جنگلوں کی سمت بڑھنے لگے۔ اگلے ہی لمحے کئی نوجوان اُن پر چڑھ گئے۔ ایسے میں ایک آواز بلند ہوئی۔ "جنگلا توڑ دو!"
یہ ایک خطرناک خیال تھا جسے دہرانے والے نے اس کی قوت کو مہمیز کیا۔ "ہاں، انہیں اکھاڑ پھینکو!"
جلد ہی ان نعروں نے مطالبے کی شکل اختیار کر لی اور اگلی نشستوں پر موجود ہزاروں افراد کو اس احساس سے بھر دیا کہ وہ بہت پُرقوت ہیں، جنگلے اُن کے سامنے بے حیثیت ہیں۔
اب ہزاروں ہاتھ جنگلے کو دھکیل رہے تھے۔ دوسری جانب ہازی کو چھڑانے کے ارادے سے میدان میں اترنے والا گیچر پولیس کے نرغے میں آگیا تھا۔ فرار کی راہیں مسدود پا کر گیچر نے ایک پولیس اہل کار کو گھونسا رسید کر دیا۔
یہ ایک فاش غلطی تھی۔ تمام پولیس اہل کار اس حملے کے جواب میں اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس منظر نے ہجوم کو مزید مشتعل کر دیا اور وہ جنگلا توڑنے کے لیے پوری قوت صرف کرنے لگا۔

پریشانیوں میں گھرا فرانسکو سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ اپنے دوست کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن اسٹینڈ میں حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ لاشعوری طور پر وہ بھی جنگلے کی سمت بڑھ رہا تھا لیکن اوپری نشستوں سے آتی تپش نے اس کے پاؤں جکڑ لیے۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور ششدر رہ گیا۔
تماشائیوں نے نشستوں کو آگ لگا دی تھی۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں تھامے پوسٹرز اور بینرز بھی نذرِ آتش کر دیے تھے۔ وہ دیوانے ہو گئے تھے اور شعلوں کا عکس اُن کے چہروں کی ہیبت ناکی میں اضافہ کر رہا تھا۔
فرانسکو نے پلٹ کر اگلے حصے کی جانب دیکھا۔ جنگلے پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ وہ ٹوٹنے کو تھا۔ پھر اس کی نظریں میدان کی سمت اٹھیں جہاں اب گیچر کو بے دردی سے گھسیٹا جا رہا تھا۔
اچانک شور بلند ہوا اور اوپری نشستوں پر موجود تماشائیوں نے نیچے اترنا شروع کر دیا۔ اُن کی حرکت میں اضطراب تھا، ہیجان تھا۔
اس صورتِ حال نے فرانسکو کو چونکا دیا۔ وہ حادثے کی بُو نتھنوں میں داخل ہوتی محسوس کر سکتا تھا۔ پریشانی کے عالم میں اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ اچانک اس کی نظر اوپری کونے میں موجود اس راہ داری پر پڑی جس کے اگلے حصے میں بیت الخلا تھے۔
اس نے سوچنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور راہ داری کی جانب دوڑ پڑا۔

☆☆☆

جنگلا ٹوٹنے کی آواز یقینی طور پر ہیبت ناک ہوگی لیکن وہاں اتنا شور تھا کہ وہ سنائی ہی نہیں دی۔ جونہی راستہ کھلا، اوپری اسٹینڈ پر موجود ہزاروں تماشائیوں نے نیچے کی سمت دوڑ لگا دی اور یہی وہ موقع تھا جب اموات کے ہولناک سلسلے کا باقاعدہ آغاز ہوا۔
وہاں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ کئی بوڑھے شہری بھی میچ دیکھنے آئے ہوئے تھے جو نہ تو اُس احتجاجی سرگرمی کا حصہ بننے کے قابل تھے، نہ ہی خود کو محفوظ رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور اس لیے وہ ایک بڑی مشکل میں پھنس چکے تھے۔
تماشائی دیوانگی کے زیرِ اثر تھے۔ وہ میدان میں اترنے کے لیے پاگل ہوئے جا رہے تھے اور یہ پاگل پن موت کو دعوت دے رہا تھا۔ وہ ایک ریلے کی صورت نیچے اترے۔ ایسا ریلا جس کے آگے بند باندھنا ناممکن تھا۔ اس طوفان کی زد میں آنے والے سیکڑوں افراد اپنا توازن کھو

بیٹھے۔ کئی لڑکھڑائے لیکن سنبھل گئے اور وہ بدنصیب جو سنبھل نہ سکے، زمین پر گر گئے، جہاں موت اُن کی منتظر تھی کیونکہ اب دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ممکن نہیں تھا۔
وہ بدقسمت تماشائیوں کے قدموں تلے کچلے گئے۔ اور یہ ہولناک عمل پوری شدت کے ساتھ ہر اسٹینڈ میں دہرایا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن بدنصیبوں کو چیخنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ پلوں میں اجل نے انہیں نگل لیا۔
اب وہاں لہو کی تال پر رقص کرتے دیوانے تھے، جن کے جوتے خون چاٹ رہے تھے۔ درجنوں افراد ابدی نیند سو چکے تھے۔
ہازی اور گیچر کی تقلید میں ہزاروں مشتعل افراد میدان میں داخل ہو چکے تھے جو اس بات سے یکسر لاعلم تھے کہ وہ کس مقصد کے لیے یہ عمل انجام دے رہے ہیں۔
صورتِ حال بگڑتی دیکھ کر پولیس اہل کار فوری حرکت میں آگئے۔ اسٹیڈیم کی دائیں سمت سے جہاں سیکیورٹی سیکشن تھا درجنوں پولیس اہل کار ہاتھوں میں ڈنڈے لیے برآمد ہوئے اور انہوں نے مشتعل تماشائیوں پر حملہ کر دیا لیکن اُن کی کوششیں جمِ غفیر پر قابو پانے میں ناکام رہیں۔
ایسے میں پولیس کا ایک اور دستہ آنسو گیس کے شیل لیے میدان میں آگیا۔
اپنے ہی شہریوں پر شیل فائر کیے گئے۔ چند شیل اسٹینڈز کے ان حصوں میں جا گرے، جہاں ہزاروں افراد پھنسے ہوئے تھے۔ جلد ہی دھوئیں کے عفریت نے اُن مظلوموں کو اپنے نرغے میں لے لیا۔
جہاں تک میدان میں گرنے والے شیلز کا تعلق ہے، وہ لاحاصل ثابت ہوئے۔ چند تماشائی ضرور پیچھے کی طرف دوڑے، لیکن اکثریت پاگل پن کے زیرِ اثر تھی اور وہ پلٹنے کے لیے تیار نہیں تھی، سو شیل اٹھا اٹھا کر واپس پولیس کی جانب پھینکے جانے لگے۔
اس اقدام نے پولیس اہل کاروں کو حواس باختہ کر دیا۔ وہ فیصلہ کرنے کی قوت سے محروم ہو گئے... آخر کار متذبذب سیکیورٹی چیف نے مشتعل افراد پر فائرنگ کا خوفناک حکم جاری کر دیا۔
اگلے چند سیکنڈز میں درجنوں پولیس اہل کار ہاتھوں میں بندوقیں تھامے میدان میں آچکے تھے۔ میدان جنگی محاذ کا منظر پیش کر رہا تھا۔

☆☆☆

فرانسکو کو بیت الخلا کی کھڑکی سے نکلنے میں زیادہ

وقت پیش نہیں آئی۔ اب وہ اسٹیڈیم کے بیرونی حصے میں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سیکیورٹی سیکشن احاطے کے اندر دائیں جانب ہے۔ بازی اور گیبر کو گھسیٹنے والے اہل کار اسی جانب غائب ہوئے تھے۔

اس نے آگے بڑھنے سے قبل اسٹیڈیم کے مرکزی دروازے کی سمت دیکھا۔ توقع کے عین مطابق وہاں قفل پڑا تھا، جسے حسبِ روایت میچ کے اختتام پر کھولا جاتا تھا، لیکن حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ انتظامیہ اس جانب توجہ ہی نہیں دے سکی۔

اسٹیڈیم کے اندرونی حصے سے بلند ہوتا شور، چیخ و پکار اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی اور وہ دھیرے دھیرے سیکیورٹی سیکشن کی جانب بڑھ رہا تھا۔

اچانک اسے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً ایک جانب ہو گیا۔ دیوار کی اوٹ سے وہ دیکھ سکتا تھا کہ سامنے سے گزرنے والے پولیس اہل کاروں کے ہاتھوں میں اسلحہ ہے اور ان کے تیور انتہائی خطرناک ہیں۔

اس دستے کے گزرنے کے بعد سیکیورٹی سیکشن سے چند اور پولیس اہل کار برآمد ہوئے۔ فرانسکو دیوار کے پیچھے ہی چھپا رہا۔ وہ پولیس اہل کار مرکزی دروازے کی جانب بڑھ رہے تھے۔

”مجھے گیبر اور بازی کو ہر صورت یہاں سے نکالنا ہوگا۔“ فرانسکو نے خود سے کہا۔ ”مگر کیسے؟“

ابھی وہ اسی سوچ میں غلطاں تھا کہ اسٹیڈیم گولیوں کی ہیبت ناک آواز سے گونج اٹھا۔

”یہ ناممکن ہے... کیا وہ عوام پر فائرنگ کر رہے ہیں۔“ وہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن جب مزید فائر ہوئے، اسے تسلیم کرنا پڑا کہ میدان میں جنگ چھڑ گئی ہے۔

پولیس اہل کاروں نے تماشائیوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کی تھی جس کے انتہائی منفی نتائج سامنے آئے۔

گولیوں کی آوازیں سنتے ہی سیکڑوں تماشائی میدان چھوڑ کر واپس اسٹینڈز کی جانب دوڑ پڑے۔ چند نے مرکزی دروازے کی سمت بڑھنا شروع کر دیا جو مقفل تھا۔

خوف کے زیرِ اثر تماشائیوں میں سے کئی اپنے حواس کھو چکے تھے۔ اگلی بار جب انہیں اپنی پشت سے فائرنگ کی مکروہ آواز سنائی دی، وہ اپنا توازن کھو بیٹھے اور پیچھے آنے والوں کے قدموں تلے روندے گئے۔

گو کہ ہزاروں افراد میدان میں اتر آئے تھے لیکن اسٹینڈز میں اب بھی ہزاروں افراد موجود تھے، جو فائرنگ شروع ہوتے ہی خارجی راستوں کی سمت دوڑ پڑے۔

کچھ مشتعل تماشائی ایسے بھی تھے، جو میدان چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے توڑ پھوڑ کا عمل جاری رکھا۔ جو شے ہاتھ لگی، اسے تباہ کر دیا۔ کھڑکی، دروازوں کو آگ لگا دی۔

☆☆☆

قدموں کی دھمک سن کر فرانسکو کو ایک بار پھر اوٹ میں ہونا پڑا۔ یہ اسٹیڈیم سے برآمد ہونے والے وہ سیکڑوں تماشائی تھے جو مرکزی دروازے کی سمت بڑھ رہے تھے۔

جب دروازوں پر موجود پولیس اہل کاروں نے ایک جمِ غفیر کو اپنی سمت آتا دیکھا، وہ فوراً وہاں سے ہٹ گئے۔

ہجوم دروازے سے پوری شدت سے ٹکرایا اور اس ٹکر کے نتیجے میں ایک المیے نے جنم لیا۔ جو لوگ ہجوم کے اگلے حصے میں تھے، وہ مقفل دروازے اور پیچھے سے آنے والوں کے درمیان بری طرح پھنس گئے اور وہیں مفلوج ہو کر رہ گئے۔

اسی اثنا میں اسٹیڈیم کے اندرونی حصے سے ایک اور ریلا برآمد ہوا اور دروازے کی سمت بڑھنے لگا۔ یوں دباؤ بڑھنے لگا اور دروازے کے اگلے حصے میں پھنسنے والے درجنوں افراد کے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا۔ زندہ رہنے کا ایک ہی طریقہ تھا، وہ دروازہ توڑ دیں لیکن یہ آسان نہیں تھا اور دوسری جانب دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

اسٹیڈیم سے باہر جانے کے چند دیگر راستے بھی تھے۔ ہجوم کے ایک ٹکڑے نے ان کی جانب بھی رخ کیا۔ جلد ہی وہاں بھی یہی صورتِ حال پیدا ہو گئی کیونکہ وہ بھی بند تھے۔

فرانسکو کی آنکھوں کے سامنے انتہائی کرب ناک مناظر تھے۔ وہ سسکتے، کراہتے ہوئے انسانوں کی آہ و بکا سن سکتا تھا جو موت سے چند قدم کے فاصلے پر تھے۔

فرانسکو کو فوری فیصلہ کرنا تھا۔ ”باہر نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہوگا!“ اس نے خود سے کہا۔

وہ جانتا تھا کہ اسٹیڈیم کی دائیں دیوار خاصی نیچی ہے۔ یہ دیوار سیکیورٹی سیکشن کے پیچھے تھی۔ اگر وہ کسی طرح اس حصے میں پہنچ جاتا تو باہر نکلنے کی کوئی سبیل ہو سکتی تھی۔

اس نے ایک نظر دروازے پر موجود جمِ غفیر پر ڈالی جس پر موت کے بادل منڈلا رہے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ سیکیورٹی سیکشن کے عقب میں پہنچنے کے لیے اسے خاصا گھوم کر جانا پڑا۔ اس دوران چیخ و پکار اور

احتجاجی نعرے اس کی سماعتوں سے ٹکراتے رہے۔ وہ بہ مشکل خود کو ان پولیس اہل کاروں کی نظروں سے اوجھل رکھنے میں کامیاب ہوا جو ٹکڑوں کی صورت میں وقفے وقفے سے سیکیورٹی سیکشن سے برآمد ہو رہے تھے۔ جب بھی ایسا موقع آتا، وہ کسی دیوار کی اوٹ میں ہو جاتا۔

اسی اثنا میں سیکیورٹی سیکشن سے ایک اور اسلحہ بردار دستہ برآمد ہوا جس کی قیادت لیما کا پولیس چیف خود کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

”چلو، ان بدمعاشوں کو سبق سکھاتے ہیں!“ اس نے کف اڑاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

اسٹیڈیم کا مرکزی دروازہ ٹوٹ گیا... اور کئی لاشیں سڑک پر گریں!

یہ وہ بدقسمت تھے، جو دم گھٹنے کے باعث اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

حواس باختہ ہجوم میں شامل ہر شخص فقط اپنی جان کی بابت فکرمند تھا، ایسے میں دروازہ عبور کرنے کا عمل وحشت ناک ثابت ہوا اور لوگوں کے کچلے جانا کا سلسلہ جاری رہا۔

دوسری جانب پولیس پوری قوت سے میدان میں داخل ہو چکی تھی۔ اسٹیڈیم فائرنگ سے گونج رہا تھا۔

اس بار پولیس نے فقط ہوائی فائرنگ پر اکتفا نہیں کیا، انہوں نے اسٹریٹ فائر بھی کیے جس سے خوفزدہ ہو کر بچے کھچے تماشائیوں نے خارجی راستوں کی سمت دوڑ لگا دی۔ پولیس نے فائرنگ جاری رکھی۔ دھیرے دھیرے اسٹیڈیم خالی ہونے لگا۔ اب وہاں فقط کچلی ہوئی لاشیں تھیں یا وہ بدنصیب تھے جو دم گھٹنے سے ہلاک ہوئے۔

میدان خالی کروانے کے بعد پولیس چیف کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اسے گمان تھا کہ حالات پر قابو پا لیا گیا ہے لیکن وہ غلط تھا۔ مشتعل افراد اب شہر کی سڑکوں کو احتجاج کے لیے چن چکے ہیں۔

اگلے چند منٹوں میں مظاہرین اسٹیڈیم سے ملحقہ علاقوں میں پھیل گئے۔ انہوں نے توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ کئی ناراض شہری بھی ان سے جا ملے۔ جرائم پیشہ افراد بھی اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے باہر آ گئے۔ یوں لیما کی سڑکوں پر لوٹ مار کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

☆☆☆

میچ ختم ہوئے کافی دیر گزر چکی تھی اور فرانسکو تاحال گھر نہیں پہنچا تھا۔

البرٹو ریڈیو سے آج رونما ہونے والے افسوس ناک حادثے کی تمام تفصیلات سن چکا تھا اور اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ کہیں اس کا بیٹا فرانسکو اسٹیڈیم میں پھوٹ پڑنے والے فسادات کی زد میں نہ آ گیا ہو۔

”دروازہ بند رکھنا، میں فرانسکو کی تلاش میں نکل رہا ہوں۔“ اذیت ناک انتظار سے تنگ آ کر بالآخر البرٹو کھڑا ہو گیا۔

”اپنا خیال رکھنا۔“ اسے رخصت کرتے ہوئے انجیلا نے دبی آواز میں کہا اور دروازہ مقفل کر دیا۔ فکر سے ہلکان وہ عورت اب گھر میں تنہا تھی۔ اس نے اپنے وجود کو کرسی کے حوالے کر دیا اور آنکھیں بند کر کے اپنے بیٹے کے لیے دعائیں کرنے لگی۔

جہاں تک فرانسکو کا تعلق ہے، وہ تاحال اسٹیڈیم میں موجود تھا اور چھپتے چھپاتے کسی طرح اسٹیڈیم کی دائیں دیوار تک پہنچ گیا تھا۔ وہ بڑی مہارت سے دیوار پر چڑھ گیا جہاں سے وہ نہ صرف سیکیورٹی سیکشن کے اندر جھانک سکتا تھا بلکہ ان تماشائیوں کو بھی دیکھ سکتا تھا جو دروازہ توڑ کر باہر نکل گئے تھے اور اب شہر کی سمت بڑھ رہے تھے۔

فرانسکو نے سیکیورٹی سیکشن میں نظریں دوڑائیں۔ وہاں الو بول رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پوری پولیس فورس میدان کی سمت چلی گئی ہو جہاں سے وقفے وقفے سے فائرنگ کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

اطمینان کرنے کے بعد فرانسکو اندر کود گیا اور فوراً ہی ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ دھیرے دھیرے اس نے آگے بڑھنا شروع کیا۔ جلد ہی وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں چار پولیس جیپیں اور ایک بڑی سی وین کھڑی تھی۔

اس نے چاروں طرف دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ دبے قدموں مرکزی بیرک کی سمت آگے بڑھنے لگا۔ دفعتاً کسی زخمی کے کراہنے کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ وہ رک گیا۔

آواز وین سے آ رہی تھی۔ وہ تیزی سے اس سمت بڑھا۔ وین کے پچھلے حصے میں زخموں سے چور بازی اور گیبر پڑے تھے۔ ان کی حالت خاصی مخدوش تھی۔ جسم پر نیل پڑے ہوئے تھے۔ سر سے خون بہہ رہا تھا۔

انہیں اس حالت میں دیکھ کر فرانسکو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، لیکن وہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے دوست کو پکارا۔ ”گیبر... گیبر۔“

کوئی جواب نہیں آیا۔

ابھی وہ اپنے دوست کی مدد کرنے کا منصوبہ ترتیب

ہی دے رہا تھا کہ اُسے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً وین سے دُور ہٹ گیا اور ایک تاریک گوشے میں چھپ کر جائزہ لینے لگا۔

وہ دو پولیس اہل کار تھے جو میدان کی سمت سے آئے اور سیدھے وین کے پچھلے حصے میں سوار ہو گئے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور فرانسکو اُن کی آواز سن سکتا تھا۔ وہ بازی اور گیپر کو پولیس ہیڈ کوارٹر لے جانے والے تھے اور وین ڈرائیور کے منتظر تھے۔

اِسی اثنا میں ایک فربہ شخص میدان کی سمت سے دوڑتا ہوا آیا اور وین کے نزدیک آ کر رک گیا۔ وین میں موجود پولیس اہل کاروں اور اُس کے درمیان چند جملوں کا تبادلہ ہوا، پھر وہ شخص چھلانگ لگا کر وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''انکل حوزے...'' فرانسکو کے منہ سے نکلا۔

وین اسٹیڈیم کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی۔

اُسی لمحے مزید فائر ہوئے!

☆☆☆

اسٹیڈیم کی سمت جانے والی سڑک پر قدم رکھتے ہی البرٹو کو ماحول میں تیرتے اشتعال کا اندازہ ہو گیا۔

جُوں جُوں وہ آگے بڑھتا گیا، تباہی کی علامات واضح ہوتی گئیں۔ جن راستوں سے مشتعل ہجوم گزرا تھا، وہاں نصب اسٹریٹ لیمپ، دکانوں اور مکانات کی کھڑکیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ کئی چھتارے زمین پر الٹے پڑے تھے چند کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔

اس دوران اُس نے چند زخمی بھی دیکھے جو مدد کے لیے پکار رہے تھے۔ ایسے افراد سے بھی سامنا ہوا جن کے ہاتھوں میں چاقو تھے، لاٹھیاں تھیں لیکن البرٹو رُکا نہیں، خود کو صورتِ حال سے لاتعلق ظاہر کرتا ہوا وہ آگے بڑھتا رہا، تاہم اسٹیڈیم کے مرکزی دروازے پر پڑی لاشیں دیکھ کر یکبارگی یاسیت نے اُس پر حملہ کر دیا، آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس پُرامن شہر پر موت یوں حملہ آور ہو سکتی ہے۔

اچانک اُسے اسٹیڈیم کی جانب سے پھر فائرنگ کی آواز سنائی دی جس نے البرٹو کے اندیشوں کو مہمیز کیا۔ اُس نے فوراً آنسو پونچھے۔ چند ساعت یونہی کھڑا رہا پھر دل کڑا کر کے آگے بڑھنے لگا۔

ابھی وہ مرکزی دروازے سے چند قدم دُور تھا کہ ایک پولیس وین دروازے سے برآمد ہوئی اور خطرناک موڑ کاٹتے ہوئے شہر جانے والی سڑک پر آ گئی۔

گو کہ یہ لمحوں کا معاملہ تھا لیکن البرٹو دیکھ سکتا تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر اُس کا چچا زاد بھائی حوزے بیٹھا ہوا ہے۔

تیزی سے آگے بڑھتی ہوئی وین اگلے ہی پل دھول کے بادل میں غائب ہو گئی۔ اُس نے گہرا سانس لیا، دہ مڑا اور اسٹیڈیم کی جانب بڑھنے لگا اس امید پر کہ شاید فرانسکو وہاں مل جائے، اِس اندیشے کو جھٹکتے ہوئے کہ شاید وہ مر چکا ہو۔

اندر داخل ہوتے ہی اُس کا سامنا سناٹے اور وحشت میں اضافہ کرتی مزید کچلی ہوئی لاشوں سے ہوا۔ گو کہ وہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا لیکن اُس منظر نے اسے توڑ دیا، وہ صدمے سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

شاید وہ وہیں بیٹھا آنسو بہاتا رہتا کہ اچانک اُسے اِس احساس نے آن گھیرا کہ کوئی بہت تیزی سے، سناٹے کو چیرتا ہوا اُس کے پہلو سے گزرا ہے۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا، وہ ایک سائیکل تھی جس کا سوار تیزی سے پیڈل مارتا ہوا اُس سڑک کی جانب بڑھ رہا تھا جس پر کچھ لمحات قبل پولیس وین غائب ہوئی تھی۔

گو کہ البرٹو کی آنکھوں میں آنسو تھے، منظر دھندلایا ہوا تھا لیکن اس نے دیکھ لیا... سائیکل سوار کوئی اور نہیں... اس کا اپنا بیٹا فرانسکو تھا!

''فرانسکو... رک جاؤ!'' وہ چلّایا، لیکن باپ کی آواز بیٹے تک نہیں پہنچ سکی۔

☆☆☆

فرانسکو کے جسم کی کل قوت اس کی ٹانگوں میں سمٹ آئی تھی۔ وہ تیز تیز پیڈل مار رہا تھا گو کہ وین اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی لیکن راستہ دھول سے اٹا تھا جسے دیکھ کر وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ وین کس سمت گئی ہو گی۔

جو کچھ وہ کر رہا تھا موجودہ حالات میں اُسے پاگل پن ہی کہا جا سکتا تھا لیکن وہ ہر صورت میں گیپر کو اس مشکل سے نکالنا چاہتا تھا۔ خوش قسمتی سے اسٹیڈیم کے باہر بنے سائیکل اسٹینڈ پر اُسے ایک ایسی سائیکل مل گئی جس کا تالا کھلا رہ گیا تھا اور اب وہ اُس پر سوار وین کا تعاقب کر رہا تھا۔

اُسے یقین تھا کہ اگر کسی طرح وہ انکل حوزے تک

پہنچ گیا تو گیپر اور بازی کی جان بچ سکتی ہے۔

رہائشی علاقے میں داخل ہوتے ہی اُسے پولیس وین نظر آ گئی جس کی رفتار سڑکوں پر پڑی رکاوٹوں کی وجہ سے سست پڑ چکی تھی۔

فرانسکو توقع کر رہا تھا کہ وین مرکزی پولیس اسٹیشن پر جا کر رکے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وین غیر متوقع طور پر صنعتی علاقے کی جانب مُڑ گئی، جہاں پولیس کا ٹریننگ اسکول تھا۔

فرانسکو کے پاس سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اس نے تعاقب جاری رکھا۔ سڑکوں پر شیشے کی کرچیاں، چھوٹے بڑے پتھر پڑے تھے جو وین کی رفتار میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ احتیاط کے پیشِ نظر فرانسکو نے مناسب فاصلہ رکھا۔

صنعتی علاقہ شروع ہونے کے بعد وین نے رفتار پکڑ لی۔ کچھ دیر بعد وہ ٹریننگ اسکول میں داخل ہو گئی اور درختوں کے جھنڈ میں جا کر رک گئی۔

پچھلے حصے میں موجود اہل کار چھلانگ مار کر نیچے اتر آئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا حوزے پیریز بھی گیٹ کھول کر باہر آ گیا اور کچھ دُور ایک درخت کے نیچے بچھی کرسی کی سمت بڑھنے لگا۔

چند منٹوں بعد فرانسکو بھی وہاں پہنچ گیا۔ اُس نے سائیکل باہر ہی چھوڑ دی اور ٹریننگ اسکول کے اندر داخل ہو گیا جہاں خلافِ توقع سناٹے کا راج تھا۔ درختوں کی اوٹ لیتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا اور وین کے بے حد نزدیک پہنچ گیا جو گھنے درختوں کے درمیان کھڑی تھی۔

وین کے اطراف مکمل خاموشی تھی البتہ کچھ فاصلے پر بنے مرکزی بیرک میں ہلچل نظر آ رہی تھی۔ اُس نے چاروں جانب نظریں گھمائیں جو انکل حوزے پر جا کر ٹھہر گئیں، وہ ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔

فرانسکو تذبذب کا شکار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آگے بڑھنا خطرناک ہے، لیکن وہ اپنے دوست کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ کسی نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ فرانسکو اچھل پڑا، اُسے یقین تھا کہ وہ پکڑا گیا ہے۔

دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے اُس کا باپ البرٹو کھڑا تھا۔

شدید دُکھ اور تھکن کے زیرِ اثر وہ اپنے باپ سے

اعتزاز

عشق ناکام نمبر میں صفحہ نمبر 177 پر مشہور مصور وان گوگ کی تصویر لگاتے وقت مغالطہ ہو گیا۔ ملتے جلتے نام کے دو مصور ہیں اور دونوں ہی نے بے شمار فن پارے تخلیق کیے۔ سرگزشت نے واقعات وان گوگ کے پیش کیے لیکن سہواً تصویر گوگ وان کی لگ گئی۔ جبکہ گوگ وان 6 ستمبر 1974 کو پیدا ہوئے اور تادمِ تحریر حیات ہیں جبکہ وان گوگ 30 مارچ 1853 کو پیدا ہوئے اور 29 جولائی 1890 کو انتقال کر گئے۔ تمام قارئین سے التماس ہے کہ وہ وان گوگ کی تصویر کی تصحیح کر لیں۔ ہم اپنے ان قارئین کے بھی مشکور ہیں جنہوں نے اس غلطی کی نشاندہی کی۔

لپٹ گیا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

کچھ دیر بعد البرٹو نے اُسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔ ''گھر چلو فرانسکو، تمہاری ماں انتظار کر رہی ہے!''

''وہ... گیپر... میں اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔'' فرانسکو نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''گیپر؟'' البرٹو کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''مجھے تفصیلات بتاؤ!''

فرانسکو نے جلدی جلدی اُسے پوری کہانی سنائی۔ کچھ دیر البرٹو خاموش کھڑا رہا۔ پھر بڑبڑایا۔ ''حوزے...''

چند سیکنڈز بعد وہ اپنے چچا زاد کے سامنے کھڑا تھا جو اسے وہاں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔

''البرٹو... فرانسکو... تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''اگرچہ کہانی طویل ہے، لیکن تمہیں سنانی ضروری ہے۔'' البرٹو نے دبی آواز میں کہا۔ تینوں ایک گھنے درخت کی اوٹ میں چلے گئے۔ البرٹو اُسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

"تمہیں ہماری مدد کرنی ہو گی حوزے... مجھے خطرہ ہے کہ کہیں دونوں بچے اپنی جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔" آخر میں البرٹو نے کہا۔

کچھ دیر حوزے خاموش کھڑا اپنے بھائی کو تکتا رہا۔ پھر اس کے لب وا ہوئے۔ "فرانسکو، انہوں نے خود سمندر میں چھلانگ لگائی ہے ہم کچھ نہیں..."

البرٹو نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "انہیں اپنے کیے کی کافی سزا مل چکی ہے حوزے... اور پولیس نے بھی کچھ کم حماقت کا ثبوت نہیں دیا، اپنے ہی لوگوں پر فائرنگ کرنا ایک شرم ناک فعل ہے۔"

حوزے کے چہرے پر تذبذب تھا۔ البرٹو نے مزید کہا۔ "حوزے... اُن کے ماں باپ کے بارے میں سوچو۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے بھائی!"

چند ساعت خاموشی چھائی رہی۔ پھر حوزے نے گہرا سانس لیا۔ "ٹھیک ہے... اب سنو تمہیں کیا کرنا ہے۔"

☆☆☆

چند پولیس اہل کار بیرک سے برآمد ہوئے اور وین کی سمت بڑھنے لگے۔

اُن کی قیادت دراز قد پولیس سارجنٹ کر رہا تھا، جس کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی بیدار ہوا ہے۔

"مسٹر حوزے... مجرموں کو نکالنے میں ہماری مدد کرو!" سارجنٹ نے جمائی لیتے ہوئے کہا تاہم درخت تلے بیٹھے دھوئیں کے مرغولے اُڑاتے حوزے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

جب پولیس اہل کار وین کے پچھلے حصے تک پہنچے، ایک انکشاف اُن کا منتظر تھا۔ وین خالی تھی۔

سارجنٹ کی نیند ہوا ہو گئی۔ "وہ دونوں کہاں گئے؟" وہ چلّایا۔

"سر... شاید وہ فرار... ہو گئے۔" ایک اہل کار نے منمناتے ہوئے کہا۔

"حوزے... حوزے... جلدی یہاں آؤ۔" سارجنٹ کے لہجے میں غصّہ تھا۔ "دونوں مجرم کہاں گئے؟"

حوزے نے سگریٹ بجھائی اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وین کی جانب بڑھنے لگا۔

"کیا ہوا سارجنٹ؟" اُس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"مجرم وین میں تھے... وہ کہاں گئے؟" وہ دہاڑا۔

"یہ تو آپ لوگ ہی بتا سکتے ہیں جناب... آپ کے ساتھی ہی انہیں یہاں لائے تھے۔" اُس نے کاندھے اچکائے۔

"مگر تم یہیں تھے۔" اُس نے ترش لہجے میں کہا۔

"جناب میں وین سے اتر کر بیت الخلا چلا گیا تھا۔ ابھی ابھی لوٹا ہوں... پہلی سگریٹ ہی سلگائی تھی... حیرت ہے، دونوں مجرم زخمی تھے، بھلا وہ کہاں جا سکتے ہیں۔" حوزے نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ دونوں زیادہ دُور نہیں جا سکتے..." سارجنٹ چلّایا۔ "سب کو الرٹ کر دو۔ ٹریننگ اسکول اور ملحقہ سڑکوں کا کونا کونا چھان مارو۔"

"سارجنٹ..." ایک اہل کار نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "اس وقت آپ سمیت فقط سات اہل کار یہاں موجود ہیں۔ پوری ٹیم شہر گئی ہوئی ہے۔"

سارجنٹ کے چہرے پر مایوسی سمٹ آئی۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ "وہ زخمی ہیں، ہم انہیں تلاش کر لیں گے۔ چلو... باہر کی طرف دیکھتے ہیں... وہ ابھی شاہراہ تک نہیں پہنچے ہوں گے..."

"اور اندر؟" ایک اہل کار نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ اندر کیا کر رہے ہوں گے احمق، چلو!" سارجنٹ چلّایا۔

حوزے دل ہی دل میں مسکراتا ہوا واپس کرسی پر آ کر بیٹھ گیا، ایک اور سگریٹ سلگا لی۔ سورج تیزی سے غروب ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ٹریننگ اسکول پر اندھیرا اتر آیا۔

آدھے گھنٹے بعد تمام اہل کار تھکے ہارے ٹریننگ اسکول کے میدان میں لوٹ چکے تھے۔ چہروں سے شکستگی عیاں تھی۔

تب حوزے اٹھا اور سارجنٹ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"سارجنٹ، میری ڈیوٹی کا وقت ختم ہو گیا، مجھے وین پولیس ہیڈ کوارٹر لے جانی ہو گی۔"

سارجنٹ نے غصیل نظروں سے اُسے دیکھا۔ "جاؤ، دفع ہو جاؤ..."

"ضرور جناب!" حوزے مسکرایا۔

کچھ دیر بعد وین اسٹارٹ ہونے کی آواز ٹریننگ اسکول میں گونجی۔ دھیرے دھیرے وہ آگے بڑھنے لگی اور دروازہ عبور کر گئی۔ مایوس پولیس سارجنٹ اُسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

اب وین اُس سڑک پر تھی جو اسکول کی دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ آگے جا کر یہ سڑک مرکزی شاہراہ سے جُڑتی تھی۔ ایک موڑ پر پہنچ کر حوزے نے وین روک دی، تاہم، انجن بند نہیں کیا۔

وہ نیچے اتر آیا۔ اُس کے سامنے ٹریننگ اسکول کے بیس کی بیرونی دیوار تھی جس میں کئی چھوٹی بڑی کھڑکیاں تھیں۔ اُس نے سیٹی بجائی۔

کچھ دیر بعد فرانسکو کا چہرہ کھڑکی میں ظاہر ہوا۔ اُس نے چھلانگ لگائی اور دوسری طرف آ گیا...... کچھ دیر بعد زخمی پچز اور ہازی بھی اُس جانب آ گئے جہاں وین کھڑی تھی۔ حوزے اور فرانسکو نے دونوں کو وین میں بٹھایا۔ پھر البرٹو کھڑکی میں نمودار ہوا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

وین آگے بڑھنے لگی۔ چند منٹوں بعد وہ مرکزی شاہراہ پر دوڑ رہی تھی۔

"خوب حوزے..." اگلی نشست پر بیٹھے البرٹو نے اپنے بھائی کا کاندھا تھپتھپایا۔ "تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ اندرونی حصے کی تلاشی نہیں لیں گے؟"

حوزے نے قہقہہ لگایا۔ "بیس سال سے اِس محکمے میں ہوں... میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ یہ بتاؤ ہمیں جانا کہاں ہے؟"

"میرے گھر۔ دونوں نوجوانوں کی مرہم پٹی ضروری ہے۔" البرٹو نے گہرا سانس لیا۔

"تم ایک اچھے حکیم ہو... مجھے یقین ہے کہ تمہارے مرہم سے اُن کے زخم جلد مندمل ہو جائیں گے۔" حوزے نے کہا۔

"میری دعا ہے کہ ایسا ہی ہو!" البرٹو نے کہا اور اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ خاصا تھک چکا تھا۔

وین شہر کی تاریک سڑک پر دوڑ رہی تھی جس پر جا بجا تباہی کے نشانات بکھرے تھے۔

☆☆☆

24 مئی 1964 کے روز لیما کے نیشنل اسٹیڈیم میں جنم لینے والے سانحے کو دنیائے فٹبال کی تاریخ کا بدترین المیہ تصور کیا جاتا ہے، جس نے نہ صرف پیرو، بلکہ فٹبال کے ہر چاہنے والے کو گہرے صدمے سے دوچار کر دیا۔

اُس روز لیما میں 318 معصوم افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ زخمیوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ بیش تر ہلاکتیں اسٹیڈیم کے اندرونی حصے میں ہوئیں جہاں کئی افراد کچلے گئے، کئی دم گھٹنے کے باعث جان کی بازی ہار گئے۔ چند پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے۔

سانحہ رونما ہونے کے کئی گھنٹوں بعد حکومت حرکت میں آئی۔ ہلاکتوں کے پیشِ نظر اسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی۔ لاشوں سے مُردہ خانے بھر گئے۔ شفاخانوں کے بستر زخمیوں کے لیے ناکافی ثابت ہوئے۔ حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر فلاحی تنظیمیں بھی میدان میں آ گئیں۔ شہریوں، خصوصاً طلبا نے رضاکارانہ طور پر کام شروع کر دیا۔

جہاں تک مشتعل افراد کا تعلق ہے، انہوں نے ساری رات احتجاج جاری رکھا۔ دیوانہ وار گلیوں میں پھرتے رہے اور اگلے روز پھر اسٹیڈیم پہنچ گئے جہاں درجنوں لاشیں اپنے ورثا کی منتظر تھیں۔

امن و امان کی صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے پیرو کے صدر فرینڈو ٹیری نے ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا۔ فسادیوں کے خلاف سخت کارروائی کی گئی۔ لگ بھگ ساٹھ افراد کو گرفتار کیا گیا اور اُن کے خلاف سخت کارروائی کا عندیہ دیا گیا۔ عوام کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے حکومت نے فوراً ہی مرنے والوں کے لواحقین کے لیے امدادی رقوم جاری کر دیں اور اِس سانحے پر ملک بھر میں سوگ منانے کا اعلان کر دیا۔

اُس موقع پر پیرو اور دنیا بھر کی سماجی تنظیمیں حقیقی ذمے داروں کا تعین کرنے اور انہیں قرارواقعی سزا دینے کے مطالبے کے ساتھ میدان میں آ گئیں۔ انہوں نے پولیس اہل کاروں کے خلاف ٹھوس تحقیقات کا تقاضا کیا، جن کی ناقص حکمتِ عملی نے ایک چھوٹے سے احتجاج کو بگاڑ کر فٹبال کی تاریخ کے بدترین المیے کی شکل دے دی اور کھیل کے میدان کو میدانِ جنگ بنا دیا۔

بین الاقوامی دباؤ کے پیشِ نظر پیرو کے صدر نے تحقیقات کا اعلان تو کیا، لیکن توقع کے عین مطابق وہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچیں۔ ترقی پذیر ممالک میں طاقتور پر ہاتھ ڈالنے کا رواج کہاں ملتا ہے۔

ہاں، یہ ضرور ہے کہ لیما کے محنت کش اور امید پرست باسی اپنی ہمت کے سہارے اِس المناک سانحے کے اثر سے نکل آئے۔ چند ہفتوں کے اندر اندر شہر میں زندگی لوٹ آئی۔ دوسری جانب نیشنل اسٹیڈیم میں نشستوں کی تعداد کم کر کے چالیس ہزار کر دی گئی۔

جہاں تک ہازی اور پچز کا تعلق ہے، وہ چند روز تک البرٹو پیریز کے گھر میں روپوش رہے۔ صحت یاب ہونے کے بعد اُنہوں نے لیما چھوڑ دیا۔ جب ڈیڑھ برس بعد وہ اپنے آبائی شہر لوٹے، دونوں خاصے بدل چکے تھے۔

ہازی نے داڑھی بڑھا لی تھی، جب کہ پچز نے سر منڈوا رکھا تھا۔ فرانسکو بھی دونوں کو بمشکل پہچان پایا۔

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک نازک اندام دوشیزہ تھی مگراس کے حوصلے آہنی تھے۔ جس کام کو کرنے کا عزم کرلیتی اسے ہرحال میں پورا کرتی، اسی عزم وحوصلے نے اس سے وہ کام کرادیا جسے انجام دیتے ہوئے جواں مردوں کے دل بھی کانپ جاتے ہیں۔ تنِ تنہا اس نے بحرِ بےکراں کو پرواز کرتے ہوئے پار کردکھایا۔

یہ ستمبر 1936ء کی ایک سرد اور کہر آلود صبح تھی۔ اس صبح مجھے فون کی گھنٹی کہیں دور سے آتی سنائی دی تھی۔ میں نے نیم غنودگی میں فون اٹھایا۔ ''صبح بخیر، مس بیرل۔''

کوئی دھند کے پار سے بولا۔ ''برطانیہ کے مغربی ساحل تیز اور طوفانی بارشوں کی زد میں ہیں اور نیوفاؤنڈ لینڈ گہرے کہر میں چھپا ہوا ہے۔ اچھا موسم اور صاف آسمان صرف بحراوقیانوس کے وسط میں ہی ہوگا۔''

''ایک منٹ، تم ہو کون؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ائر منسٹری کا ایک خادم'' ۔ اس نے کہا۔ ''اگر تم اس سال بحراوقیانوس عبور کرنے پر مصر ہی ہو تو ہمارے چارٹ کے مطابق موسم آج رات اور کل صبح تمہاری توقعات کے عین مطابق ہوسکتا ہے۔''

''تمہیں یقین ہے؟''

''یقین سے تو میں اپنی بیوی کا مزاج بھی نہیں بتا سکتا۔'' وہ ہنسا اور اس نے فون بند کردیا۔

میں فون لیے بستر پر آڑی ترچھی پڑی سوچ رہی تھی کہ میں جاگ رہی ہوں یا کوئی خواب جاری ہے۔ اس فون کال کا مجھے اتنی شدت سے انتظار تھا کہ میں اسے خوابوں میں بھی وصول کرنے لگی تھی گویا ابھی میں آنکھ کھولوں گی تو سب کچھ غائب ہوجائے گا اور یہ ایک عام سا دن رہ جائے گا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھ کھولی اور ہاتھ میں موجود فون کو دیکھ کر ایک چیخ ماری جس سے ہوٹل کے اس فلور کی میڈ دوڑی آئی۔

''مادام، آپ نے مجھے یاد فرمایا؟'' اس نے پوچھا۔ گھنٹی خراب ہونے کی وجہ سے میں اسے اسی طرح طلب کرتی تھی۔

''فوراً میرے لیے دو کپ کافی اور دو ابلے ہوئے انڈے اور ہاں توس اچھی طرح سنکے ہوئے ہوں اور میرا فلائنگ سوٹ کہاں ہے؟''

''وارڈروب میں مادام!'' میڈ نے کہا ''مگر آپ کہاں جارہی ہیں؟''

''امریکا۔'' میں نے کہا اور وہ بھونچکارہ گئی۔ اسے ساکت کھڑے دیکھ کر میں دہاڑی ''ناشتا... !'' اور وہ فوراً دوڑ گئی۔

یہ سچ تھا کہ میں پائلٹ تھی اور اب تک تقریباً چوتھائی ملین میل جہاز اڑا چکی تھی۔ میرے پاس ایک بہترین جہاز تھا جو اس وقت دستیاب ہوسکتا تھا۔ ایک اچھا فنانسر تھا جو میرے اخراجات برداشت کررہا تھا اور اب ضرورت صرف اچھے موسم کی تھی جس کے بعد میں تنِ تنہا بحراوقیانوس بذریعہ طیارہ عبور کرنے والی پہلی خاتون بن جاتی۔

میں نسلاً اینگلو سیکسن یعنی انگریز ہوں مگر لندن اور برطانیہ میں وارد ہونے کا پہلا اتفاق تھا۔ اجنبی ہونے کے باوجود یہاں میرے دوستوں کی کمی نہیں تھی اور کچھ نئے احباب بھی بن گئے۔ ان میں ایک کاربرے تھا جسے ڈنر پارٹیاں دینے اور معززین کو جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے پاس بہترین باورچی تھے جو لذیذ کھانے بنانے کا فن بخوبی جانتے تھے۔ میں ابھی تک ان کھانوں کی لذت نہیں بھولی تھی۔ ان پارٹیوں میں آنے والے افراد میں کمک کار بھی تھا۔ وہ زنجبار سے آیا تھا جو افریقا کا دور دراز ملک تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں بحراوقیانوس کو عبور کرنے کے لیے ان دنوں کسی اسپانسر کی تلاش میں تھی۔ اچانک ہی کمک نے... کاربرے سے کہا۔

''جے سی! آخر تم ایک تاریخی پرواز کے لیے بیرل کو کیوں نہیں اسپانسر کرتے۔'' کمک کا جملہ اتنا اچانک تھا کہ میں اور کاربرے دونوں دنگ رہ گئے۔ شاید میرے دل میں امید
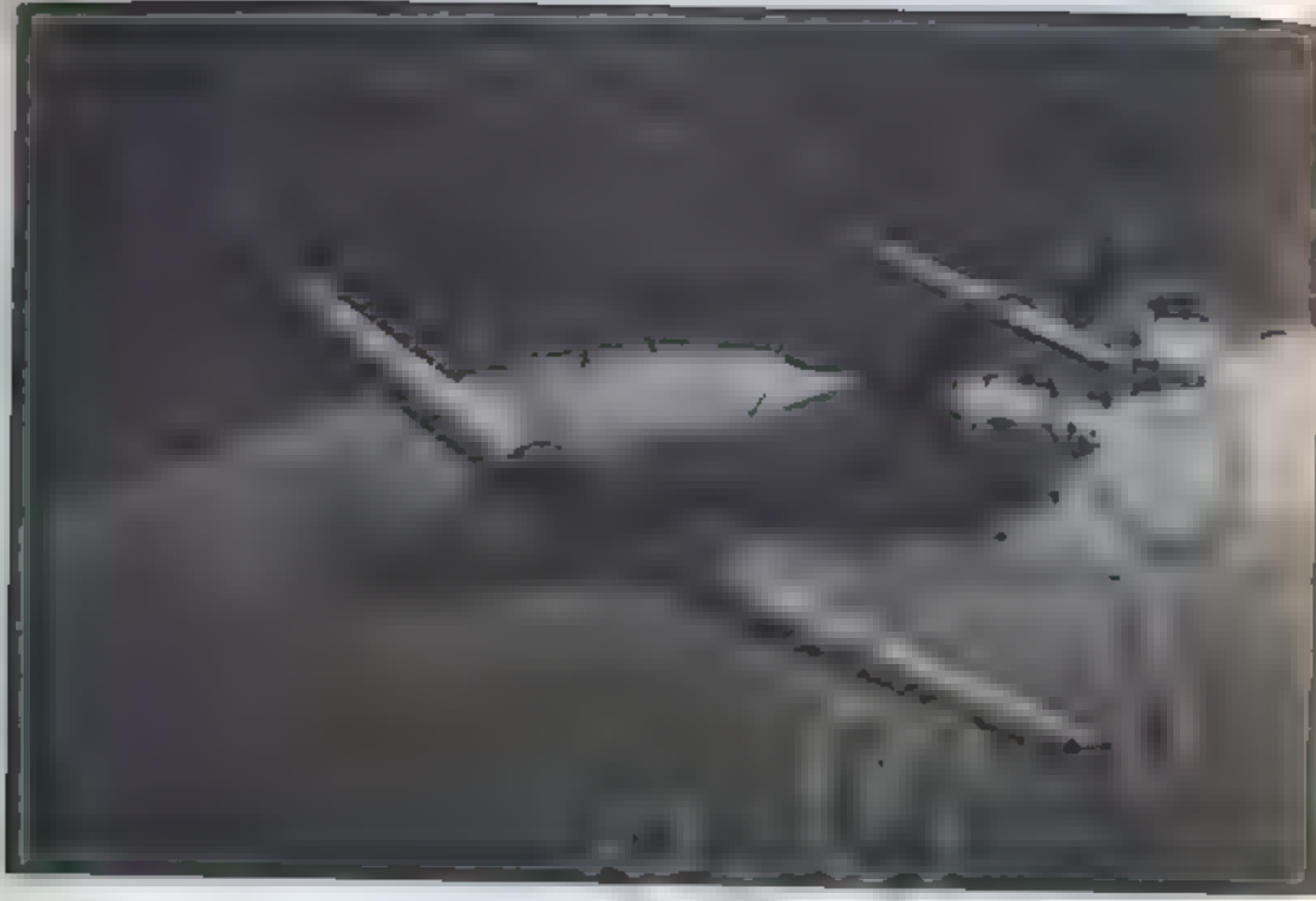
کی کسی ننھی سی کونپل نے کہیں سر اٹھایا ہی تھا کہ کاربرے کی خشک اور سرد آواز نے اسے ٹھکرا کر رکھ دیا۔

''لاتعداد پائلٹ اب تک شمالی بحراوقیانوس کو عبور کرچکے ہیں اور ان میں سے صرف جم مولیسن نے کہیں رکے بغیر یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ بھی صرف نیویارک سے آئرلینڈ تک۔ آج تک کوئی شخص بغیر رکے انگلینڈ سے امریکا کے سفر میں کامیاب نہیں ہوا۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور پھر کاٹ دار لہجے میں بولا ''کیا تم کوئی وجہ بتاؤ گے کہ تم ایک نوآموز پائلٹ اور ناتجربہ کار کم عمر لڑکی کی کامیابی کے لیے اتنے پُرامید کیوں ہو؟''

کمک کا تو پتا نہیں، البتہ مجھے یقین ہے کہ میرا چہرہ سرخ ہوگیا ہوگا مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی، کاربرے وہاں سے اٹھ گیا۔ کمک نے اس کے انکار کو اپنی بےعزتی تصور کیا اور نہ معلوم اس نے کیا، کیا کہ کاربرے نہ صرف مجھے اسپانسر کرنے پر رضامند ہوگیا بلکہ وہ اتنا پُرجوش تھا کہ معاہدے پر دستخط کرتے ہوئے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''مس بیرل! مجھے کامیابی کی کوئی امید نہیں ہے۔ اس لیے نہیں کہ تم خراب یا اناڑی پائلٹ ہو بلکہ اس لیے کہ یہ کام ناممکن حد تک مشکل ہے۔ اگر کوئی مجھے ملین پاؤنڈز کی پیش کش کرے تب بھی میں اس طیارے کا پائلٹ بننا پسند نہیں کروں گا جس کا رخ اوقیانوس کی طرف ہوگا۔''

☆☆☆

مہم کی تیاری اور تشہیر کا کام ایک ساتھ شروع ہوا۔ بلکہ موخر الذکر کام پہلے سے کہیں زیادہ زور شور سے ہوا۔ پورا انگلش پریس اس بارے میں نہایت پُرجوش تھا اور روزانہ نت نئی سرخیاں وجود میں آرہی تھیں۔ جن میں مجھے فراڈ قرار دینے سے لے کر یہ تک کہا گیا تھا کہ میں دراصل لڑکی کے بھیس میں ایک سابق پائلٹ تھی جس نے جنگِ عظیم اول میں دشمن فضائیہ کا بھرکس نکال دیا تھا۔ میں روزانہ نصف گھنٹے کی تربیتی پرواز کرتی تھی۔ کرائے کے جہاز کا انتظام کاربرے نے کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ پرسیوال کی فیکٹری میں میرے لیے ایک خصوصی جہاز تیار کرا رہا تھا۔ ویگا جل نامی یہ طیارہ اسپورٹس ماڈل تھا اور اس کی حدِ ضرب صرف چھ سو میل تھی مگر اس میں خصوصی تبدیلیاں کرکے نئی پیٹرول ٹنکیوں کی گنجائش پیدا کی گئی تھی۔ ایک ٹنکی میرے کیبن میں نشست کے عین عقب میں تھی اور دو ٹنکیاں پروں کے نیچے نصب تھیں۔ اس کے علاوہ انجن میں بعض تبدیلیاں کرکے اسے طویل ترین پرواز کے قابل بنایا گیا تھا۔

تین مہینے بعد ویگا جل بالکل تیار تھا اور میں کئی بار اس میں آزمائشی پروازیں کرچکی تھی۔ میں نے ہر لحاظ سے اسے بہترین پایا تھا۔ بلاشبہ یہ وہ جدید ترین طیارہ تھا جسے میں نے

اب تک ڑیا تھا۔ اب مجھے صرف ایک مناسب موسم کا انتظار تھا جو مجھے اوقیانوس عبور کرنے کی اجازت دے۔

جب تک میں نہا دھو کر اور فلائنگ سوٹ زیب تن کر کے تیار ہوئی، میڈ مطلوبہ ناشتا لے آئی۔ میں نے جلدی جلدی ابلے ہوئے انڈے کافی کی مدد سے حلق سے اتارے اور ایبنگڈن کی ملٹری ائرفیلڈ تک پہنچ گئی جہاں سے مجھے پرواز کا آغاز کرنا تھا اور میرا رفیقِ سفر ویگا وہیں میرا منتظر تھا۔

صرف ویگا ہی نہیں بلکہ پریس رپورٹرز، فوٹوگرافرز اور معززینِ شہر کا خاصا بڑا ہجوم بھی ائرپورٹ پر میرا منتظر تھا۔ وہ سب اس تاریخی پرواز کے آغاز کے عینی شاہد بننے والے تھے۔ کار سے اترتے ہی مجھ پر فلیش لائٹس چمکنے لگیں، میں مبہوت رہ گئی۔

آج سے محض دو سال پہلے میں اس لمحے اور اس مہم کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

اس مہم پر جانے کا خیال مجھے تب آیا تھا جب ٹام اور اس کے ساتھی کو پائلٹ نے انگلینڈ سے آسٹریلیا تک منعقد کی جانے والی ایک بین الاقوامی ریس جیتی تھی۔ یہ دنیا کی نصف مسافت بنتی تھی۔ اس سلسلے میں جو جشن منایا جارہا تھا، ٹام نے مجھے اس میں شرکت کی دعوت دی تھی جو میں نے قبول کرلی تھی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے یورپ یا انگلینڈ دیکھنے کا شوق تھا، بلکہ اس لیے کہ مجھے اس نئی چیز سے دلچسپی محسوس ہوئی تھی کہ انسان براعظموں کے درمیان بھی جہاز سے سفر کرسکتا تھا جبکہ درمیان میں بڑے اور گہرے سمندر بھی حائل تھے۔ میں نے حساب لگایا تو نیروبی سے لندن تک مکمل فضائی فاصلہ پانچ ہزار میل سے زیادہ بنتا تھا۔ میں نے یہ سفر اپنے طیارے پر کرنے کا فیصلہ کیا۔ چلنے سے پہلے میں نے بلکس سے کہا۔

”کیا تم میرے ساتھ لندن تک پرواز کرنا پسند کروگے؟“

وہ اپنی نئی رائفل کی نال کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے نال سے آنکھ ہٹائے بغیر اثبات میں سر ہلادیا۔ اگرچہ کوئی ریکارڈ پر نہیں تھا، نہ وقت کے لحاظ سے اور نہ رفتار کے لحاظ سے۔ ہم مختلف جگہوں پر قیام کرتے ہوئے لندن پہنچنا چاہتے تھے۔ مجھے امید تھی کہ بلکس جیسے ساتھی کی موجودگی میں یہ طویل پرواز ممکن نہ ہوگی۔ اس پرواز سے مجھے یہ اعزاز حاصل ہوجاتا کہ میں بین الاقوامی مسافت پر پرواز کرنے والی پہلی عورت بن جاتی حالانکہ یہ پرواز میں صرف اپنی صلاحیتوں کی آزمائش کے لیے کررہی تھی۔

مارچ 1936ء میں ہم نے نیروبی سے اپنی پرواز کا آغاز کیا۔ میں نے طیارے کی ضروری مرمت کراکے اسے ایندھن سے لبالب بھرلیا تھا۔ ہمارا سٹاپ ایتھوپیا میں پڑتا۔ جو اُن دنوں اٹلی کے قبضے میں تھا۔ وہاں کئی ایک ائرفیلڈ تھیں مگر ساتھ ہی کچھ قباحتیں بھی تھیں۔ یہ فیلڈ نہایت خراب اور ناہموار تھیں مگر اہم وجہ جس کے لیے میں نے ایتھوپیا کا رخ نہیں کیا، وہاں کے شاہی فضائیہ کے قوانین تھے جن کے تحت کوئی عورت اکیلے پرواز کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ اس کے ساتھ لازماً دوسرا مرد پائلٹ ہونا چاہیے تھا اور پیشگی اجازت کے بغیر کسی عورت کو جدہ سے پانا کے درمیان پرواز کرنے کی اجازت نہ تھی۔

انہی وجوہات کی بنا پر میں نے سوڈان میں ایک دلدلی پٹی پر لینڈنگ کو ترجیح دی جو اوپر سے بظاہر گھاس کا ہرا بھرا میدان نظر آرہی تھی، نیچے اتر کر مجھے معلوم ہوا کہ میں نے کس مصیبت میں قدم رکھ دیا تھا اور اس پورے علاقے میں نہ تو کہیں سڑک تھی اور نہ ہی کوئی ائرفیلڈ۔ درمیان میں جہاں جہاں نسبتاً خشک زمین تھی وہاں لوگ آباد تھے۔ نیچے اترتے ہی میرے جہاز کے پہیے دلدل میں دھنسنے لگے۔ بڑی مشکل سے ہم نے اسے ایک محفوظ مقام تک پہنچایا۔ یہاں ہر طرف سیاہ پانی کھڑا تھا جس کے نیچے خوف ناک دلدل تھی جس میں پھنسنے والے کو صرف اذیت ناک موت ملتی تھی اور اگر کوئی اس علاقے میں اتر جائے تو اس کی واپسی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے..... ریڈیو ہونے کے باوجود یہاں سے بہ مشکل خرطوم سے رابطہ ہوتا۔ میں بہ مشکل انہیں اپنے جائے وقوع سے آگاہ کرسکی۔ مجھے تسلی دی گئی کہ جلد ہی وہ ہماری تلاش میں امدادی طیارے روانہ کررہے ہیں۔ مجھے اشیائے خورد و نوش سے زیادہ ایندھن کی ضرورت تھی تاکہ ہم جلد از جلد اس جہنمی علاقے سے نکل سکیں۔ ہمیں لینڈ کیے بارہ گھنٹے ہوچکے تھے اور امدادی طیارے کا دور دور تک کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ مجھے شدت سے ان لوگوں پر طیش آرہا تھا جو عورتوں کو کم تر سمجھتے ہیں اور ان کے خلاف امتیازی قوانین بناتے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہی تو میں اس علاقے میں آن پھنسی تھی۔

سوڈان کا یہ علاقہ ایسا تھا کہ جہاں نہ کشتیاں چل سکتی تھیں، نہ جہاز اڑ سکتے تھے اور نہ ہی پیدل سفر کرنے کے راستے تھے۔ ہمیں یہاں اترے چوبیس گھنٹے ہوچکے تھے اور یہ پورا ہی وقت ہم نے مچھروں اور دلدلی کیڑوں سے جنگ کرتے گزارا تھا۔ یہاں پانی کے سانپوں اور مگرمچھوں کا خطرہ بھی لاحق رہتا تھا لہٰذا ہم بلاضرورت جہاز سے نہیں اترتے تھے۔

خدا خدا کرکے دوسرے روز ایک جہاز کی صورت نظر

آئی اور وہ بھی اس نے معجزانہ طور پر ہمیں دیکھ لیا۔ اس نے کچھ چکر لگائے اور بڑے ناپ تول کر کچھ پیکٹ نیچے گرائے۔ مجھے اس کے نشانے پر رشک آیا جب تمام ہی پیکٹ ٹھیک طیارے کے قریب گرے بلکہ خشک خوراک کا ایک تھیلا تو سیدھا جہاز پر ہی آن گرا اور شکر تھا کہ اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس امداد میں سب سے قیمتی چیز دس گیلن پیٹرول تھا۔ کیونکہ جہاز کی ٹنکی میں پیٹرول اتنا کم تھا کہ ہم اس دلدلی علاقے سے بھی نہیں نکل سکتے تھے۔ میں نے اور بلکس نے ایک نسبتاً خشک پگڈنڈی کو رن وے کے طور پر چنا اور کسی نہ کسی طرح ”زرپرس“ کو کھینچ کر وہاں تک لے آئے، نرم نرم زمین کی وجہ سے فالتو بوجھ سے چھٹکارا پالیا۔ بہ مشکل طیارہ بلند ہوا اور ہم خرطوم پہنچ گئے۔

سوڈان کے بعد صحرا شروع ہوگیا اور پورے تین ہزار میل تک سوائے صحرا کے کچھ نہیں تھا اور شکر ہے کہ اتنے طویل سفر کو پرنس نے بغیر کسی نخرے کے طے کرلیا۔ ہمارا اگلا پڑاؤ ٹریپولی تھا۔ اس سے پہلے ہم نے خلیج سدرہ عبور کی تھی۔ اگلا اسٹاپ تیونس تھا اور اس کے بعد کہیں جاکر ایک بار پھر افریقا کی سرزمین سرسبز ہونے لگی۔ الجزائر سے روانگی کے وقت میری کیفیت سخت جذباتی ہورہی تھی۔

میں پہلی بار افریقا سے بچھڑنے پر سخت اداس تھی۔ یہ رنگارنگ، دلچسپ اور پُراسرار زمین اپنے باسیوں کے دل کو جکڑ لیتی ہے اور پھر ان کا دل کہیں اور نہیں لگتا۔

میڈی ٹرینین کے سمندر کو عبور کرکے ہم نے فرانس میں قدم رکھا اور ایک روز پیرس کے حسین شہر میں قیام کیا۔ اس سے اگلے روز سہ پہر کو میں، ٹام اور بلکس لندن کے ہوٹل سے مے فیئر میں ساتھ لنچ کر رہے تھے۔ یہاں میں ٹام کی مہمان تھی۔ وہ لندن کے اعلیٰ حلقوں میں بے حد معروف تھا اور اس کی بدولت میں بھی جلد ہی ان طبقوں میں مکمل رل مل گئی تھی۔ یہاں تہذیب تھی، تعلیم تھی اور تمدن تھا۔ یہ میرا آبائی وطن تھا۔ یہ جگہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی مگر یہ افریقا نہیں تھا جس کی یاد مجھے ہر لمحے آتی تھی۔ اگر ٹام مجھے ایک نئی مہم پر نہ اکساتا تو شاید میں جلد ہی واپس بھاگ آتی۔

☆☆☆

اور اب میں اس نئی مہم پر روانہ ہورہی تھی۔ یہ اوقیانوس کو بغیر رکے اس کی پوری چوڑائی سے عبور کرنے کی ریکارڈ ساز مہم تھی۔ میں اور ویگا جل لوگوں اور پریس والوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ ہم پر مسلسل فلیش لائٹس چمک رہی تھیں۔ مکینکوں نے جہاز کا آخری بار معائنہ کیا اور اسے پرواز کے لیے مکمل طور پر فٹ قرار دیا۔ مجھے پہلے ہی فٹ قرار دیا جاچکا تھا۔ میں تالیوں کی گونج میں کاک پٹ میں سوار ہوئی۔ ایک ائرمین نے پنکھا گھما کر جہاز کا انجن چلا دیا اور ایک منٹ بعد میں فضا میں تھی۔

ذرا بلند ہوتے ہی ویگا کو دھند اور گہرے بادلوں نے آن گھیرا اور چشم زدن میں ائرفیلڈ اور اس کی روشنیاں نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں۔ طیارے کے باہر ہر طرف گھور اندھیرا تھا۔ ایک گھنٹے بعد میں نے برطانیہ کا مغربی ساحل عبور کرلیا اور اب آئرلینڈ میرے دائیں طرف تھا اور نیچے ٹھاٹھیں مارتا اوقیانوس۔ سفر اگر طویل اور مسلسل ہو تو وقت رک جاتا ہے۔ پہلا گھنٹا مجھے ایک سال کے برابر لگا اور ابھی مجھے ایک مکمل دن اور رات سے زیادہ عرصہ یونہی پرواز کرتے ہوئے گزارنا تھا۔ ایک طیارے میں اکیلے پن کا احساس، ہر طرف تاریکی اور نیچے موجود سمندر، یہ سب چیزیں خوف بن کر مجھ پر حملہ آور ہوئیں۔ اس لمحے نہایت شدت سے میرا دل چاہا کہ طیارہ واپس موڑلوں اور اس مہم سے دستبردار ہوجاؤں۔

مگر فوراً ہی ان لوگوں کے چہرے میری آنکھوں کے سامنے آگئے جنہیں میں کچھ دیر پہلے ائرفیلڈ پر چھوڑ کر آئی تھی۔ ان میں سے کچھ چہروں پر میری متوقع کامیابی کی مسرت تھی اور کچھ کے تاثرات طنزیہ تھے جیسے کہہ رہے ہوں، کیا پدی کیا پدی کا شوربا۔ کیا میں واپس جاکر اپنے دوستوں کی توقعات خاک میں نہیں ملادوں گی اور کیا میرے حاسد دشمن اس پر بغلیں نہیں بجائیں گے کہ ہم تو پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ یہ ایک عورت کے بس کی بات نہیں ہے۔

نہیں، میں نے فیصلہ کن انداز میں سوچا۔ چاہے ویگا سمندر میں جاگرے اور میں عین جوانی میں اس دنیا سے رخصت ہوجاؤں لیکن ویگا کا رخ اب امریکا ہی کی طرف رہے گا۔

جلد ہی میں ذہن کو جھٹک کر آنے والے ممکنہ مسائل کے بارے میں سوچنے لگی۔ ویگا کی ذاتی ٹنکی کے علاوہ بھی طیارے میں تین اضافی ٹنکیاں تھیں۔ ایک ٹنکی جو کاک پٹ میں عین میری نشست کے عقب میں تھی، اس کے علاوہ دو ٹنکیاں پروں کے نیچے نصب تھیں۔ کل وزن کا اسّی فی صد صرف تیل پر مشتمل تھا۔ وزن کم کرنے کے لیے طیارے سے ہر غیر ضروری چیز نکال دی گئی تھی۔ حتیٰ کہ ہنگامی حالات میں استعمال ہونے والی کٹ اور میڈیکل ایڈ کا سامان تک ہٹا دیا تھا۔ میرے پاس بس کچھ پانی، کافی کا ایک تھرماس اور کھانے کے لیے کچھ چیزیں تھیں اور اس زادِ راہ کے ساتھ

مجھے تین ہزار تین سو میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ جس میں سے دو ہزار میل کا سفر مکمل طور پر سمندر پر تھا اور سفر کا بیشتر حصہ رات پر مشتمل تھا کیونکہ رات میرے ساتھ ہی مشرق سے مغرب کی طرف سفر کر رہی تھی۔ نیچے ایک جگہ روشنی سی نظر آئی، یہ بریہوان کا لائٹ ٹاور تھا جو ایک مختصر سے جزیرے پر کھڑا تھا۔ یہ آخری روشنی اور آخری زمین تھی جو مجھے نظر آئی۔ اس کے بعد صرف پانی تھا اور تاریکی تھی۔ اس تاریک سمندر میں واحد روشنی کی کرن میرے کاک پٹ میں انسٹرومنٹ پینل کی سرخ روشنی تھی۔

میں نے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے اور تھرماس سے کافی نکال کر پینے لگی۔ مجھے موسمی نقشہ یاد تھا جس کے مطابق پہلے تین گھنٹے تک مجھے صاف موسم ملتا۔ اس کے بعد دھند، بارش اور طوفان کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ جو وسطی اوقیانوس تک جاری رہتا۔ آلات بتا رہے تھے کہ میں دو ہزار فٹ کی بلندی پر مطلوبہ سمت میں پرواز کر رہی تھی۔ شمالی ہواؤں کا دباؤ نسبتاً زیادہ تھا لہٰذا میں نے ڈرفٹ کو تین ڈگری زیادہ پر سیٹ کر دیا تاکہ ہوا طیارے کو بھٹکا نہ سکے۔ میں مختصر سے نیم تاریک کاک پٹ میں اکیلی تھی اور یہ تنہائی بہت وحشت ناک تھی، میرے پاس اس کے سوا کوئی مصروفیت نہیں تھی کہ فلائنگ اسٹک تھامے رہوں اور انسٹرومنٹ پینل کو تکتی رہوں۔ امید اور اندیشے جڑوں کے مانند میرے ذہن میں مچل رہے تھے۔ کیا میں کامیاب رہوں گی یا پھر ناکام؟ یہ سوچتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یہ بات میں بھول ہی گئی تھی کہ ناکامی کا مطلب میرا انتقال بھی ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر میں امریکا تک پہنچنے میں ناکام رہتی تو میرا مقدر بحر اوقیانوس کی گہرائیاں ہی بنتیں۔ زندہ رہنے کے لیے ضروری تھا کہ میں اس مہم میں کامیاب رہوں۔

توقع کے عین مطابق مجھے موسلا دھار بارش اور تیز ہواؤں نے آ لیا۔ جو ایک سو تیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے چل رہی تھیں اور ویگا جل کو ہلکے پھلکے کھلونے کی طرح اِدھر اُدھر اچھال رہی تھیں۔ بے ہودہ موسم میں طیارہ بار بار اپنے راستے سے ہٹ رہا تھا اور اسے راہ پر رکھنے کے لیے مجھے فلائنگ اسٹک سے باقاعدہ کشتی لڑنا پڑ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے میرا وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا اور اب مجھے گھڑی کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ نصف رات کے قریب مجھے طوفان سے نجات مل گئی مگر بارش بہ دستور جاری تھی۔ باہر کا درجۂ حرارت صفر سے نیچے تھا مگر کیبن میں خوشگوار حرارت تھی۔

میرے پاس چاروں ٹنکیوں میں کل تیس گھنٹے کی پرواز کا پیٹرول موجود تھا۔ سب سے زیادہ تیل کیبن والے ٹینک میں تھا اور اس پر لکھا تھا کہ یہ دس گھنٹے کی پرواز کے لیے کافی تھا اور مجھے پرواز کرتے ہوئے آٹھ گھنٹے ہو چکے تھے۔ گویا ابھی دو گھنٹے کا ایندھن باقی تھا۔ اس کے بعد ہی اگلے ٹینک کے استعمال کی نوبت آتی۔ میں ایندھن کے معاملے میں پوری طرح سے مطمئن تھی مگر معاً ہی ویگا کا انجن کھانسا اور وہ بند ہو گیا۔ اس کے گھومتے ہوئے پر ساکت ہو گئے۔ یعنی پیٹرول قبل از وقت ہی ختم ہو گیا تھا۔ اب طیارہ بغیر انجن پاور کے صرف پروں کے سہارے گلائیڈ کر رہا تھا۔ برستی بارش کا بوجھ اسے تیزی سے نیچے لے جانے لگا۔

میں نے خود کو حوصلہ برقرار رکھنے کی تلقین کی اور صورتِ حال کو اتفاقیہ قرار دیا۔ انجن بند ہو جانا کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا۔ اگر یہاں خشکی ہوتی تو میں مزے سے گلائیڈ کرتی کہیں بھی اتر جاتی مگر یہاں تو ہزاروں میل تک بے کراں سمندر تھا اور جو صرف دو ہزار فٹ نیچے تھا۔ اگر انجن اسٹارٹ نہ ہوتا تو میرا حشر کچھ زیادہ اچھا نہ ہوتا۔ کاک پٹ میں میری نشست سے ذرا نیچے ایک آلہ پٹ کوک نصب تھا جس کا بٹن دبانے سے دوسری ٹنکی سے انجن کو پیٹرول کی فراہمی شروع ہو جاتی۔ اگر تیل مقررہ وقت پر ختم ہوتا تو میں ذرا دیر پہلے اس بٹن کو دبا دیتی اور انجن بند ہونے کی نوبت ہی نہ آتی لیکن اگر مجھے علم ہوتا تب۔

ویگا جل تیزی سے سمندر کی طرف لپک رہا تھا اور میرے ہاتھ دیوانہ وار نشست کے عقب میں پٹ کوک کے نوکیلے بٹن کو تلاش کر رہے تھے۔ موت کو قریب دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے تھے اور مجھے ایک معلوم شدہ چیز نہیں مل رہی تھی۔ التی میٹر کی تیزی سے دائیں طرف جھکتی ہوئی سوئی مجھے دہلا رہی تھی۔ بارہ سو فٹ، گیارہ سو فٹ۔ ہزار فٹ . . !

میں نے اپنی جدوجہد تیز کر دی۔ کہاں گیا کم بخت یہ بٹن۔ آہا . . . مل گیا۔ میں نے اسے اتنی قوت سے دبایا کہ اس کی نوک میری انگلی میں گھس گئی۔ التی میٹر کی سوئی ثابت قدمی سے گر رہی تھی۔ نو سو فٹ . . آٹھ سو فٹ بٹن دبانے پر بھی کچھ نہیں ہوا۔ انجن بہ دستور جامد پڑا تھا۔ پانچ سو فٹ . . چار سو فٹ . . اور . . اور . . پھر تین سو فٹ میں نے التی میٹر سے نظر ہٹالی اور عظیم بحر اوقیانوس میں ڈوب مرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ کئی بار ایسا ہوا تھا کہ جب موت مجھ تک آتے آتے پلٹ گئی تھی مگر اس بار بچنا محال نظر آ رہا تھا لیکن شاید جب میں سمندر سے سو فٹ تھی، انجن ایک دھماکے سے بیدار ہوا۔ میں نے بے اختیار فلائنگ اسٹک کو پیچھے کھینچا اور ویگا جل شاید پانی کو چھوتا ہوا اوپر اٹھنے لگا۔ التی میٹر کی سوئی نے ایک بار پھر بائیں طرف کا سفر شروع کر دیا۔ میں نے گہری سانس لے کر دل کی گہرائیوں سے خدا کا شکر ادا کیا اور پھر جیوترے ہیولینڈ کی مشکور ہوئی جس نے ویگا جل کے لیے از خود اسٹارٹ ہونے والا انجن ڈیزائن کیا تھا ورنہ میری کہانی اوقیانوس میں ہی تمام ہونے والی تھی۔

☆☆☆

صبح کی نمودار ہوتی روشنی میں میری نگاہ جس شے پر سب سے پہلے پڑی وہ ایک بحری جہاز تھا جو شاید یورپ جا رہا تھا۔ نیو فاؤنڈ لینڈ کا سمندر شروع ہو چکا تھا اور میں اپنے سفر کا بڑا حصہ مکمل کر چکی تھی اور اب امریکا محض چند لمحے کی مسافت پر تھا۔ میں نے نیچے دیکھا جہاں گہری دھند نے ہر چیز کو چھپا رکھا تھا۔ یکدم میں ایسی تھکن محسوس کرنے لگی جیسی تھکن طویل سفر کر کے آنے والے مسافر منزل کو قریب دیکھ کر محسوس کرتے ہیں، مجھ پر ایک سرشاری چھا گئی۔ میں نے موسم، فاصلے اور وقت کو بیک وقت شکست دی تھی۔ مگر نیچے مسلسل گہری ہوتی ہوئی دھند دیکھ کر میری خوشی کافور ہونے لگی۔ اگر زمین اسی طرح غائب رہی تو میں نیویارک کی ائرفیلڈ تک کیسے پہنچوں گی اور کیوں کر طیارہ نیچے اتار پاؤں گی؟

تھکن کے ساتھ اب مجھے سردی بھی لگ رہی تھی۔ سامنے اسکرین کے شیشے پر اوس جم جم کر برف بن گئی تھی۔ میں اس اجنبی سرزمین پر ٹھیک سے لینڈنگ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ نیویارک تھا، اونچی عمارتوں کا شہر۔ عین ممکن تھا کہ ویگا جل ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ میں جا گھستا۔ میں نے نقشے پر پروٹیکٹر اور کمپاس کی مدد سے اندازہ لگایا کہ میں نیو برنس وک کے سمندر پر تھی۔ اس کے بعد مینے تھا اور پھر نیویارک آ جاتا۔ خوش قسمتی سے سورج کے بلند ہوتے ہی دھند تیزی سے چھٹنے لگی اور زمین کے خدوخال نمودار ہونے لگے۔ یہ کوئی غیر آباد علاقہ تھا جہاں ہر طرف سبزہ اور جنگل تھے۔ کہیں کہیں سڑکیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ میں خوشی سے بے حال ہو گئی۔ میں کامیاب ہو گئی۔ میں نے چیخ کر کہا۔ لیکن مکمل طور پر اعتماد کون کر سکتا ہے، سوائے خدا کے۔

دن روشن تھا۔ ہوا بھی موافق تھی۔ اب میں زمین پر پرواز کر رہی تھی۔ میری منزل کچھ ہی دور تھی اور میرا آخری پیٹرول ٹینک تین چوتھائی بھرا ہوا تھا۔ میں خود کو بہت پُراعتماد محسوس کر رہی تھی اور اس بات سے بے خبر تھی کہ اعتماد اور خوشی کا یہ لمحہ عارضی اور مختصر ہے اور میرے نصیب میں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ . . میں ایک بار پھر دو ہزار فٹ کی بلندی پر تھی جب انجن اچانک ہی بند ہو گیا۔ مکمل اعتماد کے ساتھ میں نے پٹ کوک کا بٹن دبایا مگر کچھ نہیں ہوا۔ دوبارہ دبانے پر انجن تھوڑی دیر کھانسا اور پھر وہی سکوت طاری ہو گیا۔ ایسا سکوت جیسے پوری کائنات خاموش ہو گئی ہو، اور میں خلا میں ڈول رہی ہوں۔ یہ خیال خاصا خوفناک تھا کہ پیٹرول قبل از وقت ہی ختم ہو گیا تھا لیکن نہیں . فیول گیج کی سوئی بتا رہی تھی کہ ویگا کا مرکزی ٹینک نصف سے زیادہ بھرا ہوا ہے تو پھر انجن کیوں خاموش تھا۔ میں نے دیوانہ وار پٹ کوک کے نوک دار بٹن کو دبانا شروع کر دیا۔ انجن تو کیا چلتا میری انگلیاں ہی چھلنی ہو گئیں اور جب میں نے بلبلا کر ہاتھ ہٹایا تو خون کے قطرے میرے لباس اور نقشے پر گرنے لگے۔ گویا صورتِ حال مزید ابتر ہو گئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ میں اب بھی اپنی منزل سے چالیس میل دور تھی۔

ویگا جل اب گلائیڈ کر رہا تھا اور اس کی رفتار تیس ناٹ فی گھنٹا تھی مگر بلندی محض دو ہزار فٹ تھی۔ موافق ہوا کے باوجود یہ ناممکن تھا کہ میں اتنے فاصلے تک طیارہ گلائیڈ کر سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ انجن اسٹارٹ نہیں ہوتا تو میں ایک مثالی لینڈنگ کا موقع کھو دیتی اور مجھے اس علاقے میں کسی سڑک یا کھیت پر اترنا پڑتا۔

ویگا جل بتدریج زمین سے نزدیک ہوتا جا رہا تھا اور عین اس وقت جب میں طیارہ زمین پر اتارنے کا فیصلہ کر چکی تھی، انجن ایک بار پھر کھانسا اور چلنے لگا۔ میرے حلق سے چیخ نکل گئی اور میں تیزی سے طیارے کو اوپر لے جانے لگی۔ اگرچہ اس کا کوئی بھروسا نہیں تھا اور وہ پھر بند ہو سکتا تھا لہٰذا میں زیادہ سے زیادہ بلندی حاصل کرنا چاہتی تھی تاکہ انجن بند ہونے کی صورت میں گلائیڈ کر کے نیویارک پہنچ سکوں۔ ابھی مجھے ہڈسن بے کا سمندر عبور کرنا تھا۔ میں ویگا کو پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر لے آئی۔ اب دن کی روشنی پوری طرح نکھر چکی تھی اور حدِ نگاہ چالیس سے پچاس میل بالکل واضح تھی۔ اب میری فوری منزل سڈنی تھی۔ وہاں ایک اچھا ائرفیلڈ موجود تھا اگر میں وہاں تک پہنچ جاتی تو ویگا کی مرمت کرا کے محض دس منٹ میں نیویارک میں ہوتی۔

کم بخت انجن ایک بار پھر بند ہو گیا۔ ابھی میں سڈنی سے کم از کم بارہ میل دور تھی۔ ویگا اتنا فاصلہ ہوا میں بھی تیر کر طے کر سکتا تھا مگر مرے کو مارے شاہ مدار کے مصداق بدقسمتی سے ہوا کا رخ بدل گیا اور وہ اب ویگا کو سہارا دینے کے بجائے اسے پیچھے دھکیل رہی تھی۔ طیارے اور زمین کے درمیان فاصلہ تیزی سے کم ہونے لگا۔ مجھے تشویش ہونے لگی

کہ اس رفتار سے تو میں پکے ہوئے پھل کی طرح نیچے جا پڑوں گی اور امریکیوں کو جہاز اور میرے پرزے الگ الگ کرنا پڑیں گے۔ میں ایک بار پھر فلائنگ اسٹک سے نبرد آزما تھی اور میری کوششوں سے ویگا کسی حد تک بہتر طریقے سے گلائیڈ کرنے لگا۔ کم از کم اب وہ ایک بھاری پتھر کی طرح نیچے نہیں گر رہا تھا۔ جیسے جیسے زمین نزدیک آتی جارہی تھی، اس کے خدوخال دیکھ کر مجھے رونا آرہا تھا۔ زمین میں جا بہ جا گڑھے تھے اور جگہ جگہ گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ زمین کا رنگ کائی جیسا تھا۔ معاً ویگا نے غوطہ لگایا اور زمین کی طرف لپکا۔ میں نے بروقت فلائنگ اسٹک کو پیچھے کھینچا اور اوپر اٹھتے ہوئے طیارے کی دم درختوں کی شاخوں سے ٹکرائی تھی۔ اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوجاتی تو طیارہ خود درختوں سے جا ٹکراتا مگر تھوڑا۔۔۔ سا اٹھ کر ویگا ایک بار پھر جھکا اور منہ کے بل زمین پر جا گرا۔ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ میں سیٹ بیلٹ توڑ کر سامنے والے شیشے سے جا کر ٹکرائی اور میرا سر پھوٹ گیا۔ خون بہہ کر آنکھوں میں آنے لگا اور حواس مختل ہوگئے۔

میں ٹٹولتی ہوئی باہر نکلی اور اپنی آنکھوں سے خون صاف کرکے سب سے پہلے گھڑی دیکھی۔ اکیس گھنٹے اور پچیس منٹ کی طویل پرواز کے بعد میرے طیارے نے ایک بار پھر زمین کو چھولیا۔ بے شک منہ کے بل سہی۔ میں نے ویگا جل کی طرف دیکھا اور بے اختیار ہنسنے لگی۔ وہ جس طرح گرا تھا اسی طرح زمین پر کسی تیزے کی طرح دھنس گیا تھا۔ اس کا اگلا سرا انجن تک زمین میں غائب تھا اور دم آسمان کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ یہ علاقہ دلدلی تھا اور اس کا احساس مجھے تب ہوا جب میرے جوتے زمین میں دھنسنے لگے۔ ریکارڈ میں یہ تاریخی پرواز اس طرح درج تھی۔

”انگلینڈ سے امریکا کی ایک دلدل تک نان اسٹاپ اٹلانٹک کراس فلائٹ ....“

☆☆☆

سب سے پہلے مجھے ایک ماہی گیر نے دریافت کیا اور اس کا رویّہ کچھ ایسا پُرجوش تھا جیسے وہ کولمبس ہو اور امریکا دریافت کرلیا ہو۔ وہ بدشمن جزیرے کا رہنے والا تھا۔ میں اس جزیرے پر گری تھی۔ اس نے دور سے میرے طیارے کی اوپر اٹھی ہوئی دم دیکھی اور وہ دوڑا چلا آیا۔ اس نے وہاں مجھے نم اور بدبودار زمین پر گھوڑے بیچ کر سوتے پایا۔ کچھ دیر بعد میں اس کے گھر پر تھی۔

وہاں سے میں نے سڈنی کی ائرفیلڈ پر فون کرکے اپنے بارے میں اطلاع دی کہ میں خیریت سے ہوں اور میری تلاش میں نکلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جزیرے کے پُرخلوص باسیوں نے فراخ دلی اور مقامی بیئر سے میری تواضع کی۔ اسی شام سڈنی سے امریکی ائرفورس کے دو افسران مجھے لینے آگئے۔ یہ رات میں نے سڈنی میں گزاری اور اگلی صبح میں ائرفورس کا ایک طیارہ لے کر نیویارک روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

جب نیویارک کی فلوئیڈ بینٹ ائرفیلڈ پر میرے طیارے نے لینڈنگ کی تو وہاں بہ دستور پریس والوں کا ایک ہجوم تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ میں کل ہی امریکا پہنچ گئی تھی مگر انہوں نے اس طرح میرا استقبال کیا جیسے میں ابھی اوقیانوس عبور کرکے آئی ہوں۔ نیویارک کا میئر بذاتِ خود ائرفیلڈ پر موجود تھا۔ بعد میں اس نے میرے اعزاز میں نیویارک کے شہریوں کی طرف سے ایک عشائیہ دیا تھا۔ مجھ پر ٹیلی گراموں اور فون کالوں کی بارش ہوگئی۔

میں جس ہوٹل میں مقیم تھی وہاں لوگوں کا ایک ہجوم ہر وقت میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے موجود رہتا تھا۔ مجھے بے تحاشا دعوت نامے مل رہے تھے اور آٹوگراف دیتے دیتے میرے ہاتھ شل ہورہے تھے۔

ویگا جل جس نے مجھے یہاں تک پہنچایا تھا، میں اسے ہرگز نہیں بھولی تھی۔ ائرفورس والوں نے اسے دلدل سے نکالا اور اسے ورکشاپ میں لاکر اس کی مرمت کی گئی۔ اس دوران میں یہ انکشاف ہوا کہ بارش کا پانی مسلسل اس کے ہوائی دخول سے گزر کر تیل سپلائی کرنے والی لائن میں جا کر جم جاتا تھا۔ جس سے انجن کے ایندھن کی فراہمی بند ہوجاتی تھی اور ظاہر ہے کہ بغیر تیل کے انجن کیوں کر چلتا۔

ماہرین حیران تھے کہ اتنے بڑے نقص کے باوجود اتنے خراب موسم میں طیارے نے اتنا طویل فاصلہ کیوں کر طے کرلیا۔

امریکیوں کو میں نے عورتوں کے معاملے میں انگریزوں سے کہیں زیادہ فراخ دل پایا۔ میں ان کے خلوص اور گرم جوشی سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ میرے پاس مبارک باد کے ٹیلی گرام اور خط ابھی تک موجود ہیں جو مجھے بعد میں ملے۔ اخبارات نے مجھے خوب کوریج دی۔ ہر کوئی میرا انٹرویو لینے کی کوشش کررہا تھا۔ بلاشبہ ان دنوں میں امریکا کی مقبول ترین شخصیت تھی۔ ویگا جل کی بھی کم پبلسٹی نہیں ہوئی۔ خاص طور سے اس کی وہ تصویر تو تقریباً ہر اخبار نے شائع کی جس میں وہ منہ کے بل دلدل میں دھنسا نظر آرہا تھا۔ یہ سب میری سنہری یادداشتیں ہیں اور میری زندگی کا سرمایہ بھی۔ ☐

عی سُفیان آفاقی کی یادداشتیں

فلمی الف لیلہ

20

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو
آنکھوں میں اُڑ رہی ہے لُٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

یہ در روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرمِ عمل ہوں اور اپنے روزِ اول کی طرح تازہ دم بھی۔ اُن کے ذہنِ رسا کی پرواز میں کمی کبھی واقع ہوئی نہ اُن کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کے نشان اُس کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں اُنہیں اپنے عہد کی ہر قابلِ ذکر شخصیت سے ملنے اور اُس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابلِ رشک ہے۔ آئیے ہم بھی اُن کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں، وہ اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب وصحافت سے فلمی دُنیا تک دراز ایک داستان دردداستاں سرگزشت

غزل کے شہنشاہ مہدی حسن بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ زندگی کے آخری کئی سال انہوں نے بیماری کے عالم میں گزارے۔ وہ بیماری کے جس دور سے گزر رہے تھے وہ زیادہ تکلیف دہ تھا۔ ان کے لیے بھی اور ان کے اہلِ خاندان اور پرستاروں کے لیے بھی۔

اللہ تعالیٰ کے کام اور ان کے انجام وہی جانتا ہے۔ ہم لوگ تو صرف دیکھنے، سننے والے ہیں۔ مہدی حسن نے برصغیر میں غزل کو زندہ کرنے میں بہت نمایاں حصہ لیا بلکہ یہ

علالت کے دوران مہدی حسن تقریب موسیقی میں

کہنا درست ہوگا کہ انہوں نے غزل اور غزل سرائی کو نئی زندگی دی۔ ان کا انتقال تو جون 2012ء میں ہوا لیکن اپنے مداحوں اور آواز کے پرستاروں کے لیے وہ پہلے ہی جان سے گزر چکے تھے۔ یہاں تک کہ زندگی کے آخری ایام میں وہ آواز جو سالہا سال تک دنیا بھر میں جادو جگاتی رہی تھی، خاموش ہو گئی تھی۔ وہ بول نہیں سکتے تھے، صرف سنتے اور خاموشی سے آنسو بہاتے تھے۔

گزشتہ چند سالوں میں ہمارے قریبی واقف کاروں میں دو نامور شخصیات ایسی تھیں جو آواز کے استعمال پر قادر تھیں، ان منفرد شخصیات میں ایک شاعر سیف الدین سیف جو شاعر کے علاوہ صاحب مطالعہ دانشور بھی تھے۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر انسان بہت کچھ سیکھتا تھا لیکن یہ بھی ایک المیہ ہے کہ زندگی کے آخری حصے میں وہ بول نہیں سکتے تھے۔ البتہ سنتے تھے اور تحریری طور پر گفتگو کرتے تھے۔ دیکھنے والے غمزدہ ہو کر یہ دیکھا کرتے تھے۔ اللہ کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے؟

ایسی دوسری شخصیت مہدی حسن کی تھی۔ اپنی آواز سے دنیا کو مسحور کرنے والا یہ شخص آخری ایام میں بول تک نہیں سکتا تھا۔

مہدی حسن نے غالباً 1996ء میں بیماری کے باعث گانا ترک کر دیا تھا۔ البتہ 2009ء میں ان کا اور لتا منگیشکر کا ایک مشترکہ البم "سرحدیں" کے عنوان سے جاری ہوا تھا جسے بہت پسند کیا گیا۔ یہ دونوں آوازیں برصغیر کی قابلِ قدر اور ناقابلِ فراموش آوازیں رہی ہیں۔

قدرت نے انسان کو جو نعمتیں بلا معاوضہ یا بلا مانگے عطا کی ہیں ان میں آواز کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ یوں تو جسم کے ہر اندرونی اور بیرونی حصے کو ناگزیر سمجھا جاتا ہے لیکن انسان اللہ کی وہ مخلوق ہے جو اس احسان کو اس وقت تک نہیں مانتی جب تک کہ اس میں کوئی خرابی یا تکلیف پیدا نہ ہو۔ ہاتھ کی چھوٹی انگلی کو عام حالت میں کون اہمیت دیتا ہے لیکن اگر اس کا ناخن بھی ٹوٹ جائے تو انسان تڑپ جاتا ہے۔ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو ہم اہمیت نہیں دیتے جب تک کہ ان میں تکلیف نہ ہو جائے۔ ہر شخص آئے دن کسی نہ کسی چیز کا رونا روتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو جو دیا گیا ہے، وہ اسے شمار ہی نہیں کرتا۔

بچپن میں ہم سنا کرتے تھے کہ
"تندرستی ہزار نعمت ہے۔"

بچپن، لڑکپن اور جوانی میں تندرستی کی کون قدر کرتا ہے۔ یہ تو ہر ایک کو حاصل ہوتی ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی ہے اور بیماریوں سے واسطہ پڑتا ہے تو اس کہاوت کی صداقت کا احساس ہوتا ہے کہ واقعی تندرستی ہزار نعمت ہے۔ اس کی اہمیت کسی بیمار سے پوچھیے۔

بات میں بات نکل آتی ہے۔ تذکرہ دراصل آواز کا تھا۔ آواز کی قدر عام حالات میں ہم نہیں کرتے لیکن کسی گونگے کو دیکھتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ آواز بھی انسان کے لیے کس قدر اہم اور لازمی شے ہے۔ آواز کے ذریعے ہم ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے اور دنیا کے بارے میں جانتے ہیں۔ خوش آواز

لوگوں کی آوازوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

شیریں اور خوبصورت آواز سن کر ہی دل خوش ہو جاتا ہے۔ آوازیں دھوکا بھی دیتی ہیں مثلاً ٹیلی فون یا موبائل فون پر آپ کسی خوبصورت آواز کے شیدائی ہو گئے ہیں لیکن آمنا سامنا ہونے پر معلوم ہوتا ہے کہ آواز کی خوبصورتی کے باعث آپ نے چہرے اور سراپا کا جو تصور قائم کیا تھا وہ درست نہ تھا۔

ہم پچاس کی صدی میں جب صحافت سے وابستہ ہوئے تو لاہور اور پنجاب میں چند بیگمات کا سیاست میں بہت عمل دخل تھا۔ بیگم تصدق حسین، بیگم جی اے آفاق (غالباً یہی نام تھا) اور بیگم عرفان اللہ، ان میں نمایاں تھیں۔ صحافی کی حیثیت سے ہماری ٹیلی فون کے ذریعے ان بیگمات سے گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ بیگم جی اے خان کی سیکریٹری ٹیلی فون اٹھاتی تھیں اور ان سے مختصر گفتگو کے بعد ہی بیگم صاحبہ سے بات ہو سکتی تھی۔ ان خاتون کی آواز اس قدر شیریں اور دلکش تھی کہ جی چاہتا تھا کہ بس سنتے رہیں۔ فون پر رسمی اور ضروری بات چیت تو ہوتی رہتی تھی لیکن اس زمانے میں خواتین سے زیادہ بات کرنا سوئے ادب میں شامل تھا۔

سیکریٹری سے بات چیت کے بعد ہم نے ان کا ایک سراپا فرض کر لیا تھا جو اس شیریں آواز کے عین مطابق تھا۔

ایک بار بیگم جی اے خان بیرون ملک سے واپس آئیں تو سیکریٹری کے ذریعے پیغام ملا کہ وہ ملنا چاہتی ہیں۔ بیگم صاحبہ سے بھی ہماری اکثر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ ہم اس زمانے میں سائیکل سوار تھے مگر سائیکل سواری کو حقارت سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ متوسط طبقے کے لوگوں کی یہی مخصوص سواری تھی۔

ہم اپنی سائیکل پر بیٹھ کر نہر کنارے بیگم جی اے خان کی کوٹھی گئے۔ بہت شاندار کوٹھی تھی۔ ہم نے سائیکل کی گھنٹی بجا کر ملازم کو بلایا جس نے ہمیں ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا اور سیکریٹری کے بارے میں بتایا کہ بس وہ آنے ہی والی ہیں۔

کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر، ہنس مکھ خاتون ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ جب انہوں نے علیک سلیک کے بعد مخاطب کیا تو معلوم ہوا کہ اس قدر خوبصورت اور نوخیز آواز کی مالک یہی خاتون ہیں۔ اندازے کی غلطی پر افسوس تو ہوا مگر وہ اس قدر خوش اخلاق اور خوش کلام تھیں کہ کچھ دیر میں ہی ہم نے ان کو اپنی بزرگ تسلیم کر لیا۔

بیگم صاحبہ مسکراتے ہوئے تشریف لائیں تو سیکریٹری خاموش ہو گئیں۔ بیگم صاحبہ سے ہم دو ایک بار مل چکے تھے۔ وہ نہایت بااخلاق خاتون تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ بیرونِ ملک سے وہ جو کچھ دیکھ کر آئی ہیں اس بارے میں ان کے تاثرات شائع کیے جائیں۔ یہ بہت دلچسپ انٹرویو تھا اور روزنامہ "آفاق" کے قارئین نے اسے بہت پسند کیا تھا۔

چائے پینے کے بعد ہم نے رخصت کی اجازت چاہی تو بیگم صاحبہ نے اپنی سیکریٹری کو اشارہ کیا۔ انہوں نے ایک خوبصورت بنڈل ہمیں لا کر دیا۔

ہم نے حیرت سے بیگم صاحبہ کو دیکھا۔ وہ بولیں کہ میں اتنی دور گئی تھی، آپ کے لیے ایک گرم سوٹ کا کپڑا لے کر آئی ہوں۔

ہم نے معذرت کی تو انہوں نے ڈانٹا کہ بڑوں کے تحفے لازماً قبول کرنے چاہئیں۔ ہم وہ کپڑا لے کر آ گئے۔ واقعی بہت نفیس انگلش سوٹ کا کپڑا تھا۔ اس زمانے میں غیر ملکی کپڑا پاکستان میں عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا تھا اور اگر مل بھی جائے تو ملکی کپڑے کے مقابلے میں بہت زیادہ مہنگا۔

ہماری حماقت یا سادگی ملاحظہ ہو کہ ہم نے دو دن کے اندر یہ سوٹ سلوا لیا اور اس کو پہن کر دفتر گئے تو سب ساتھیوں نے تعریف کی۔ ہمارے منہ سے نکل گیا کہ سوٹ کا تحفہ بیگم جی اے خان ہمارے لیے لائی ہیں۔ اس بات کا ایک مذاق بن گیا اور ساتھیوں نے یہ مشہور کر دیا کہ جو بھی

امانت علی

بڑے غلام علی

بیگمات ملک سے باہر جاتی ہیں وہ آفاقی کے لیے تحفہ ضرور لاتی ہیں۔

ذکر مہدی حسن کا تھا۔ مہدی حسن کو اللہ نے ایسی آواز دی تھی جو کہ ان کا سرمایہ تھی۔ ان کی آواز میں ایک خاص قسم کی کھنک، والہانہ پن اور کشش تھی۔

انہوں نے مشکل حالات میں ابتدائی زندگی گزاری لیکن گائیکی اور موسیقی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ موسیقی بلکہ گائیکی ان کی زندگی تھی۔ وہ تو اسی دن مر گئے تھے جس دن ان کی خوبصورت آواز نے ان کا ساتھ چھوڑا تھا۔

برصغیر کے معروف اور اچھے گانے والوں کی آوازوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک کی آواز میں انفرادیت تھی اور آواز کی یہ انفرادیت ان کی شہرت اور دائمی پسندیدگی کا باعث تھی۔

بیگم اختر کی آواز میں ایک خاص کھنک تھی۔ انہوں نے بھی بہت اچھی غزلیں گائی ہیں۔ ان کی آواز سن کر ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ آپ کس کی آواز سن رہے ہیں۔

اسی طرح شمشاد بیگم کی آواز میں ایک لگاؤ اور کشش کھنکتی ہوئی آواز اس پر بولوں کی ادائیگی۔ فلمی دنیا میں لتا منگیشکر کی آواز سے پہلے شمشاد بیگم کا ڈنکا بجتا رہا ہے۔ لتا منگیشکر کی آواز میں مٹھاس اور لوچ ہے۔ الفاظ کی ادائیگی بھی خوب کرتی ہیں لیکن عجب بات یہ ہے کہ اس آواز میں انفرادیت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انڈیا کی فلم انڈسٹری میں جب نئی گانے والی آوازیں آئیں تو ان کے نغمات سن کر یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ گانا لتا گا رہی ہیں یا کوئی اور۔

محمد رفیع کی آواز میں اللہ نے ایک عجب بانکپن دیا تھا اور وہ ہر قسم کا گانا اتنی آسانی سے گاتے تھے جیسے روزمرہ کی بات ہے۔ انہوں نے المیہ، مزاحیہ، نیم کلاسیکی نغمات گا کر اپنی عظمت کا ثبوت دیا۔ وہ اچانک ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے وفات پا گئے۔ کچھ لوگ ایسی موت کو بے وقت کی کہتے ہیں حالانکہ ہر ایک کی موت کا وقت، جگہ اور پہلے ہی اس کی تقدیر میں لکھ دیا جاتا ہے۔

کشور کمار ہندوستانی فلموں کی ایک اور دلکش ہے۔ کشور کمار کی آواز میں بنیادی طور پر بنگالی عنصر تھا۔ انہوں نے ہر قسم کے گانے بہت خوبصورتی سے گائے۔ بھی ایک منفرد آواز کے مالک تھے۔ ان کی آواز دور سے کہہ دیا کرتی تھی کہ یہ کس کی آواز ہے۔

انڈیا کے ایک اور فلمی سنگر مکیش تھے۔ مکیش اور رفیع کا زمانہ کم و بیش ایک ہی تھا۔ دونوں ہی مقبول اور معروف تھے لیکن دونوں کی آوازوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مکیش کی آواز بھی بتا دیا کرتی تھی کہ میں مکیش کی آواز ہوں۔ آغاز میں انہوں نے کے ایل سہگل کے انداز میں گانا شروع کیا تھا مگر معروف موسیقار انیل بسواس نے انہیں مشورہ دیا کہ سہگل کی آواز اور انداز کی نقل کر کے تم کہیں کے نہ رہو گے اور بے شمار آوازوں میں گم ہو جاؤ گے تو انہوں نے تجربہ کار موسیقار کے مشورے پر عمل کیا اور فلمی گانے والوں کی صف اول میں اپنا نام شامل کرا گئے۔ تعجب کی بات ہے کہ وہ بھی محمد رفیع کی طرح ادھیڑ عمری میں اچانک ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے وفات پا گئے۔ موت کا فرشتہ اچانک نازل ہوتا ہے اور اچھا خاصا تندرست انسان اچانک دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

برصغیر کے ابتدائی گلوکاروں میں کالے خان بہت مشہور تھے۔ اس زمانے میں گانوں کے ریکارڈ بنائے جاتے تھے تو گانے کے اختتام پر آواز آتی تھی۔ میرا نام ہے کالے خان۔ سریندر بھی ایک اداکار اور گلوکار تھے مگر بہت زیادہ شہرت حاصل نہ کر سکے حالانکہ اچھے اداکار اور گلوکار تھے۔

انڈیا کے فلمی گلوکاروں میں سب سے پہلے ملک گیر شہرت کے ایل سہگل نے حاصل کی تھی۔ ان کے بارے میں بارہا تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ کے ایل سہگل جالندھر میں پیدا ہوئے مگر شہرت انہوں نے کلکتہ جا کر حاصل کی۔ سہگل جیسی منفرد اور درد بھری سریلی آواز کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ وہ گاتے تھے تو بقول شخصے دیپ جل اٹھتے تھے۔ فلم تان سین میں انہوں نے جو اداکاری اور گلوکاری کی ہے اسے کون بھلا سکتا ہے۔ دیکھ کر اور سن کر یوں لگتا ہے جیسے واقعی تان سین بھی ایسا ہی ہوگا۔

سہگل نے اداکاری بھی کی۔ وہ اچھے اداکار تھے لیکن حزنیہ اور المیہ اداکاری میں انہیں کمال حاصل تھا۔ شاید یہ

بھی کہ ان کے چہرے پر ہر وقت اداسی اور غم کا تاثر رہتا تھا اس لیے انہیں المیہ اداکاری کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ جب فلم "دیوداس" دوسری بار بنی تو اس کی ہیرو سہگل ہی تھے۔ پہلی دیوداس کے ہیرو اور ہدایت کار اے پی بروا تھے۔ دوسری دیوداس کے ہدایت کار بروا تھے لیکن دیوداس کا کردار سہگل نے ادا کیا تھا۔ بعد میں دلیپ کمار نے بھی اپنے عروج کے دور میں دیوداس کا کردار ادا کیا اور پھر شاہ رخ خان نے بھی دیوداس بننے کی کوشش کی۔ دلیپ کمار نے اپنی اداکاری کے زور پر اس کردار میں جان ڈال دی مگر سہگل کی اور خصوصاً ان کے گانوں کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے سہگل شکل و صورت

محمد رفیع

اور حلیے سے بھی مظلوم اور دکھی انسان نظر آتے تھے اس لیے دیوداس جیسے کرداروں میں ان کا مقابلہ دلیپ کمار بھی نہ کر سکے۔ جن لوگوں کو سہگل کی دیوداس دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے ان کی نظروں میں سہگل کا چہرہ اور کانوں میں ان کی آواز گونجتی رہی۔ شاہ رخ خان کی فلم دیوداس کو تو اس فلم کی پیروڈی ہی کہا جا سکتا ہے۔

سہگل کی آواز میں جو درد، سوز اور سریلا پن ہے وہ کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آیا۔ خاص طور پر المیہ گانوں میں تو کوئی ان تک نہ پہنچ سکا۔ فلم دیوداس کا اہم منظر ہے کہ پاربتی (ہیروئن) کی شادی کہیں اور ہو جانے کے بعد دیوداس شراب میں ڈوب جاتا ہے، وہ پاربتی سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ جہاں بھی ہوگا مرنے سے پہلے ایک بار پاربتی سے ضرور ملے گا۔

فلم کا آخری منظر یہ ہے کہ دیوداس قریب المرگ اور بیمار ہے۔ زندہ رہنے کی کوئی امید نہیں رہی۔ وہ ایک بیل

اقبال بانو

گاڑی میں پاربتی کے گاؤں کا سفر کرتا ہے اور اس موقعے پر جو گیت گاتا ہے شاید اس کی فلمی گیتوں میں مثال نہ مل سکے۔ گیت کے بول بھی دل کو چھونے والے ہیں۔

دکھ کے دن اب بیتت ناہیں

(اب دکھ کے دن گزارنا دوبھر ہو گیا ہے) دیوداس کی بیل گاڑی پاربتی کے گاؤں پہنچتی ہے اور دیوداس وعدہ پورا کر کے مر جاتا ہے۔ اس داستان کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سہگل جیسی آواز کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ سہگل نے غزلیں خصوصاً غالب کی غزلیں بھی بہت خوبصورت اور سادہ انداز میں گائی ہیں، مثلاً

درد منت کش دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا

غالب کی غزلیں گانے کا سہگل نے حق ادا کر دیا ہے۔

ہمارے ٹی وی پروگراموں میں معروف اور مرحوم گلوکاروں کے بارے میں جو خصوصی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں ان میں ایک حماقت یہ کی جاتی ہے کہ اس معروف گلوکار یا گلوکارہ کے گانے دوسرے گلوکار پیش کرتے ہیں۔ یہ اصولاً بھی غلط ہے۔ مثال کے طور پر اگر نور جہاں یا مہدی حسن کا گایا ہوا گیت کوئی اور گلوکار خواہ کتنے ہی اچھے انداز میں گائے، اصل گانے والوں کی آواز کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ پرانے لوگوں کے کانوں میں تو پرانے گانے ہی گونجتے رہتے ہیں مگر نئی نسل کو صحیح طور پر اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ گلوکار یا گلوکارہ کس معیار کی تھی۔ ہم نے بارہا لکھ کر اور زبانی بھی ٹی وی پروڈیوسروں سے درخواست کی کہ ایسے پروگراموں میں کم از کم ایک شعر یا ایک بند تو اصل گلوکار کا پیش کرنا چاہیے تاکہ لوگ اس فن کار کے بارے میں صحیح اندازہ لگا سکیں مگر کسی نے توجہ نہیں دی۔

تذکرہ گلوکاروں کی آوازوں کا ہو رہا تھا خصوصاً

مکیش

معروف اور صاحبِ طرز گانے والوں سے یہ بات شروع ہوئی تھی۔

انڈیا میں ایک گلوکار جی اے درانی بھی کسی زمانے میں بہت مشہور تھے مگر وقت کی گرد نے انہیں ڈھانپ لیا۔

ہندوستان کی گلوکارہ گیتا رائے کی آواز میں بھی انفرادیت تھی اور بے شمار آوازوں میں الگ ہی پہچانی جاتی تھی۔ گرودت سے شادی کرنے کے بعد وہ گیتا دت ہوگئی تھیں۔ کچھ عرصے بعد غائب ہوگئیں مگر ان کی آواز آج بھی زندہ ہے۔ مثلاً ان کا گایا ہوا گیت

میرا سندر سپنا ٹوٹ گیا
میں پیار میں سب کچھ ہار گئی
بے درد زمانہ جیت گیا
میرا سندر سپنا ٹوٹ گیا

گیتا رائے کی آواز اپنی انفرادیت اور خوبصورتی کی وجہ سے ہمیشہ یاد رہے گی۔

انڈیا کی اداکارہ اور گلوکارہ ثریا دیو آنند کے ساتھ اپنے رومان کی وجہ سے بہت مشہور ہوئی تھیں۔ وہ اس عہد کی فن کاراؤں میں (نور جہاں کی طرح) تھیں جو بیک وقت بہت اچھی اداکارہ بھی تھیں اور صفِ اول کی گلوکارہ بھی۔ 1960ء میں وہ فلموں سے کنارہ کش ہوکر گوشہ نشین ہوگئیں اور پھر کبھی منظرِ عام پر نہ آئیں۔ ثریا کی آواز میں جو کشش اور لچک تھی، ہمارے ایک دوست اس کو "لگاوٹ" بھی کہا کرتے تھے۔ ثریا کی آواز بھی دوسری آوازوں سے مختلف اور دل پر اثر کرنے والی تھی۔

زہرہ بائی انبالے والی کی آواز میں ایک عجیب سی کھنک اور تاثر تھا۔ جن لوگوں کو فلم "رتن" کے یادگار نغمے یاد ہیں وہ ان کی آواز کبھی نہیں بھلا سکتے، مثلاً

ساون کے بادلو
ان سے یہ جا کہو
تقدیر میں یہی تھا
ساجن مرے نہ رو
ساون کے بادلو

یا پھر

گھنا گھنگھور گھور
مور مچائیں شور
مورے سجن آجا آجا

یہ آوازیں اور گیت سدا بہار ہیں۔

کلکتہ کی فلمی اداکارہ اور گلوکارہ کانن بالا کی آواز میں بنگالی انداز تھا۔ بہت میٹھی اور دل پر اثر کرنے والی آواز تھی۔ اسی طرح کلکتہ کے موسیقار اور گلوکار پنکج ملک کی آواز دوسروں سے مختلف تھی۔ انہوں نے ایک بار یہ تجربہ کیا کہ سہگل سے جو گانے گوائے، وہی گانے ریکارڈ کے دوسری جانب اپنی آواز میں ریکارڈ کیے۔ پنکج ملک بھی اچھی آواز کے مالک تھے اور بذاتِ خود موسیقار تھے لیکن سہگل کی آواز کا درد اور الم کہاں سے لاتے۔ مثلاً یہ گانا جس نے بھی سنا ہے، کبھی بھول نہیں سکتا۔

اے کاتبِ تقدیر مجھے اتنا بتا دے، اتنا بتا دے
کیوں مجھ سے خفا ہے تو کیا میں نے کیا ہے

سہگل واقعی ایک ناقابلِ فراموش اور بے مثال گلوکار تھے۔ "شاہجہاں" ان کی آخری فلم تھی۔ وہ بھی درمیانی عمر ہی میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔ وجہ..... کثرتِ شراب نوشی۔ شاہجہاں میں سہگل کے کچھ گانے آج بھی یادگار ہیں۔

... ہم جی کے کیا کریں جب دل ہی ٹوٹ گیا

...... غم دیے مستقل کتنا نازک ہے دل یہ نہ جانا
ہائے ہائے رے ظالم زمانہ

سہگل جیسی آواز کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔

طلعت محمود کی آواز میں مٹھاس اور نغمگی بھی تھی۔ ان کا گانا سن کر فوراً معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ طلعت محمود گا رہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، خورشید اور امیر بائی کرناٹکی، وغیرہ بھی ایسی ہی منفرد آوازیں تھیں۔

ہندوستان کا تذکرہ ختم کرکے اب پاکستان کی طرف آیئے تو یہاں بہت بڑے بڑے گلوکار پیدا ہوئے جنہوں نے موسیقی کو چار چاند لگا دیے۔ روشن آرا بیگم، بڑے غلام علی خاں، امانت علی خان، فتح علی خان کی آوازیں اپنے انداز میں منفرد تھیں لیکن یہ کلاسیکی گانے والے تھے جنہوں نے کچھ فلمی گانے بھی گائے۔

فلموں میں پاکستانی گلوکاروں میں بہت زیادہ ورائٹی ہے۔ کس بزرگ نے میں مجیب عالم، اخلاق احمد کی آوازوں میں مٹھاس اور درد تھا۔ ان دونوں نے بہت مقبول نغمات گائے ہیں۔ سلیم رضا کی آواز ان دونوں سے مختلف تھی۔ اس میں مٹھاس اور سُریلا پن زیادہ تھا۔ احمد رشدی کی آواز اپنی جگہ سب سے الگ تھی۔ انہوں نے مزاحیہ، رومانی اور المیہ نغمات گائے ..... اور سب کا حق ادا کردیا..... مسعود رانا کی آواز میں سوز اور درد کے ساتھ یہ خوبی بھی تھی کہ وہ بڑے اونچے سُروں میں بھی بہت اچھا گاتے تھے۔

پھر مہدی حسن فلم "شکار" کے ایک نغمے کے ساتھ فلمی دنیا میں نمودار ہوئے۔ ان کی غزلوں کی گائیکی نے انہیں شہنشاہِ غزل کا لقب دلا دیا۔ ان کی آواز کو بھولنا مشکل ہے۔ بہت اچھے اچھے گلوکاروں کی موجودگی کے باوجود مہدی حسن

محمد رفیع اور شمشاد

جیسی آواز اللہ نے کسی اور گلوکار کو نہیں بخشی۔ اب وہ اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں مگر ان کی آواز ہمیشہ زندہ رہے گی۔

ملکۂ ترنم نور جہاں برصغیر کی بے مثال گلوکاراؤں میں شمار ہوتی ہیں۔ وہ گلوکارہ ہونے کے ساتھ ساتھ اداکارہ بھی تھیں۔ نور جہاں کی آواز ہر گلوکارہ پر بھاری تھی۔

بھارت میں جب تک وہ رہیں کوئی اور گلوکارہ ان پر بازی نہ لے جاسکی۔ ان کی آواز میں سُریلے پن کے ساتھ ساتھ معصومیت اور شوخی بھی تھی۔ وہ ہر قسم کے نغمات گا سکتی تھیں اور ان کے ساتھ انصاف کرتی تھیں۔ پنجابی میں بھی ان کے نغمات لاجواب ہیں لیکن جب انہوں نے بہت زیادہ پنجابی گانے شروع کردیے تو آواز پر بھی اثر پڑا۔

ناہید نیازی

یہاں تک کہ موسیقار خواجہ خورشید انور جو کہ ان کی آواز کے بغیر فلم نہیں بناتے تھے، ناہید نیازی وغیرہ کی آوازیں استعمال کرنے پر مجبور ہوگئے۔ مگر میڈم نور جہاں کی آواز زندہ جاوید ہے۔ ان کے گائے ہوئے گانے گا کر بہت سی گلوکاراؤں نے شہرت اور دولت حاصل کی مگر وہ نور جہاں والی بات کہاں؟ نور جہاں کی آواز ہمیشہ دلوں پر حکمرانی کرتی رہی ہے اور آیندہ بھی کرتی رہے گی۔

اقبال بانو اپنی جگہ ایک منفرد آواز کی مالک تھیں۔ نظم، گیت اور غزل، ہر قسم کے گانوں کے ساتھ انصاف کرتی تھیں۔ فلم کے لیے گایا تو ان کے گیت

تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے
پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے

اور

الفت کی نئی منزل کو چلا
تو بانہیں ڈال کے بانہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

..... امر ہوگئے۔ ہندوستان کی فلمی دنیا کے لوگ اور دوسرے موسیقی کے دلدادہ ان کے ریکارڈ خرید کر لے جایا کرتے تھے۔ ان کی آواز یکسر مختلف تھی۔ انہوں نے کلاسیکی، نیم کلاسیکی اور فلمی ہر قسم کے نغمے گائے ہیں اور اپنی یادیں چھوڑ گئی ہیں۔

فریدہ خانم کی آواز مذکورہ بالا دونوں گلوکاراؤں سے مختلف ہے۔ انہوں نے فلمی گانے کم ہی گائے ہیں لیکن ان کی گائی ہوئی غزلیں اور گیت سب سے الگ اور مختلف ہیں۔ پاکستان کی گلوکاراؤں میں منور سلطانہ اور کوثر پروین نے ابتدائی زمانے میں بہت شہرت حاصل کی۔ کوثر پروین،

روشن آرا

کی آواز ایک خاص سُر سے اوپر جاکر بگڑ جاتی تھی مگر عام طور پر انہوں نے بہت سے فلمی نغمات گائے۔ وہ جوانی ہی میں وفات پاگئیں۔

دوسری قابلِ ذکر آوازوں میں زبیدہ خانم، ناہید اختر، ناہید نیازی، مالا اور مہناز نے بہت شہرت حاصل کی اور بہت خوبصورت گیت گائے۔

زبیدہ خانم کی آواز دوسری آوازوں سے الگ تھی۔ وہ گاتے ہوئے گیت میں کھو جاتی تھیں جس کی وجہ سے ان کی آواز میں زیادہ درد اور خوبصورتی پیدا ہو جاتی تھی۔ انہوں نے بے شمار مقبول ترین اردو اور پنجابی فلموں میں گلوکاری کی۔ شادی کے بعد انہوں نے فلمی دنیا سے منہ موڑ لیا۔ آج کل (جولائی 2012ء میں) وہ علیل ہیں۔ انہوں نے معروف کیمرا مین اور فلم ساز ریاض بخاری سے شادی کی تھی۔ فیصل بخاری ان ہی کے بیٹے ہیں۔ اخلاق، انکسار اور شائستگی کی وجہ سے بھی وہ سب سے مختلف تھیں۔

مالا بیگم نے بہت سے مقبول فلمی نغمے گائے ہیں مگر ان کی آواز زیادہ اونچے سُر کے لیے مناسب نہ تھی۔ جن موسیقاروں نے اس بات کو نظر انداز کیا۔۔ ان کی آواز کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اونچے سُروں میں وہ سُر سے باہر نکل جاتی تھیں لیکن ان کے اپنے سُر میں ان کی آواز بہت دلکش اور منفرد تھی۔ انہوں نے بہت مقبول نغمے گائے ہیں، مثلاً

دل دیتا ہے رو رو دہائی
کسی سے کوئی پیار نہ کرے
بڑی مہنگی پڑے گی یہ جدائی
کسی سے کوئی پیار نہ کرے

فلم "سات لاکھ" میں نیلو پر فلمایا ہوا گیت، مہار راگ ہے۔ نیلو کو اس گانے نے ہیروئن بنادیا تھا۔ اس گیت کو بھلا کون بھول سکتا ہے۔

آئے موسم رنگیلے سہانے
جیا نہیں مانے
تو چھٹی لے کے آجا بالما

مہناز کی آواز نرالی ہے۔ وہ اونچے سُروں میں بھی خوب گاتی ہیں۔

مختصر یہ کہ گلوکاروں اور خوبصورت آوازوں کی پاکستان میں کوئی کمی نہیں رہی۔ ریشماں کی صحرائی آواز سن کر ذہن کھو سا جاتا ہے۔ ان جیسی آواز بھی کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ ریگستان کی اس بیٹی نے بہت شہرت حاصل کی۔ یہاں تک کہ ہندوستان گئیں تو اس وقت کی وزیراعظم اندرا گاندھی نے خصوصی طور پر ان سے ملاقات کی اور ان کی خواہش پر ہندوستان میں واقع ان کے آبائی گاؤں تک پکی سڑک اور بجلی فراہم کردی۔

عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی ایک اور آواز ہے جو میانوالی کے پہاڑوں سے آبشار کی طرح نکلی اور ساری دنیا میں پھیل گئی۔

قمیص تیری کالی

ان کا مشہور نغمہ ہے۔ ایک زمانہ ان کی آواز اور گائیکی کے انداز کا شیدائی ہے۔ کینرڈ کالج کی فیشن ایبل طالبات سے لے کر ایک عام پاکستانی بھی عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی آواز کو پسند کرتا ہے۔ خدا نے انہیں منفرد اور دلکش آواز سے نوازا ہے۔ انہوں نے پانچ شادیاں کی ہیں۔ آخری شادی ابھرتی ہوئی فلمی اداکارہ بازغہ سے کی تھی جو بہت کامیاب اور خوشگوار ثابت ہوئی۔ ان کے بچے اب جوان ہیں۔

☆☆☆

زمانہ بھی کیسا بے درد ہے۔ انسان کو آسمان تک عروج دینے کے بعد زوال سے بھی آشنا کرتا ہے اور اس کو پستی میں گرا دیتا ہے۔

ہندوستان کے اداکار راجیش کھنہ کو ہندوستانی فلمی دنیا کا سب سے پہلا سپر اسٹار کہا جاتا ہے۔ ان کی فلمیں پے در پے سپرہٹ ہوئی تھیں اور اس زمانے کی معروف ہیروئنیں شرمیلا ٹیگور، ممتاز، وحیدہ رحمن اور ہیما مالنی وغیرہ جیسی ہیروئنیں ان کے ساتھ کام کرنے کی خواہش رکھتی تھیں۔ انہوں نے بالی وڈ کی لگ بھگ 175 فلموں میں کام کیا جن میں آنند، ارادھنا بہت نمایاں ہیں۔ آنند میں انہوں نے ایک کینسر کے مریض

کا کردار بہت خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔ بدقسمتی سے آخری ایام میں وہ بذاتِ خود کینسر کے مریض رہے۔ قدرت کے کھیل بھی نرالے ہوتے ہیں۔ راجیش کھنہ نے ڈمپل کپاڈیہ سے شادی کی تھی جنہوں نے فلم "بوبی" میں کام کرکے بہت شہرت حاصل کی تھی۔ خیال تھا کہ یہ نئی اداکارہ فلم کے نئے اداکار رشی کپور سے شادی کرے گی مگر ڈمپل نے راجیش کی شہرت اور دولت کو ترجیح دی لیکن یہ شادی کامیاب نہ ہوسکی اور کچھ عرصے بعد ہی دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔ ان کی ایک بیٹی ٹوئنکل نے بھی چند فلموں میں کام کیا اور پھر اکشے کمار کے ساتھ شادی کرکے فلمی دنیا کو ترک کردیا۔ دوسری بیٹی رینکی کھنہ ایک تاجر کی بیوی ہیں۔

امیتابھ اور دھرمیندر کے ساتھ ان کا مقابلہ تھا لیکن اپنے زمانے میں راجیش جیسی کامیابیاں اور مقبولیت کسی اور کو حاصل نہ ہوسکی۔ وہ جہاں جاتے تھے ایک ہجوم ان کو گھیر لیا کرتا تھا۔ لڑکیاں ان کی کار کو بوسے دے دے کر اسے سرخ کردیا کرتی تھیں۔

راجیش کھنہ اپنے رومانس کے لیے بھی بہت مشہور تھے۔ یوں تو ان کے رومانی رابطوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن حقیقی زندگی میں شرمیلا ٹیگور، ممتاز، ٹینا منیم اور ڈمپل کے ساتھ ان کے رومانس بہت مشہور ہیں۔ ڈمپل سے تو انہوں نے شادی بھی کرلی تھی جو ناکام رہی۔ راجیش کھنہ کے لیے زیادہ تر گانے کشور کمار نے گائے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان کی کامیابی میں کشور کی آواز کا نمایاں ہاتھ رہا ہے۔

راجیش کھنہ امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ (بعض مبصرین کے نزدیک وہ بورے والا کے تھے بعد میں امرتسر کے رہائشی بنے) 1965ء میں اداکاروں کے انتخاب کے لیے مقابلے میں دس ہزار امیدواروں میں ان کی آٹھویں پوزیشن تھی۔ اس مقابلے میں کامیابی کے بعد انہوں نے پہلی بار فلم "خاموشی" میں کام کیا جو کامیاب ہوگئی۔ وہ کامیابیوں

راجیش کھنہ

سلیم رضا

کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بالی وڈ میں سب سے زیادہ بلندی تک پہنچ گئے۔ وہ بھارتی لوک سبھا کے رکن بھی رہے۔ ان کی مشہور فلموں میں آنند کے علاوہ امر پریم، ارادھنا ناقابلِ فراموش ہیں۔

راجیش کھنہ کامیابیوں سے سرشار ہونے کے بعد مغرور ہوگئے تھے۔ انہوں نے اداکارہ ٹینا منیم اور ماڈل انجو سے بھی شادی کی مگر ان کی عادتوں اور کثرتِ شراب نوشی کے باعث یہ شادیاں بھی قائم نہ رہ سکیں۔

یہ مشہور و معروف سپر اسٹار جس نے فلم "آنند" میں کینسر کے مریض کے طور پر بے مثال اداکاری کا مظاہرہ کرکے اسے حقیقت میں تبدیل کردیا تھا، آخری ایام میں خود اس موذی مرض کا شکار ہوئے اور ان کا مرض انتہا کو پہنچ گیا، وہ بہت کمزور ہوگئے تھے اور انہوں نے داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ (17 جولائی 2012ء کو ان کا انتقال ہوگیا)

چار دن کی چاندنی میں انسان بے خود ہوکر خود کو بھی بھول جاتا ہے مگر قدرت اس کو یاد دلا دیتی ہے کہ تقدیر کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔

☆☆☆

ہندوستان کی فلمی صنعت کا تذکرہ چھڑ گیا ہے تو اداکاروں کا بھی کچھ ذکر ہو جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ آپ کے خیال میں انڈیا میں سب سے زیادہ معاوضہ لینے والا اداکار کون ہے؟ سلمان خان، شاہ رخ خان، عامر خان یا کوئی اور؟ جی نہیں، یقیناً کوئی اور ہی اداکار ایسا ہے جو انڈیا میں سب سے زیادہ معاوضہ لیتا ہے اور اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ یہ تامل فلموں کا سپر اسٹار رجنی کانت ہے جس نے کچھ عرصہ قبل جس کی ایک فلم "روبوٹ" میں بھی ایشوریا رائے کے مقابلے

میں کام کیا تھا۔ یہ فلم دنیا بھر میں مقبول ہوئی تھی۔
کہا جاتا ہے کہ ایشیا میں سب سے زیادہ معاوضہ اداکار جیکی چن وصول کرتا ہے۔ جیکی چن اداکاری کے ساتھ ہدایت کاری اور فلم سازی بھی کرتا ہے۔ وہ 1980ء سے

سہگل

اپنی ایکشن فلموں کی وجہ سے مشہور اور مقبول ہے۔ اس کی فلموں نے ہالی ووڈ میں بھی بہت کامیابیاں حاصل کی ہیں۔
ایشیا کے دوسرے سب سے مہنگے اداکار کا تعلق تامل ناڈو سے ہے۔ رجنی کانت کی عمر اس وقت 62 سال کے قریب ہے۔ وہ سر کے بالوں سے محروم یعنی گنجا ہے اور وگ لگاتا ہے۔ اس کی مونچھوں کا انداز آج بھی وہی ہے جو 1985ء میں تھا۔ تامل عوام و خواص اس کے دیوانے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رجنی کانت اداکار نہیں بلکہ قدرت کا ایک تحفہ ہے۔ اس کی ہر فلم سپر ہٹ ہوتی ہے اسی لیے اس کو سپر اسٹار کہا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں تامل میں کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ تامل فلم انڈسٹری کو ممبئی کے مقابلے میں غریب فلمی صنعت کہا جاتا ہے لیکن درحقیقت تامل فلم سازوں اور اداکاروں کے پاس پیسا بہت ہے۔ وہ بہت نظم و ضبط کے ساتھ کام کرتے ہیں، وہ بیک وقت بڑے فلم ساز، تقسیم کار اور نمائش کار بھی ہیں اس لیے خوب کماتے ہیں۔

"روبوٹ" کو بالی ووڈ کی سب سے مہنگی فلم کہا جاتا ہے۔ اتنا سرمایہ آج تک کسی اور فلم پر خرچ نہیں کیا گیا۔ اس کی نمائش بیک وقت انڈیا اور دنیا بھر کے دو ہزار سنیماؤں میں کی گئی تھی۔ اس کے مختلف ٹیکنیکل کاموں کے لیے دنیا کے بہترین ہنر مندوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ تامل فلم بینوں سے انڈیا کے سپر اسٹارز کے بارے میں دریافت کرو تو وہ ان میں ہزاروں عیب نکال دیتے ہیں۔ مثلاً ان کے نزدیک شاہ رخ خان ایک بگڑا ہوا بچہ ہے۔ امیتابھ بچن وگ پہنتا ہے (حالانکہ رجنی کانت بھی وگ پہنتا ہے) رجنی کانت کے نام پر ان کی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے۔ وہ بہت دولت مند ہے اور فلاحی کاموں پر دل کھول کر روپیہ خرچ کرتا ہے۔ اس کی تمام فلمیں نمبر ون اور سپر ہٹ ہوتی ہیں۔ تامل فلم بین کہتے ہیں کہ رجنی کانت محض ایک اسٹار ہی نہیں، حقیقت میں ایک مکمل انسان ہے۔
رجنی کانت کے بارے میں آئے دن نئے نئے لطیفے سننے میں آتے ہیں۔ ایک لطیفہ یہ ہے کہ ایک سانپ نے رجنی کانت کو ڈس لیا۔ چار گھنٹے بعد زہریلا سانپ مر گیا۔ لوگ ایک دوسرے کو رجنی کانت کے واقعات اور لطیفوں سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ اسکرین پر فلم میں جب وہ اپنی انگلی اٹھاتا ہے تو پس منظر موسیقی میں ایک ہنٹر کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جب وہ غصے میں آتا ہے تو ہدایت کار پس منظر موسیقی میں شیر کے دہاڑنے کی آواز شامل کر دیتا ہے۔ علامتی طور پر ہدایت کار انسرشن میں رجنی کانت کے غصے کو گوریلے کے خوفناک حملے یا دہاڑ کر شیر کے شکار پر لپکنے کا منظر دکھاتا ہے۔
ایکشن فلموں میں وہ اپنے دشمن کو ان الفاظ میں للکارتا ہے۔ "اس وقت سے ڈرو جب میں لوٹ کر آؤں گا۔ میں کب اور کیسے آؤں گا یہ کوئی نہیں جانتا۔ میں وہ کر کے دکھاؤں گا جو میں کہتا ہوں۔ میں وہ بھی کر سکتا ہوں جو میں نہیں کہتا۔"
وہ اپنے حریف کو ایک گھونسا مارتا ہے اور وہ کار کے شیشے توڑ کر کار کے اندر سے کار کے پچھلے شیشے کو توڑ کر باہر جا کر گرتا ہے۔
رجنی کانت کی فلموں میں کامیڈی بھی خوب ہوتی ہے۔ ان میں ایکشن، ڈراما، کامیڈی، ٹریجڈی اور بہترین موسیقی ملتی ہے۔ انڈیا کا آسکر ایوارڈ یافتہ موسیقار اے آر رحمان اکثر اس کی فلموں کی موسیقی مرتب کرتا ہے۔ 2005ء میں بنائی جانے والی فلم "چندر مکھی" میں اس نے

ایک ایسے انسان کا کردار ادا کیا ہے جو سامنے والے شخص کے چہرے کے تاثرات سے جان جاتا ہے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اس فلم میں وہ ماہر نفسیات بنتا ہے۔
اس فلم کی کہانی کچھ اس طرح ہے۔ اس کا آغاز ایک شادی سے ہوتا ہے بعد میں یہ ایک آسیب زدہ گھر کی کہانی بن جاتی ہے۔ فلم کے ایک گانے میں آسمان پر سیکڑوں پتنگیں نظر آتی ہیں۔ پھر آتش بازی کا منظر دکھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد رجنی کانت کو ایک مکان کی چھت پر ایک نیم برہنہ اور طاقت ور دشمن سے لڑتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ ان دونوں کے آس پاس بے شمار کبوتر اُڑ رہے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب منظر ہے۔ اس فلم نے کامیابی اور کمائی کے تمام اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ تامل ناڈو میں یہ فلم سب سے طویل عرصے تک سنیماؤں میں چلی تھی اور اس نے باکس آفس پر نئے ریکارڈ قائم کیے تھے۔ یہ ایک سنیما میں آٹھ سو دن تک چلتی رہی تھی۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا، اس کو مختلف زبانوں میں مختلف ناموں سے مقامی زبانوں میں ڈب کر کے دکھایا گیا تھا اور یورپ کے کئی ملکوں میں بھی یورپی فلم بینوں نے اس کی بہت پذیرائی کی تھی۔
رجنی کانت کی فلموں میں ایکشن کے مناظر حیرت انگیز حد تک موثر ہوتے ہیں، اس کی فلموں میں مخصوص کیمرامین، ساؤنڈ ریکارڈسٹ اور ایڈیٹر ہوتے ہیں۔
رجنی کانت کی فلموں کا آغاز بھی انوکھے انداز میں ہوتا ہے۔ اس کی 1999ء میں بننے والی ایک فلم "پڑایپا" کا آغاز یوں ہے کہ ایک آواز اس سے دریافت کرتی ہے،
"اے شخص، تم کون ہو؟"
اس کے جواب میں چار منٹ کا ایک گانا دکھایا جاتا ہے جس میں وہ اچھلتا، کودتا اور مارشل آرٹ کے نمونے دکھاتا ہوا نظر آتا ہے اور پھر سکڑ کر ایک بچہ بن جاتا ہے۔
گاؤں کا سرپنچ کہتا ہے "تمہارا گانا بہت اچھا تھا۔"
اس کے بعد موسیقی تیز ہوجاتی ہے۔ رجنی کانت کو 30 فٹ اونچے ایک مینار پر چڑھا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ ایک مٹی کا بڑا برتن ٹوٹ جاتا ہے اور اس کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں سے فلم کے ٹائٹل کا آغاز ہوتا ہے۔
رجنی کانت میں ایسی کشش ہے کہ کسی بھی فلم پر "سپر اسٹار رجنی کانت" کا نام دیکھ کر لوگ دیوانہ وار سنیما گھروں کی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں انڈیا کا سب سے بڑا سپر اسٹار ہے۔ کیا اب بھی آپ کو یقین نہیں آیا؟

☆☆☆
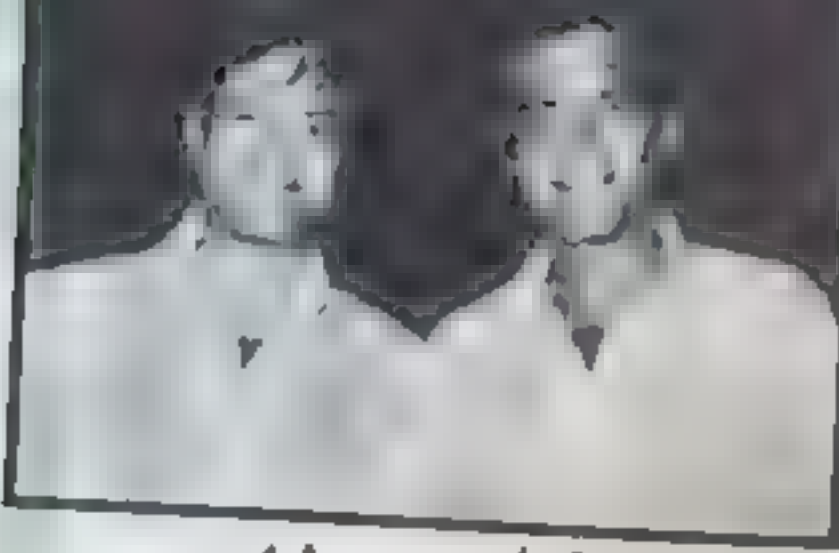
سہیل رانا اور احمد رشدی

تذکرہ مہدی حسن کی وفات سے شروع ہوا تھا۔ ان کی اور ان کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اب ان کے انتقال کے بعد یاد دہانی کے لیے کچھ مختصر حالات پیش کیے جارہے ہیں۔
مہدی حسن خان ان کا اصلی نام تھا۔ غزل کے شہنشاہ کہلاتے ہیں لیکن پاکستانی فلموں میں ان کے گائے ہوئے گانے بھی انتہائی مقبول اور مشہور ہوئے جو فلمی گلوکاری کے اعتبار سے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری نے ان کی بے مثال آواز سے بہت فائدہ اٹھایا۔ پاکستانی فلموں میں ان کی آمد فلمی صنعت اور خود ان کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوئی ہے۔ حکومت پاکستان نے انہیں تمغۂ امتیاز اور ہلال امتیاز کے خطابات سے نوازا تھا لیکن وہ ان القاب سے کہیں زیادہ بڑے فنکار تھے۔ حکومت نیپال نے انہیں "گورکھا دکشنا باہو" کا خطاب دیا تھا۔ وہ پاکستان کی فلمی صنعت کی ایک ضرورت بن گئے تھے لیکن فلموں کے زوال کے بعد ان کی توجہ کنسرٹس اور دیگر موسیقی کی تقریبات پر زیادہ ہوگئی تھی۔ ایک طویل بیماری کے بعد مہدی حسن 13 جون 2012ء کو وفات پاگئے۔
ان کی ساری زندگی لاہور میں گزری لیکن بیماری کی زندگی کے آخری سال انہوں نے کراچی میں گزارے اور وہیں وفات پائی۔ فالج کی وجہ سے آخری ایام میں وہ بول نہیں سکتے تھے۔ وہ شخص جس کی آواز کے بارے میں لتا منگیشکر نے کہا تھا کہ ان کے گلے میں بھگوان بولتے ہیں، وہ آواز گلے سے باہر آنے سے معذور تھی۔ یہ بھی ایک بہت بڑا المیہ ہے اور عبرت کا مقام بھی ہے کہ انسان قدرت کے ہاتھوں میں ایک کھلونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔
مہدی حسن 18 جولائی 1927ء میں راجستھان (انڈیا) کے ایک گاؤں "لونا" میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا گھرانا روایتی موسیقی سے لگاؤ رکھنے والا تھا۔ مہدی حسن کا

دہلی گھرانے کلاونت گھرانے کے وہ سولھویں وارث تھے۔ انہیں موسیقی کی تربیت ان کے والد استاد عظیم خان اور چچا استاد اسماعیل خان نے دی تھی جو خود بڑے موسیقار اور گلوکار تھے۔ یہ دونوں دھرپد راگ گانے میں مہارت رکھتے تھے۔

مہدی حسن نے نو عمری میں ہی گانا شروع کردیا تھا۔ انہوں نے پہلا گانا دھرپد راگ کے ایک کنسرٹ میں گایا تھا۔ یہ فاضلکا میں منعقد ہوا تھا جو کہ اب ہندوستان کا حصہ ہے۔

قیام پاکستان کے بعد 20 سالہ مہدی حسن اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کرکے پاکستان چلے آئے۔ یہاں اس خاندان کو شدید مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ روزگار کے لیے مہدی حسن نے چیچہ وطنی میں ایک سائیکل والے کی دکان میں نوکری کرلی تھی۔ بعد میں وہ ٹریکٹر مکینک کے طور پر کام کرتے رہے۔ انہوں نے زمانے کی بہت سختیاں جھیلیں مگر موسیقی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ اس زمانے میں بھی ہر روز ریاض کیا کرتے تھے، اس وجہ سے مہدی حسن کی آواز اور گلوکاری زندہ رہی۔ اگر انہیں گلوکاری اور موسیقی سے عشق نہ ہوتا تو وہ ابتدائی دنوں میں ہی کچھ اور پیشہ اختیار کرلیتے اور دنیا ایک بہت بڑے غزل گانے والے سے محروم رہتی۔

خوش قسمتی سے 1957ء میں انہیں ریڈیو پاکستان سے گانے کا موقع ملا۔ آغاز میں وہ ٹھمری گایا کرتے تھے۔ ان کی آواز اور گانوں کو بہت پسند کیا گیا۔ مہدی حسن کو اردو شاعری سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے جس کی وجہ سے انہیں غزل تک رسائی ہوئی۔ ان کے اصرار پر انہیں غزل گانے کی بھی اجازت دے دی گئی۔ ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل زیڈ اے بخاری اور موسیقار و گلوکار غزل رفیق انور نے ان کی بہت رہنمائی کی اور غزل گانے کے سلسلے میں ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔

مہدی حسن نے فلم "شکار" میں ایک گانا گاکر فلمی گلوکاری کا آغاز کیا تھا لیکن فلمی گلوکار کی حیثیت سے انہیں شہرت ریاض شاہد کی فلم "سسرال" سے حاصل ہوئی۔ اس فلم میں ان کا گایا ہوا نغمہ۔

جس نے مرے دل کو درد دیا

اس شکل کو میں نے بھلایا نہیں

سپرہٹ ہوگیا۔ نغمہ نگار منیر نیازی تھے اور حسن لطیف ملک نے اس فلم کی موسیقی بنائی تھی۔ یہ فلم 1962ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ رفتہ رفتہ فلمی صنعت میں ان کی اہمیت میں اضافہ ہوتا رہا اور وہ برصغیر کے بہت بڑے فن کار اور گلوکار بن گئے۔ ان کی شہرت اور پسندیدگی بھارت تک پھیلی ہوئی تھی۔ بھارت میں موسیقی کے دلدادہ ان کے پرستاروں میں شامل رہے ہیں۔ وہ جب بھی ممبئی جاتے تھے، فلمی دنیا کی ممتاز شخصیات ان کے ساتھ نشست کا اہتمام کرنا ضروری سمجھتی تھیں۔ یہی صورت حال مرحوم نصرت فتح علی خان کے دورۂ بھارت کے دوران میں بھی پیش آئی تھی جب فلمی دنیا کے بڑے بڑے لوگ پروانوں کی طرح ان کے آس پاس منڈلاتے نظر آتے تھے۔ وہاں انہوں نے کئی فلموں کی موسیقی بھی ترتیب دی تھی۔ مہدی حسن کو بھی پاکستان کے علاوہ بھارت اور یورپ کے ممالک میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔

مہدی حسن نے پاکستان کی فلمی صنعت کے عروج میں نمایاں حصہ لیا اور فلموں کی کامیابیوں اور بلند معیاری میں مہدی حسن کی آواز کا بھی نمایاں دخل رہا ہے۔

بھارت کے گلوکار مہدی حسن کے قدر داں تھے۔ لتا منگیشکر تو ان کے پرستاروں میں شامل رہی ہیں۔ اکتوبر 2009ء میں ایچ ایم وی نے "سرحدیں" کے نام سے ایک البم ریلیز کیا تھا جس میں مہدی حسن اور لتا منگیشکر کا ایک دو گانا بھی شامل ہے۔ مہدی حسن نے بذاتِ خود اس البم کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ فرحت شہزاد نے نغمہ لکھا تھا۔ اس نغمے کو دو حصوں میں ریکارڈ کیا گیا تھا۔ مہدی حسن کی آواز پاکستان میں اور لتا کی آواز بھارت میں صدابند کی گئی تھی۔ ملکۂ ترنم نور جہاں نے بھی مہدی حسن کے ساتھ کئی فلمی نغمات گائے۔ "تیرا ملنا" کے عنوان سے ان دونوں نے ایک البم کے لیے دوگانا بھی گایا تھا۔

موسیقی اور گائیکی کے شعبے میں مہدی حسن خان مرحوم کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

مہدی حسن اپنی وفات سے کئی سال پہلے پھیپھڑوں کی بیماری میں مبتلا ہوگئے تھے۔ وہ کئی سال علالت کی تکالیف برداشت کرتے رہے۔ آخری دنوں میں فالج نے بھی ان کے کمزور جسم پر حملہ کردیا تھا جس کی وجہ سے وہ نقل و حرکت، یہاں تک کہ بولنے سے بھی معذور ہوگئے تھے۔ 13 جون 2012ء کو انہوں نے آغا خان یونیورسٹی اسپتال میں وفات پائی۔ اس سے پہلے وہ لگ بھگ بارہ سال بیمار اور گلوکاری سے محروم رہے۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔

مہدی حسن کو اپنی گلوکاری اور فن کاری کی بدولت بے شمار ایوارڈز سے نوازا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ملکۂ ترنم نور جہاں اور مہدی حسن خان ایوارڈز سے بالاتر تھے۔ حکومت نے مہدی حسن کو تمغۂ امتیاز اور ہلالِ امتیاز کے القاب سے

نوازا۔ پہلا اعزاز انہیں ایوب خان کے دورِ حکومت میں اور دوسرا پرویز مشرف کے دورِ حکومت میں ملا تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے جمہوری حکمرانوں کو فنونِ لطیفہ سے کتنی دلچسپی ہے۔ کیونکہ انہیں کسی جمہوری دور میں اعزاز نہیں دیا گیا۔ انہوں نے درجنوں نگار ایوارڈز اور گریجویٹ ایوارڈز حاصل کیے۔ جالندھر (بھارت) میں انہیں "سہگل ایوارڈ" دیا گیا تھا۔ یہ ایوارڈ کے ایل سہگل کی یاد میں ہر سال بہترین فن کاروں کو دیا جاتا ہے۔ نیپال کے مہاراجا ان کے پرستار تھے۔ وہ انہیں نیپال مدعو کرتے رہتے تھے اور ان کی گلوکاری سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ نیپال کی حکومت نے انہیں "گورکھا دکشنا باہو" ایوارڈ سے نوازا تھا۔ بیماری سے پہلے دبئی میں بھی انہیں ایک ایوارڈ دیا گیا تھا۔

مہدی حسن کے چند مقبول البم ذیل میں پیش کیے جارہے ہیں۔

1۔ کہنا اسے۔
2۔ نذرانہ۔
3۔ کلاسیکل غزلیں (اس کے تین البم ہیں)
4۔ رائل البرٹ ہال لندن میں گائے ہوئے نغمات۔
5۔ انداز مستانہ۔
6۔ دل جو روتا ہے۔
7۔ غالب کی غزلیں۔
8۔ کلاسیکل غزلیں۔ (تین البم)
9۔ ہمیشہ زندہ رہنے والی غزلیں۔
10۔ مہدی حسن کے نغمات کا سنہری مجموعہ (دو البم)
11۔ کنسرٹ میں گائے ہوئے نغمے۔
12۔ لائف اسٹوری۔
13۔ کھلی جو آنکھ۔
14۔ بھارت میں گائے ہوئے تقریبات کے نغمے۔
15۔ مہدی حسن کی غزلیں۔
16۔ صدائے عشق۔
17۔ سرحدیں۔
18۔ سر کی کوئی سیما نہیں۔
19۔ بہترین غزلیں۔
20۔ دی لیجنڈ۔
21۔ یادگار غزلیں۔
22۔ طرز۔
23۔ نقشِ فریادی۔

مہدی حسن کی آواز کی رسائی لامحدود تھی۔ انہوں نے

زہرا بائی

غزلوں کی گائیکی کو چار چاند لگا دیے اور دوسرے گلوکاروں کو بھی غزل سرائی پر مجبور کردیا۔ ان کی آواز اور ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اللہ مغفرت کرے۔

☆☆☆

رنگیلا جیسا ہمہ صفت فن کار دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ اگر وہ یورپ یا امریکا میں ہوتے تو دنیا بھر میں ان کا نام ہوتا اور ان کی صلاحیتوں میں مزید نکھار پیدا ہوتا۔ ان کے ذکر سے اگر کوئی فن کار اور ہنرمند یاد آتا ہے تو وہ چارلی چپلن ہے۔ رنگیلا کی طرح چارلی چپلن بھی تعلیم سے محروم رہا۔ ماں سے اداکاری کا شوق اور فن ورثے میں ملی تھی۔ اپنے وطن انگلستان میں چودہ پندرہ برس کی عمر تک رہنے کے بعد اس نے امریکا کا رخ کیا۔ چھوٹا بھائی بھی اس کے ساتھ تھا۔ ماں کو دیوانگی کے دورے پڑا کرتے تھے اور وہ اکثر نفسیاتی مریضوں کے اسپتالوں میں ہی رہتی تھی۔ بھلا ہو انگلستان کی فلاحی ریاست کا جو اس کی ماں کو مفت علاج معالجے کی سہولت فراہم کرتی تھی۔ چارلی کو اپنی ماں سے بے حد پیار تھا۔ وہ اس ارادے سے امریکا گیا تھا کہ وہاں دولت اور نام پیدا کرے گا اور اپنی ماں کو اپنے پاس بلا کر اس کی تمام حسرتیں پوری کرے گا۔ مگر ایسے یہ ہوا کہ جب دولت مند اور مشہور ہونے کے بعد اس نے اپنی ماں کو اپنے پاس بلایا تو وہ ہوش و حواس کھو چکی تھی اور اپنے بیٹوں تک کو

نہیں پہنچاتی تھی۔ ماں کے شوق و ذوق کے مطابق چارلی نے گھر کو گلاب کے پھولوں سے بھر دیا تھا۔ اس کی پسند کے رنگوں کے پردے، قالین اور فرنیچر فراہم کیا تھا مگر اس کی ماں یہ سجاوٹ اور پھول دیکھنے سے قاصر تھی۔

چارلی نے محض اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے اداکاری اور ہدایت کاری میں نام پیدا کیا تھا۔ اپنی فلموں کی کہانیاں وہ خود لکھتا تھا۔ انگلستان اور امریکا کے ماحول نے اس کے ذہن کو نئے نئے خیالات سے آراستہ کردیا تھا۔ وہ زمانہ خاموش فلموں کا تھا۔ چارلی نے خاموش فلمیں بنائیں جن کے موضوع اور کہانی میں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز بھی تھا۔ اس نے بین الاقوامی حالات کے بارے میں بھی یادگار فلمیں بنائیں اور ساری دنیا نے اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔ اس وقت کے بڑے بڑے سیاست داں، دانش ور، مصنف، ڈراما نگار، شاعر اور حکمراں اس سے ملاقات کے خواہش مند رہا کرتے تھے۔

چارلی چپلن کا مختصر تذکرہ محض اس لیے کیا گیا ہے کہ اس میں اور رنگیلا میں جو مشترکہ خداداد صلاحیتیں تھیں انہیں اجاگر کیا جائے۔ شاید بہت سے مغرب زدہ اور تعلیم یافتہ لوگ یہ سن کر مذاق اڑائیں گے کہ کہاں چارلی چپلن اور کہاں رنگیلا۔ مگر قدرت نے یکساں ماحول فراہم نہ کرنے کے باوجود دونوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھالا تھا۔

رنگیلا کا اصلی نام سعید خان تھا۔ وہ ایک غریب گھرانے اور ایسے دور دراز مقام پر پیدا ہوا تھا کہ جب وہ پہلی مرتبہ شہر آیا تو بسیں، ریل گاڑی، موٹر کاریں اور شہر کی رونق دیکھ کر حیران رہ گیا۔

رنگیلا نے زندگی کا سفر کسی کے سہارے، سفارش اور مدد کے بغیر شروع کیا تھا اور اپنی صلاحیتوں کی بنا پر وہ زمین سے اٹھ کر آسمان تک پہنچ گیا۔ روزگار کی تلاش میں سعید خان نے لاہور کا رخ کیا کیونکہ اس کو فلم سے بھی لگاؤ تھا۔

وہ بہت کم تعلیم یافتہ اور دیکھنے میں ایک اجڈ گنوار نظر آتا تھا۔ اس کو قدرت نے تصویریں بنانے کی صلاحیت عطا کی تھی۔ لاہور میں اس نے فلمی لوگوں کی گھریلو ملازمت کی۔ گھر سے کھانا لانے اور گھریلو ملازموں کی طرح اس نے سارے کام کیے۔ ایک فلمی پوسٹر بنانے والے آرٹسٹ کے ساتھ کام کر کے فلمی پوسٹر بھی بنائے۔ اسے کوئی بھی کام کرنے میں عار نہ تھی۔ وہ خاموشی اور انکساری سے اپنی منزل کے حصول کے سفر پر گامزن تھا۔

اس کی راہ میں بے شمار مشکلات آئیں۔ ذلت بھی اٹھانی پڑی مگر اس نے ہار نہیں مانی۔ مستقل مزاجی سے زندگی کا سفر طے کرتا رہا۔

رنگیلا کو شباب کیرانوی نے اپنی ایک فلم میں ایک چھوٹا سا مزاحیہ کردار دیا تھا جس نے اس کو فلم بینوں اور فلم سازوں سے متعارف کرایا۔ اس کا فلمی نام رنگیلا رکھا گیا۔ اس نام نے ایسی شہرت حاصل کی کہ لوگ سعید خان کو بھول گئے اور صرف رنگیلا ہی انہیں یاد رہ گیا۔

رنگیلا دیکھنے میں ایک کھویا کھویا اور بوکھلایا ہوا آدمی لگتا تھا۔ وہ بہت کم بولتا تھا۔ لوگوں کے تمسخر اور مذاق اُڑانے سے بالکل متاثر نہ ہوتا تھا۔ ہم نے رنگیلا کو کبھی اطمینان سے بیٹھ کر فلم یا دوسرے موضوعات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ بہت مختصر فقرے بولتا تھا۔ اکثر بے ربط اور نامکمل فقرے بول کر خود ہی ہنستا تھا۔ فلم والوں نے اسے گھوڑے کے منہ والا کا خطاب دیا تھا۔ فلموں میں وہ اپنی جانب سے جو مزاحیہ فقرے بولتا تھا وہ لوگوں کی زبان پر چڑھ جاتے تھے۔ مثلاً میں نے ہانگ کانگ کے نلکوں کا پانی پیا ہے۔ وہ پرانی فلموں کے دور کی مزاحیہ اداکاری کرتا تھا۔ یعنی چیزوں سے ٹکرانا، گرنا، منہ بنانا، ایک خاص انداز میں مکالمے بولنا اس کا شیوہ تھا جو عام فلم بینوں کو بے حد پسند تھا۔

رنگیلا نے مزاحیہ اداکار کے طور پر پاکستان کی فلمی صنعت میں بہت نام پیدا کیا۔ یہاں تک کہ فلموں میں ہیرو کے طور پر بھی کام کیا اور داد حاصل کی۔

رنگیلا نے جب فلم بنانے کا اعلان کیا تو فلم والوں نے بہت تمسخر اُڑایا کیونکہ اس فلم میں ہیرو کے علاوہ بطور ہدایت کار بھی رنگیلا کا نام تھا۔

بہ طور فلمساز و ہدایت کار رنگیلا کی پہلی فلم "دیا اور طوفان" تھی۔ اس فلم میں اعجاز اور نغمہ نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ اس خبر پر سب نے بہت مذاق اڑایا لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ یہ فلم جب نمائش کے لیے پیش کی گئی تو "سپرہٹ" ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی علی زیب کی فلم "بیسے جانتے نہیں" بھی نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ یہ بہت معیاری فلم تھی جس کے ہدایت کار سید سلیمان تھے۔ اس فلم کی موسیقی بھی بہت پسند کی گئی تھی۔ اس کے باوجود رنگیلا کی فلم دیا اور طوفان باکس آفس پر اس سے بازی لے گئی۔

رنگیلا نے بعد میں فلم سازی جاری رکھی اور اس کی تمام فلمیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ رنگیلا کی دوسری فلم "رنگیلا" تھی۔

رنگیلا وہ فلم تھی جسے "ون مین شو" کہا جاسکتا ہے کیونکہ

فلم میں رنگیلا نے سارے اہم فرائض ادا کیے تھے۔ اس کے فلم ساز اور ہدایت کار وہ خود تھے۔ اس فلم کے مصنف بھی وہی تھے۔ وہی اس فلم کے ہیرو تھے۔ اس فلم میں رنگیلا نے گلوکاری بھی کی تھی۔ رنگیلا میں نشو اور صاعقہ کے علاوہ منور ظریف اور دوسرے ممتاز اداکار بھی شامل تھے۔ یہ رنگین فلم سپرہٹ ہوئی تھی۔ رنگیلا کا گایا ہوا نغمہ بھی بہت پسند کیا گیا تھا۔ رنگیلا کی فلمیں "دل اور دنیا" دیا اور طوفان" اور "رنگیلا" نے باکس آفس پر طوفان برپا کردیا۔ کامیابیوں کے نشے میں مدہوش رنگیلا نے اس کے بعد بہت بڑے پیمانے پر فلم "کبڑا عاشق" بنائی تھی جو انگریزی فلم "ہنچ بیک آف نوٹرے ڈیم" سے متاثر ہوکر بنائی گئی تھی۔ اس فلم میں فلم بینوں کو وہ رنگیلا نظر نہیں آیا جسے وہ مزاحیہ انداز میں دیکھتے رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فلم "کبڑا عاشق" بہت بری طرح ناکام ہوئی اور رنگیلا کے عروج کا زمانہ ختم ہوگیا۔ کوئی اور ہوتا تو مایوس اور شکستہ دل ہوکر گھر میں بیٹھ جاتا مگر رنگیلا نے فلموں میں اداکاری کا سلسلہ شروع کردیا اور پھر بہ طور مزاحیہ اداکار بہت نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ رنگیلا کے بارے میں اس سے پہلے بھی بہت کچھ بیان کیا جاچکا ہے۔ اس وقت ان کی انتہائی کامیاب فلم "دل اور دنیا" کی یادیں تازہ کی جارہی ہیں۔ اس فلم میں رنگیلا نے حساس انسانی مسائل کی نشاندہی بھی کی تھی۔ دل اور دنیا ایک پُراثر اور ہر اعتبار سے معیاری فلم تھی جس کی کہانی بھی رنگیلا نے لکھی تھی۔ اس کہانی میں ہمارے معاشرے کے مسائل اور طبقاتی اونچ نیچ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کئی فلمی نقادوں نے اس فلم کو کلاسیکی فلم کا درجہ دیا ہے۔

فلم کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ رنگیلا (شہنشاہ) ایک غریب آدمی ہے جسے کوشش کے باوجود کہیں ملازمت نہیں ملی اور وہ بے روزگار ہے۔ مالی حالات اتنے خراب ہیں کہ وہ پیٹ بھرنے کے لیے کھانا تک حاصل نہیں کرسکتا۔ حالات سے تنگ آ کر اس نے سوچا کہ ایمانداری اور حق حلال کی کمائی تو شاید قسمت میں نہیں ہے تو پھر چوری اور ڈاکے سے روٹی حاصل کی جائے۔ اس ارادے کے پیش نظر وہ جرم کرنے کے طریقے سوچتا ہے۔ وہ اسی خیال میں گم سڑک پر جارہا ہے کہ اس کی نظر ایک نوجوان خوبصورت لڑکی پر پڑتی ہے جو بینائی سے محروم ہے لیکن پھر بھی پھول بیچ کر گزارہ کرتی ہے۔ اس لڑکی کا نام گوری ہے۔ یہ کردار آسیہ نے بہت خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد وہ دنیا میں تنہا رہ گئی ہے اور بذاتِ خود اپنا پیٹ

ثریا

پالنے کے لیے پھول فروخت کرکے روزی کماتی ہے۔ گوری کو دیکھ کر شہنشاہ کو خیال آیا کہ جب یہ لڑکی زمانے میں تنہا حلال کی کمائی سے زندہ رہ سکتی ہے تو میں ایسا کیوں نہیں کرسکتا۔ شہنشاہ نے گوری سے اظہارِ ہمدردی کیا تو وہ بھی اس کی طرف مائل ہوگئی۔ اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے۔

شہنشاہ گوری کو لے کر ایک آنکھوں کے ماہر ڈاکٹر (حبیب) کے پاس گیا کہ ممکن ہو تو اس کی بینائی واپس آسکے۔ ڈاکٹر گوری کو دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ وہ اس کی مرحوم بیوی کی ہم شکل تھی۔ اس نے وعدہ کیا کہ گوری کی آنکھوں کا آپریشن کرکے اس کی بینائی واپس لانے کی پوری کوشش کرے گا۔ اس وقت جبکہ گوری کو شہنشاہ کی ہمدردی اور حمایت حاصل ہوگئی تھی اچانک ایک نئی مصیبت نے انہیں گھیر لیا۔ شہنشاہ کو پولیس نے بہرام ڈاکو سمجھ کر گرفتار کرلیا۔ بہرام ڈاکو نے لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا اور پولیس اسے پکڑنے کو پھر رہی تھی۔ پولیس نے شہنشاہ کو اس لیے گرفتار کیا تھا کہ بدقسمتی سے اس کی شکل بہرام ڈاکو سے ملتی تھی۔ ادھر ڈاکٹر نے آپریشن کرکے گوری

کا ہیجان بحال کردی تھی۔ ڈاکٹر کی بچی نے جب گوری کو دیکھا تو ''امی امی'' پکارتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی۔ معصوم بچی یہ سمجھی کہ اس کی کھوئی ہوئی ماں پھر مل گئی ہے۔ گوری یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئی مگر ڈاکٹر نے اس کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ دراصل بچی کی ماں (ڈاکٹر کی بیوی) گوری کی ہمشکل تھی۔ ڈاکٹر کا کردار حبیب نے بہت خوبی سے نبھایا تھا۔

ڈاکٹر گوری کو پسند کرنے لگا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے شہنشاہ سے ہر بات چھپائی اور گوری کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔ محلے میں اس بات پر باتیں بننے لگیں۔ محلے کے ایک بدمعاش کلن نے ڈاکٹر کو پریشان کرنا شروع کر دیا کہ تم نے ایک جوان لڑکی کو اپنے گھر میں کیوں رکھا ہے؟ یہ تو کوئی شرافت نہیں ہے۔

ڈاکٹر گوری میں بذاتِ خود دلچسپی لینے لگا تھا اور اس کو گوری اس لیے بھی پسند تھی کہ اس کی معصوم بچی اس کو اپنی کھوئی ہوئی ماں سمجھ کر خوش رہے گی۔ اس نے گوری سے شادی کر لی۔ گوری کا بھی دنیا میں کوئی اور سہارا نہیں تھا۔ ڈاکٹر جیسے باوقار اور دولت مند شخص سے شادی کرنے میں اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔

شہنشاہ بہ دستور بہرام ڈاکو کے جرائم میں جیل میں بند تھا۔ پولیس نے اصل مجرم بہرام ڈاکو کو گرفتار کر لیا تو پتا چلا کہ شہنشاہ بے قصور ہے۔ اس کو محض بہرام ڈاکو کا ہم شکل ہونے کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔ شہنشاہ کو رہا کر دیا گیا۔ رہا ہونے کے بعد وہ بے تاب ہو کر ڈاکٹر کے گھر پہنچا۔ ڈاکٹر کے گھر جا کر اسے معلوم ہوا کہ گوری اب ڈاکٹر کی بیوی بن چکی ہے۔ گوری اس کو دیکھ کر پہچان نہ سکی کیونکہ اس نے کبھی شہنشاہ کو دیکھا نہیں تھا۔ شہنشاہ نے بھی گوری کو یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ وہ کون ہے اور گوری کے لیے اس نے کیا کچھ کیا ہے؟ تقدیر نے اس کو اپنی پہلی اور آخری محبت سے ہمیشہ کے لیے دور کر دیا۔ مایوسی کے عالم میں وہ غمزدہ ہو کر وہاں سے چلا آیا۔ اب دنیا میں اس کے لیے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر سے تو چلا آیا لیکن اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اب وہ کہاں جائے گا، کیا کرے گا؟ دنیا نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ وہ ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح تھا اور اپنی غربت اور بدنصیبی کا ماتم کر رہا تھا۔

یہ تھی رنگیلا کی تیسری فلم ''دل اور دنیا'' کی کہانی۔ اس فلم میں رنگیلا نے یہ دکھایا تھا کہ دنیا میں غریبوں کے لیے مایوسیوں، مجبوریوں اور دکھوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہر آسائش اور خوشی صرف امیروں کو ملتی ہے۔

فلم میں ایک مکالمے کے ذریعے بھی اس تاثر کا اظہار کیا گیا ہے جب رنگیلا کہتا ہے ہر مصیبت غریبوں پر ہی کیوں آتی ہے؟

اس فلم کی کہانی رنگیلا نے خود ہی لکھی تھی۔ فلم کا موضوع بہت اچھا اور دل پر اثر کرنے والا تھا۔ اس میں معاشرے کی برائیوں اور کمزوریوں کو واضح کیا گیا تھا۔ رنگیلا نے بذاتِ خود بہت کٹھن حالات میں اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا اس لیے غریبوں کے دکھوں اور مجبوریوں کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا کیونکہ وہ خود بھی ایسے حالات سے گزرا تھا۔ یہ ایک سوشل اور ڈرامائی فلم تھی جس میں شروع سے آخر تک دیکھنے والوں کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ فلم میں یہ خیال بھی رکھا گیا تھا کہ فلم بینوں کو ہر قسم کا مسالا دستیاب ہو۔

اس فلم کا اسکرین پلے اور مکالمے بشیر نیاز نے لکھے تھے اور خوب لکھے تھے۔ انہوں نے کہانی کے موضوع کے ساتھ پوری طرح انصاف کیا تھا۔ اسکرین پلے تیز رفتاری سے کہانی کو آگے بڑھاتا تھا۔ ہر سچویشن کے مطابق بہت خوبصورت مکالمے لکھے گئے تھے۔ بشیر نیاز ایک حساس اور تجربہ کار مصنف تھے۔ . . انہوں نے اس فلم پر بہت داد حاصل کی تھی۔ فلم میں شروع سے آخر تک دلچسپی باقی رہتی ہے جو ایک اچھے لکھنے والے کا فرض ہے۔ شہنشاہ نے جو مکالمے ادا کیے وہ بہت پُراثر ہیں۔ ڈاکٹر اور گوری کے مکالمے بھی رواں، سادہ اور عام فہم ہیں۔

فلم میں ہر اداکار نے اچھی اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا لیکن چونکہ کہانی شہنشاہ کے گرد گھومتی ہے اس لیے اس کے کردار اور سچویشنز کے مطابق رنگیلا کے مکالمے دل پر اثر کرنے والے تھے۔ پوری فلم پر رنگیلا چھایا ہوا تھا۔ اپنے کردار کے ساتھ اس نے پورا پورا انصاف کیا تھا اور کامیڈی کے ساتھ ساتھ المیہ مناظر میں بھی بہت اچھی اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ رنگیلا کا ڈبل رول تھا۔ ایک شہنشاہ اور دوسرا بہرام ڈاکو۔ رنگیلا نے دونوں کردار بہت خوبصورتی سے نبھائے اور ثابت کر دیا کہ وہ بہت اچھے اداکار ہیں۔

آسیہ نے گل فروش لڑکی کے کردار کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا تھا۔ ایک اندھی لڑکی اور پھر آنکھیں ٹھیک ہو جانے کے بعد کے مناظر میں انہوں نے اچھی اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ آسیہ ایک بہت اچھی اداکارہ تھیں جنہوں نے اردو اور پنجابی، دونوں زبانوں کی فلموں میں بہت اچھی اداکاری کی تھی۔ وہ ایک اچھی رقاصہ بھی تھیں۔ انہوں نے اپنے عروج کے زمانے میں ہی شادی کر کے فلمی دنیا کو ترک کر دیا تھا اور پھر کبھی کسی فلمی تقریب میں بھی نظر نہیں آئیں۔ وہ ایک خوشگوار گھریلو زندگی بسر کر رہی ہیں۔ ان کے شوہر ایک بزنس مین ہیں جن کا بزنس تھائی لینڈ کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی پھیلا ہوا ہے۔

رنگیلا کی اس فلم میں حبیب کے علاوہ سلطان راہی، علاؤالدین، ممتاز، صاعقہ، چنگیزی، علی اعجاز اور منور ظریف نے بھی مختلف کردار ادا کیے تھے۔ ان فن کاروں کی وجہ سے فلم کے معیار میں اضافہ ہو گیا تھا۔

ہمایوں قریشی نے پہلی بار اس فلم میں ایک بردہ فروش گینگ کے کارندے کا کردار ادا کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں ہمایوں قریشی اسی فلم کے ذریعے فلمی دنیا میں متعارف ہوئے تھے۔

اس فلم کی موسیقی کمال احمد نے بہت دلکش بنائی تھی۔ کمال احمد بہت اچھے موسیقار تھے۔ کئی فلموں کو انہوں نے اپنی موسیقی سے سجایا تھا۔ ہماری ایک فلم میں بھی انہوں نے بہت اچھی موسیقی مرتب کی تھی۔ وہ ایک کم گو، کم آمیز اور سیدھے سادے انسان تھے جس کی وجہ سے انہیں بہت زیادہ مواقع نہیں مل سکے مگر انہوں نے جن فلموں کی موسیقی بنائی اس کو پسند کیا گیا۔

فلم ''دل اور دنیا'' میں بھی انہوں نے بہت اچھی دھنیں بنائی تھیں اور رنگیلا سے ایک خوبصورت گانا گوا کر ان کی اس صلاحیت کو بھی اجاگر کیا تھا۔ اس فلم کی موسیقی کی کامیابی اور پسندیدگی کے باعث کمال احمد بھی ممتاز موسیقاروں کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔ انہیں اس فلم میں جن نغمہ نگاروں کا تعاون حاصل ہوا ان میں کلیم عثمانی، رشید ساجد اور سعید گیلانی کے لکھے ہوئے نغمات بہت پراثر اور دلکش تھے۔ سعید گیلانی کی نغمہ نگار کی حیثیت سے یہ پہلی فلم تھی جس کے بعد انہوں نے نامور ہدایت کاروں اور موسیقاروں کے ساتھ کام کیا اور اپنے نغموں کی داد حاصل کی۔ اس فلم کے گانوں کی تفصیل پیش ہے۔

1۔ چمپا اور چنبیلی
یہ کلیاں نئی نویلی
یہ گانا رونا لیلیٰ کی آواز میں تھا۔

2۔ بتا اے دنیا والے یہ کیسی تری بستی ہے۔ گلوکار رنگیلا

3۔ شمع جلی پروانے آئے
یہ نغمہ نسیم بیگم کی آواز میں صدا بند کیا گیا تھا۔ فلم میں یہ صاعقہ اور ممتاز پر فلمایا گیا تھا۔
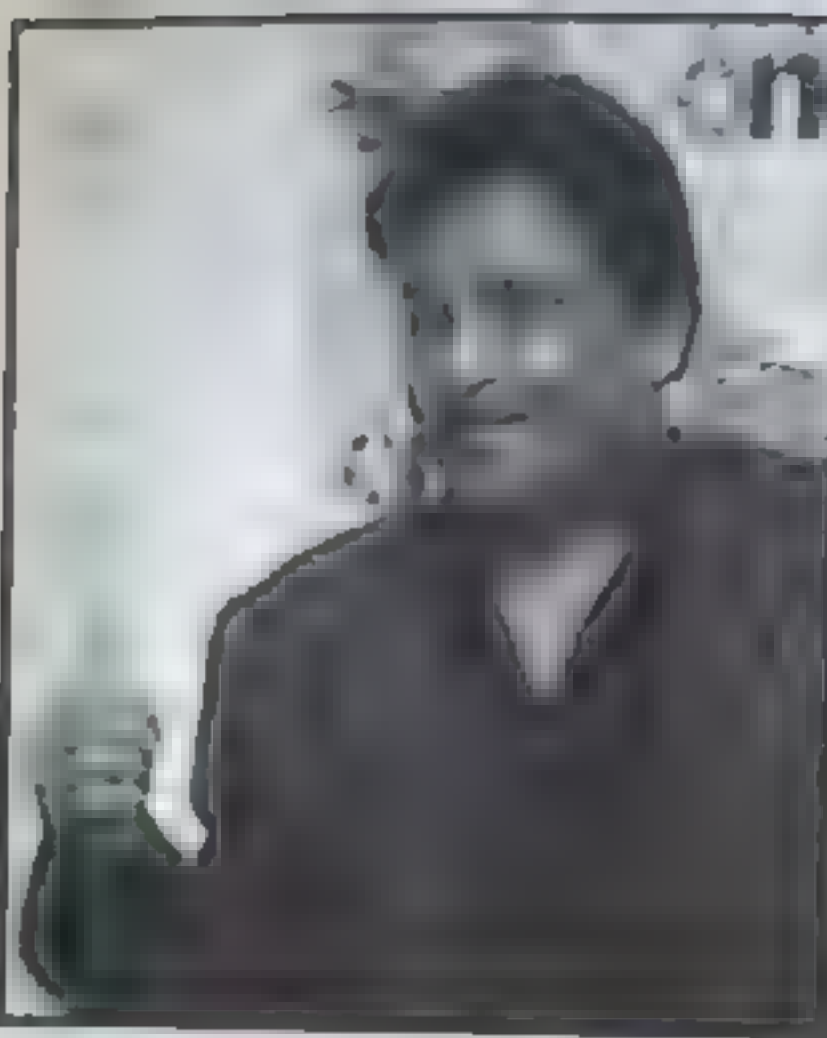
عمر شریف

4۔ چل میرے ہمراہی
نہ جھک جھک دھر پاؤں ...... گلوکار رنگیلا۔

5۔ میں تو ناچوں سانوریا
گلوکارہ نسیم بیگم۔ اس کو صاعقہ پر فلمایا گیا تھا۔

6۔ مری وفاؤں کا یہی صلہ تھا۔ گلوکار رنگیلا۔

7۔ ... کے محفل میں، پاؤں میں باندھ گھنگھرو
یہ گانا نسیم بیگم اور مالا کی آوازوں میں تھا اور وہ ڈانس کرنے والی لڑکیوں پر فلمایا گیا تھا۔

فلم کی ہدایت کاری معیاری تھی اور نظر آتا تھا کہ ہدایت کار کی کہانی اور اداکاروں پر پوری گرفت ہے۔ رنگیلا نے کہانی نویس، ہدایت کار، فلم ساز، گلوکار تمام کردار بہت خوبی اور کامیابی سے نبھائے تھے۔ یہ فلم رنگیلا پروڈکشن کے تحت بنائی گئی تھی۔ عکاس علی جان نے بہت اچھی عکاسی کی تھی۔

یہ فلم ایک ٹیم ورک کا نتیجہ تھی جس میں ہر ایک نے اپنے کام سے انصاف کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ایک یادگار فلم تصور کی جاتی ہے۔

☆☆☆

پاکستان مزاحیہ اداکاروں کے اعتبار سے ہمیشہ ایک زرخیز سرزمین رہا ہے۔ پاکستان میں جتنے اچھے مزاحیہ اداکار فلموں کے ذریعے سامنے آئے، قیامِ پاکستان کے بعد کے زمانے میں بالی وڈ کو ایسے اچھے مزاحیہ اداکار نصیب نہ ہوئے۔ چارلی، غوری، بھگوان وغیرہ کے زمانے کے بعد

انڈیا میں جو مزاحیہ اداکار سامنے آئے اور شہرت حاصل کی ان میں جانی واکر، جگدیپ جانی لیور شامل ہیں لیکن مزاحیہ اداکاری کے اعتبار سے ان میں سے کسی کو منور ظریف، ستور ظریف، رنگیلا، ننھا، لہری اور علی اعجاز جیسی صلاحیتیں حاصل نہیں ہوئیں۔ پاکستان میں مزاحیہ اداکاری کا معیار ہی بلند نہیں ہے ہمارے مزاحیہ اداکار اپنے طرزِ اداکاری کے باعث بھی بہت منفرد اور مختلف رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کامیڈی میں بہت زیادہ ورائٹی ہے۔ ہر اداکار نے اپنے اندازِ اداکاری کا معیار قائم کیا اور داد حاصل کی۔ نذر ابتدائی فلموں کے اداکار تھے۔ ان کی اداکاری کا انداز بھی نرالا تھا۔ وہ اپنے زمانے میں انتہائی مقبول مزاحیہ اداکار تھے۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب مغربی پاکستان سے فلمی اداکاروں کا ایک وفد مشرقی پاکستان گیا تو ہوائی اڈے پر اتنا ہجوم تھا کہ لوگ عمارت کی چھت پر چڑھ گئے اور چھت کے گرنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔

ہزاروں کی تعداد میں پرستار پذیرائی کے لیے آئے تھے۔ ڈھاکا کے فلمی اداکاروں کی بہت بڑی تعداد بھی اپنی کاروں سمیت وہاں موجود تھی۔ ہم اس وفد کے اراکین کی دیکھ بھال کے لیے ساتھ لے جائے گئے تھے۔ آغا طالش ہمیں ہیڈ ماسٹر اور لہری صاحب سرکس ماسٹر کہا کرتے تھے۔ ہماری ذمے داری یہ تھی کہ اداکاروں کو یکجا رکھا جائے اور انہیں پرستاروں سے محفوظ رکھا جائے۔ یہ ہدایات سب اداکاروں کو ہوائی جہاز ہی میں دے دی گئی تھیں۔ اس وفد میں اس وقت کے سبھی ممتاز اداکار اور اداکارائیں شامل تھیں۔

جب وفد کو محافظوں کے گھیرے میں سواریوں کی طرف لے جایا گیا تو نیلو بیگم غائب تھیں۔ تلاش کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک امیر زادے کی چمکتی ہوئی کار میں تشریف فرما تھیں۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ اس کار میں کیوں بیٹھ گئیں؟

بولیں "انہوں نے کہا کہ میں آپ کا فین ہوں اور آپ کو ہوٹل پہنچانے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

ہم نے کہا "اب آپ نیچے اتر آئیے، سب ساتھ اکٹھے ہو کر ہوٹل جا رہے ہیں۔"

امیر زادے نے انگریزی میں ہمیں قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر ہم نیلو بیگم کو لے کر چلے آئے۔ ہوٹل "شاہ باغ" پہنچ کر ہم نے ڈائننگ روم میں سب کو ایک لیکچر دیا اور بتایا کہ یہ ایک ایسا شہر ہے جس کے بارے میں ہم لوگ کچھ نہیں جانتے اس لیے ہر ایک سے رابطہ براہِ راست نہ رکھا جائے۔ سارے فون ہمارے پاس آئیں گے۔ ہم مناسب جواب دیں گے۔ دوسرے یہ کہ وفد کا کوئی بھی رکن کسی غیر متعلق شخص کی کار میں نہ بیٹھے۔ اگر کوئی اغوا کر کے لے گیا تو کون ذمے دار ہوگا؟ اس کے بعد سب نے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔

تذکرہ دراصل نذر صاحب کی مقبولیت کا تھا۔ ائرپورٹ پر ہجوم صبیحہ، سنتوش، مسرت نذیر، سدھیر اور نیلو وغیرہ کے بجائے نذر کو دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ ان کی فلم "دوسی" حال ہی میں مشرقی پاکستان میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس فلم میں نذر کا مزاحیہ کردار بے حد پسند کیا گیا تھا۔ فلم میں ان کا نام شیر گل تھا۔ وہ کیلا کھاتے ہی ایک دم طاقتور ہو جاتے تھے۔

دوسرے دن اداکاروں کا کرکٹ میچ تھا جس میں مشرقی پاکستان کے اداکار اور اداکارائیں بھی شامل تھے۔ یہ میچ ڈھاکا اور چٹاگانگ میں مشرقی پاکستان کے سیلاب زدگان کی مدد کرنے کے لیے کھیلا گیا تھا۔ میچ کے دوران میں بھی ہزاروں تماشائی "شیر گل" کے نعرے لگاتے رہے۔ نذر صاحب نے بھی اس میچ میں مزاحیہ انداز کا مظاہرہ کیا۔ ٹانگوں پر وہ الٹے پیڈ باندھ کر آئے اور الٹے بیٹ سے بیٹنگ شروع کر دی۔ انہیں اور ہیروئنوں کو یہ رعایت دی گئی تھی کہ ایک بار آؤٹ ہونے کے بعد انہیں دوسرا چانس بھی دیا جائے گا مگر نذر صاحب بار بار آؤٹ ہونے کے باوجود "ناٹ آؤٹ" کا نعرہ لگا کر اپنی جگہ پر کھڑے رہتے۔ کبھی "نو بال" کہہ کر اور کبھی یہ عذر پیش کر کے کہ میں تیار نہیں تھا اور انہوں نے گیند پھینک ماری۔ تماشائی بھی بلند آواز میں ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ اس طرح وہ کافی دیر تک آؤٹ ہونے پر راضی نہ ہوئے۔ ان کی حرکتیں دیکھ کر تماشائیوں کا خوشی کے مارے برا حال تھا۔ یہ تمام داستان تفصیل سے پہلے بھی بیان کی جا چکی ہے۔ مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ مزاحیہ اداکاروں اور نذر کی مقبولیت بے انتہا تھی۔ نذر کے بعد فلمی افق پر نمودار ہونے والے مزاحیہ اداکاروں نے بھی بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور فلم بینوں کو مسکرانے اور قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا۔ انڈین اور پاکستانی مزاحیہ اداکاروں میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ پاکستانی کامیڈین ذہین اور حاضر جواب ہوتے ہیں اور ان کی کامیڈی میں بے ساختگی ہوتی ہے۔ برجستہ اور برمحل فقرے ادا کرنے میں پاکستانی مزاحیہ اداکاروں کا جواب نہیں ہے۔

دائیں سے سادھنا، ہیلن، وحیدہ رحمن اور مندا

یہاں ایک ایسے ہی اداکار کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جس کی ذہانت اور حاضر جوابی کا ایک زمانہ قائل ہے۔ پاکستان میں نہیں، ہندوستان اور دوسرے بیرونِ ملکوں میں بھی انہیں بے حد مقبولیت حاصل ہے۔ یہ ہیں عمر شریف۔

عمر شریف تھیٹر کے علاوہ فلم اور ٹی وی کے بھی پسندیدہ اداکار ہیں۔ ان کی ذہانت، حاضر جوابی اور خداداد صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ وہ کسی شو میں جب کسی پر مزاحیہ انداز میں طنزیہ فقرہ کستے ہیں تو وہ برا ماننے کی بجائے خود بھی مسکراتا اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ ان کی فقرہ بازی کا کوئی برا نہیں مانتا۔ محمد علی صاحب کی زندگی میں ہی وہ اسٹیج اور ٹی وی پر ان کی نقل اتارتے تھے۔ کئی بار ان کی موجودگی میں بھی انہوں نے محمد علی صاحب کی نقلیں اتاریں اور محمد علی بھی ہنسنے پر مجبور ہو گئے۔ طنز اور مزاح کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ جس پر طنز کیا جائے وہ بھی برا نہ مانے۔ بقول غالب ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

عمر شریف نے شاید یہ انداز غالب کے شعر سے متاثر ہو کر ہی اختیار کیا ہے۔

عمر شریف کو لڑکپن سے اداکاری کا شوق تھا۔ وہ فلمیں بھی دیکھتے تھے۔ محمد علی ان کے سب سے زیادہ پسندیدہ اداکار تھے۔ انہوں نے اپنی اداکاری کا آغاز اس وقت کیا جب ایک اسٹیج ڈرامے میں "جن" کا کردار ادا کیا۔ اس زمانے میں وہ اسکول ہی کے طالب علم تھے۔ ایک نقاد کا کہنا ہے کہ ایک بار بوتل سے باہر آنے کے بعد یہ "جن" دوبارہ بوتل میں بند نہیں کیا جا سکا۔ اس کے بعد انہوں نے ویڈیو کا سہارا لیا اور ویڈیو کے ذریعے اپنے ڈرامے اور مزاحیہ پروگرام لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ ان کے آڈیو کیسٹ اور ویڈیو کیسٹ پاکستان کے علاوہ بھارت اور اردو بولنے سمجھنے والے چالیس ملکوں میں بھی بہت مقبول ہوئے۔

عمر شریف نے ٹی وی اور فلموں میں بھی اداکاری کی اور داد حاصل کی۔ عمر شریف کی ذہانت نے انہیں محض اداکاری تک محدود نہیں رکھا۔ انہوں نے کئی فلموں میں مختلف کردار بھی ادا کیے۔ اس کے بعد نہ جانے کیا جی میں سمائی کہ فلم ساز اور ہدایت کار بھی بن گئے۔ انہوں نے اسٹیج ڈراموں اور اپنی فلموں کے اسکرپٹ بھی لکھے اس طرح ان کا شمار فلم ساز، اداکار، مصنف کی صفوں میں ہونے لگا۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے ہر ڈرامے میں معاشرے کی خرابیوں کی عکاسی اور خود احتسابی کا عنصر بھی شامل ہوتا کہ ڈراما محض تفریح ہی نہ ہو، معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بھی ہو۔ وہ دلچسپ انداز میں معاشرے کی خرابیوں پر طنز کرتے ہیں اور لوگوں کے دل جیت لیتے ہیں۔

عمر شریف 1958ء میں کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تین بہنیں اور دو بھائی ہیں مگر ان میں سے کوئی شوبزنس کی طرف راغب نہ ہوا۔ شاید اس لیے کہ ان کے حصے کی تعریف اور داد و تحسین بھی عمر شریف نے سمیٹ لی۔

عمر شریف اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہیں۔ پانچ برس کی عمر میں وہ والد کے سائے سے محروم ہوگئے تھے۔ ان کی والدہ نے سب بچوں کی پرورش کی اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بنایا۔ کچھ عرصے قبل ان کی والدہ بھی فوت ہوگئی ہیں جن کی کمی عمر شریف بہت شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ انہیں اپنی والدہ سے بہت محبت تھی۔ ان کے بعد وہ بہت تنہائی محسوس کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں اپنے والدین کی خدمت کرنے کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ ان کے ہنستے اور ہنساتے ہوئے چہرے کے پیچھے دکھوں سے بھرا ہوا ایک دل بھی ہے۔

ابتدا میں عمر شریف شو کے نام سے آڈیو اور ویڈیو کیسٹس کے ذریعے انہوں نے اپنے مزاح اور فن کی داد حاصل کی۔ عمر شریف اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ اپنے مزاح کے ذریعے وہ لوگوں کو خوشیاں فراہم کرتے ہیں۔ ان کے مشہور اور مقبول ڈراموں میں ون ڈے عید میچ، بکرا قسطوں پر، بڈھا گھر پر ہے، بیگم میری بی بی سی، بہروپیا، دلہن میں لے کر جاؤں گا، مسٹر چار سو بیس اِن کراچی، اب گھر جانے دو، سلام کراچی، پردہ نہ اٹھاؤ، لیس سر عید نو سر عید' یہ ہے فلمی چکر، پیار کا ورلڈ کپ، ولیمہ تیار ہے، لوٹا اور لفافہ، منا بھائی ایم بی ایس، لوٹ سیل، چاند برائے فروخت، آؤ سچ بولیں، ہم سب ایک ہیں، ہنی مون، عمر شریف اِن جنگل، دو ہزار 2000 اور نیا زمانہ شامل ہیں۔

ان ڈراموں کے مصنف بھی وہ خود ہیں۔ ان میں ہدایت کاری اور اداکاری بھی کی ہے۔ ان کے مکالموں میں طنز و مزاح کے علاوہ دلچسپی اور شوخی بھی ہوتی ہے جو ان کے زرخیز دماغ اور بے پناہ صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔

عمر شریف کو فلموں میں اداکاری کا موقع مرحوم ہدایت کار جاوید فاضل نے دیا تھا۔ اس فلم کا نام ''حساب'' تھا۔ اس فلم میں ندیم ہیرو تھے جن کے ساتھ کامیڈین کا کردار عمر شریف نے ادا کیا تھا۔

اس فلم میں انہوں نے ایک گاؤں والے دیہاتی سندھی کا کردار بہت خوبصورتی سے ادا کیا تھا۔ اس فلم کی ہیروئن روزینہ تھیں۔ افضال احمد، منور سعید اور ہمایوں قریشی بھی اس فلم کے اداکاروں میں شامل تھے۔ یہ عمر شریف کی پہلی فلم تھی جس میں ان کی اداکاری کو بہت سراہا گیا اور نقادوں نے فیصلہ دیا کہ پاکستان کی فلمی صنعت کو ایک اور بہت اچھا مزاحیہ اداکار مل گیا ہے۔

جاوید فاضل کے ساتھ عمر شریف نے بعد میں ان کی متعدد فلموں میں کام کیا جن میں آوارگی، آگ ہی آگ اور کندن جیسی فلمیں شامل ہیں۔

عمر شریف کو دوسرے ہدایت کاروں نے بھی اپنی فلموں میں کاسٹ کیا۔ ہدایت کار نذرالاسلام کی فلم ''بارود کی چھاؤں'' میں عمر شریف نے اداکاری کا مظاہرہ کیا اور نگار ایوارڈ حاصل کیا۔ ہدایت کار ظہور گیلانی کی فلم ''دنیا میری جیب میں'' اور ''ڈنڈا پیر'' میں عمر شریف بھی اداکاروں میں شامل تھے۔ سنگیتا کی فلم ''بہروپیا'' اور ''صاحب بی بی اور طوائف'' ہدایت کار الطاف حسین کی فلموں ''جھوٹے رئیس، چھپے رستم، لاٹ صاحب اور کھوٹے سکے۔ ہدایت کار داؤد بٹ کی فلم ''جھگڑی'' ہدایت کار فیصل اعجاز کی فلم ''محلے دار'' ہدایت کار اقبال اختر کی فلم ''مسکراہٹ'' اسلم ڈار کی فلم ''پھول'' ہدایت کار امتیاز قریشی کی فلم ''مستانہ ماہی'' اور ہدایت کار ظفر شریف کی فلم ''نو سرباز'' میں کام کرکے عمر شریف نے فلمی صنعت میں بھی مزاحیہ اداکار کی حیثیت سے داد حاصل کی۔ فلم کامیاب ہو یا ناکام عمر شریف کی اداکاری کو ہر فلم میں پسند کیا گیا۔

جاوید فاضل کی فلم ''دشمنوں کے دشمن'' میں انہوں نے معین اختر کے ساتھ کام کیا۔ معین اختر کی یہ پہلی فلم تھی۔

ہر فلم میں عمر شریف کا کردار مختلف تھا۔ کندن میں انہوں نے ایک ایسے شخص کا کردار ادا کیا تھا جو ہر ایک کے ساتھ فراڈ کرتا ہے اور جب اس کا پول کھل جاتا ہے تو اس سے سب کچھ چھین لیا جاتا ہے اور وہ بھیک مانگنے لگتا ہے۔ یہ بہت اچھا کردار تھا جس کے ساتھ عمر شریف نے پورا انصاف کیا۔ اس فلم میں بھی عمر شریف نے بہترین کامیڈین کا ''نگار'' ایوارڈ حاصل کیا تھا۔

فلموں میں اداکاری کے ساتھ ساتھ عمر شریف نے اسٹیج اداکاری کا سلسلہ بھی جاری رکھا کیونکہ تھیٹر ان کا پہلا پیار ہے۔ لاہور کے ایک سنیما ''شمع'' کو انہوں نے لیز پر حاصل کرکے تھیٹر میں تبدیل کردیا جہاں انہوں نے بہت اچھے اسٹیج ڈرامے پیش کیے۔ عمر شریف خود بھی ایک شائستہ انسان ہیں۔ اچھے ماحول میں پرورش پائی اور اس کے بعد بھی بہت اچھے لوگوں کے ساتھ کام کیا۔ ان کے مزاح کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ وہ معاشرے کے عام مسائل کے بارے میں طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں نکتہ چینی کرکے ڈراما دیکھنے والوں میں ہنسی مذاق کے علاوہ شعور، ایک اچھا انسان اور پاکستانی بننے کا جذبہ بھی پیدا کرتے ہیں۔ تقاریب میں وہ فی

البدیہہ الفاظ کی پھلجھڑیاں چھوڑ کر دیکھنے والوں کو ہنسنے اور قہقہے لگانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ عمر شریف مختلف پروگراموں کے لیے پاکستان سے باہر جاتے رہے جہاں انہیں ہندوستانی فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے بھی دیکھا اور بہت پسند کیا۔ انہیں کئی بار بالی وڈ سے اداکاری کی پیشکش ہوئی مگر انہوں نے بھارتی فلموں میں بھاری معاوضوں کی پیشکش کے باوجود کام کرنا پسند نہیں کیا۔

فلموں کا مزہ پڑا تو عمر شریف کو اپنی ذاتی فلم بنانے کی سوجھی اور انہوں نے فلم ''چارسوبیس'' بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس فلم کا تقریباً ہر شعبہ عمر شریف نے سنبھال لیا تھا۔ وہ اس فلم کے کہانی نویس، مکالمہ نویس اور ہدایت کار تھے۔ اس فلم کے نغمے بھی عمر شریف ہی نے لکھے تھے۔ صرف گلوکاری نہیں کی ورنہ رنگیلا کے ہم پلہ ہو جاتے۔ اس فلم کے بارے میں فلمی دنیا میں زیادہ توقعات نہیں تھیں خصوصاً ایک نوآموز (فلم کے لیے) شخص کو اتنی زیادہ ذمے داریاں سنبھال کر بنانے کی وجہ سے بھی عام طور پر اس فلم کے بارے میں امیدیں وابستہ نہیں تھیں مگر جب فلم نمائش کے لیے پیش کی گئی تو کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور عمر شریف نے یہ بازی جیت لی۔ فلم ''چارسوبیس'' میں انہوں نے تین مختلف کردار ادا کیے تھے اور ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا تھا۔ انہوں نے اس فلم میں ایک ایسے شخص کا کردار بھی ادا کیا تھا جو بندروں میں رہ کر بندروں جیسی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ ایک کردار پولیس افسر کا تھا جو بہت ایماندار اور فرض شناس ہے۔ تیسرا کردار ایک دیہاتی کا تھا۔ عمر شریف نے یہ سب کردار بہت خوبی سے نبھائے تھے۔ اس فلم میں انہوں نے کچھ اور بھی نئے تجربات کیے تھے۔ روبی نیازی کو انہوں نے ہیروئن کا کردار سونپا تھا۔ مدیحہ شاہ کے ساتھ شکیلہ قریشی بھی مرکزی کرداروں میں موجود تھیں۔ یہ سب نسبتاً نوآموز اداکارائیں تھیں لیکن عمر شریف کی کردار نگاری، مکالموں اور سچویشنز کے باعث انہیں مقبولیت حاصل ہوئی کیونکہ انہیں موزوں کردار دیے گئے تھے اور بہ طور ہدایت کار بھی عمر شریف نے اپنی ذمے داریاں بہت سلیقے سے نبھائی تھیں۔

فلم چارسوبیس کے بعد انہوں نے دوسرے فلم سازوں کے لیے دو فلموں کی ہدایت کاری کے فرائض ادا کیے جن میں ایک ''مس فتنہ'' اور دوسری ''چاند بابو'' تھی۔ ان فلموں میں مزاح پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ اس کے بعد عمر شریف نے ایک فلم ''مرد کا بچہ'' کے نام سے بنانے کا اعلان کیا تھا لیکن یہ ''مرد کا بچہ'' ابھی تک پیدا نہیں ہوا یعنی فلم نہیں بن سکی۔

عمر شریف کی اداکاری اور تحریر سے تو سبھی واقف ہیں۔ ان کی بے ساختہ فقرے بازی اور موقع و محل کے مطابق طنز و مزاح پیدا کرنے کی صلاحیت سے صرف پاکستان ہی نہیں، بیرونی دنیا میں بھی وہ اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ وہ اپنے پروگرام اسکرپٹ کے بغیر فی البدیہہ کرتے ہیں کیونکہ وہ حالات اور وقت کے مطابق فقرے چست کرتے ہیں اور تماشائیوں کے علاوہ اس شخص کو بھی ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں جس پر فقرہ چست کیا جاتا ہے۔ یہ خوبی بہت کم مزاحیہ اداکاروں میں پائی جاتی ہے۔

عمر شریف کا بچپن اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ وہ دوسرے بچوں کے برعکس بہت حاضر جواب اور ذہین تھے۔ فلم کا شوق انہیں بچپن میں بھی تھا۔ وہ موقع پا کر فلم ضرور دیکھتے تھے۔ یہ کام وہ گھر والوں سے چھپ کر کیا کرتے تھے لیکن جب گھر والوں کو معلوم ہو جاتا تھا تو انہیں مار بھی پڑتی تھی۔ فلم بینی کا شوق انہیں پھر سینما کی طرف جانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ آج کل وہ ٹی وی پروگرام کرتے ہیں جس میں ان کا مخصوص انداز نمایاں نظر آتا ہے۔ یہاں بھی وہ اپنے مہمانوں سے ان کی اعلیٰ حیثیت سے قطع نظر بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے سے باز نہیں آتے لیکن ان کی گفتگو کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ان کی باتوں اور فقرہ بازی سے ناراض نہیں ہوتا بلکہ عمر شریف کے پروگرام میں وہ عام زندگی کے مقابلے میں بالکل مختلف شخصیت لے کر سامنے آتا ہے۔ بڑے بڑے بزنس مین، صنعت کار، فن کار اور سیاست دان ان کے شو میں اپنے اوپر سے سنجیدگی کا لبادہ اتار کر ہنستے ہنساتے اور ان کے ساتھ گھل مل کر دلچسپ باتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی عمر شریف کی فن کاری ہے کہ وہ ہر شخصیت کے سامنے وہ باتیں اور سوالات بھی کر جاتے ہیں جو اگر کوئی اور صحافی ان سے پوچھے تو وہ برہم ہو جائیں مگر عمر شریف کی میٹھی زبان اور معصومیت کے ساتھ ادا کیے جانے والے بے ساختہ سوالوں سے کوئی برہم نہیں ہوتا۔

عمر شریف کیسٹ ڈراموں کے ذریعے دنیا بھر میں مقبول ہوئے اس کے بعد انہوں نے تھیٹر کو اپنے ڈراموں سے ایک نیا رخ اور انداز دیا۔ ان کے ڈراموں کا انداز اطہر شاہ خان (جیدی) سے ملتا جلتا تھا جنہوں نے اس سے پہلے پاکستانی تھیٹر میں خوبصورت، بامقصد اور دلچسپ ڈراموں کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ وہ بھی اپنے ڈراموں میں مصنف، ہدایت کار اور اداکار کی حیثیت سے مختلف نظر آتے تھے۔ عمر شریف نے شوبزنس میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا

ہے۔ اسٹیج، تھیٹر، ٹی وی اور فلم میں ان کی کارکردگی کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ عمر شریف جیسے ہمہ صفت فن کار کسی بھی ملک کے لیے فخر اور وقار کا باعث بنتے ہیں۔ دعا کیجیے کہ ہمیں عمر شریف جیسے افراد مستقبل میں بھی نظر آئیں۔

☆☆☆

پچھلے دنوں اداکارہ شبنم اور ان کے شوہر موسیقار روبن گھوش پاکستان کے مختصر دورے پر آئے تھے۔ شبنم اپنا ایوارڈ وصول کرنے آئی تھیں اور یہ دونوں لاہور اور کراچی میں اپنے پرانے ساتھیوں سے ملنے اور پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے آئے تھے۔ شبنم نے بیمار فن کاروں سے خاص طور پر ملاقات کی۔ خود بھی روئیں اور دوسروں کو بھی رُلایا۔

شبنم نے کراچی ہی سے فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ ہم سے بھی ضرور ملنا چاہتی ہیں مگر کراچی اور لاہور میں وہ جہاں بھی گئیں، وہاں میڈیا کا ایک ہجوم ساتھ تھا۔ وہ اسلام آباد سے لاہور آئیں تو ہم نے فون کے ذریعے انہیں بتایا کہ وہ براہِ کرم ہمارے گھر نہ آئیں کیونکہ ان کے ساتھ میڈیا کی فوج بھی آئے گی جس سے ہم بہت گھبراتے ہیں۔ ہوٹل ہی پر کوئی وقت دے دیں، ہم وہیں آ جائیں گے۔

لاہور میں شبنم کا قیام مختصر اور مصروفیات بہت زیادہ تھیں۔ انہوں نے اگلے دن صبح نو بجے کا وقت دیا اور کہا کہ اس وقت نہ کوئی اور ملاقاتی یا میڈیا والا ہوگا اور نہ ہی ٹیلی فون کی لگاتار بجتی گھنٹی۔

دوسرے دن ہم لیلیٰ کے ساتھ نو بجے ان کے ہوٹل پہنچ گئے۔ وہ رات کو دیر تک جاگنے کے باوجود جلد بیدار ہو گئی تھیں اور ہماری منتظر تھیں مگر روبن گھوش سوئے ہوئے تھے۔ ہم نے انہیں جگانے سے روک دیا اور شبنم کے ساتھ گپ شپ کرتے رہے۔ پاکستان میں اتنے عرصے بعد بھی شبنم کو جو پذیرائی اور محبت ملی اس سے وہ بہت زیادہ متاثر تھیں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ زیادہ وقت کے لیے پاکستان آئیں گی۔

شبنم سادہ سے لباس میں بغیر میک اپ کے سامنے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں اور پرانی یادیں تازہ کر رہی تھیں۔ شبنم نے ہماری اور ہماری لکھی ہوئی کئی فلموں میں کام کیا۔ فلم سے قطع نظر بھی ہمارا ان سے کافی میل جول تھا۔ ان کے گھر جا کر بہت خوشی ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ ہیروئنوں والے نخروں سے دور رہیں۔ ان کا سلوک ہمیشہ ایک جیسا رہا۔ ان کے حسنِ اخلاق کا اعتراف سبھی فلم سے وابستہ اور ان کے ساتھ کام کرنے والے لوگ کرتے رہے ہیں۔ ان کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب ان کی سادگی اور خوش اخلاقی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ نرم اور ملائم آواز میں گفتگو کی۔ ان کا کبھی کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ تمام ہیروئنوں سے بھی ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔

ہمارے سامنے جو شبنم صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں وہ پہلے کے مقابلے میں کچھ موٹی نظر آ رہی تھیں۔ وہ گزشتہ سالوں میں ہیمبرج اور دوسرے کئی امراض میں مبتلا رہیں مگر اب صحت مند ہیں۔

شبنم سے ملاقات کر کے ہمیں ان سے پہلی طویل ملاقات یاد آ گئی جو ڈھاکا میں ہوئی تھی۔ فلم تلاش کے بعد ہر جگہ ان کی دھوم مچی ہوئی تھی اور مغربی پاکستان کا ہر فلم ساز انہیں اپنی فلم میں شامل کرنے کا خواہش مند تھا۔ اس زمانے میں ہم حسن طارق صاحب کے ساتھ مل کر فلمیں بناتے تھے۔ طے پایا کہ ہم اپنے ڈسٹری بیوٹر میاں خادم حسین کے ساتھ ڈھاکا جائیں اور شبنم کو اپنی آئندہ فلم کے لیے کاسٹ کریں۔

ڈھاکا میں اس زمانے میں فلم اور صحافت میں اور بھی دوست تھے۔ ان کے ذریعے شبنم کا پتا حاصل کر کے ہم ایک کوٹھی میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ شبنم اور ان کے والدین کوٹھی کے گیراج میں رہتے ہیں۔ یہ سن کر حیرت بھی ہوئی مگر اس وقت شبنم مشہور اور بڑی اداکارہ نہیں بنی تھیں۔ مشرقی پاکستان کی فلمی صنعت نوزائیدہ تھی اس لیے فلموں کی لاگت بھی بہت کم ہوتی تھی اور کوئی امیر نہیں ہوا تھا۔ اس ملاقات کا احوال پہلے بھی تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔ مختصر یہ کہ اس گیراج کو بھی بہت سادگی مگر سلیقے سے سجایا گیا تھا اور درمیان میں ایک پردے کے ذریعے ڈرائنگ روم اور بیڈ روم علیحدہ بنا دیے گئے تھے۔

شبنم سے یہ پہلی ملاقات تھی جس میں ہم انہیں مغربی پاکستان آنے پر آمادہ نہ کر سکے۔ ڈھاکا کی فلمی دنیا میں مغربی پاکستان کی فلمی صنعت کے بارے میں اچھا تاثر نہیں تھا۔ وہاں کے فلم ساز بھی فن کاروں کو ڈراتے رہتے تھے تاکہ وہ ان کے ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔

شبنم کو ہم نے پہلی بار لاہور میں دیکھا تھا جب وہ 57-56 میں ایک فلمی وفد کی ساتھ مغربی پاکستان آئی تھیں۔ اس وقت وہ ایک انتہائی سادہ لڑکی تھیں۔ اردو بولنا تو کیا سمجھتی بھی نہیں تھیں۔ ساڑی میں ملبوس ہمارے سامنے سانولی رنگت کی ایک اداکارہ موجود تھی جس کی نمایاں خصوصیات اس کی بڑی بڑی اثرانگیز آنکھیں اور گھٹنوں سے بھی نیچے تک پھیلے ہوئے سیاہ بال تھے۔

ہم جب پاکستان آئیں تو ان کا پہلا پڑاؤ کراچی میں ہوا جہاں وہ وحید مراد کے ساتھ فلم ”سمندر“ میں کام کر رہی تھیں۔ وہ لاہور آگئیں تو فلم سازوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ شبنم کی اداکاری تو قابلِ دید تھی لیکن اردو کا تلفظ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ اردو پڑھنا بھی نہیں جانتی تھیں اس لیے وہ مکالمے بنگالی میں لکھ لیتی تھیں۔ فلموں میں ان کی آواز کسی اور خاتون کی آواز میں ڈب کی جاتی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے شبنم نے اپنا اردو کا لب و لہجہ اور تلفظ بہت حد تک درست کر لیا۔ کچھ عرصے بعد وہ اردو پڑھنا بھی سیکھ چکی تھیں۔ ہمارے لکھے ہوئے اسکرپٹ کو پڑھ کر وہ اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار بھی کرتی رہتی تھیں۔ مکالموں کی ادائیگی میں اردو کا صحیح تاثر پیدا کرنے پر اکثر ہدایت کاروں نے زیادہ توجہ نہیں دی مگر جب انہوں نے فلم ”آس“ میں ہماری ہدایت کاری میں کام کیا تو ہم نے انہیں خاص طور پر تاثرات کے اظہار کے لیے لفظوں کی ادائیگی پر زور دیا۔ مثلاً ”کیا؟“ یہ لفظ مختلف مواقع پر مختلف انداز میں بولا جاتا ہے۔ اسی طرح ”اچھا“ ایسا لفظ ہے جس کی ادائیگی اور تاثر موقع و محل کے مطابق تبدیل ہو جاتا ہے۔ ”آس“ میں شبنم کے مکالموں کی ادائیگی سے ہم بہت مطمئن ہوئے۔

شبنم نے ہمارے ساتھ چند فلموں کی شوٹنگ کے سلسلے میں انگلستان سے کینیڈا کا سفر بھی کیا۔ وہاں انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔ گھر میں ان کا لباس اور بالوں کا انداز تبدیل ہو کر بہت دلکش ہو گیا تھا۔ وہ گھر میں اکثر پتلون اور بلاؤز میں نظر آتی تھیں۔ ان سے ہماری گپ شپ رہی۔ ہنسی مذاق کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ شمیم آرا کو ہم نے کالا کپتان کا لقب دیا اور شبنم کو..... کرنل کا۔ دونوں اس سے بہت لطف اندوز ہوتیں۔ ہنستیں اور دل صاف تھے اس لیے برا ماننے کا سوال ہی نہیں تھا۔

شبنم جب فلم ”میرے ہم سفر“ کے لیے لندن گئیں تو ہم سب لوگ فراغت سے لندن کے شاپنگ سینٹرز میں گھومتے رہتے تھے اور دوسری بار وہاں جانے پر بھٹکتے رہتے تھے مگر شبنم ساڑی پر ایک برساتی نما کوٹ اور چپل پہن کر جب کسی شاپنگ سینٹر میں جاتیں تو سیدھی وہاں پہنچ جاتیں جہاں جانا ہوتا تھا۔ شبنم نے شاپنگ واپسی کے وقت کی اور بہت اچھی شاپنگ کی اس لیے کہ وہ پہلے ہی ہر چیز کا جائزہ لے چکی تھیں۔

روبن گھوش کی خوبی یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں جب پاکستانی کھانا یورپ اور کینیڈا میں بہت مشکل سے دستیاب ہوتا تھا، روبن گھوش دوسرے ہی دن کوئی دیسی ریستوران تلاش کر لیا کرتے تھے۔ روبن کو دلچسپ چیزیں اکٹھی کرنے کا بھی شوق تھا مثلاً ربڑ کا ایک تکیہ جسے دبانے پر قہقہے سنائی دیتے تھے۔ وہ ہر جگہ تفریحی دکانوں پر جوئے میں قسمت آزمائی بھی کرتے تھے اور اکثر جیت لیا کرتے تھے۔

”میرے ہم سفر“ کی شوٹنگ کے لیے محمد علی صاحب کے ساتھ زیبا بھی تھیں۔ ان کے ساتھ گپ شپ اور فقرہ بازی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ہم نے ایک دن ان سے کہا کہ بھئی آپ محمد علی صاحب کے ساتھ نانی اماں یا والدہ کی طرح نگہداشت کے لیے کیوں چلی آئیں، گھر بیٹھ کر آرام کیوں نہیں کیا؟

وہ بولیں ”انہیں تم جیسے لوگوں کی صحبت سے بچانے کے لیے ساتھ آئی ہوں۔“

ہم نے کہا ”مگر وہ تو ہر وقت ہماری صحبت میں رہتے ہیں۔“

زیبا کی عادت تھی کہ جو قیمتی چیزیں خریدتی تھیں ان کی فخریہ نمائش کرتی تھیں۔ ہم نے شبنم سے کہا کہ آپ نے جو چیز خریدی ہے، زیبا کے سامنے اس کی قیمت بڑھا چڑھا کر بتائیں۔

وہ ہنسنے لگیں ”آفاقی صاحب، اتنی سی بات کے لیے جھوٹ بولنے کا کیا فائدہ؟“

ہم نے کہا ”یہ جھوٹ نہیں ہے۔ اردو میں اس کو ”مبالغہ“ کہتے ہیں۔“

مگر انہوں نے ہماری بات نہیں مانی۔ پاکستان سے باہر یونٹ کے سب لوگ ایک خاندان کی طرح مل جل کر رہتے تھے۔ محمد علی پیسا خرچ کرنے میں بادشاہ تھے۔ فرصت کے دن سب کو لے کر کسی مہنگے ریستوران میں جاتے اور مختلف قسم کے کھانوں کا آرڈر دے کر خوش ہو جاتے۔ کئی بار ہم نے کہا بھی کہ بھائی، غیر ضروری فضول خرچی کر کے کیوں قیمتی زرِمبادلہ ضائع کرتے ہو۔ ان کا جواب ہوتا تھا ”آفاقی! اللہ مالک اور رازق ہے۔ وہی کمی پوری کر دے گا۔“

اس دن ہوٹل میں ہماری جس شبنم سے ملاقات ہوئی، ظاہری طور پر ان میں کچھ تبدیلی نظر آ رہی تھی مگر ان کے دل اور دماغ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور نہ ہی خوش اخلاقی میں۔ شبنم کی باتیں کریں تو ایک لمبی داستان بن جائے گی۔ پہلے بھی ان کے بارے میں وقتاً فوقتاً بیان کیا جاتا رہا ہے۔ کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں۔ شبنم سے مل کر یہ شعر یاد آ گیا۔

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ
یاد رکھو فسانہ ہیں ہم لوگ

جاری ہے

طارق عزیز خان

آج مغرب و مشرق کے فاصلے مٹ چکے ہیں۔ دوریاں سمٹ گئی ہیں۔ اب تو پتا ہی نہیں چلتا کہ کب سفر شروع ہوا اور کب ہم دنیا کے دوسرے سرے پر پہنچ گئے۔ مگر ایک دور وہ بھی تھا جب لوگ یہی سمجھتے تھے کہ ہمارے علاقے کے بعد دنیا ختم ہے۔ لیکن اُس دور میں بھی باہمت لوگوں کی کمی نہ تھی جو جان ہتھیلی پر لیے نئے نئے جہان کی تلاش میں پھرا کرتے تھے۔ وہ بھی ایک پورا بحری بیڑا لے کر ہند کی تلاش میں نکلا تھا اور لاتعداد مصائب جھیلتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

[illegible]

شہنشاہ پرتگال جان دوم کا دربار سجا ہوا تھا مگر دربار پر خاموشی کی چادر تنی ہوئی تھی۔ ہر ایک درباری سہما ہوا تھا۔ شہنشاہ غصے میں بھرا ہوا تھا۔ اسے ویٹی کن سٹی سے جاری کردہ اعلامیہ پر اعتراض تھا۔ ایک کیتھولک ہونے کی وجہ سے اسے پوپ پر بھروسا تھا۔ اس سے عقیدت تھی۔ یہ اس کے ایمان کا حصہ تھا مگر اس اعلامیہ نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔ پوپ نے جانب داری کا مظاہرہ کیا تھا۔ دنیا کی تقسیم کے معاملے میں پوپ نے اپنے مذہب کی توہین کی تھی۔ اصل

بات یہ تھی کہ مارچ 1493ء میں ہسپانوی حکومت نے بحراوقیانوس کے مغرب میں دریافت شدہ نئی سرزمین کی ملکیت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ حکومت جلد ہی کولمبس کے دریافت کردہ جزائر کو پار کرلے گی اور مغرب کی طرف سے ہندوستان تک رسائی بھی حاصل کرلے گی۔ ادھر پرتگالیوں نے جو کولمبس کی مہم پر نظر رکھے ہوئے تھے، ہندوستان پر اپنا حق جتادیا تھا انہوں نے اسپین کو دھمکی دی کہ مغرب کی طرف سے مشرقی علاقوں میں گھسنے والے ہسپانوی بحری جہازوں کو تباہ کر دیا جائے گا۔ اپریل 1493ء میں دنیا کی ملکیت کے معاملے کو لے کر دونوں بڑی ..... طاقتوں کے درمیان کشیدگی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب ویٹی کن سٹی کے نئے منتخب شدہ رومن کیتھولک پادری پوپ الیگزینڈر ششم (Pope Alexander VI) نے دونوں بڑی عیسائی مملکتوں کے درمیان تناؤ کم کرنے کے لیے دنیا کی تقسیم کی تجویز پیش کی۔ پوپ نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے اپنے طور پر 4 مئی 1493ء کو دنیا کو پرتگال اور اسپین کے مابین تقسیم کا فارمولا پیش کردیا۔ پوپ نے دنیا کا مشرقی حصہ پرتگال جبکہ مغربی حصہ اسپین کو الاٹ کردیا اور یہ کہا کہ اگر کولمبس کے دریافت کردہ جزائر جنوب مشرقی ایشیا سے متصل ہوئے تو اسپین کو بھی ہندوستان سے تجارت کا حق حاصل ہوگا۔

اسپین کے بادشاہ فرڈی نینڈ اور ملکہ ازابیلا نے پوپ کے فارمولے کی حمایت کی لیکن پرتگالی بادشاہ جان دوم نے پوپ کی تجویز مسترد کردی۔ اسے یہ بات بری لگی تھی اُس کا خیال تھا کہ ہسپانوی نژاد پوپ نے دنیا کی تقسیم میں ڈنڈی ماری ہے اور اسپین کو جغرافیائی فائدہ پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ جان دوم کا کہنا تھا کہ پرتگال نے ہندوستان تک رسائی کا راستہ دریافت کیا ہے اس لیے ہندوستانی سرزمین پرتگال کی ملکیت ہے۔

راس امید کی دریافت اور اس پر قبضے کے بعد پرتگالی حکومت کی ہندوستان تک رسائی کی تیاری طویل ہوتی جارہی تھی جبکہ ہسپانوی حکومت ستمبر 1493ء میں بحراوقیانوس کے پار اپنی دوسری مہم کو روانہ کرنے کی تیاری میں تھی۔ پرتگالی حکومت کو احساس ہوا کہ اگر اس بار کولمبس اپنے دریافت کردہ جزائر کو پار کرکے ایشیا پہنچ گیا تو اس سے اسپین کو ہندوستان پر قبضے کا جواز حاصل ہوجائے گا۔ اس لیے جان دوم نے لہجے میں نرمی پیدا کرلی۔ اس نے اسپین کے بادشاہ کے نام دوستی کا پیغام بھیجا جس میں باضابطہ طور پر دنیا کی تقسیم کی تجویز پیش کی گئی تھی۔

1494ء کے آغاز میں اسپین کے شہر تورڈی سیلاس میں دونوں ممالک کے درمیان مذاکرات کا آغاز ہوگیا۔ اگلے چھ ماہ تک دنیا کی تقسیم کے مختلف فارمولوں پر بحث ہوتی رہی بالآخر 7 جون 1494ء کو دونوں سُپر پاورز کے نمائندوں نے دنیا کی تقسیم کے معاہدے پر دستخط کردیے۔ 2 جولائی 1494ء کو اسپین اور 5 ستمبر 1494ء کو پرتگال نے سرکاری طور پر اس معاہدے کی توثیق کی تھی۔ معاہدے کے مطابق بحراوقیانوس میں واقع جزائر کیپ ورڈے کے 1770 کلومیٹر مغرب میں (تقریباً 46.37 ڈگری مغرب کے خط پر) شمالاً جنوباً ایک فرضی لائن کھینچ کر دنیا کو مشرقی اور مغربی دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ معاہدے میں طے کیا گیا تھا کہ مشرقی علاقے پرتگال جبکہ مغربی علاقے اسپین کی ملکیت ہوں گے۔ معاہدے کے وقت دستیاب دنیا کے جس نقشے کے مطابق یہ تقسیم عمل میں لائی گئی تھی، اس نقشے میں یورپ، افریقا اور ایشیا کے براعظموں کے علاوہ بحراوقیانوس کے مغرب میں نئی سرزمین کے نام پر چند جزائر اور ایک کم چوڑے لمبے جزیرہ نما علاقے کو ظاہر کیا گیا تھا۔ اس طرح براعظم افریقا اور ہندوستان کو پرتگال جبکہ کولمبس کی دریافت کردہ نئی سرزمین کو اسپین کا علاقہ تسلیم کرلیا گیا تھا۔

دنیا کی تقسیم کے معاہدے کا سب سے دلچسپ اور اہم پہلو بحراوقیانوس میں کھینچی گئی لائن کے مخالف اثرات سے متعلق تھا، مثلاً معاہدے کے وقت یورپین جغرافیہ دان نہیں جانتے تھے کہ بحراوقیانوس میں شمالاً جنوباً کھینچی گئی لائن کرۂ ارض کے دوسری جانب کن کن علاقوں کو تقسیم کررہی ہوگی یا کن کن علاقوں کے اوپر سے گزر رہی ہوگی؟ معاہدے میں طے پایا کہ پرتگال مشرق جبکہ اسپین مغرب کی طرف سے دنیا کو دریافت کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس طرح جب دونوں ممالک کے مہم جو دنیا کے گرد گھومتے ہوئے گلوب کے دوسری جانب ایک دوسرے کو کراس کرلیں گے تب کرۂ ارض کو زیادہ بہتر پیمائش کے ساتھ اسپین اور پرتگال کے مابین تقسیم کردیا جائے گا۔

دنیا کی تقسیم کے معاہدے میں پرتگال اور اسپین دونوں کو ملوکا کے جزائر تک رسائی کا موقع حاصل تھا۔ اس وقت یورپ میں یہ جزائر گرم مصالحوں کے جزائر کے نام سے مشہور ہوچکے تھے۔ یورپی جغرافیہ دانوں کی رائے میں اس بات کے قوی امکانات تھے کہ دنیا کو تقسیم کرنے والی فرضی لائن کا گلوب کی دوسری جانب اثر گرم مصالحوں کے جزائر کے اریب قریب ہورہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ گرم مصالحوں کے جزائر اسپین اور پرتگال کے مابین تقسیم دنیا کی سرحد پر واقع تھے۔ یورپ میں یہ رائے سامنے آنے کے بعد اسپین اور پرتگال نے اپنے اپنے راستوں سے ان جزائر تک رسائی کی کوششیں تیز تر کردیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی کامیاب کوشش 1513ء میں ہوئی۔ جب ہسپانوی فوج کے ایک فرد واسکو نونس ڈی بالبوا نے 29 ستمبر 1513ء کے دن پانامہ کے اس مقام سے خلیج پانامہ کا نظارہ کیا جہاں آج شہر پانامہ کا جنوبی دروازہ واقع ہے۔ بالبوا نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ خلیج پانامہ کے 30 کلومیٹر جنوب میں واقع پرل کے جزائر تک سفر کیا تھا۔ تاہم وہ جنوب میں موجود کھلے سمندر (بحرالکاہل) میں داخل ہونے کے بجائے واپس پانامہ چلا آیا تھا۔ بالبوا اپنے دریافت کردہ سمندر کی وسعت سے لاعلم تھا۔ اس نے اسے بحرِ ہند کا ذیلی سمندر مانتے ہوئے ہسپانوی میں Mardel Sur یا جنوبی بحر (South Sea) کا نام دیا۔ بالبوا کی اس مہم کے بعد اسپین کی حکومت نے امریکی براعظم میں کسی ایسے سمندری راستے کی تلاش پر توجہ دی کہ جس میں سے ہوکر بحرالکاہل میں داخل ہوا جاسکے۔ تاہم اگلے چند سالوں تک اسکی ہر کوشش ناکام رہی۔ یہاں تک کہ اگست 1519ء میں اسپین کی طرف سے پرتگالی نژاد مہم جو فرڈی نینڈ میگلن نے اپنے پانچ بحری جہازوں کے بیڑے کے ساتھ مغرب کی طرف سے ایشیا تک رسائی کی مہم کا آغاز کیا۔ 28 نومبر 1520ء کو میگلن کے بحری جہاز بحرالکاہل تک رسائی میں کامیاب ہوگئے۔

میگلن نے اسپین کی بندرگاہ سان لوکار سے لے کر اپنے نام سے منسوب آبنائے میگلن کو پار کرلینے تک ایک سال 3 ماہ اور 18 دن کی مہم جوئی کے دوران 15 ہزار کلومیٹر کے قریب سفر طے کیا تھا۔ اس دوران وہ اپنے 2 بحری جہازوں سمیت 67 ملاحوں سے ہاتھ دھو چکا تھا اور اب اس سمیت تین بحری جہازوں پر 200 کے قریب ملاح سوار تھے۔ اب میگلن کو مغرب کی طرف سے اس وسیع و عریض سمندر کو پار کرنے کے بعد جنوب مشرقی ایشیا سے متصل مالے کے جزائر تک جانا تھا۔ جہاں اس کی اگلی منزل مالے کے مشرقی حصے میں عین خطِ استواء پر واقع ملوکا کے جزائر تھے۔ گرم مصالحوں کی دولت سے مالا مال یہ وہی جزائر تھے کہ جن تک رسائی کے لیے اس مہم کو ترتیب دیا گیا تھا۔

آبنائے میگلن سے باہر نکل کر ہسپانوی ملاحوں کو احساس ہوگیا کہ انہوں نے ایک وسیع اور کھلے سمندر تک رسائی حاصل کرلی ہے۔ میگلن نے اسے بحرالکاہل یا پُرسکون سمندر کا نام دیا۔ وہ اس سمندر کی وسعت سے لاعلم تھا۔ تاہم اس نے کرۂ ارض کے اس وقت تک معلوم محیط (40 ہزار کلومیٹر کے قریب) کو ذہن میں رکھتے ہوئے اندازہ لگایا کہ اسے ملوکا کے ایشیائی جزائر تک رسائی حاصل کرنے کے لیے بحرالکاہل میں قریب ڈیڑھ سے دو ماہ تک کا طویل سفر درپیش ہے۔ وہ آگے بڑھنے سے پہلے کسی انسانی آبادی تک پہنچنا چاہتا تھا تاکہ ایک لمبے سفر کے لیے خوراک اور ضروری اشیا کا وافر ذخیرہ ساتھ لے سکے۔

آبنائے میگلن سے باہر نکل کر ہسپانوی بیڑے نے ایک سرسبز لیکن غیر آباد جزیرے پر لنگر گرائے۔ خشکی پر قدم رکھنے کے بعد میگلن نے اپنے ساتھیوں کو ایک کامیاب دریافت پر خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس نے کہا کہ وہ رات یہاں گزاریں گے اور پھر اگلی صبح ساحل کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف آگے بڑھتے ہوئے کسی آباد جگہ کو تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ 29 نومبر کی صبح تینوں بحری جہازوں نے سفر کا آغاز کیا۔ ان کے مشرق میں جنوبی امریکا کی مغربی ساحلی لکیر سے متصل چھوٹے بڑے غیر آباد جزائر کا ایک سلسلہ جبکہ مغرب میں بحرالکاہل کا کھلا سمندر موجزن تھا۔ یکم دسمبر 1520ء کے دن وہ لوگ خطِ استواء سے 47 ڈگری جنوب کے خط پر واقع (Gulf of de penas) کے قریب پہنچے جہاں انہوں نے جنوبی چلی کی سرزمین سے متصل جزیرہ نما (Taltao Peninsula) کا نظارہ کیا۔ میگلن کو کٹے پھٹے ساحلوں اور جھلسی ہوئی زرد گھاس کے ٹیلوں پر مشتمل اس جزیرہ نما میں کوئی کشش محسوس نہ ہوئی۔ آنے والے دنوں میں موسم نے تیزی سے اپنا مزاج بدلا اور انہیں مشرق میں واقع سرزمین پر سبزے کی چادر بھی دکھائی دینے لگی۔ اس دوران انہوں نے خطِ استوا سے 43.30 ڈگری جنوب کے خط پر واقع ایک بڑے سرسبز جزیرے کا نظارہ کیا۔ یہ چلی کے جنوبی ساحل پر واقع چلوئی (Chiloe) کا جزیرہ تھا۔ میگلن کے ساتھیوں نے سکون کا سانس لیا جب انہیں جزیرے کے مشرقی ساحل سے متصل خلیج کروکوڈواڈو (Corcodvado) میں مقامی ماہی گیروں کی کشتیاں اِدھر اُدھر جاتی دکھائی دیں۔ وہ کئی ماہ بعد کسی انسانی آبادی

بحرالکاہل کرۂ ارض پر واقع پانچ بڑے سمندروں میں سب سے بڑا اور سب سے گہرا سمندر ہے۔ خط استوا اسے جغرافیائی لحاظ سے شمالی و جنوبی جبکہ 180 ڈگری پر کھینچی گئی بین الاقوامی تاریخی لائن مشرقی اور مغربی حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ بحرالکاہل کا کل رقبہ 169.2 ملین مربع کلومیٹر ہے۔ یہ کرۂ ارض کے کل رقبے کا 33 فی صد اور کرۂ ارض کے سمندروں کے رقبے کا 47 فی صد ہے۔ اس وسیع سمندر میں پانی کے ذخیرے کا اندازہ 679 6 ملین کیوبک کلومیٹر ہے۔ شمال میں بیرنگ اسٹریٹ سے لے کر جنوب میں بحر جنوبی تک بحرالکاہل کی کل لمبائی 15 ہزار کلومیٹر (9320 میل) جبکہ مشرق میں کولمبیا سے لے کر مغرب میں جزیرہ نما ملاکا تک درمیانی حصے کی چوڑائی 20 ہزار کلومیٹر (12427 میل) ہے۔ بحرالکاہل کے شمال میں بیرنگ اسٹریٹ کے پار بحر منجمد شمالی، جنوب میں 60 ڈگری کے دائرے پر بحر جنوبی، مشرق میں براعظم شمالی و جنوبی امریکا جبکہ مغرب میں ایشیا اور آسٹریلیا واقع ہیں۔ بحر منجمد شمالی اور بحر جنوبی کے علاوہ مشرق میں نہر پانامہ کے راستے یہ بحر اوقیانوس سے ملتا ہے تو مغرب میں آبنائے ملاکا، آبنائے سنڈا اور بحیرہ تسمانیہ کے ذریعے بحر ہند سے اس کا سنگم ہوتا ہے۔

بحرالکاہل کے ذیلی سمندروں کی تعداد بیس کے قریب ہے۔ ان میں خلیج پانامہ، خلیج الاسکا، بحیرہ بیرنگ، بحیرہ اوکھوٹسک، بحیرہ جاپان، بحیرہ چین، بحیرہ فلپائن، خلیج تھائی لینڈ، بحیرہ مولوکا، بحیرہ سولا، بحیرہ سولاویسی، بحیرہ باندا، بحیرہ کورل اور بحیرہ تسمانیہ نمایاں ہیں۔ بحرالکاہل کے مغربی حصے میں بحیرہ فلپائن کی حدود میں کرۂ ارض کا سب سے گہرا مقام ماریانا ٹرینچ (Manana Trench) واقع ہے جس کی گہرائی 36 ہزار 1 سو 98 فٹ (11033 میٹر) ہے۔ بحرالکاہل کے طول و عرض میں پھیلے ان جزائر کی تعداد تیس ہزار کے قریب ہے جو کرۂ ارض پر واقع کل جزائر (چالیس ہزار) کا 75 فی صد ہے۔ ان جزائر میں ہوائی، گلاپاگوس، جاپان، گوام، شمالی ماریانا، فلپائن، نیوگنی، نیوزی لینڈ اور اوشنیا کے جزائر قابل ذکر ہیں۔ اوشنیا کے جزائر بحرالکاہل میں واقع جزائر کا 90 فی صد ہیں۔ اوشنیا کے جزائر کو تین ذیلی انتظامی حصوں مائیکرونیشیا (Micronesia)، میلے نیشیا (Melanesia) اور پولی نیشیا (Polynesia) میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان تینوں حصوں میں واقع اہم جزائر میں ایسٹر، فرنچ پولی نیشیا، مارکوئس، سوسائٹی، تاہیتی، ٹونگا، کیرولائن، لائن، کیریباتی، مارشل، فجی، وینواتو، پاپوا، ٹونگا، سولومن، کیلیڈونیا، ٹوکیلو، مائیکرونیشیا کی وفاقی ریاست کے جزائر، گوام اور شمالی ماریانا شامل ہیں۔ بحرالکاہل کے جزائر میں پیدا ہونے والے اہم قدرتی وسائل میں جست، لوہا، بکسائٹ، نکل اور خام تیل نمایاں ہیں جبکہ یہاں کی اہم زراعت ناریل، کیلا، آلو، چاول اور متعدد اقسام کے پھلوں اور سبزیوں پر مشتمل ہے۔ اوشنیائی جزائر اپنے خوبصورت قدرتی ماحول، سرسبز مناظر اور حسین ساحلوں کی وجہ سے دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے کشش رکھتے ہیں۔

تاریخ میں پہلی بار بحرالکاہل میں سفر کرنے کے شواہد 20 ہزار سال پہلے ملتے ہیں جب مشرقی سائبیریائی باشندوں نے جمے ہوئے بحیرہ بیرنگ کو پار کرکے شمالی امریکا میں قدم رکھا۔ اس پہلی انسانی ہجرت کے بعد تقریباً پانچ سے دس ہزار سال کے درمیانی عرصے میں ملین ماہی گیروں نے اوشنیا کے جزائر اور ایک ہزار سال پہلے اوشنیائی ماہی گیروں نے وسطی بحرالکاہل میں سفر کرتے ہوئے ہوائی کے جزائر تک رسائی حاصل کی۔ 15 ویں صدی کے آخر تک یورپی اقوام بحرالکاہل کو بحر اوقیانوس ہی کا حصہ سمجھتی تھیں۔ 1492ء میں کولمبس کے ہاتھوں امریکا کی دریافت کے بعد یورپین کو پہلی بار نئے براعظم کے مغرب میں واقع بحرالکاہل کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ 1494ء میں پرتگال اور اسپین کے مابین دنیا کی تقسیم کے معاہدے کے بعد ہسپانوی حکومت نے امریکا کو پار کرکے مغربی بحر تک رسائی کی کوششوں کا آغاز کیا۔

کے قریب تھے۔

"خلیج کے اندر چلو۔" میگلن نے ملاحوں کو حکم دیا۔

مقامی ماہی گیروں کے لیے بادبانی بحری جہازوں کا نظارہ حیران کن تھا۔ وہ اپنی کشتیاں ان کے قریب لے آئے اور سفید فام یورپین کو دیکھ کر چیخنے چلانے لگے۔ میگلن کے ٹی ہوئچی راہنماؤں نے بتایا کہ وہ ان کی مقامی بندرگاہ تک راہنمائی کررہے تھے۔ تینوں ہسپانوی جہاز مقامی کشتیوں کے پیچھے چلتے ہوئے چلوئی کے جنوبی حصے میں واقع ایک آباد علاقے کے قریب پہنچے۔ چار دسمبر 1520ء کی صبح ہسپانوی بیڑے نے ٹھیک اس مقام پر لنگر گرائے جہاں آج کوئے لون ویجو (Quellon Viejo) نام کی چھوٹی سی بندرگاہ واقع ہے۔ میگلن نے بہ طور پہلے یورپین کے چلی کی سرزمین پر قدم رکھا اور اسے اسپین کا علاقہ قرار دیا۔

☆☆☆

میگلن کے ساتھیوں کے بندرگاہ میں اترتے ہی مقامیوں کی ایک بھیڑ ان کے گرد جمع ہوگئی۔ اس بھیڑ میں نوجوان، بچے بوڑھے اور عورتیں بھی شامل تھے۔ بیشتر لوگوں نے جانوروں کی کھالوں اور بھیڑوں کی اون سے بنے ایسے لباس پہنے ہوئے تھے جن میں ستر پوشی کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ میگلن نے پایا کہ برازیلین گورانیوں کی نسبت یہ لوگ قدرے صحت مند تھے اور ان کی رنگت سفیدی مائل تھی۔ مقامی لوگ سفید فاموں کو اپنے درمیان دیکھ کر حیران تھے۔ وہ یورپین کے لباس، پیروں میں پہنے چمڑے کے جوتوں اور کندھوں سے لٹکی بندوقوں کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

"ان کے ساتھ اپنا رویہ دوستانہ رکھنا۔" میگلن نے مقامی مردوں کے لباس میں نمایاں طور پر اڑسے ہوئے لمبے پھل والے خنجر نما ہتھیاروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"دوستو... یہ آپ کے لیے ہیں۔" سیرانو نے ہاتھ میں پکڑے کچھ خشک بسکٹ مقامیوں کی طرف بڑھاتے ہوئے انہیں کھانے کی ترغیب دی۔ چند ایک نے ہاتھ بڑھا کر بسکٹ لے لیے اور بڑی دلچسپی سے انہیں الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ایک دو نے یورپین کی تقلید میں انہیں منہ میں لے کر چبایا۔ میٹھے خستہ بسکٹ کھا کر ان کے چہروں پر چھایا تناؤ چھٹ گیا۔ انہوں نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے یورپین کی طرف لالچ بھری نظروں سے دیکھا۔ موقع مناسب دیکھ کر میگلن کے ساتھ آئے ٹی ہوئچی راہنماؤں نے مجمع کو مخاطب کرکے اعلان کیا کہ یورپین ان کے دوست ہیں اور یہاں تجارت کی غرض سے آئے ہیں۔ اس دوران میگلن نے اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں پیوست کرکے مقامیوں سے دوستی کرنے کا اعلان کیا۔ اس نے اپنے لباس سے نکال کر کچھ اور بسکٹ ان کی طرف بڑھائے جس کے بعد مقامی خوش دکھائی دینے لگے۔ اگلے

چند گھنٹوں کے دوران ہسپانوی ملاحوں نے بندرگاہ میں اپنا کیمپ قائم کرلیا تھا۔ میگلن نے مسلح سپاہیوں کے ایک دستے کو وہاں نگرانی پر چھوڑا اور خود اپنے جہاز رانوں کو لے کر شہر کے گشت پر روانہ ہوگیا۔

شمالاً جنوباً 180 کلومیٹر لمبا اور شرقاً غرباً 50 کلومیٹر چوڑا چلوئی کا جزیرہ گھنے برساتی جنگلوں، سرسبز ٹیلوں اور گھاس کی وسیع و عریض وادیوں پر مشتمل ہے۔ جزیرے پر چھوٹے ندی نالوں، دریاؤں اور میٹھے پانی کی درجنوں جھیلیں واقع ہیں۔ یہ چلی میں شامل رہنے کے لحاظ سے سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ آج جزیرے کی کل آبادی پندرہ لاکھ (2010) ہے لیکن میگلن کی آمد کے وقت آبادی کا اندازہ پچاس ہزار نفوس کے قریب تھا۔ یہ ایک گنجان آباد شہر تھا۔ آبادی کے بیچوں بیچ سانپ کی طرح بل کھاتی ایک کچی سڑک کے دونوں جانب جھونپڑی نما دکانوں، چبوتروں اور کھلی جگہوں پر گندم، مکئی اور آلو کے ڈھیر رکھے دکھائی دے رہے تھے۔ پھلوں اور سبزیوں کی دکانوں پر ہرے رنگ کے لمبے لمبے کیلوں کے گچھے سب سے نمایاں تھے۔ کچھ دکانوں سے ملحق چھوٹے چھوٹے باڑوں میں بھیڑیں بندھی دکھائی دے رہی تھیں جبکہ دکانوں پر ان کے تازہ گوشت کے ساتھ ساتھ بڑی جسامت کی مچھلیاں بھی فروخت ہورہی تھیں۔ میگلن نے چند ایک دکانوں پر مچھلی پکڑنے کے جال، رسے، بانس اور جانوروں کی کھالیں بھی فروخت ہوتے دیکھے۔

یورپین کی بندرگاہ میں آمد کی خبریں پورے شہر میں پھیل چکی تھیں۔ میگلن اور اس کے ساتھیوں کو بازار میں گھومتے پھرتے دیکھ کر وہاں بھی عوام کا جم غفیر ان کے آگے پیچھے چل رہا تھا۔ اس مجمع میں موجود تقریباً ہر مرد نے زیر ناف لمبے پھل والے چاقو لٹکا رکھے تھے اور ان کے ہاتھوں میں نیزے نما لاٹھیاں تھیں جن کے سرے کسی نوکیلی دھات کے بنے ہوئے تھے۔ بیشتر مردوں کے چہروں اور جسم پر رنگین نقش و نگار بنے ہوئے تھے جبکہ چند ایک نے اپنی مردانگی دکھانے کے لیے ناک کے آرپار تیز دھار باریک لکڑی کی لمبی لمبی تیلیاں بھی اڑس رکھی تھیں۔ عورتوں نے سونے چاندی اور دیگر دھاتوں سے ڈھالے گئے بھاری زیور پہن رکھے تھے۔ یہاں کی عورتیں دراز قد، خوبصورت اور جنسی کشش رکھتی تھیں۔ میگلن نے اپنے کچھ ساتھیوں کو ان عورتوں کی طرف گھورتا پا کر انہیں محتاط رہنے کی ہدایت کی۔ ہسپانوی ملاحوں کو مختلف اشیا میں دلچسپی لیتا دیکھ کر مقامی دکاندار چیخ چلا کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ لوگ اشیا کے بدلے اشیا کی تجارت سے واقف تھے اور سفید فاموں کے حلیے میں انہیں بڑے خریداروں کی جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ہر دکاندار کی کوشش تھی کہ غیرملکی اس کے پاس رک کر خریداری کریں۔ میگلن نے چند ایک دکانوں پر رک کر آو

اور مکئی خریدنے کے لیے بھاؤ تاؤ کیا۔ اس نے دکانداروں کو اپنے ساتھ لائے کچھ چینی کے برتن اور کپڑے کے تھان دکھائے۔ چمکتا دمکتا اعلیٰ ریشمی کپڑا اور چینی کے جاذبِ نظر ظروف دیکھ کر مقامیوں کی باچھیں کھل گئیں۔ انہوں نے یورپین کے ساتھ تجارت پر رضامندی ظاہر کی۔ تاہم میگلن نے کسی بڑے لین دین کی بجائے فی الحال کچھ گوشت، انڈوں، پنیر، زندہ مرغیوں، کیلوں اور کالے انگور سے کشید کی گئی شراب کی خریداری کی۔ بازار میں سیر سپاٹے اور سامان خریدنے کے بعد یہ لوگ واپس بندرگاہ پہنچے۔ رات کے کھانے کی تیاری کے دوران میگلن نے تینوں بحری جہازوں کا باریک بینی سے معائنہ کیا اور ان کی مرمت وغیرہ سے متعلق ہدایات دیں۔

چلوئی میں موسم ٹھنڈا لیکن قدرے خوشگوار تھا۔ میگلن اگلے ایک ہفتے تک اس جزیرے پر رکا رہا۔ اس دوران اس نے خوب مول تول کر کے مقامی بازار سے کئی من آلو، مکئی، پرندوں کا گوشت، انڈے، شراب، ناریل کے تیل، مچھلی کے تیل، ہرن کے، پیٹ کے علاج کے لیے جڑی بوٹیوں اور دودرجن کے قریب زندہ بھیڑوں کی خریداری کی۔ اس نے خشک میوہ جات کے حصول کے لیے چلوئی کے 50 کلومیٹر مشرق میں چلی کی مرکزی سرزمین پر واقع ایک چھوٹی سی بندرگاہ چےٹن (Chaiten) کا بھی مختصر دورہ کیا۔ خوراک اور دیگر سامانِ رسد ذخیرہ کر لینے کے بعد میگلن نے مقامی ماہی گیروں سے بحرالکاہل کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ مقامیوں نے اسے بتایا کہ چلوئی کے شمال میں ایک ہفتے کی مسافت پر چند چھوٹے چھوٹے غیر آباد جزائر واقع تھے اور ان کی پہنچ بس انہی جزائر تک تھی۔ ان جزائر کے آگے کیا تھا وہ نہیں جانتے تھے؟ میگلن کے لالچ دینے کے باوجود کوئی بھی ماہی گیر ان کے ساتھ چلنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ وہ کھلے سمندر میں سفر کرنے سے اس حد تک خوف زدہ تھے کہ انہوں نے میگلن کو بھی اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مقامیوں کے مطابق دور مغرب میں سمندر کے بیچوں بیچ بدروحوں کا بسیرا تھا۔ آج تک جس کسی نے بھی اس سمندر کے پار جانے کی کوشش کی تھی اسے پھر دوبارہ زندہ واپس لوٹنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ یہ معلومات حوصلہ افزا نہیں تھیں۔ اب میگلن کو جو بھی منصوبہ بندی کرنی تھی اپنے بل بوتے اور سمجھ بوجھ کو مدِنظر رکھ کر کرنی تھی۔ دسمبر کے پہلے عشرے کے اختتام پر وکٹوریا کے کپتان ڈورٹے باربوسا اور کون سیپ سیون کے کپتان سیرانو نے میگلن کو روانگی کی تیاریاں مکمل ہونے کی اطلاع دی۔ میگلن نے ان تیاریوں کا جائزہ لینے کے دوران پایا کہ اگر حالات موافق رہے تو وہ آنے والے دو ماہ تک کھلے سمندر کی سختیاں جھیل سکتے تھے۔ خوراک کے معائنے کے بعد میگلن نے اسپنی اوسا کی مدد سے چند تجربہ کار مقامی ماہی گیروں کو دھوکے سے ڈبلی ڈاڈ پر بلا کر گرفتار کر لیا۔ اس نے انہیں مجبور کیا کہ اگر وہ اپنی سلامتی چاہتے ہیں تو ان کی بحرالکاہل میں راہنمائی کریں۔

یہ چلوئی میں ہسپانوی ملاحوں کی آخری رات تھی۔ تمام ملاحوں نے مل کر کھانا کھایا۔ میگلن نے اپنے ساتھیوں کے عزم و حوصلے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے بحرالکاہل تک رسائی حاصل کر کے ایک اہم سنگ میل عبور کر لیا تھا اور اب انہیں مہم کے دوسرے مرحلے میں اس سمندر کو پار کر کے مہم کو کامیابی سے ہمکنار کرنا تھا۔

"ہم اس وقت جنوبی نصف کرے میں خطِ استواء سے 40 سے 45 ڈگری جنوب کے خط پر موجود ہیں۔ جبکہ ہماری منزل یہاں سے ٹھیک شمال مغرب میں عین خطِ استواء پر واقع ہے۔" میگلن نے ساحل کی نم زمین پر بحرالکاہل کا ممکنہ نقشہ بنا کر چلی اور ملوکا کے جزائر کے مقام کو واضح کیا۔ "چونکہ بحرالکاہل کے کھلے حصے تک رسائی حاصل کرنے والے ہم پہلے لوگ ہیں اس لیے ہم اس سمندر کی وسعت کے بارے میں درست اندازہ نہیں لگا سکتے۔ ہوسکتا ہے کولمبس کے جہازوں کی طرح اس وسیع سمندر کے بیچوں بیچ واقع کوئی نیا براعظم ہمارا راستہ روک لے یا پھر ملوکا تک پہنچتے پہنچتے ہمیں خشک زمین ہی دکھائی نہ دے۔ اسپین سے لے کر یہاں تک ہم جنوبی امریکا کی ساحلی لکیر کا سہارا لے کر آگے بڑھتے رہے ہیں۔ لیکن اب ہمیں کھلے سمندر میں بغیر کسی سہارے کے محض اپنی سمجھ بوجھ کو بروئے کار لا کر آگے بڑھنا ہوگا۔ ہم آنے والے ایک ہفتے تک شمال میں سفر کرتے ہوئے سمندر کے معتدل حصے تک رسائی حاصل کریں گے اور پھر شمال مغرب کی طرف سفر کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھیں گے۔"

میگلن نے اپنے جہازرانوں پر واضح کیا کہ خطِ استواء پر موسم گرم ہوگا، وہاں پانی کی طلب میں اضافہ فطری بات ہے۔ اس لیے وہ اپنے اپنے بحری جہاز پر پانی کے استعمال میں احتیاط کریں اور دورانِ سفر ہونے والی بارش کے ایک ایک قطرے کو محفوظ رکھنے کا انتظام کر لیں۔ اس نے دوٹوک انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ انہیں بھوک پیاس اور بیماری سمیت ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے

خود کو تیار کر لینا چاہیے کیونکہ صورتِ حال کتنی بھی بدتر ہو جائے خوراک اور پانی کے کوٹے پر عملدرآمد یقینی بنایا جائے گا۔

گیارہ دسمبر 1520ء کے دن فرڈی نینڈ میگلن کی قیادت میں ہسپانوی بیڑے نے چلی سے لنگر اٹھائے اور مغرب میں دکھائی دے رہے بحرالکاہل کی طرف بڑھنے لگا۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں کھلے سمندر تک رسائی کے بعد میگلن نے بحری جہازوں کا رخ موڑ دیا۔ اب وہ چلی کے مغربی ساحل سے سو کلومیٹر کی دوری بناتے ہوئے شمال کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اگلے چند دن تک سب کچھ معمول کے مطابق رہا۔ یہاں تک کہ وسط دسمبر میں میگلن کو دور مغرب میں دو چھوٹے جزائر کی دھندلی سی شبیہ دکھائی دے گئی۔ یہ خطِ استواء سے 33 ڈگری جنوب اور 80 ڈگری مغرب پر واقع جوآن فرنانڈز کے جزائر تھے۔ میگلن نے ان کی طرف بڑھنے کی بجائے اس مقام پر اپنے جہازوں کا رخ شمال مغرب کی طرف کر دیا۔ قارئین کی معلومات کے لیے بتاتے چلیں کہ ہسپانوی مہم جُو، جوآن فرنانڈز نے 1563ء میں ان جزائر میں قدم رکھا۔ انہیں اپنا نام دیا اور یہاں اسپین کا پرچم لہرایا۔

کرسمس کے دن تک ہسپانوی بیڑے نے بحرالکاہل میں لگ بھگ تین ہزار کلومیٹر کا سفر طے کر لیا تھا۔ اب وہ خطِ استواء سے 25 ڈگری جنوب اور 90 ڈگری مغرب کے خط پر ایک ایسے علاقے میں موجود تھے جہاں نہ صرف موسم بلکہ مغرب کی طرف چل رہی تیز تجارتی ہوائیں بھی سفر کے لیے موافق تھیں۔ میگلن نے مغربی ہواؤں سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور جہازوں کا رخ شمال مغرب کی بجائے سیدھا مغرب کی طرف کر دیا۔ اس دوران کرسمس کی مناسبت سے بحری جہازوں پر خصوصی دعائیہ تقریبات منعقد کی گئیں اور محدود پیمانے پر ملاحوں کی ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ پُرسکون سمندر، سہانا موسم اور جوشیلے ملاحوں کا ساتھ۔ فی الحال میگلن کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ دسمبر کے آخر تک وہ 8 کلومیٹر (4.32 ناٹ) فی گھنٹے کی رفتار سے سفر کرتا ہوا جنوب مشرقی بحرالکاہل میں 100 ڈگری مغرب کے خط پر پہنچ چکا تھا۔

جنوری 1521ء کی شروعات میں میگلن کے بحری جہاز، ایسٹر (Easter) جزیرے کے 240 کلومیٹر شمال سے گزرے۔ اتنی دور سے 24 کلومیٹر لمبے اور 10 کلومیٹر چوڑے اس تکونی جزیرے کو دیکھنا ممکن نہ تھا ورنہ وہ لوگ یہاں ضرور قیام کرتے۔ 10 جنوری کی رات صاف آسمان پر تاروں کی اشکال کا مشاہدہ کرنے کے بعد ماہر فلکیات آندریس ڈی سان مارٹن نے اعلان کیا کہ وہ 120 ڈگری مغرب کے خط پر خطِ جدی عبور کر رہے ہیں۔ یہاں میگلن نے ایک بار پھر اپنے رخ میں تبدیلی کی اور بیڑے کا رخ مغرب کی بجائے شمال مغرب کی طرف کر دیا۔ اس نے چلی سے لے کر اب تک مجموعی طور پر 6 ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا تھا اور اب اس کی اگلی منزل بحرالکاہل کا وسطی حصہ تھی۔

اس مقام پر ملاحوں کو پہلی بار بحرالکاہل کی وسعت کا اندازہ ہوا۔ تاحدِ نظر تک سوائے پانی کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وسیع و عریض سمندر میں وہ ایک دم اکیلے تھے اور انہیں اپنی ہستی کے ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ چلوئی کے ماہی گیر اس بحرِ بے کراں میں سفر کرنے سے کیوں خوفزدہ تھے؟ خطِ جدی عبور کرتے ہی موسم نے بھی تیور بدل لیے اور اب ہر گزرتے دن کے ساتھ درجہ حرارت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ خاص کر دوپہر کے چند گھنٹوں کے دوران اچھا خاصا حبس محسوس ہوتا تھا۔ تاہم شام کے وقت جوں جوں سورج ڈھلتا جاتا تھا، جنوب کی طرف سے چلنے والی ٹھنڈی ہوائیں ماحول کو خنک بنا دیتی تھیں۔ بحری جہازوں کے کھلے حصوں میں ذمہ داریاں انجام دے رہے ملاحوں کی مشقت میں اضافہ ہو گیا تھا اور وہ ہر وقت پسینے میں شرابور رہنے لگے تھے۔ پچھلے تین ہفتوں کے دوران ہر دوسرے تیسرے دن کھل کر بارش ہوتی رہی تھی اور پانی کی کمی مسئلہ نہیں بنی تھی۔ لیکن جنوری کے دوسرے عشرے کے دوران بارشوں میں کمی اور گرم مرطوب موسم کی وجہ سے پانی کی طلب میں اضافہ ہو گیا۔ پانی کا ذخیرہ کم ہوتا دیکھ کر میگلن کی فکر بڑھنے لگی۔ اس کا عملہ قرب و جوار پر نظر رکھے ہوئے تھا لیکن انہیں ابھی تک کوئی جزیرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے جھلسا دینے والی گرمی اور نمی اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ اس دوران تینوں بحری جہازوں پر موجود تمام زندہ جانور ذبح کیے جا چکے تھے۔ اب میگلن کے پاس خشک خوراک کے نام پر آلو، چاول، مکئی اور بسکٹ ہی باقی بچے تھے۔ خوراک کے کوٹے پر سختی سے عمل درآمد کیا جا رہا تھا۔ ہر ملاح کو صبح ناشتے میں چند بسکٹ، دوپہر کے بعد مکئی کے ایک مٹھی دانوں کے ساتھ تھوڑے سے ابلے ہوئے چاول اور پھر غروبِ آفتاب کے بعد ابلے ہوئے آلوؤں کے ساتھ پینے کے لیے چند گھونٹ شراب دی جا رہی تھی۔ گو کہ مچھلی کے شکاری اپنا شغل بھی جاری رکھے ہوئے تھے لیکن امید واروں کے مقابلے میں پکڑی جانے والی

جنوبی امریکا کے مغربی ساحل پر 4 ہزار 5 سو کلومیٹر لمبی اور اوسطاً 170 کلومیٹر چوڑی لکیر پر مشتمل، چلی کا کل زمینی رقبہ 7 لاکھ 56 ہزار 6 سو 26 مربع کلومیٹر جبکہ موجودہ آبادی ایک کروڑ ستر لاکھ (2010ء تک) کے قریب ہے۔ چلی کے مشرق میں ارجنٹائن، شمال مشرق میں بولیویا، شمال میں پیرو، جنوب میں بحرِ جنوبی اور مغرب میں بحر الکاہل واقع ہے۔ ملک کا دار الحکومت، سب سے بڑا شہر اور بندرگاہ سان تیاگو ہے جو شمالاً جنوباً پھیلی مملکت کے تقریباً درمیان میں واقع ہے۔ پورے ملک کی مجموعی آبادی کا ایک تہائی اسی شہر میں رہتا ہے۔ چلی ایک پہاڑی ملک ہے۔ ملک کا شمالی حصہ اٹاکاما کے خشک اور سنگلاخ پہاڑی سلسلوں پر مشتمل ہے۔ وسطی حصہ گھنے برساتی درختوں سے اٹے سرسبز پہاڑی ٹیلوں اور زرخیز میدانوں پر مشتمل ہے۔ یہ چلی کا واحد علاقہ ہے کہ جہاں کی زمین زراعت کے قابل ہے۔ پیٹاگونیا کی سرحد سے متصل چلی کا جنوبی علاقہ انڈیز کے بلند سلسلۂ کوہ پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے میں ارجنٹائن کی سرحد کے قریب واقع پہاڑ اوجوس ڈیل سلاڈو چلی کا سب سے اونچا مقام ہے جس کی بلندی 22572 فٹ ہے۔ جنوبی امریکا کی ٹیل پر مشتمل چلی کا انتہائی جنوبی حصہ برف سے ڈھکے ویران بنجر علاقوں پر مشتمل میگلن اینڈ انٹارکٹک ریجن کا حصہ ہے۔

سطحِ زمین کی طرح چلی کی آب و ہوا کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ شمالی حصے کا سالانہ اوسط درجۂ حرارت 18 سے 23 سینٹی گریڈ، وسطی حصے کا 12 سے 29 اور جنوبی حصے کا سالانہ اوسط درجۂ حرارت 7 ڈگری سینٹی گریڈ تک رہتا ہے۔ چلی میں مئی سے اگست کے درمیان موسم سرما اور ستمبر سے اپریل کے دوران موسم گرما ہوتا ہے۔ طویل ساحلی پٹی اور بحر الکاہل سے قربت کی بنا پر یہاں کی سردیاں معتدل جبکہ گرمیوں کے دوران موسم خوشگوار رہتا ہے۔ یہاں بارش کی اوسط 350 ملی میٹر سالانہ ہے۔ چلی کی کم چوڑی پٹی کی وجہ سے یہاں بہنے والے تمام دریاؤں کی اوسط لمبائی 300 کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے۔ ملک کے طول و عرض میں بہنے والے دریاؤں اور جھیلوں کے پانی کا ماخذ انڈیز کے سلسلۂ کوہ پر پڑنے والی برف اور ملک کے جنوبی حصے میں موجود برف کے عظیم گلیشیئرز ہیں۔ تمام دریا مشرقی پہاڑوں سے نکل کر مغرب میں بحر الکاہل میں گرتے ہیں۔ یہاں بہنے والے اہم دریاؤں میں لوآ، ایل کوئی، آسون سا گوا، بے یو، ماؤلے اور بی او بیو نمایاں ہیں۔ ان دریاؤں کے علاوہ چلی میں واقع جھیل لانکوئی ہوئی، رانکو اور لاگو جنرل کاریرا میٹھے پانی کے بڑے ذخیرے ہیں۔

چلی میں پیدا ہونے والی اہم زراعت میں گندم، مکئی، انگور، کیلے، آلو اور پھل نمایاں ہیں۔ جبکہ یہاں ملنے والی اہم معدنیات میں کاپر، لوہا، کوئلہ، تیل اور گیس قابلِ ذکر ہیں۔ چلی کے نیم صحرائی علاقوں، برساتی جنگلوں اور جنوبی پہاڑی علاقوں میں پائی جانے والی جنگلی حیات اور پیٹاگونیا میں پائے جانے والے جانوروں اور پرندوں کی اقسام تقریباً ایک جیسی ہیں۔ چلی کے طول و عرض میں 79604 کلومیٹر لمبی سڑکیں اور شمالی شہر اریکا سے جنوبی شہر پورٹ مونٹ تک بچھی 2030 کلومیٹر لمبی ریلوے لائن کے ذریعے ملک کے اہم شہر اور بندرگاہ آپس میں منسلک ہیں۔ ملک کے شمالی حصے میں 10 ہزار فٹ سے بلند پہاڑی سلسلوں میں بچھی ریل لائن کا شمار دنیا کے چند بلند ترین ٹریکس میں ہوتا ہے۔ چلی اس ٹریک کے ذریعے ہمسایہ ممالک بولیویا اور پیرو سے بھی جڑا ہوا ہے۔

میگلن کی چلی آمد کے وقت قرب و جوار کا تمام علاقہ ٹی چلی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ٹی چلی مقامی زبان میں "برف" یا برفیلے لوگ کو کہتے ہیں اور اسی لفظ سے چلی نکلا ہے۔ اس زمانے میں یہاں آراؤکے نیان (Araucanian) نسل کے لوگ آباد تھے۔ آراؤکے نیان قبائل لڑائی بھڑائی کے ماہر تھے۔ قریب سو سال پہلے انہوں نے چلوئی سمیت چلی کے بیشتر علاقوں کو پیرو سے تعلق رکھنے والے انکا قبائل سے لڑ بھڑ کر حاصل کیا تھا۔ آراؤکے نیان، شکار اور ماہی گیری کے ساتھ ساتھ آلو اور مکئی کی کاشت کیا کرتے تھے۔ یہ قبائل جنوبی امریکا کے دیگر قبائل کی طرح دیوی دیوتاؤں اور مظاہرِ قدرت کی عبادت کرتے تھے۔ چلی کی دریافت کے پندرہ سال بعد تک اسپین نے اس علاقے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ یہاں تک کہ 1535ء میں ہسپانوی بحریہ کے ایک افسر فرانسسکو پیزارو کے ہاتھوں پیرو پر قبضے کے بعد اس کی فوج کے کچھ سپاہیوں نے چلی کے نیم صحرائی شمالی علاقے کی سیاحت کی۔ 1540ء میں پیزارو نے اپنے ایک ماتحت فوجی افسر پیڈرو ڈی والڈیویا کی قیادت میں ہسپانوی فوج کو چلی پر باقاعدہ قبضے کے لیے روانہ کیا۔ والڈیویا کی فوج نے 1541ء میں چلی کے دار الحکومت سان تیاگو کو دریافت کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ ہسپانوی فوج نے وہاں اپنا فوجی اڈا قائم کیا جس کے بعد 1553ء تک پورا ملک ہسپانوی کنٹرول میں آ گیا تھا۔ جنوبی امریکا کے بیشتر علاقوں کی طرح یہاں بھی اگلی تین صدیوں تک ہسپانوی راج قائم رہا۔ یہاں تک کہ 18 ستمبر 1810ء کو چلی نے اسپین سے آزادی حاصل کر لی۔

سمندری مخلوق کا معاملہ اونٹ کے منہ میں زیرے کے مترادف ہی تھا۔

جنوری کے تیسرے عشرے کے آغاز پر ہسپانوی بحری جہاز وسطی بحر الکاہل میں خطِ استواء سے 15 ڈگری جنوب اور 135 ڈگری مغرب کے خطے پر فرنچ پولی نیشیا کی حدود میں داخل ہوئے۔ وہ جزائر مارکوئس کے جنوب اور جزائر سوسائٹی کے شمال سے ہو کر شمال مغرب میں خطِ استواء کی طرف بڑھنے لگے۔ بدقسمتی سے جہازوں کا عملہ اپنے قرب و جوار میں پھیلے سیکڑوں سرسبز جزائر میں سے کسی ایک کو بھی نہیں دیکھ پایا۔ البتہ اس دوران انہوں نے سطحِ سمندر سے ابھری گھونگے کی چند چٹانوں کا نظارہ ضرور کیا۔ چند میٹر لمبی چوڑی ان چٹانوں پر گلابی رنگ کے بڑے بڑے کیکڑوں کو کلبلاتے دیکھا جا سکتا تھا۔ میگلن کی ہدایت پر ملاحوں کے ایک گروپ نے دو سے تین گھنٹوں کی محنت کے بعد کئی درجن کیکڑوں کا شکار کیا۔ اب جوں جوں وہ لوگ خطِ استواء سے قریب ہو رہے تھے درجہ حرارت میں بتدریج اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ہر وقت پسینے میں شرابور رہنے کی وجہ سے پانی کی طلب کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ اس دوران ملاحوں کی پریشانیاں دو چند ہو گئیں جب کم ہوتے پانی کے ذخیرے کے ساتھ ساتھ اچانک ہی جیسے بادل بھی برسنا بھول گئے۔ تقریباً ایک ہفتہ پہلے ہوئی موسلا دھار بارش کے بعد سے اب تک آسمان سے ایک بوند بھی نہیں برسی تھی۔ ہر روز دوپہر کے شدید حبس کے بعد یہ تماشا ہو رہا تھا کہ جنوب کی طرف سے اڈلی سرمئی گھٹائیں آسمان پر چھا جاتیں۔ پیاس سے نڈھال ملاح امید بھری نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتے لیکن سوائے ہلکی بوندا باندی کے کچھ نہیں ہوتا۔ گہرے بادل برسنے سے پہلے ہی منتشر ہو جاتے اور ملاحوں کی امیدیں دم توڑ جاتیں۔ میگلن کی طرف سے ہر ملاح کے لیے پانی کا کوٹا مقرر کیے جانے کے بعد صورتِ حال مزید ابتر ہو گئی اور تینوں بحری جہازوں پر پانی پانی کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ جہازوں کا عملہ دہری مصیبت کا شکار تھا۔ پیاس کی شدت کے ساتھ گرم اور کھارے پانی کی مسلسل بوچھاڑ سے ان کی جلد جھلسنے لگی تھی۔ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ابلتے ہوئے کھارے پانی کے کڑھائے میں سفر کر رہے ہوں۔ آج انہیں احساس ہو رہا تھا کہ سمندر بھی کتنا بے رحم ہو سکتا

تھا۔ میگلن نے خارش سے بچنے کے لیے ملاحوں کو اپنے جسموں پر ناریل کا تیل ملنے کی ہدایت کی۔ ناریل کے تیل سے انہیں کچھ سکون ضرور ملا لیکن پانی کی کمی کا علاج کسی کے پاس نہیں تھا۔ محض دو سے تین دن کے اندر ہی صورتِ حال اس حد تک گمبھیر ہو گئی کہ تین درجن سے زیادہ ملاح جسم میں پانی اور نمکیات کی کمی (Dehydration) کا شکار ہو گئے۔ رہی سہی کسر خوراک کے مقررہ کوٹے نے پوری کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے۔ ان کی پسلیاں نکل آئیں، پیٹ پھول گئے اور مستقل متلی ہونے اور چکر آنے کی وجہ سے وہ لوگ ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھے۔ بھوک، پیاس، بیماری اور دن رات لہروں کے تھپیڑے سہنے کے بعد زندہ رہنے کی خواہش کمزور پڑنے لگی۔ بیماروں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور پانی کی کمی انہیں موت کی طرف کھینچنے لگی۔

استوائی خطے میں نمی زیادہ ہونے کی وجہ سے پسینا زیادہ آتا ہے اور یہاں ایک آدمی کو چاق چوبند رہنے کے لیے چوبیس گھنٹوں کے دوران کم از کم سات سے دس لیٹر پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں بنا کھائے دو ہفتے تک زندہ رہا جا سکتا ہے لیکن بغیر پانی کے دو دن بھی نہیں۔ تاہم صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میگلن اور اس کے ساتھیوں کے لیے وہاں فی کس صرف دو لیٹر پانی ہی دستیاب تھا۔ میگلن کو پندرہ سال پہلے ہندوستان کا پہلا سمندری سفر یاد آ رہا تھا جب وہ اور اس کے ساتھی جنوبی بحرِ اوقیانوس میں کچھ اسی قسم کی صورتِ حال سے دوچار تھے۔ تجربہ کار میگلن جانتا تھا کہ کھارے پانی کے اس جہنم میں تازہ پانی کا ایک ہی نعم البدل تھا اور وہ تھا پیشاب۔۔۔

اب یہاں وہی زندہ رہتا جو انتہائی حد تک جا سکتا تھا۔ حالات بگڑتے دیکھ کر تینوں بحری جہازوں کے کپتانوں کی طرف سے اپنے عملے کو ہدایت دی گئی کہ وہ اپنا پیشاب ضائع کرنے کی بجائے اسے تازہ پینے کی عادت ڈالیں۔

پیشاب میں 95 فیصد پانی اور باقی نمکیات ہوتے ہیں۔ جان بچانے کے لیے اس کا تازہ استعمال بہتر ہوتا ہے۔ اگر اسے کچھ دیر تک یونہی جمع رکھا جائے تو پھر اس میں مہلک جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں جو کسی کمزور انسان کی جان بھی لے سکتے ہیں۔ ملاحوں کے سامنے تازے پیشاب کی خصوصیات گنوانے کے بعد میگلن نے ہاتھ میں پکڑے

پیالے کو منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں اسے اپنے معدے میں اتار لیا۔ پیگا فی ٹا کے مطابق ملاحوں کی اکثریت نے میگلن کی ہدایات پر عمل کیا۔ تاہم کچھ ایسے بھی تھے کہ جنہیں اپنا پیشاب پیتے ہوئے کراہت محسوس ہوئی۔ انہوں نے اسے فوری طور پر حلق سے اتارنے کی بجائے جمع کرلیا اور یہی ان کی غلطی تھی۔ کچھ گھنٹے بعد پیاس سے نڈھال ہو کر جب انہوں نے نمکیات بھرے اس بیلے محلول کو پیا تو ان کے معدے اسے برداشت نہیں کر پائے۔ چند ہی گھنٹوں میں انہیں پیٹ میں شدید مروڑ اٹھنے کے بعد پیچش لگ گئی۔ مجبور ہو کر کچھ لوگوں نے سمندر کے نمکین پانی سے حلق تر کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں انہیں قے لگ گئی۔

بگڑتے حالات میں ملاحوں کو چوبیس گھنٹوں میں تین بار پینے کے لیے تازے پانی کے چند گھونٹ دیے جا رہے تھے۔ ہر روز منہ اندھیرے اور غروب آفتاب کے وقت پانی کی تقسیم کا معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہو جاتا تھا۔ تاہم سہ پہر کے بعد پانی کی تقسیم پر جھگڑا روز کا معمول بن چکا تھا۔ پیاس سے نڈھال ملاحوں کے درمیان پانی کے چند قطروں کے حصول کے لیے دھینگا مشتی اور تلخ کلامی ہوتی۔ اگر اس دوران چند قطرے پانی جہاز کے فرش پر گر جاتا تو وہ لوگ ایک دوسرے پر پل پڑتے اور خم ہوتے ہوئے فرش کو دیوانوں کی طرح چاٹتے۔

جنوری کے آخری ایام میں ہسپانوی بحری جہاز 10 ڈگری جنوب اور 145 ڈگری مغرب کے خط پر سفر کرتے ہوئے بحرالکاہل کے وسطی حصے میں بین الاقوامی تاریخی لائن (International Date Line) کے مشرقی خم کے قریب پہنچ گئے تھے۔ وہ پچھلے ڈیڑھ ماہ کے مسلسل سفر کے دوران اوسطاً 9 کلومیٹر فی گھنٹے (4.86 ناٹ) کی رفتار پر سفر کرتے ہوئے 10 ہزار کلومیٹر کا طویل فاصلہ طے کر چکے تھے اور اب تک انہیں کوئی بڑا جزیرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ خشک زمین دیکھنے کی آس میں ملاحوں کی امیدیں دم توڑ رہی تھیں لیکن وہاں سوائے اچھلتے پانی کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اس دن صبح ہی سے آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ملاح پوری طرح گیلے، بھوکے اور تھکے ہوئے تھے۔ ہوا بند تھی اور دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ دوپہر تک حبس میں ناقابل برداشت اضافہ ہو گیا۔ پیاس سے حلق سوکھ کر کانٹا ہو گئے اور زبانیں باہر نکل آئیں۔ ہر کوئی امید بھری نظروں سے آسمان کو تک رہا تھا۔ انہیں قدرت سے کسی کرشمے کی امید تھی۔ لیکن آسمان تو جیسے ان کا امتحان لینے پر تلا ہوا تھا۔ اس دن سورج ڈھلنے تک نہ تو بادل متفرق ہوئے اور نہ ہی روزانہ کی طرح ہلکی بوندا باندی ہوئی... اندھیرا اچھل رہا تھا، سمندر کی لہریں پُرسکون تھیں اور ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ عملے میں کھانا تقسیم کر دیا گیا تو کچھ لوگ اونگھ رہے تھے جبکہ اکثریت اپنی آنکھوں میں امید کے دیے جلائے کچھ سننے کی کوشش کر رہی تھی کہ تب ہی ٹپ ٹپ... کی آوازیں سنائی دیں۔ اکا دکا بوندیں گرنے لگیں۔

"بارش... بارش ہو رہی ہے۔" پیاس سے بے حال کچھ ملاح اٹھ کر بیٹھ گئے۔ کیا آج بھی بس یہی چند بوندیں ان کا مقدر بننے والی تھیں؟ "یا خدا، آج کمل کر برسا دے۔"

دعا کے الفاظ جیسے حلق میں پھنس کر رہ گئے۔ ابتدا میں ہلکی بوندا باندی ہوتی رہی جیسے آسمان ان کے حال پر آنسو بہا رہا ہو۔ پھر جیسے قدرت کو ان پر رحم آ گیا۔ اچانک ہی زوردار گرج کے ساتھ آسمان کا سینہ پھٹ پڑا۔ موسلا دھار بارش شروع ہوتے ہی تینوں بحری جہازوں پر افراتفری سی مچ گئی۔ ہر کوئی دیوانہ وار جہازوں کے کھلے حصوں کی طرف لپکا۔ پانی جمع کرنے کی ڈیوٹی پر مامور عملے نے کھلے برتن سنبھالے تو پیاسے ملاحوں نے آسمان کی طرف کر کے منہ کھول دیے۔ وہ بارش کا ہر ہر قطرہ حلق سے اتار لینا چاہتے تھے۔ کئی روز کے بعد ٹھنڈا اور میٹھا پانی ان کے حلق سے نیچے اتر رہا تھا۔ اگلے ایک گھنٹے کے اندر اندر تمام کھلے برتن، کین اور بالٹیاں پانی سے لبالب بھر چکی تھیں۔ آدھی رات کے قریب بارش کا زور کچھ کم ہوا لیکن کچھ ہی دیر بعد بادلوں کی تازہ دم فوج امڈ آئی۔ میگلن سمیت کوئی ہشاش بشاش لگ رہا تھا۔

اس دوران برستی بارش میں میگلن نے ٹرینی ڈاڈ کے ایک تہ خانے میں ہرنانڈو بسٹ میٹے کی جانب سے قائم عارضی اسپتال کا دورہ کیا۔ ہرنانڈو نے میگلن کو بتایا کہ لوگ دیسی جڑی بوٹیوں اور ٹوٹکوں سے بیماروں کا علاج کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تہ خانے میں قطار در قطار بیمار اور لاغر افراد لیٹے ہوئے تھے۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے، ان کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، پسلیاں نکل آئی تھیں اور کیڑے پڑنے کی وجہ سے پیٹ پھول گئے تھے۔ بیمار افراد کمزوری کے باعث اپنی انگلی تک ہلانے

تا مر تھے۔ اُن کی بے نور ہوتی ہوئی آنکھوں میں صرف بھوک ناچتی دکھائی دے رہی تھی۔ میگلن ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ وہ زندگی اور موت کی سرحد پر موجود اپنے ان بدقسمت ساتھیوں کے لیے صرف دعا ہی کر سکتا تھا۔ میگلن نے بارش برسنے کی خوشی میں بیماروں سمیت ہر ایک ملاح کو شراب کا ایک اضافی جام پینے کی اجازت دی۔ صبح کے قریب جب تمام ملاح تھک ہار کر ادھر اُدھر لیٹے ہوئے تھے کہ تب ہی سینئر جہاز راں کاروال ہو عجلت میں میگلن کے قریب پہنچا۔

"کیا ہوا؟" میگلن جو جاگ رہا تھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ہمارے کچھ ساتھی اس دنیا میں نہیں رہے۔"

"اوہ......" میگلن کے منہ سے ایک لمبی آہ نکلی۔ وہ کچھ دیر گم صم رہا۔ "ٹھیک ہے..... تم انہیں سمندر برد کرنے کے انتظامات کرو۔"

دن نکلنے پر میگلن کو بتایا گیا کہ ٹرینی ڈاڈ پر 7 جبکہ مجموعی طور پر 11 ملاح زندگی کی بازی ہار گئے تھے۔ بحری جہازوں پر موت کی سوگواری چھائی ہوئی تھی۔ ٹرینی ڈاڈ کے کھلے حصے میں ایک قطار میں رکھے گئے اپنے ساتھیوں کے مردہ جسموں کے گرد کھڑے ملاح خاموش اور اداس تھے۔ کچھ آنکھیں اشکبار تھیں تو کچھ کے چہروں پر موت کی زردی کھنڈی صاف محسوس ہوتی تھی۔ موت پَر پھیلا رہی تھی، کون جانے کب کس کی باری آنے والی تھی؟ بارش اب بھی موسلا دھار ہو رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے آسمان بھی ان کے غم میں رو رہا تھا۔

میگلن نے نعشوں کے گرد گھیرا ڈالے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ کچھ لوگ عجیب سی نظروں سے مردہ جسموں کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کے بھوکے ساتھی کیا سوچ رہے تھے؟ میگلن نے آگے بڑھ کر باریک بینی سے مردہ جسموں کا معائنہ کیا اور یہ دیکھ کر سکون کی سانس لی کہ تمام نعشیں مکمل تھیں۔ اس نے سختی کے ساتھ اعلان کیا کہ وہ اپنے کسی بھی جہاز پر غیر انسانی حرکت کو برداشت نہیں کرے گا۔ اس نے مسلح سپاہیوں کے لیڈر اسپنی اوسا کو حکم دیا کہ وہ پورے جہاز کی تلاشی لے اور اس بات کی اچھی طرح تسلی کر لے کہ بیماروں میں کوئی مردہ ملاح تو شامل نہیں ہے؟ کچھ ہی دیر میں چھان بین مکمل ہو گئی۔ ایک پادری نے نعشوں کے قریب کھڑے ہو کر دعائیہ کلمات ادا کیے۔ میگلن سمیت سپاہیوں کے ایک دستے نے اپنے مردہ

نادر شاہ کا ایک عجیب و غریب قصہ سندھ کے قدرتی ذرائع اور ٹھٹھہ کے متعلق میرے بیان کردہ تاثرات پر روشنی ڈالے گا۔ جب وہ شہر میں پہنچا تو اس نے گورنر، میر نور محمد کو طلب کیا۔ وہ اپنی پگڑی گردن میں ڈالے اور منہ میں گھاس لیے اور پاؤں ڈھک کر (آداب نیاز مندی کے طور پر) آیا اور تخت کے سامنے سجدہ ریز ہوا تو نادر شاہ نے زور سے پوچھا ''کیا تمہارے پاس سونے کا بھرا ہوا کنواں ہے؟'' اس نے اختصار سے عاجزانہ جواب دیا کہ ''ایک نہیں بلکہ دو۔'' نادر نے پھر پوچھا ''کیا تمہارے پاس امیرانِ سندھ کا لعل ہے؟'' میر نے وہی جواب دیا۔ نادر نے اپنا رومال پھینکا اور پوچھا کہ اسے دیکھ کر اسے کیا نظر آرہا ہے؟ اس نے جواب دیا ''کچھ نہیں بلکہ فوج اور اسلحہ۔'' پھر نادر نے کہا ''اپنا سونا اور لعل لاؤ۔'' گورنر نے ایک قلی مانگا یا ایک بڑی ٹوکری جس میں غلہ اور آٹا کے لیے الگ الگ خانے ہوں۔ اسے بھر کر دائیں ہاتھ پر رکھا اور پھر بائیں پر گھی کا ایک مشکیزہ رکھا اور شاہ سے کہا ''میں ایک کاشت کار ہوں اور یہی میرا سونا اور لعل ہیں۔'' بادشاہ نے خوش ہو کر خلعت دی اور اس کے بعد میر نور محمد نے سولہ دن تک نادر شاہ اور اس کی پانچ لاکھ سے زیادہ فوج کی خاطر مدارات کی اور کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔

لیفٹیننٹ ہنری پوٹنگر کے 1816ء میں لکھے گئے ''سفرنامہ بلوچستان اور سندھ'' سے اقتباس

تلاش: اظہر جمیل صدیقی، کراچی

ساتھیوں کو سلامی دی۔ جس کے بعد ایک ایک کر کے تمام ہلاک شدگان کو سمندر کے حوالے کیا جانے لگا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میگلن نے پہلے ٹرینی ڈاڈ اور پھر ایک کشتی کے ذریعہ کون سیپ سیون اور وکٹوریا پر جا کر خوراک کے ذخیرے کا معائنہ کیا۔ اس نے پایا کہ اگر خوراک کے کوٹے میں سختی برقرار رکھی جاتی تو بہت کھینچ کھانچ کر جمع شدہ ذخیرہ ایک ماہ تک ان کے کام آسکتا تھا۔

فروری کی شروعات میں ہسپانوی بحری جہازوں نے خطِ استواء سے 8 ڈگری جنوب اور 150 ڈگری مغرب کے خط پر سفر کرتے ہوئے بین الاقوامی تاریخی لائن کے مشرقی خم کو عبور کر لیا تھا۔ اب وہ بحرالکاہل کے وسطی حصے میں واقع جزائر کیریبتی (Kiribati Islands) کی حدود میں داخل

ہو رہے تھے۔ پچھلے تین ہفتوں سے میگلن کے بحری جہاز پر منڈلاتے البٹروس کے غول اس بات کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ ان کے قرب و جوار میں خشک زمین وا[قع] تھی۔ ہر روز سورج غروب ہونے پر کچھ پرندے جہاز پر لگے اونچے بانسوں پر بیٹھے جھولتے رہتے جبکہ بیشتر مختلف سمتوں میں روانہ ہو جاتے۔ اس موقع پر بعض جہاز رانوں نے میگلن کو جزائر کی تلاش میں جنوب مغرب کی طرف جانے کی ترغیب دی۔ تاہم اس نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ میگلن نے انہیں سمجھایا کہ خطِ استواء پار کر لینے تک شمال مغرب کے اپنے مقررہ راستے کو چھوڑنے سے ان کے لیے مشکلات بڑھ سکتی تھیں۔

خوش قسمتی سے ایک ہفتہ پہلے شروع ہوئی موسلادھار بارشوں کا سلسلہ اب تک جاری تھا۔ ملاحوں کی پیاس بجھ چکی تھی لیکن اس دوران موت کا رقص بھی جاری تھا۔ تینوں بحری جہازوں پر پے در پے اموات کا ایک سلسلہ سا شروع ہو گیا تھا۔ پچھلے چند روز کے دوران کوئی وقت ایسا نہ گزرا جب میگلن کو اپنے کسی نہ کسی ساتھی کے مرنے کی خبر نہ ملی ہو۔ اب تو ہر آہٹ پر وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا اور اس کی آنکھوں میں بس ایک ہی سوال ہوتا۔ کتنے؟ کتنے؟

اب تک مرنے والوں کی کل تعداد 29 تک پہنچ چکی تھی۔ ہفتوں کے اکیلے پن اور دن رات موت کا سامنا کرتے کرتے اب اس کے ساتھی تھک چکے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ انسان نہ ہوں سمندر میں بھٹکتی روحیں ہوں۔ وہ خوف اور افسردگی کو اپنے چہروں پر سجائے موت کو اپنی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب محسوس کر رہے تھے۔ چھوڑنے کا غم ان پر حاوی تھا۔ انہیں یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ بھی بہت جلد پانی کی اس قبر کا حصہ بن کر قصۂ پارینہ بننے والے تھے۔

میگلن کا عملہ بھوک، پیاس اور موت سے لڑ رہا تھا کہ اسی دوران ایک نئی مصیبت نے ان کے جہازوں کو گھیرے میں لے لیا۔ یہ تیز سمندر کے ساتھ سفر کرتی ٹائیگر شارک (Tiger Shark) تھیں جو بے تابی سے جہازوں کا طواف کر رہی تھیں۔ قریب [دس] فٹ لمبی اور سو کلوگرام سے زیادہ وزنی ان سرمئی مچھلیوں کے درانتی جیسے تیز نوکیلے دانت صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ بحرالکاہل میں پائے جانے والے سب سے خطرناک

چالاک شکاری تھے۔ ان کا غصے بھرا غول نہ صرف میگلن کے بادبانی جہازوں کو چٹ سکتا تھا بلکہ ملاحوں کی ذرا سی بے پروائی بھی انہیں ان بھوکی مچھلیوں کے جبڑوں تک پہنچا سکتی تھی۔ سچ یہ تھا کہ ٹائیگر شارک پچھلے چند دنوں سے انسانی گوشت کی دعوت اڑاتی رہی تھیں۔ انہیں انسانی خون کی چاٹ لگ چکی تھی اور اب وہ اپنے خوفناک جبڑے کھولے جہازوں کے عملے سے مزید خوراک کا تقاضا کر رہی تھیں۔ میگلن نے ملاحوں کو ہدایت کی کہ وہ کھانے پینے کی کوئی بھی چیز سمندر میں نہ پھینکیں اور ان مچھلیوں سے کسی بھی قسم کی چھیڑ چھاڑ سے گریز کریں۔ آدم خور مچھلیوں نے اگلے دو تین دن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑا تو میگلن نے مجبور ہو کر پانی میں گولیاں داغنے کا حکم دیا۔ اس نے چند ماہر نشانے باز سپاہیوں کو ہدایت کی کہ وہ ان مچھلیوں کے نازک گل پھڑوں کو نشانہ بنائیں۔ پے در پے گولیاں چلنے کے بعد کچھ شارک زخمی جبکہ باقی اِدھر اُدھر منتشر ہو گئیں۔

چار فروری 1521ء کی صبح ہسپانوی ملاحوں کے لیے خوشی اور مسرت کا پیغام لے کر آئی جب کچھ دیر کے بعد سطحِ سمندر سے باہر نکلی چند چھوٹی بڑی چٹانوں کے نظارے کے بعد انہیں ایک دوسرے سے جڑے دو جزیروں کی دھندلی سی شبیہ دکھائی دے گئی۔

''زمین قریب ہے چند جزیرے دکھائی دے رہے ہیں۔'' سمندر پر نظر رکھے ملاحوں کی پُرجوش آوازیں سنائی دیں۔

مایوس اور اداس چہرے کھل اٹھے۔ زمین دیکھے جانے کی خوشی جیسے ان کے چہروں سے پھوٹ رہی تھی۔ پچھلے چھ ہفتوں کے مسلسل سفر کے بعد وہ ایک بار پھر خشک زمین پر قدم رکھنے والے تھے۔ ہفتوں سمندری لہروں کے دوش پر ڈولتے رہنے کے بعد ٹھوس زمین پر قدم رکھنے کے احساس کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل تھا۔ جہازوں پر ہر طرف ہلچل دکھائی دے رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں جزیروں کے خدوخال نمایاں ہو گئے، یہ گھونگے کی چٹانوں سے بنے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے دو چھوٹے جزیرے تھے۔ آج ہم حتمی طور پر تو نہیں جانتے لیکن بحرالکاہل میں میگلن کے روٹ کو مدِنظر رکھیں تو ممکنہ طور پر انہیں دکھائی دینے والے جزیرے، بین الاقوامی تاریخی لائن کے مشرقی خم سے اندر واقع (کیریبتی کے مشرقی حصے میں) لائن آئی لینڈز کے کوئی جزیرے ہو سکتے تھے۔ میگلن نے جلی سے لے کر

اب تک لگ بھگ 11 ہزار کلومیٹر کا طویل فاصلہ طے کر لیا تھا۔ وہ اس وقت خطِ استواء سے 6 ڈگری جنوب اور 152 ڈگری مغرب کے خط پر جزائر ہوائی سے 2500 کلومیٹر جنوب، جزائر کک سے 1500 کلومیٹر شمال، جزائر فجی سے 3 ہزار کلومیٹر شمال مشرق اور نیوزی لینڈ سے 4 ہزار کلومیٹر شمال مشرق میں موجود تھا۔

''ہم یہاں دو تین دن تک آرام کریں گے اور خوب جم کر شکار کھیلیں گے۔'' میگلن نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر اعلان کیا۔

بھوکے پیاسے تھکان سے چُور ملاحوں نے بحری

میر سہراب خان خیرپور کے تالپور خاندان کے سب سے پہلے حکمران تھے جنہیں فنونِ جنگ کے ماہر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ انہوں نے قلعہ کوٹ ڈیجی کی تعمیر کے لیے ایک پہاڑی کا انتخاب کیا تاکہ مشرق سے آنے والے جنگجوؤں سے اس قلعے کے اندر رہنے والوں کو محفوظ رکھا جا سکے۔ اس قلعے کو زیادہ خطرہ مشرقی سمت سے آنے والی فوج سے تھا۔

قلعہ کوٹ ڈیجی احمد آباد قلعہ کے نام سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ یہ قلعہ دریائے سندھ سے 25 میل کے فاصلے پر نارا راجستھان ریگستان کے کنارے پر واقع ہے۔

میر سہراب خان تالپور نے جب 1793ء میں بالائی سندھ میں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی تو اس کے ساتھ ہی یہ قلعہ بھی تعمیر کروایا۔ اس قلعے کی دیوار پانچ کلومیٹر طویل اور 12 فٹ چوڑی ہے۔ یہ دیوار مٹی کے ساتھ پورے شہر کے گرد تعمیر کی گئی تھی۔ دیوار کے اوپر چند گز کے فاصلے پر برجیاں بھی تعمیر کی گئی تھیں تاکہ رات کے وقت دشمن کو دیکھا جا سکے۔

یہ قلعہ میر سہراب خان کے زمانے میں شاہی خاندان کی رہائش کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ اس قلعے میں داخل ہونے کے ساتھ ہی 18 ویں صدی میں استعمال ہونے والی توپیں نظر آتی تھیں جو اب کئی سالوں سے غائب ہو چکی ہیں۔

اقتباس: سندھ کا سہرا اودو

مرسلہ: مہوش حسن، فیصل آباد

جہازوں کے پوری طرح رکنے کا بھی انتظار نہیں کیا اور پانی میں چھلانگیں لگا دیں۔ تھکن سے چُور کچھ لوگ بے دم ہو کر ساحل کی ریت ہی پر گر گئے جبکہ باقی جزیروں کے اندرونی حصوں میں دکھائی دے رہے گھنے درختوں کی طرف بڑھے۔ میگلن کے ساتھیوں نے اگلے دو سے تین گھنٹوں کے اندر اندر ہی جزیروں کو کھنگال ڈالا۔ دونوں جزیرے ساتھ ساتھ تھے اور اس حد تک ایک دوسرے کے قریب تھے کہ لگتا تھا۔۔۔ کسی زمانے میں یہ ایک ہی جزیرہ ہوگا۔ اب ان دونوں کے درمیان ایک کم چوڑی سمندری نہر سی وجود میں آ گئی تھی جس میں چند فٹ تک گہرا پانی موجزن تھا۔ جزیروں کی لمبائی چوڑائی تین کلو میٹر سے زیادہ نہیں تھی۔ دونوں جزیرے سرسبز تھے اور گھنے استوائی درختوں اور جھاڑیوں سے اٹے ہوئے تھے۔ جزیروں کی ریت پر ہزاروں گھونگے بکھرے پڑے تھے۔ میگلن کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہاں ناریل کے درختوں کی بہتات تھی۔ استوائی خطے میں ناریل کو زندگی بچانے والا درخت کہا جاتا ہے۔ ناریل سے کھانے کے لیے تازہ گری، پینے کے لیے پانی اور جلانے کے لیے لکڑی حاصل ہوتی ہے۔ ناریل کی گری پر کھارے پانی کا اثر نہیں ہوتا اور یہ طویل عرصے تک تازہ رہ سکتی ہے۔ ان جزیروں پر ہر چیز تیز دھار تھی۔ درختوں کی چھال، موٹے لیبے پتے والی جھاڑیاں اور چبھتی ہوئی دھوپ۔ ان سب سے بچنا ضروری تھا۔ جزیرے انسانی وجود سے خالی تھے تاہم درختوں پر متعدد اقسام کے پرندے بیٹھے چیخ چلا رہے تھے۔ شاید انہوں نے پہلی بار دو ٹانگوں والی مخلوق دیکھی تھی۔

پیگافی تا کے مطابق کئی ہفتوں کے مسلسل سفر کے بعد خشکی نظر آنے پر میگلن کو امید تھی یہاں انسانی آبادی ہوگی جہاں سے اسے خوراک اور پانی مل جائے گا۔ لیکن یہاں پرندوں اور درختوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ میگلن اپنی بدنصیبی پر مسکرا دیا اور اس نے ان جزائر کو بدنصیبی کے جزائر (Misfortune Islands) کا نام دیا۔ جزیروں کی چھان بین کے دوران ملاحوں نے درجنوں پرندوں کا شکار کیا۔ ان کے ہاتھ پرندوں کے انڈے بھی لگے۔ انہوں نے دونوں جزیروں کے درمیان موجود کم گہرے پانی میں مچھلیاں اور جھینگے بھی شکار کیے۔ اس دوران ملاحوں کا ایک گروپ گھونگوں پر بھی پل پڑا تھا۔ مرغی کے انڈے کے برابر سخت خول کے اندر پروٹین سے بھرپور گھونگے کے نرم دھڑ کو ابالنے کے بعد سرکہ چھڑک کر کھایا جا سکتا تھا۔ گوشت جمع کرنے کے بعد انہوں نے آگ جلانے کے لیے ناریل کی چھال اور قریب کی جھاڑیوں میں بنے دیمک کے گھونسلوں کا استعمال کیا۔ خشک گھونسلوں نے فوراً ہی آگ پکڑ لی۔ ملاحوں نے بے صبری کے ساتھ گوشت کو بھونا اور شام تک جی بھر کر اس کی دعوت اڑاتے رہے۔ اسی دوران وکٹوریا کے کپتان ڈورٹے باربوسا نے میگلن کو بتایا کہ کچھ دن پہلے جہاز کے ایک تہ خانے سے پانی رسنا شروع ہو گیا تھا۔ میگلن نے وکٹوریا کے تہ خانوں سے بوجھ کم کرنے کے لیے کچھ سامان کو کون سیپ سیون پر لوڈ کرنے کا حکم دیا۔ اس نے بیمار ملاحوں کے معائنے کے دوران پایا کہ اس کے مزید بیس کے قریب ساتھی موت و حیات کی کشمکش میں تھے۔ اس کی ہدایت پر بیماروں کو کچھ شراب، ناریل اور سرکہ لگا گوشت کھانے کو دیا گیا۔ میگلن کے عملے نے اگلے تین دن کے دوران جتنا ممکن ہو سکتا تھا یہاں سے ناریل، گھونگے اور پرندوں کا گوشت اکٹھا کیا۔ جزیروں سے روانہ ہوتے وقت سان مارٹن، کاروال ہو اور چند دیگر جہاز رانوں نے ایک بار پھر میگلن کو جنوب مغرب کی طرف بڑھنے کا مشورہ دیا۔

"ایک بات آپ سب ذہن نشین کر لیں کہ خط استواء پر واقع ملوکا کے جزائر سمیت مالے کے تمام جنوبی جزائر پرتگالی علاقہ ہیں۔ اگر ہم یہاں سے سیدھے جنوب مغرب کی طرف گئے تو بہت ممکن ہے کہ ہم دشمنوں کے ہتھے چڑھ جائیں۔" میگلن نے ریت پر بحرالکاہل میں اپنے ممکنہ روٹ کا نقشہ بنایا۔ "ہم یہاں سے شمال مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے خط استواء کو پار کریں گے اور پھر مزید ایک ہفتے تک شمال مغرب میں سفر کرنے کے بعد سیدھے مغرب کی طرف بڑھیں گے۔"

"لیکن اس طرح تو ہم ملوکا کے جزائر سے دور شمال کی طرف نکل جائیں گے۔" سان مارٹن نے بحث کی۔ "اور دوبارہ جنوب میں آنے کے لیے ہمیں مزید وقت درکار ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" میگلن نے سر ہلایا۔ "میری معلومات کے مطابق خط استواء کے 15 ڈگری شمال میں جزائر کا ایک بڑا سلسلہ (فلپائن) واقع ہے۔ ہم براہ راست اپنی منزل کی طرف بڑھنے کی بجائے وہاں بیٹھ کر ملوکا جانے کی منصوبہ بندی کریں گے۔" اور پھر اسی راستے کو اپنا کر انہوں نے نئی دنیا پائی۔

جنگجو لکھاری

شکیل صدیقی

اس لکھاری کی زندگی کا ایک ہلکا سا عکس جس کی تحریر نے زندگی کا رخ بدل دیا۔ ہر کہانی طوفان اٹھا دینے والی ٹھہری۔ وہ سپاہیانہ زندگی سے وابستہ تھا اس لیے کہانیاں بھی فوجی زندگی کی عکاسی لکھیں اور یہی بات اس کے لیے کامیابی کی ضمانت ثابت ہوئی۔

ایک معروف مصنف کی زندگی کا پرتو

السٹیر میکلین کا ناول ہاتھ میں آتے ہی سنسنی خیزی کی ایک دھند قاری کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ ناول اتنا برق رفتار ہوتا ہے کہ وہ کھانا پینا تک بھول جاتا ہے۔ ناول کے واقعات اور افسانوی تانے بانے اسے جکڑے رکھتے ہیں۔ وہ اس سحر سے نکل کر حقیقی زندگی میں اسی وقت واپس آتا ہے، جب ناول ہاتھ سے رکھتا ہے۔ ناول اور کہانیاں اس سے پہلے بھی لکھی جا رہی تھیں، لیکن مہم جوئی کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ پہاڑوں پر نصب توپوں کو تباہ کرنا، صدر

امریکا کا اغوا، جرمن سپاہیوں سے اتحادیوں کی چشمک زنی، چرچ میں لٹکتی لاشیں، ایک طاعون زدہ شخص شہر میں بھاگا بھاگا پھر رہا ہے اور حفظانِ صحت کے ادارے اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں کہ وہ سارے شہر کو طاعون میں مبتلا نہ کر دے۔ پھر وہ ایک ٹرین میں بیٹھ جاتا ہے تو اس ٹرین کو تباہ کرنے کوشش۔ یہ سب اس کے ناولوں کے یک سطری خاکے ہیں جن سے آپ اس کے ناولوں کی مہم جوئی اور سنسنی خیزی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگر امریکی صدر اغوا ہو جائے تو کیا آپ کے رونگٹے کھڑے نہیں ہوں گے؟

قارئین کی یادداشت اگر کمزور نہیں ہے تو انہیں میکلین کے ناولوں پر مبنی وہ فلمیں ضرور یاد ہوں گی جنہیں دیکھ کر وہ ہفتوں تک محظوظ ہوتے رہتے تھے اور ایک دوسرے سے ان فلموں کی کہانی بیان کرتے اور منظر کو دہراتے تھے۔ اردو کے کہنہ مشق مترجمین نے اس کے ناولوں کا ترجمہ کرکے قارئین کو ایڈونچر ناولوں سے فیضیاب کیا۔ عقابوں کا نشیمن (ضیاء شاہد)۔ خوف کی کلید (اثر نعمانی) نیورون کی توپیں (سراج الدین شیدا) رات کا کفن (مظہر الحق علوی) جیسے ناول اب بھی ان کی ذاتی لائبریریوں کی زینت بنے ہوئے ہوں۔

الستیئر میکلین نے 1955ء میں ایچ ایم یولائسس لکھا جسے مقبولیت حاصل ہوئی اور وہ بیسٹ سیلر لسٹ عرصہ دراز تک رہا۔ تبصرہ نگاروں نے اس کے متعلق مثبت رائے کا اظہار کیا۔ میکلین کی ہمت بندھ گئی اور 1957ء میں دوسرا ناول گنز آف نیورون مارکیٹ میں آیا تو لوگوں نے اعتراف کیا کہ وہ ناول نگاری سے واقفیت رکھتا ہے اور اسے بڑے ناول نگاروں کی صف میں مقام دیا جاسکتا ہے۔ دو برس کے بعد جب اس ناول پر اسی نام سے فلم بنی تو ساری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ جس کے نتیجے میں وہ بیسٹ سیلر رائٹر بن گیا اور ساری دنیا میں لوگ اس کے نئے ناول کے شائع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

الستیئر میکلین ایک پادری کا بیٹا تھا جو 21 اپریل 1922ء میں گلاسگو میں پیدا ہوا تھا۔ وہ چار بچوں میں تیسرا تھا۔ اس کے گھر میں اسکاٹش زبان بولی جاتی تھی اور انگریزی میں بات کرنے پر پابندی عائد تھی (اس لیے کہ اسکاٹ لینڈ کے باشندے برطانوی لوگوں کو پسند نہیں کرتے) اس کا خاندان جب گلاسگو سے ہجرت کرکے اسکاٹ لینڈ کے شمالی علاقے ڈیوئٹ میں جا کر بسا تو میکلین نے اپنا بچپن آئرلینڈ کے کھیتوں اور میدانوں میں گزارا۔ اسے بچپن ہی سے مطالعے کا شوق تھا۔ اس کے پسندیدہ مصنفین میں چارلز ڈکنز اور الیگزینڈر ڈوما شامل تھے۔ جب اس کی عمر صرف چودہ برس کی تھی تو اس کے والد کا دماغ کی رگ پھٹنے سے انتقال ہو گیا۔ میکلین بہت اداس ہوا۔ اسے اپنے آبائی مکان کی یاد ستانے لگی تو وہ اپنی ماں میری اور بھائی لیکلان کے ساتھ واپس گلاسگو چلا آیا۔ لیکلان میڈیکل کا ہونہار دماغ طالب علم تھا، مگر اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور سرطان میں مبتلا ہو کر اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اس طرح سے میکلین کی آزردگی میں اضافہ ہو گیا اور اس کا دل خالی خالی سا ہو گیا۔ اب اس کی تنہا زندگی میں صرف اس کی ماں تھی۔ زندگی گزارنے کے لیے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا اس نے اپنی توجہ تعلیم کی طرف مبذول کر دی۔ وہ جانتا تھا کہ تعلیم ہی اسے بامِ عروج تک پہنچا سکتی ہے۔ اس سے منہ نہیں موڑنا چاہیے۔

ہائی لیول کی تعلیم ختم کرنے تک وہ انگریزی، لاطینی اور جرمنی زبان سے واقف ہو چکا تھا۔ اس نے ایک بحری کمپنی میں درخواست دی جو منظور کر لی گئی۔ یوں اسے دنیا دیکھنے کا موقع ملا۔ چند برس ایف۔ سی اسٹرک نامی اس کمپنی میں کام کرنے کے بعد میکلین نے رائل نیوی میں درخواست دی۔ حسنِ اتفاق سے یہ درخواست بھی منظور ہو گئی۔ وہ 1941ء کا زمانہ تھا اور میکلین کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی۔ دوسری جنگِ عظیم میں وہ ایچ ایم یولائسس نامی بحری جہاز پر متعین تھا جس سے دشمن کے بحری جہازوں کی طرف تارپیڈو پھینکے جاتے تاکہ ان کے پیندوں میں سوراخ کیا جاسکے۔ اس کا جہاز زیادہ تر بحیرۂ روم میں رواں دواں رہا، جس سے اس کے خمیر میں سمندروں سے عشق سما گیا۔ اس کے ایک قریبی دوست ڈیوس کا کہنا ہے کہ میکلین ہوشیار اور بیدار دماغ تھا اور اس میں بروقت فیصلہ کرنے کی قوت تھی۔ وہ نامساعد حالات سے بالکل نہیں گھبراتا تھا۔ میکلین نے ایک بار انٹرویو دیتے ہوئے انکشاف کیا تھا کہ جب دورانِ جنگ اسے جاپان کے علاقے کی معلومات حاصل کرنے اس پر نظر رکھنے کی ڈیوٹی سونپی گئی تو اس نے جاوا، ساترا، بورنیو اور آسام کا علاقہ دیکھا، جس سے اس کے مشاہدات میں کافی اضافہ ہوا۔ اسے ایک بار جاپانیوں نے اغوا کر لیا تھا اور اس پر بے پناہ تشدد کیا تھا۔ جنگ کے بعد اسے جاپانی کے قید خانے سے رہا کیا گیا جو سنگاپور میں تھا۔ اس طرح اس کے جنگی تجربے میں اضافہ ہوا۔

جنگ کے خاتمے پر 1946ء میں وہ گھر لوٹ

سمندر، آلات حرب، بارود، جنگ کی ہولناکی اور تخت و تشویش کے ماحول نے اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کر دیا تھا۔ چونکہ ابھی اس کی انگریزی کمزور تھی، اس لیے اس نے گلاسگو کی یونی ورسٹی میں داخلہ لیا اور گریجویشن مکمل کیا۔ اس کے بعد جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے رودھرگیلن کے ایک اسکول میں بطور ٹیچر ملازمت کر لی اور نونہالوں کی تعلیمی تربیت انجام دینے لگا۔ وہ محض تعلیم نہیں دے رہا تھا، بلکہ اپنے تجربات اور مشاہدوں میں اضافہ کر رہا تھا۔

جب اس کے پاس وقت ہوتا تھا تو وہ چھوٹی کہانیاں لکھنے لگتا۔ اس کی کہانیاں رسائل اور اخبارات کی زینت بننے لگیں اور ایک محدود حلقہ اس کے نام سے واقف ہو گیا۔ 1945ء میں اس نے گلاسگو ہیرالڈ میں ایک مقابلے میں حصہ لیا اور ڈیلس نامی کہانی لکھی جس پر اسے ایک سو پونڈ انعام ملا۔ یہ کوئی بہت بڑی رقم نہیں تھی لیکن اس کی صلاحیتوں کا یک گونہ اعتراف تھا جس سے اس کی حوصلہ مندی دوچند ہوئی اور اس نے ایک اشاعتی کمپنی سے رابطہ کیا۔ اس کمپنی نے اس کی حوصلہ افزائی کی اور اس کو ناول لکھنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ اس نے اپنا پہلا ناول ایچ ایم یولائسس لکھا، جو اس کے بحری تجربات پر مشتمل تھا۔ (ناول کا نام اسی بحری جہاز کے نام پر تھا جس پر اس کی ڈیوٹی جنگ کے دوران لگی تھی) اس ناول کو تحریر کرنے میں اس کے کزن ڈیسمنڈ نے بھی اس کی مدد کی جو بحری جہازوں پر ملازمت کر چکا تھا۔ ناول میں اس نے شمالی اوقیانوس کا ماحول پیش کیا تھا، جہاں جہاز کا عملہ دوسری جنگِ عظیم میں حصہ لیتا ہے۔ اس ناول کا اختتامیہ بے حد جاندار تھا، جب ایچ ایم یولائسس ڈوبتے وقت ایک جرمن بحری جہاز پر حملہ کر دیتا ہے اور فتح یابی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ یہ جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی تھی، جو کچھ اس پر گزر چکی تھی وہ میکلین احاطۂ تحریر میں لے آیا تھا۔ یہ ناول بہت پسند کیا گیا اور اسے بحریات میں کلاسیک کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اس کا یہ ناول کئی ہفتوں تک بیسٹ سیلرز لسٹ پر رہا۔ اس کے مجلد ایڈیشن کی ۲۵ لاکھ جلدیں پہلے چھ ماہ میں فروخت ہوئیں اور ناقدین نے دل و جان سے سراہا۔

اس کا تحریری سفر جاری رہا اور اسی اشاعتی ادارے کی حوصلہ افزائی پر اس نے اپنا دوسرا اور پھر...... تیسرا ناول ساؤتھ بائی جاوا ہیڈ لکھ ڈالا۔ یہ دونوں ناول بھی اس کے مشاہدات پر مبنی جنگی ماحول پر تھے۔ ان ناولوں کو لکھنے کے دوران اس نے اسکول کی ٹیچری سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

شکل

دوسرے روز ہمیں فارم جمع کرانا تھا اور اس لیے قریشی صاحب کی اس پیشکش سے خوش ہو گئے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور ہمیں دفتر ہی میں ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کرکے تصویر اتار دی۔ چنانچہ دوسرے روز ہم انہی کی گاڑی میں پاسپورٹ کے دفتر پہنچے۔ وہاں جو افسرِ اعلیٰ تھے، ان سے آشنائی تھی۔ انہوں نے فارم لیا، پڑھا اور پھر تصویر کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا یہ آپ کی تصویر ہے؟"

ظاہر ہے اس کا جواب ہاں میں دینا تھا۔ عرض کیا۔

"جی ہاں، میری ہے۔"

جواب میں انہوں نے ایک بار پھر تصویر کا جائزہ لیا، ہمارے چہرے کی طرف دیکھا اور بولے۔ "شفیع صاحب، تصویر تو کوئی سلیقے کی اتروائی ہوتی؟"

قریشی صاحب بھی قریب کھڑے تھے، ہم نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"قریشی صاحب "جنگ" اخبار کے چیف فوٹوگرافر ہیں۔ انہوں نے اتاری ہے۔"

انہوں نے قریشی صاحب کی جانب دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "قریشی صاحب، کوئی ڈھنگ کی تصویر اتارتے؟"

جواب میں قریشی صاحب جھٹ سے بولے۔ "ان کی شکل ہی ایسی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔"

شفیع عقیل کی کتاب "سرخ سفید سیاہ" سے اقتباس

ناول گنز آف نیورون پانچ ماہرین کی ٹیم پر مشتمل ایک جنگی سیوتاژ تھا جس میں وہ پانچوں ماہرین پہاڑی پر لگی دو توپوں کو جا کر تباہ کرتے ہیں۔ اس ناول کا منظرنامہ کارل فورمین جیسے نامور اور مشاق مصنف نے لکھا تھا۔ (اس نے میکنازگولڈ جیسے ناول کا منظرنامہ لکھ کر اسے امر بنا دیا تھا) اس کا کہنا تھا کہ وہ اس ناول کو پڑھ کر بہت متاثر ہوا۔ میکلین نے شروع سے آخر تک قاری کو اس کے واقعات میں جکڑے رکھا۔ ناول ہاتھ میں لینے کے بعد قاری دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے اور کئی مقامات پر سانس لینا بھول جاتا ہے۔ اس فلم کو اسپیشل افیکٹ کی بنا پر اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا تو ساری دنیا میں دھوم مچ گئی۔

اس ناول کی شہرت سے متاثر ہو کر میکلین نے ایک اور ناول فورس ٹین فرام نیورون لکھا جس پر بھی فلم بنی۔ اس ناول کی کہانی کچھ یوں ہے کہ دس جنگی ماہرین کی ایک ٹیم یوگوسلاویہ میں ایک ایسے پل کو تباہ کرنے کی مہم پر

جاتے ہیں جو جرمنوں کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ ناول گنز آف نیورون کا تسلسل تھا۔ تاہم اس ناول اور اس پر بننے والی فلم نے کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کی اور قارئین وناظرین کو بھی متاثر نہ کرسکی۔

میکیلن نے اپنا انداز تحریر تبدیل نہیں کیا اور جنگ کے ساتھ اسپائی ناول کو بھی اپنا موضوع بنالیا۔ 'لاسٹ فرنٹیئر' میں ایک جاسوس آہنی پردے کے پیچھے جاکر ایک انگریز سائنس داں کو رہا کراکے آزاد دنیا میں لاتا ہے۔ یہ ناول انتہائی سنسنی خیز تھا اور پڑھنے والوں کے ذوق پر پورا اترا۔ جس سے میکیلن پھر فارم میں آگیا۔ میکیلن اب پابند تھا کہ وہ اپنے قلمی نام سے ایک مخصوص اشاعتی ادارے کو اپنے ناول لکھ کر دے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ناول کہیں اور چھپنے کے لیے نہیں دے سکتا تھا۔ اسے ایک اور اشاعتی ادارے کی طرف سے پیشکش کی گئی تو اس نے اپنا قلمی نام تبدیل کرکے 'آئن اسٹیوارٹ' رکھ لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ نام تبدیل کرنے میں ایک رمز یہ بھی ہے کہ اس کے قارئین اس کے انداز تحریر سے یہ جان لیں کہ ایڈونچر ناول اسی نے لکھے ہیں، چاہے اس پر نہایت جلی حروف میں السٹیئر میکیلن لکھا ہو یا نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس نئے نام کے تحت اس نے دو ناول 'میٹن بگ' اور 'دی لاسٹ کروسیڈ' لکھے۔ یہ دونوں ناول بھی مہماتی تھے اور اس کے خاص اسٹائل میں رچے بسے ہوئے۔ 1957ء سے لے کر 1963ء تک میکیلن جینوا (سوئٹزر لینڈ) کے ایک ہوٹل میں مقیم رہا اور شہنشاہوں کی سی زندگی گزارتا رہا تھا۔ اسی اثنا میں اس نے جمیکا کی ایک سرائے خرید لی اور لندن کے چار ہوٹلوں کا مالک بن گیا۔ وہ ناول نویسی سے اکتا چکا تھا، اس لیے ہوٹل بزنس کرنا چاہتا تھا۔ لندن کے ہوٹلوں کا جب تین برس کے بعد اسے ٹیکس دینا پڑا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ دیوالیا ہوجائے گا۔ چنانچہ اس نے ہوٹل فروخت کردیے اور سوئٹزر لینڈ میں رہائش اختیار کرلی۔ اس کے بعد دوبارہ ناول نویسی کو اپنا ذریعہ معاش بنالیا۔

اسی دوران میں 'وہیر ایگلس ڈیئر' (جسے عقابوں کا نشیمن کے نام سے ضیا شاہد نے اردو میں ترجمہ کیا ہے) شائع ہوا تو وہ حسب معمول شہرت اور ناموری کے بلند ترین مینار پر بیٹھ گیا۔ اس ناول کے حقوق فلم کے لیے فوراً خرید لیے گئے۔ اس فلم پر ۶ کروڑ ڈالر خرچ ہوئے اور جب فلم دنیا بھر میں ریلیز ہوئی تو اس کی آمدنی دوگنی تھی۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ رچرڈ برٹن کو اس فلم میں اپنا رول پھیکا لگ رہا تھا، اس لیے وہ لندن کے اس ہوٹل میں جا کر میکیلن سے لڑا کرتا تھا، جہاں وہ قیام پذیر تھا۔ رچرڈ برٹن کہتا تھا کہ وہ اس کا رول ابھارنے کے لیے منظر نامے میں تبدیلی کرے، جب کہ میکیلن اس پر تیار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ لوگوں نے ناول پڑھ لیا ہے اور توقعات باندھ لی ہیں۔ اب اگر میں نے اس سے سرمو بھی انحراف کیا تو ناول نگار کی حیثیت سے میری شہرت داغ دار ہوجائے گی۔ فلم میں اس کا کردار ویسا ہی رہے گا جیسا کہ ناول میں ہے۔ اگر اسے پسند نہیں ہے تو وہ فلم چھوڑ دے۔

رچرڈ برٹن نے فلم تو نہیں چھوڑی مگر کبیدہ خاطر رہا۔ بہرحال اس کی آزردگی اس وقت دور ہوگئی جب فلم نے باکس آفس پر کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ فلم کی کامیابی کا مطلب ہوتا ہے اداکاروں کی کامیابی اور ان کے معاوضوں میں اضافہ۔

۱۹۷۱ء تک میکیلن کے فروخت ہونے والے ناولوں کی مجموعی تعداد ۲ کروڑ تیس لاکھ ہوچکی تھی (ہمارے ہاں تو ابھی تک کوئی ایک لاکھ تک نہیں پہنچا)

السٹیئر میکیلن کے ناولوں کے ہیرو خاموش خاموش سے ہوتے ہیں، مگر فطرتاً چالاک اور بیدار مغز۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ کام کے علاوہ ان کے پیش نظر کچھ نہیں ہوتا۔ وہ محض تفریحاً بھی دوسری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ وہ برائی کے خلاف مسلسل جنگ میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کے ناولوں میں سسپنس بے پناہ ہوتا ہے بعض اوقات ہیرو کا قریب ترین ساتھی دشمنوں کا آلۂ کار نکلتا ہے۔

دنیا ایسے عناصر سے بھری پڑی ہے، جو اپنی ریشہ دوانیوں سے سچائی کے خلاف برسرپیکار رہتے ہیں، لہٰذا ان کا فنا کیا جانا ضروری ہے۔ ان میں اکثر مزاج جرمن، کمیونسٹ، منشیات فروش اور مجرموں کے گروہ شامل ہیں۔ میکیلن کا ہیرو ان کو فنا کرنے کے منصوبے تیار... کرتا رہتا ہے۔

میکیلن اپنے ناولوں میں جنس و جذبات سے گریز کرتا ہے۔ جیمز بانڈ کے خالق آئن فلیمنگ، جیمز ہیڈلے چیز اور ہیرالڈ روبنز کی طرح اس کے قاری خوابگاہ کے مناظر سے لطف اندوز نہیں ہوسکتے۔ اس لیے کہ میکیلن کہتا ہے کہ جنسی مناظر کہانی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور ایڈونچر کا تاثر زائل کردیتے ہیں (یورپ اور امریکا میں ایسے ناول لکھ کر کامیابی حاصل کرلینا کوئی مذاق نہیں ہے)

میکیلن کو بعد میں آنے والے ناولوں پر قارئین کی طرف سے پہلے جیسی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی (ممکن ہے وہ تنقید کا شکار ہوگیا ہو)۔ ان ناولوں میں 'دی وے ٹو ڈسٹی ڈیتھ' اور 'دی گولڈن گیٹ' شامل ہیں۔ 'ڈسٹی ڈیتھ' کار ریسوں کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ ریس میں حصہ لینے والے کیسے گھپلے بازی کرتے ہیں اور جیتنے والی کار کو ہرا کر ہارنے والی کار کو جتوا دیتے ہیں۔ پھر داؤ پر لگی ہوئی رقم، جو کروڑوں ڈالر میں ہوتی ہے، سمیٹ لیتے ہیں۔ اس ناول کی ناکامی کی وجہ اس میں بین الاقوامی سازش کا نہ ہونا تھا۔ جب کہ دوسرے ناولوں سے یہ تاثر ملتا ہے کہ گویا دنیا ختم ہونے جارہی ہے۔ اگر مجرموں کو کیفر کردار تک نہ پہنچایا گیا تو سب کچھ ختم ہوجائے گا۔ دنیا موت کی مٹھی میں ہے۔

'گولڈن گیٹ' امریکی صدر کے اغوا کی کہانی تھی جنہیں ایک پل پر روک لیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ دو عرب فرماں روا بھی تھے۔ مجرم برانسن صدر کو رہا کرنے کے لیے تین ارب ڈالر کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ "یہ امریکا ہے، دنیا کی سب سے مال دار ریاست، افریقا کا کوئی غریب ملک نہیں جو ادھار پر چلتا ہے۔ تین ارب ڈالر کی اس ریاست کے نزدیک کیا حیثیت ہے، اس سے تو ایک آبدوز خریدی جاتی ہے۔ ایک شخص کو چاند پر بھیجا جاتا ہے۔ یہ ملک کی مجموعی آمدنی کی ایک بوند کے برابر ہے۔ اگر میں نے امریکی خزانے سے ایک بوند مانگ لی ہے تو آپ جیسے دولت مند کی معیشت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ لیکن مجھے یہ رقم نہ ملی تو قوم آپ سے اور آپ کے عرب دوستوں سے محروم ہوجائے گی، جناب صدر!"

میکیلن نے ایک بار انٹرویو میں کہا تھا کہ میں پیدائشی مصنف نہیں ہوں اور اب مجھے لکھنے میں مزہ بھی نہیں آتا۔ اسی لیے میں نے لندن میں ہوٹل خرید کر دولت کمانا چاہا تھا اور تین برس تک میں لکھنے کی میز پر نہیں بیٹھا، لیکن میرے پڑھنے والوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں ان کے لیے لکھوں، لہٰذا میں پھر میدان میں آگیا۔ میں اپنا ناول 35 سے 40 روز میں ختم کرلیتا ہوں، مگر اس ناول کو لکھنے کے لیے جو خاکہ بناتا ہوں وہ دو سال میں مکمل ہوتا ہے۔ میں ان جگہوں پر جاکر انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور مکمل معلومات جمع کرتا ہوں۔ خاکہ بناتا رہتا ہوں، جب رنگ آمیزی مکمل ہوجاتی ہے تو ٹائپ رائٹر پر بیٹھتا ہوں اور آسانی سے لکھ ڈالتا ہوں۔

1960ء سے 1970ء کے عشرے میں میکیلن کی

"ماضی نامے"

مامون الرشید عباسی اگرچہ بڑی عظمت وشان کا بادشاہ تھا اور ناموری کے دفتر میں عام مورخین نے اس کے جاہ وجلال کی داستانیں جلی حروف میں لکھی ہیں، مگر ہمارے خیال میں جو چیز اس کی تاریخی زندگی کو نہایت حزین اور پراثر بنادیتی ہے وہ اس کی سادہ مزاجی اور بے تکلفی ہے۔ ایک ایسا شہنشاہ جو تخت حکومت پر بیٹھ کر کل اسلامی دنیا کا ذمے دار بن جاتا ہے، کس قدر عجیب بات ہے کہ عام دوستوں سے ملنے جلنے میں شان سلطنت کا لحاظ رکھنا پسند نہیں کرتا۔ اکثر اہل علم اور باکمال راتوں کو اس کے مہمان ہوتے تھے اور اس کے بستر سے بستر لگا کر سوتے تھے مگر اس کا عام برتاؤ ایسا ہی ہوتا تھا جیسا کہ ایک سادہ مخلص دوست کا دوست کے ساتھ ہوتا ہے۔ قاضی یحییٰ ایک رات اس کے مہمان تھے۔ اتفاقاً آدھی رات کو ان کی آنکھ کھل گئی اور پیاس معلوم ہوئی۔ مامون نے پوچھا۔ "خیر ہے؟"

قاضی صاحب نے پیاس کا اظہار کیا، مامون خود چلا گیا اور دوسرے کمرے سے پانی کی صراحی اٹھا لایا۔ قاضی صاحب نے گھبرا کر کہا۔

"حضور نے خدام کو ارشاد کیا ہوتا۔" مامون نے کہا۔

"نہیں، آنحضرت ﷺ ...... نے ارشاد فرمایا ہے کہ سید القوم خادمہم۔" راتوں کو خدام سو جاتے تھے تو مامون خود اٹھ کر چراغ اور شمعیں درست کردیا کرتا تھا۔

("المامون"......علامہ شبلی نعمانی)

قسمت کا تارہ بام عروج پر تھا۔ اس کے ناول گرم کیک کی طرح فروخت ہوتے تھے۔ لندن کے بعد اس نے سوئٹزرلینڈ میں مستقل رہائش اختیار کرلی۔ اس پر الزام تھا کہ وہ ٹیکس نادہندہ میں شامل ہے۔

اپنے کیریئر کا آغاز اس نے چھوٹی کہانیاں لکھنے سے کیا تھا۔ مرنے سے کچھ پہلے اس کی چھوٹی کہانیوں کا ایک مجموعہ مارکیٹ میں آیا تھا جسے پڑھنے والوں نے زیادہ پسند نہیں کیا، اس لیے کہ وہ اس کے طویل، پُرپیچ ناول اور سنسنی خیز ناول پڑھنے کے عادی ہوچکے تھے۔ 1978ء میں اس کے بیسٹ سیلر ناولوں کے فروخت ہونے کی تعداد 2 کروڑ ہوچکی تھی۔ یہ تعداد اگاتھا کرسٹی کے ناولوں سے تقریباً

مساوی تھی۔ جس نے تحیر خیز ناول لکھ کر دھوم مچا رکھی تھی اور مسٹری کوئین کہلاتی تھی۔

1980ء میں ایک فلم میکر نے اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے لیے ایسے ناول لکھے جس پر فلم بن سکے۔ میکلین نے اس کی خواہش کے احترام میں دو ناولوں کا پلاٹ تیار کیا۔ ا۔ ہونیج ناور ۲۔ ڈیتھ ٹرین۔ ان ناولوں کو اس کے دوست رائٹروں نے مکمل کیا۔ ان دونوں کی قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ ان میں میکلین کا مخصوص اندازِ تحریر سمویا ہوا ہے اور یہ انداز پڑھنے والوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس کی موت کے بعد نئے پڑھنے والوں نے میکلین کی طرف کوئی توجہ نہیں دی، اسی لیے امریکا میں 2009ء کے بعد اس کے ناولوں کے نئے ایڈیشن شائع نہیں ہوئے۔ البتہ برطانیہ جو ایک روایتی ملک ہے، وہاں اسے اب بھی یاد رکھا جا رہا ہے اور ہارپر کولنز نامی ایک ادارہ ناولوں کو نئے ٹائٹلز کے ساتھ شائع کر رہا ہے۔

شراب نوشی کی زیادتی کی بنا پر 1987ء میں اس پر دل کے کئی دورے پڑے۔ آخری دورے میں وہ جانبر نہ ہوسکا۔ میکلین کا انتقال 2 فروری 1987ء کو میونخ میں ہوا۔ موت کے وقت پہلی بیوی اس کے نزدیک تھی۔ اسے کیلنکی سوئٹزر لینڈ میں دفن کیا گیا۔ اس کی قبر اداکار رچرڈ برٹن کی قبر سے کچھ فاصلے پر ہے۔ اس کی قبر پر جو کتبہ لگا ہے اس پر درج ہے۔ "مستو دوست! ایک نئی دنیا کی تلاش میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔" اس کے مرنے پر اس کے لاکھوں چاہنے والے آزردہ اور دل شکستہ ہوگئے۔ اس کی مقبولیت کا بین ثبوت وہ ناول ہیں جو دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوئے۔ وہ حسن پرست تو نہیں تھا لیکن شراب نوشی اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اسی لت کی وجہ سے موت نے اسے جلد گلے لگا لیا۔

اس نے دو شادیاں کیں، جن میں سے پہلی ۱۹۵۳ء میں ایک جرمن نژاد خاتون جسیلیا تھی، جو ایک اسپتال میں نرس تھی۔ اس سے میکلین کے تین بچے ہوئے۔ میکلین اس وقت اسکول میں جغرافیہ، انگریزی اور تاریخ پڑھایا کرتا تھا اور کہانی نویس کی حیثیت سے بھی اپنا کیریئر بنا رہا تھا۔ پہلی بیوی سے علیحدگی کی وجہ میکلین کی حد سے زیادہ شراب نوشی تھی۔ وہ پینے کے بعد ہوش و حواس کھو بیٹھتا تھا۔ چنانچہ اس کی بیوی کا گھٹنا دو بار ٹوٹا، جبڑا کئی بار زخمی ہوا اور منہ سے نہ معلوم کتنی بار خون نکلا۔ وہ خون تھوکنے پر مجبور نہیں تھی، لہٰذا اس نے علیحدگی اختیار کرلی۔ اس نے ایک انٹرویو میں کہا۔ "جیکس لوگوں سے بہت کم افراد کی ملاقات ہوتی ہے، وہ ان کے بارے میں اپنے ذہنوں میں دلچسپ اور عجیب خاکے بنا کر رکھتے ہیں لیکن میں تو دن رات ایک جینئس کے ساتھ رہتی تھی، میں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ ایک جینئس کے ساتھ تو گزارہ ہے۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے، مگر یہ جینئس روایتی کہانیوں کی طرح نہیں تھا۔ میری الم ناک زندگی میں نہ تو پریوں کا دیس تھا اور نہ میرے گرد مرغزار تھے۔ رنگ تو خواب و خیال کی باتیں ہیں۔ میرا جینئس بد مزاج، اکھڑ اور بے ہنگم تھا۔ چنانچہ میری زندگی گھونسوں، لاتوں، مکوں اور گالم گلوچ سے عبارت تھی۔ اس میں زہر ہی زہر بھرا تھا۔ اب تو آپ بہ خوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے اس سے علیحدگی کیوں اختیار کی؟"

1972ء میں اس نے دوسری شادی مارسیل جارگرس سے کی جو ایک فرانسیسی موسیقار کی بیٹی تھی۔ اس نے چھوٹی موٹی فلموں میں اداکاری کے جوہر بھی دکھائے تھے مگر افسوس کہ یہ شادی بھی زیادہ عرصے تک نہیں چلی اور 1977ء میں انہوں نے علیحدگی اختیار کرلی۔ میکلین نے مارسیل کو چار لاکھ پونڈ ادا کیے اور اپنا ایک غیر مطبوعہ ناول 'گولڈن گرل' بھی دیا۔ اس کے بعد اس نے ایک بار پھر پہلی بیوی سے تعلقات استوار کرلیے۔ سوئٹزر لینڈ کی رہائش چھوڑ کر اس نے یوگوسلاویہ کو اپنی قیام گاہ کے لیے پسند کیا۔ تاکہ مستقبل میں لکھے جانے والے کولڈ وار ناولوں کے لیے مواد اکٹھا کر سکے۔ یوگوسلاویہ روس سے آنے والوں کی آماجگاہ تھا اور وہاں رہتے ہوئے روس کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنا بے حد آسان تھا۔

اس نے موت سے پہلے اپنے ایک دوست میکیل کو آٹھ خاکے بنا کر دیے تھے جن پر وہ ناول لکھنا چاہتا تھا لیکن ناسازیٔ طبع کی بنا پر نہیں لکھ پایا۔ لہٰذا اس کے دوست نے وہ ناول لکھے۔ 1962ء میں الستیئر میکلین نے لارنس آف عربیا کی سرگزشت بھی لکھی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کی پسندیدہ شخصیت تھی۔ اس کے علاوہ وہ کیپٹن جان کک نامی کتاب کا مصنف بھی ہے۔

اس کے کل ناولوں کی تعداد 28 ہے جب کہ 8 اس کی موت کے بعد شائع ہوئے۔ اپنی 65 سالہ زندگی میں وہ 30 برس تک لکھتا ہی رہا (قلم برداشتہ ہی سہی)۔ 1983ء میں گلاسگو یونی ورسٹی نے الستیئر میکلین کو ڈاکٹر آف لٹریچر کا ایوارڈ دیا۔ ایوارڈ دینے کے لیے ایک شاندار تقریب کا انتظام کیا گیا جس میں ریاست کا گورنر بھی مدعو تھا۔

موت کے قریب

اے آر راجپوت

جنگل خطروں کا گھر ہے اور وہ خطروں کی کھلاڑی تھی۔ اس نے بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ اس کے ساتھی بھی حیران رہ گئے۔ اس نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خطروں کو پیچھے دھکیلنے کا فن سیکھ لیا تھا۔

لندن آنے سے قبل میں نے کبھی افریقا سے باہر قدم تک نہیں رکھا تھا۔ میں وہاں پیدا ہوئی اور وہیں میری پرورش گھوڑوں، گاڑیوں اور بکریوں کے درمیان ہوئی۔ مشرقی افریقا کے ملک کینیا میں میرے ... بلی نگسٹن آباد کار بن کر آئے تھے۔ انہیں بچپن ہی سے گھوڑوں سے والہانہ لگاؤ تھا اور وہ افریقا بھر کے بہترین ٹرینر مانے جاتے تھے۔ وہ خاص طور سے ریس کے گھوڑوں کو تربیت دیتے تھے۔ میری والدہ ایک شوہر پرست خاتون تھیں جن کی زندگی کا محور شوہر کی خوشنودی رہی، لہٰذا وہ بغیر کسی احتجاج کے پاپا کے ساتھ ویران اور جنگلی علاقے میں چلی آئیں اور مجھے وہیں جنم دیا۔ اتفاق سے میں ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔

پُراسرار افریقا اس زمانے میں بھی پُراسرار ہی تھا۔ وہاں ہر طرف اسرار رینگتے اور دوڑتے محسوس ہوتے تھے۔ وہاں کا موسم، زمین، آب و ہوا اور پانی ہر چیز مختلف تھی۔ وہاں کی دھوپ، سرسبز پہاڑیاں، ٹھنڈے پانی کے چشمے اور صبح کی زرد رُو کہر بھلائی جانے والی چیز نہیں ہیں۔ وہاں زندگی بہت دشوار ہے۔ ہر قدم پر ایک نیا چیلنج موجود ہوتا ہے۔ شاید اس وجہ سے تقدیر نے افریقا کے باسیوں میں جفاکشی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ یہ میرا اور بہت سارے دوسرے لوگوں کا گھر ہے اور ہمیں اس سے محبت ہے کیونکہ یہاں سب کچھ ہے مگر یورپ اور یکسانیت نہیں ہے۔

صوبہ پہلی میں نیروبی سے کچھ دور کار ہائے انٹیشن کے

مقام پر میرے پاپا کا فارم تھا جو ایلی گنگشن فارم کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں کسی قسم کی سہولت کا تصور بھی ممکن نہیں تھا۔ سوائے ان کے جو آپ اپنے زورِ بازو سے پیدا کرلیں۔ ذرائع آمدورفت کے لیے گھوڑے اور بگھی استعمال ہوتی تھی۔ بچپن سے پاپا مجھے افریقا کے بارے میں بتاتے رہتے تھے۔ اس روز بھی ہم قصبے سے کچھ خریداری کر کے واپس فارم جا رہے تھے اور پاپا مجھے شہروں کے متعلق بتا رہے تھے۔

"شیر بعض افراد سے زیادہ ذہین جانور ہے اور بہت سوں کی نسبت زیادہ حساس بھی۔ یہ گولی کا اتنا برا نہیں مناتا جتنا کہ بے عزتی کا۔ ایک شیر بلاوجہ بھی حملہ نہیں کرتا۔ یہ محتاط رہتا ہے، طاقت ور جانوروں سے مڈبھیڑ سے گریز کرتا ہے لیکن تم اسے خوف نہیں کہہ سکتیں۔ شیر اس نام کی کسی چیز سے واقف ہی نہیں ہے۔ یہ فطرت کے قریب ترین جانور ہے اور اس کا طرزِ عمل ہمیشہ ایک جیسا ہوتا ہے۔ یہ دھوکا نہیں کرتا مگر جب یہ دھوکے پر اتر آئے تو اس سے زیادہ خطرناک جانور کوئی نہیں ہوتا۔ جیسا کہ بدمعاش شیر ہے۔ جو ان دنوں ہمارے جانوروں کی تاک میں فارم کے اردگرد منڈلاتا رہتا ہے۔"

یہ شیر جس کا نام لوگوں نے پیڈی رکھ دیا تھا ہمارے فارم سے بارہ میل کے دائرے میں پھرتا رہتا تھا اور اکثر ہم اس کے دھاڑنے کی آواز سنا کرتے تھے۔ خاص طور سے جب وہ بھوکا یا اداس ہوتا تھا یا اس کا دھاڑنے کو دل چاہ رہا ہوتا تھا اور شاید اس کا دل اکثر دھاڑنے کو چاہتا تھا۔ ہم حیران تھے کہ وہ سوتا کس وقت تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شیر ایک کاہل اور سست جانور ہے جو دن رات کا بڑا حصہ سو کر گزارتا ہے۔ مگر پیڈی تو بے خوابی کا مریض لگتا تھا۔ وہ پورے قد و قامت کا جوان شیر تھا، اس کا جسم بھاری اور پٹھے سخت تھے۔ چہرے پر خوف ناک تاثرات اور آنکھوں میں چمک.... وہ اکثر ایلی گنگشن فارم کے اردگرد کھیتوں اور جنگلوں میں کسی شہنشاہ کی طرح چہل قدمی کرتا نظر آتا جو اپنی سلطنت کے معائنے کو نکلا ہو۔ وہ کبھی اس علاقے سے باہر نہیں گیا۔ پاپا نے بتایا کہ شیر کبھی اپنا آبائی علاقہ چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ خاص طور سے جو انسانی بو سے مانوس ہوں۔

"بیرل! تم ہمیشہ اس سے محتاط رہا کرو۔" پاپا نے کہا۔ "یہ ایک خبیث جانور ہے۔"

"حالانکہ یہ ایک بار ماما کے ہاتھوں جھاڑو کے ڈنڈے سے پٹ چکا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

پیڈی ایک بار ہمارے لان میں گھس آیا تھا جہاں میں اور ماما بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ وہ غراتا ہوا میری طرف بڑھا ہی تھا کہ ماما نے اس کی خبر لے ڈالی۔ وہ دم دبا کر بھاگ گیا اور میں جو ایک لمحے پہلے مارے خوف کے چیخیں بجا رہی تھی، ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی۔

پاپا نے سرد آہ بھر کر کہا "اس سے اپنی ماما کے بارے میں اندازہ لگالو، شیر تک اس سے ڈرتے تھے۔ خیر یہ ایک غیر فطری چیز ہے اور جو چیز غیر فطری ہو وہ ہمیشہ ہی خطرناک ہوتی ہے۔"

ہمارے گھوڑے فارم کے احاطے میں داخل ہوئے۔ وہاں خاصی رونق لگی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے اور پاپا کے گھوڑے باڑے سے باندھے اور ماما کی طرف لپکی جو ہمارے خوبصورت سے مکان کے طویل برآمدے میں میز پر چائے کیک اور بسکٹ سجائے بیٹھی تھیں۔ میں یہ سب دیکھتے ہی لرز اٹھی۔ مجھے کیک سے نفرت تھی اور ماما ہمیشہ مجھے اپنے بنائے ہوئے کیک کھلانے پر کمربستہ رہتی تھیں۔ اس سے بچنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ میں خاموشی سے وہاں سے کھسک جاؤں۔ خوش قسمتی سے ماما کچھ پڑوسیوں سے مصروفِ گفتگو تھیں۔ البتہ پاپا مجھے فرار ہوتے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

فارم بہت وسیع و عریض رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ دراصل ایک وادی تھی جسے پاپا نے فارم کی شکل دے دی تھی۔ یہاں مویشی، پرندے اور گھوڑے پالنے سے لے کر مختلف فصلیں اگانے اور ان کے بیج بیچنے تک کے مکمل انتظامات موجود تھے۔ ناریل کے درختوں کے پاس سے گزرتے ہوئے میری نگاہ بشن سنگھ پر پڑی۔ اس نے پُرجوش انداز میں مجھے سواحلی میں سلام کیا۔ وہ انڈیا کا سکھ تھا اور فارم پر مالی کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ گھوڑوں کی دیکھ بھال اور سائیسی بھی کرلیا کرتا تھا۔

"مس، زیادہ آگے مت جایئے گا۔" اس نے پکار کر کہا میں سر ہلا کر آگے بڑھ گئی۔ فارم کی اطراف کا علاقہ جنگل اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا اور اکثر پاپا اور میں یہاں شکار کھیلنے آتے تھے۔ یہاں ہرن، مور اور نیل گائے کا شکار مل جاتا تھا۔ میں فطرت کے نظاروں میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ میں فارم سے آگے نکل آئی ہوں۔ پاپا کہتے تھے کہ بیرل میں خالص انگلش ضد کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اگر اسے ضد چڑھ جائے تو پوری کیے بغیر نہیں رہتی۔ اس روز بھی میں نے بشن سنگھ کا انتباہ، شعوری طور پر نظرانداز کردیا اور تقریباً موت کے منہ میں جا پہنچی۔ ہوش

مجھے اس وقت آیا جب پیڈی مجھ سے بہ مشکل بیس گز دور رہ گیا تھا۔ وہ ایک جھاڑی تلے لیٹا تھا اور بدبخت حسبِ معمول جاگ رہا تھا۔ حالانکہ یہ شیروں کے سونے کا وقت تھا۔ مزید بدبختی یہ ہوئی اس نے مجھے دیکھ لیا اور اس کی آنکھوں میں جو وحشی چمک نمودار ہوئی اسے دیکھ کر میری گھگی بندھ گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے بے اختیار پلٹ کر دوڑ لگانے کی خواہش پر قابو پایا کیونکہ میں جانتی تھی کہ اس صورت میں پیڈی کو مجھ تک پہنچنے میں شاید چند سیکنڈ بھی نہ لگیں۔ وہ بہ دستور لیٹے اور سر اٹھائے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے ذہن پر زور دیا کہ ایسی صورتِ حال میں پاپا کی کیا ہدایات تھیں مگر پیڈی کے خوف سے میرا ذہن کورے کاغذ کی طرح صاف ہوگیا تھا۔ بہرحال، میں تقدیر پر بھروسا کر کے دبے قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔ اپنے خوف کو کم کرنے کے لیے میں ایک نغمہ گنگنانے لگی۔ میری نگاہ اس کی دم پر مرکوز تھی جو بالکل سیدھی زمین پر رکھی تھی۔ یعنی پیڈی فی الوقت غصے میں نہیں تھا اور نہ وہ مجھ سے خطرہ محسوس کر رہا تھا لیکن کم بخت مجھ میں دلچسپی ضرور محسوس کر رہا تھا۔ لہٰذا میرے پیچھے ہٹتے ہی وہ اٹھ کر سست روی سے میری طرف بڑھنے لگا۔

بدقسمتی سے وہاں کوئی اونچا درخت موجود نہیں تھا۔ صرف جھاڑیاں تھیں یا چند ایک ایسے درخت تھے جن پر اگر میں چڑھ بھی جاتی تو شیر کو مجھے لانے کے لیے چھلانگ وغیرہ لگانے کی زحمت بھی نہ کرنا پڑتی۔ وہ صرف پنجہ بڑھا کر مجھے کھینچ سکتا تھا۔ میری عافیت اسی میں تھی کہ پیچھے ہٹتی رہوں جس میں جس سست روی سے چل رہی تھی، پیڈی کو میرے نزدیک آنے میں چنداں دیر نہ لگتی۔ میرے پاؤں ایک ٹیلے سے ٹکرائے جس پر چڑھنے کے لیے مجھے لازماً مڑنا پڑتا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ پیڈی میری نگاہوں سے اوجھل ہو۔

کوئی چارہ نہ پا کر میں نے ہتھیار ڈال دیے اور اپنے اسکرٹ میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔ میں منتظر تھی کہ کب شیر کے پنجے مجھے چھوتے ہیں اور کب اس کے دانت مجھے بھنبھوڑتے ہیں کہ معجزانہ طور پر بشن سنگھ اس طرف آنکلا۔

اس نے ٹیلے سے شیر کو دیکھا اور چلا کر مدد طلب کرنے لگا۔ اس مداخلت پر پیڈی سخت برافروختہ ہوا اور خوف ناک انداز میں دھاڑنے لگا۔ مجھے موت آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگی۔ بشن کی پکار پر فوراً ہی دس بارہ فارم کے مزدور اپنے اوزار سنبھالے دوڑے چلے آئے۔ ان کے پیچھے جم اور میرے والد تھے۔ جن کے پاس دریائی گھوڑے کی کھال سے بنا ہوا ہنٹر تھا۔ وہ ایک وضع دار روایتی انگریز تھے جو سنگین ترین صورتِ حال میں بھی اپنا وقار ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، اپنی اکلوتی بیٹی کو خطرے میں دیکھ کر انہوں نے عجلت نہیں دکھائی، البتہ جم ایسے دوڑ رہا تھا جیسے افریقا کی تمام بدروحیں اس کے پیچھے لگی ہوں۔

مزدوروں میں سب سے آگے بوانا تھا۔ وہ ایک تنومند شخص تھا۔ بشن نے اسے شیر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کو کہا۔ اگرچہ یہ کام خودکشی سے کم نہ تھا مگر بہادر بوانا اسے کر گزرا۔ اس نے چند پتھر اٹھا کر شیر کو دے مارے، وہ دھاڑا اور بوانا کی طرف بڑھا۔ وہ بدحواس ہو کر پلٹا اور سب سے نزدیکی درخت کی طرف دوڑا۔ موقع پاتے ہی بشن سنگھ نے مجھے اٹھایا اور فارم کی طرف دوڑ لگادی۔

یوں میں اپنی زندگی میں پہلی بار مرتے مرتے بچ گئی۔ اس شام پاپا نے ایک چھوٹا موٹا جشن برپا کیا اور فارم کے تمام کارکنوں کی دعوت کی مگر انہیں دعوت میں شرکت کا موقع نہیں ملا کیونکہ اسی شام ناکام پیڈی نے جھلا کر ہمارے گھوڑوں کے فارم پر حملہ کیا اور دو گھوڑے مار ڈالے۔ پاپا سخت اشتعال میں اپنی سب سے بہترین بندوق لے کر روانہ ہوئے۔ جاتے وقت انہوں نے اعلان کیا کہ وہ اپنے مظلوم گھوڑوں کا انتقام ضرور لیں گے۔

وہ گھوڑوں کا انتقام تو کیا لیتے، رات کو پیڈی نے ان کے ایک اور عزیز گھوڑے کو اس جہانِ فانی سے کوچ کرادیا اور اگلے دن ہمارا سب سے طاقت ور بیل اس کی نذر ہوگیا۔ اس کے بعد پاپا نے فارم کی اطراف میں جابجا پھندے لگوادیے اور شامت کا مارا تیسرے ہی روز ایک پھندے میں جا پھنسا۔ پاپا نے اسے ہلاک کرنے کے بجائے ایک پنجرہ بنوا کر اس میں قید کردیا۔

اس کے پکڑے جانے کی خبر سنتے ہی علاقے میں جشن کا سماں ہوگیا کیونکہ علاقے کے لوگ اپنے مویشیوں کی ہلاکت سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ کئی روز تک ہمارے گھر میں پیڈی کی زیارت کے شائق افراد کا ہجوم رہا۔ شیر انہیں دیکھ کر غصے سے دھاڑتا اور پھر ایک کونے میں دبک کر بیٹھ جاتا۔

کچھ دنوں بعد پاپا نے اسے بے ہوش کر کے اس کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ بے چارہ پیڈی ایک بوڑھا شیر تھا۔ اس کے ناخن اور دانت گھس کر تقریباً ختم ہوگئے تھے۔ چستی اور طاقت میں بھی کمی آگئی تھی۔ جنگل کے تیز رفتار جانور اس کے ہاتھے نہیں چڑھتے تھے۔ اس لیے مجبوراً اسے اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے پالتو مویشیوں کو نشانہ بنانا پڑا جو وافر

تعداد میں تھے اور قابلِ رسائی بھی۔ کچھ عرصے بعد وہ ہم سے اتنا ہل گیا کہ اکثر لان میں ہمارے ساتھ چہل قدمی کرتا تھا۔ اگرچہ پاپا نے اس پر کبھی اعتبار نہیں کیا مگر پیڈی نے کبھی کوئی جارحانہ حرکت نہیں کی۔ وہ اب بلی کی طرح پالتو ہو گیا۔ افسوس کہ وہ زیادہ عرصے ہمارے پاس زندہ نہیں رہا۔

☆☆☆

پنجارو کا یہ فارم بے حد وسیع و عریض تھا مگر پہلے یہ فارم کہلائے جانے کا مستحق نہیں تھا۔ مشرقی افریقا میں یورپی باشندوں کے قدم نئے نئے پہنچے تھے اور وہ دھڑا دھڑ وہاں کی زرخیز اور سستی زمینیں خرید رہے تھے۔ پاپا نے بھی اس اجاڑ وادی کو سستے داموں خرید لیا۔ انہوں نے اس پر جان توڑ محنت کی۔ انہوں نے وادی سے جنگلی جھاڑیاں صاف کیں۔ بارود لگا کر چٹانیں اڑائیں اور ناہموار زمین کو درست کیا۔ یہ سارے کام انہوں نے تپتے سورج اور برستی بارش میں تن تنہا بغیر کسی مزدور کے کیے۔ اس وقت ان کی اتنی حیثیت ہی نہیں تھی کہ وہ مزدور رکھ سکتے۔

پاپا نے فارم کو فصلیں اور درخت لگانے سے لے کر جانور اور پرندے پالنے تک ہر چیز سے لیس کر دیا تھا۔ انہوں نے فارم میں جا بہ جا کیدار، ایجونے، مہاگنی، ٹیک اور بیمبو کے دیو قامت درخت لگائے۔ وادی کی ڈھلانوں پر انہوں نے چائے اور کافی کے پودے لگائے۔ شمالی حصہ گھوڑوں اور فارم مویشیوں کے لیے مختص تھا۔ وہیں قریب ہی ہمارا لکڑی کا چھوٹا سا مگر حسین ترین دو منزلہ گھر تھا۔ فارم کا وسطی اور جنوبی حصہ فصلوں کے لیے تھا۔ جہاں متعدد ڈچ مین ہل اور بیلوں کی جوڑی کے ساتھ زمین نرم کرتے نظر آتے تھے۔ کچھ عرصے بعد پاپا کے پاس رقم آئی تو انہوں نے دو پرانے اسٹیم انجن خرید کر ایک گرائنڈنگ مل بنالی۔ یہ مل سارا سال ہی کام کرتی تھی کیونکہ سال کے ہر حصے میں فارم سے کسی نہ کسی چیز کی فصل حاصل ہوتی رہتی تھی۔ ایک ننھی لڑکی کے لیے یہ کارخانہ ایک جادو سے کم نہ تھا جہاں ایک طرف سے سالم بیج ڈالے جاتے اور دوسری طرف سے ان کا پاؤڈر بن کر نکلتا تھا۔ مجھے اسٹیم انجن کی آواز اور چکی کے پسنے کی آوازیں بہت بھاتی تھیں اور میں گھنٹوں ان کے سُر تال پر سر دھنتی رہتی تھی۔ فارم خریدنے کے کچھ عرصے بعد میں پیدا ہوئی تھی اور جب میں چلنے پھرنے کے لائق ہوئی تو فارم پر سوائے ہمارے گھر کے کوئی قابلِ دید چیز نہیں تھی مگر آہستہ آہستہ اس کے خوبصورت خدوخال واضح ہوتے چلے گئے۔

جب پاپا نے گھوڑے پالنے شروع کیے تو ہمارے فارم پر صرف چند اسٹالز تھے جو کچھ عرصے بعد بڑھ کر ایک بڑے اصطبل کی شکل اختیار کر گئے۔ شروع کے دو گھوڑے بڑھ کر پہلے درجن بھر اور پھر سو سے بھی تجاوز کر گئے۔ یہ میرے پاپا کی گھوڑوں سے لازوال محبت کا نتیجہ تھا۔ اگر باقی فارم کے لیے انہوں نے محنت کی تھی تو گھوڑوں کی پرورش اور تربیت میں انہوں نے جان لڑا دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف کینیا بلکہ افریقا اور یورپ بھر کے ریس کورسوں میں پاپا کے گھوڑوں کی زبردست مانگ تھی۔

ہیڈ سائیس گروم صبح سویرے اٹھ کر گھنٹی بجاتا۔ اس کی آواز پورے فارم میں زندگی کی لہر دوڑا دیتی۔ ڈچ مین ہل ہانکتے کھیتوں کی طرف روانہ ہو جاتے۔ سائیس گھوڑوں سے لگ جاتے۔ گرائنڈ مل کے لڑکے اور مالی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے۔

میں اور میرا کتا بلر ایک ہی بستر پر محوِ استراحت تھے۔ جب ماما نے آ کر ہم دونوں کو اٹھایا۔ بلر نے نیم وا آنکھوں سے ماما کو دیکھا اور پھر سو گیا جبکہ میں اٹھ کر نہانے چلی گئی۔ میں واپس آئی تو بلر بدستور سو رہا تھا۔ وہ پرانی انگریزی نسل کا بل ٹیریر تھا۔ دوغلی نسل کا بلر ایک خوبصورت کتا نہیں تھا مگر میرا دعویٰ تھا کہ یہ افریقا کا سب سے زبردست شکاری کتا تھا۔ اس کے پنجے تیز اور دانت خوفناک تھے۔ بلر اس چیز سے لڑ سکتا تھا جو اس سے لڑنے کو تیار ہو جائے۔ اس نے کبھی مخالف کی جسامت اور طاقت کی پروا نہیں کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا سفید و سیاہ جسم زخموں کے متعدد نشانات سے سجا ہوا تھا۔ وہ بہت کھردرا، بہت سخت اور بہت باوقار کتا تھا۔ اس کی مجھ سے محبت بے مثال تھی اور میرے لیے تو وہ جہنم میں بھی چھلانگ لگا سکتا تھا۔

نہا کر واپس آ کے میں نے اپنی کھڑکی سے فارم کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا۔ سائیس اصطبل کا دروازہ کھول کر گھوڑوں کو باہر نکال رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ پاپا آج گھوڑوں کے نئے گروپ کی تربیت کا آغاز کریں گے۔ یعنی وہ آج شکار پر نہیں جائیں گے۔ تیار ہو کر میں نے سیٹی بجائی تو بلر یوں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا جیسے کبھی سویا ہی نہ تھا، میں نے بشن سنگھ کی تحفے میں دی ہوئی کرپان کمر سے باندھی اور اپنا نیزہ لیے باہر نکل آئی۔ فولادی پھل والا یہ ہلکا پھلکا نیزہ بھی مجھے بشن نے بنا کر دیا تھا اور یہ بالکل ان چھوا تھا۔ آج تک اسے استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ یہ سؤر کے شکار کے سیزن کا پہلا روز تھا۔ مجھے اردگرد سے کئی قبائل نے شکاری پارٹی میں شمولیت کی پیش کش کی تھی مگر میں نے

نانڈی گاؤں کے آراپ مانینا کو ترجیح دی۔ وہ علاقے کا سب سے بہادر اور بہترین شکاری تھا۔

نانڈی فارم سے چار میل شمال مغرب میں اونچی اونچی گھاس میں گھرا ہوا گاؤں تھا جہاں مقامی طرز کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ آراپ مجھے گاؤں سے باہر ہی مل گیا۔ وہ ایک ہاتھ میں گائے کے دودھ اور دوسرے ہاتھ میں بیل کے خون سے بھرا پیالہ لیے مشرق میں سورج کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سواحلی زبان میں مناجات پڑھتا جا رہا تھا "اے دیوتا! ہمارے بیلوں کے خون کو بڑھا جو شیروں کو طاقت ور بناتے ہیں اور ہماری گایوں کے دودھ کو بڑھا۔" یہ دودھ بڑھانے والی بات تو سمجھ میں آتی تھی مگر خون بڑھانے اور شیروں کو طاقت ور کرنے کا ذکر کس خانے میں فٹ ہوتا تھا میں کبھی نہیں سمجھ سکی تھی۔

بہرطور... یہ ان کی مذہبی رسم تھی جو ہر سال شکار شروع کرنے سے پہلے ادا کی جاتی تھی۔ میں بہ غور مناجات پڑھتے آراپ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سختی اور نرمی کا عجیب سا امتزاج تھا۔ وہ جوان اور طاقت ور شخص تھا جو اپنی طاقت اور شکار سے محبت کرتا تھا۔ مناجات ختم کر کے اس نے خون اور دودھ ایک گڑھے میں ڈال کر اس پر مٹی ڈال دی۔ مجھے دیکھ کر آراپ نے کہا۔

"ہم تیار ہیں لڑکی!" اس نے تلوار نکال کر اس کی دھار دیکھی۔

"میری ماں کی پیش گوئی ہے کہ ہمیں آج اچھا شکار ملے گا۔"

شکار پارٹی چار افراد پر مشتمل تھی۔ آراپ، اس کا بھائی مورانی، کاسوگی اور میں۔ ہاں ایک فرد اور بھی تھا یعنی بلر، بلکہ شکار پر جاتے ہوئے وہ ہم چاروں سے زیادہ پُرجوش تھا۔ چلتے ہوئے میرے چرمی جوتے چرچرا رہے تھے اور طویل اسکرٹ جھاڑیوں سے الجھ رہا تھا۔ بلر میرے نقشِ قدم سونگھتا میرے پیچھے آ رہا تھا۔ جلد ہی ہم وادیٔ رونگالی کے کنارے پہنچ گئے جو ہزار فٹ نشیب میں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

افریقی سؤر ایک دلیر اور حوصلہ مند جانور ہوتا ہے مگر یہ زیادہ ذہین نہیں ہوتا اور بعض اوقات حماقت کر جاتا ہے۔ اس وجہ سے شکاری اسے بہ آسانی مار گراتے ہیں۔ یہ اپنے بچوں اور علاقے کے بارے میں بہت حساس ہوتا ہے اور ذرا سی مداخلت پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت میں یہ شیر اور ہاتھی جیسے جانوروں کی بھی پروا نہیں کرتا اور جان لڑا دیتا ہے۔ ایسے وقت یہ بے حد خطرناک ہو جاتا تھا، اس کے نوکیلے اور خمیدہ دانت مخالف کے لیے مہلک ثابت ہوتے تھے۔ یہ سن کر آپ شاید حیران ہوں کہ ایسے خطرناک جانور کے شکار کے لیے ہمارے پاس صرف نیزے اور تلواریں تھیں۔ ہم میں سے کسی کے پاس بارودی ہتھیار نہیں تھے۔ دراصل سؤر کے شکار میں یہ زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوتے، سؤر کا شکار اس وقت ممکن ہے جب یہ آپ پر حملہ آور ہو اور آپ نیزے سے اسے چھید ڈالیں۔ وہ اتنی برق رفتاری سے حملہ کرتا ہے کہ بعض اوقات تو آدمی کو اپنے ہتھیار استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ میں پارٹی کی سب سے ناتجربہ کار رکن تھی اس لیے سب سے پیچھے تھی۔ مجھ سے پیچھے بلر تھا۔ اسے سؤر کے شکار کی مہارت تھی اور کئی بار وہ دست بہ دست لڑائی میں بری طرح زخمی ہوا تھا مگر کبھی اس کے جوش و خروش میں کمی نہیں آئی تھی۔ اسے شکار کی سنسنی پسند تھی اور وہ یوں اکڑ کر چل رہا تھا جیسے کوئی جنگجو دشمن کے مورچے کی طرف پیش قدمی کر رہا ہو۔

افریقی سؤر کم از کم چار سو پونڈ وزنی ہوتے ہیں۔ ان کی تھوتھنی گول اور آنکھیں بہت سفید ہوتی ہیں۔ ان کی دم نالی کے چوہے کی طرح سخت اور سیدھی رہتی ہے۔ یہ بے حد مشکوک جانور ہے۔ ہر چیز پر اور ہر وقت شک کرنا اس کی عادت ہے اور جس چیز پر انہیں شبہ ہو جائے، یہ اس سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ ان کے دوڑنے کی رفتار حیران کن ہوتی ہے اور کھلے میدان میں ان کا شکار تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ انہیں صرف گھیر کر ہی زیر کیا جا سکتا ہے لیکن احتیاط ضروری ہے۔ گھر جانے پر یہ برافروختہ ہو جاتا ہے اور ذرا سی غلطی سے زمین پر گرنے والے سؤر کے خون میں انسانی خون بھی شامل ہو جاتا ہے۔

ہمیں پہلا سراغ موتنگے بلا کے قریب گھاس کے وسیع میدان میں ملا۔ وہاں سے کسی سؤر کے چیخنے کی آواز آئی۔ شاید اسے ہماری بُو مل گئی تھی اور وہ دوسروں کو خبردار کر رہا تھا۔ بڑے سؤر کے مقابلے میں بچہ سؤر زیادہ پھرتیلا ہوتا ہے اور یہ رکے بغیر اپنا رخ بھی موڑ لیتا ہے۔ اس کی چیخ سنتے ہی ہم نے اپنے نیزے تان لیے اور چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ بچے کی چیخ سن کر اس کے بزرگ ہوشیار ہو گئے تھے اور اب کسی وقت بھی ہم پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ توقع کے باوجود پہلا سؤر بالکل اچانک ہی نمودار ہوا۔ گھاس سے نکلتے ہی اس نے سر جھکایا اور خرخراتا ہوا مورانی کی طرف دوڑا۔ وہ شاید غصے سے اندھا ہو رہا تھا۔ مورانی نہایت آرام سے

ایک طرف ہٹ گیا۔ اس کے قریب سے گزر کر سُور مانتیا کے سامنے جا پہنچا۔ اس نے اپنا نیزہ سُور کے تومند جسم میں گھونپ کر اس کا خاتمہ کردیا پھر مانتیا نے ٹارزن کی طرح چیخ مار کر مسرت کا اظہار کیا۔

اس اثنا میں دوسرا سُور کوسوکی پر حملہ آور ہوا اور باقیوں نے شاید راہِ فرار اختیار کی کیونکہ فوراً بلر بھونکتا ہوا گھاس میں گھس گیا۔ میں اور آراپ اس کے پیچھے دوڑے۔ گھاس قدِ آدم سے کہیں اونچی تھی اور تین گز سے آگے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ ہم بلر کی آواز کی رہنمائی میں دوڑے جارہے تھے۔ یونہی بھاگتے ہوئے تین میل کا فاصلہ طے کرلیا۔ معاً گھاس کا میدان ختم ہوگیا اور ہم نے خود کو ایک پہاڑی کے دامن میں ایک غار کے سامنے پایا۔ بلر اس طرف منہ کیے زور شور سے بھونک رہا تھا۔ سُور غار میں جاچھپے تھے۔ کچھ دیر بعد سورانی اور کوسوکی بھی ہم سے آملے۔

مانتیا شکار کیے سُوروں کی حفاظت کے لیے چلا گیا کہ موقع پا کر کہیں دوسرے جانور انہیں چٹ نہ کرجائیں۔ سُور اس بری طرح پسپا ہوئے تھے کہ وہ ہماری تمام تر کوششوں کے باوجود غار سے باہر آنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ بلر کے بھونکنے کے علاوہ ہم لوگوں نے بھی خاصا شور مچایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔

آخر میں نے کہا ”غار میں پتھر پھینکنے پڑیں گے۔“

سورانی یہ تجویز سن کر کانپ اٹھا، بولا ”یہ بہت خطرناک کام ہے۔ غار سیدھا نہیں ہے۔ پتھر پھینکنے کے لیے اس کے منہ پر جانا پڑے گا۔ نہیں مس، کوئی اور ترکیب بتاؤ۔“

دوسری ترکیب کا کام میں نے ان پر چھوڑ دیا۔ وہ دونوں کچھ دیر سر جوڑے بحث کرتے رہے اور آخرکار میری بات ماننے پر بادلِ ناخواستہ تیار ہوگئے۔ پتھر پھینکنے کا کام سورانی کے سپرد ہوا۔ وہ سست روی سے غار تک گیا اور ابھی اس نے ایک ہی پتھر پھینکا تھا کہ جیسے بھونچال آگیا۔ پھنکارتے اور خوخیاتے سُور نہایت اشتعال کے عالم میں باہر نکلے۔ میں سورانی کے پیچھے تھی۔ سُوروں کے دوڑنے سے اتنی دھول مٹی اڑی کہ کچھ دیر کے لیے فضا دھندلا گئی۔ بلر، سورانی، حتیٰ کہ میرے نیزے کی انی بھی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ کوئی چیز زن سے میرے قریب سے گزری اور میں بال بال بچی۔ یہ ایک کٹاری نما دانتوں والا سُور تھا جو بھاگتا ہوا جاکر گھاس میں روپوش ہوگیا۔ میں بری طرح بدحواس ہوگئی۔ سُور میرے قریب ہی دوڑ رہے تھے مگر نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ ہر لمحے یوں لگ رہا تھا کہ ابھی گرد و غبار سے کوئی غضب ناک سُور برآمد ہوکر اپنے دانت میرے پیٹ میں گاڑ دے گا۔ اس دھند میں، میں نیزہ بھی استعمال نہیں کرسکتی تھی کہ وہ کہیں بلر یا سورانی کو نہ لگ جائے۔ جیسے ہی آخری سُور بھی گھاس میں غائب ہوا، بلر بھونکتا ہوا ان کے عقب میں لپکا۔

میں نے اسے چیخ کر روکا۔ سورانی غار کے دہانے پر زخمی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی دائیں ران میں آٹھ انچ لمبا اور انچ بھر گہرا شگاف نظر آرہا تھا۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ میں نے اپنا مفلر پھاڑ کر اس کے زخم پر باندھ دیا۔ کچھ دیر بعد خون رک گیا۔ میرے پکارنے پر بلر واپس آگیا تھا۔ اس نے سورانی کا زخم سونگھا اور پُرتشویش انداز میں بھونکا پھر وہ غضب ناک ہوکر واپس گھاس میں اس طرف دوڑا جہاں سُور غائب ہوئے تھے۔ وہ اتنے غصے میں تھا کہ میرے پکارنے پر بھی واپس نہ آیا۔

”سورانی! تم چل سکتے ہو؟“ میں نے پریشان ہوکر کہا ”بلر خودکشی کرنے گیا ہوا ہے۔ سُور اکیلا پا کر اسے مار دیں گے۔“

سورانی پھیکے انداز میں مسکرایا ”کیوں نہیں مس! تم فکر مت کرو۔ یہ زخم میری حماقت کا نتیجہ ہے۔ میں واپس چلا جاؤں گا۔ تم جاکر بلر کو دیکھو۔ ویسے بھی سورج ڈوبنے میں زیادہ وقت نہیں رہا۔ جلدی کرو مس! میں جاکر مانتیا اور کوسوکی کو بھیجتا ہوں۔“

گھاس میں گھستے ہی میرے اعصاب تن گئے۔ گھاس سخت اور دھاری دار تھی۔ کھلے حصوں پر بلیڈ کی طرح لگ رہی تھی۔ یہاں نظر کام نہیں کررہی تھی۔ میں تمام تر توجہ سماعت پر لگا کر ارد گرد کی آوازوں کو سننے کی پوری کوشش کررہی تھی اور نیزے کو مضبوطی سے تھامے محتاط قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔ فضا پر عجیب سا تناؤ تھا۔ جیسے کہیں کچھ ہورہا ہو۔ معاً بلر کے جارحانہ انداز میں بھونکنے کی آواز آئی۔ میں احتیاط اور خوف کو بالائے طاق رکھ کر اندھادھند آواز کی سمت دوڑی۔ اس وقت میرے لیے بلر سے زیادہ اہم چیز کوئی اور نہیں تھی۔ معاً میری نگاہ کچلی ہوئی گھاس پر پڑے خون کے تازہ قطروں پر پڑی۔ اب بلر کمزور اور اذیت کے احساس کے ساتھ بھونک رہا تھا۔ میں ایک بار پھر محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگی۔ خون کے قطرے بڑھتے جارہے تھے پھر یہ دھبوں میں تبدیل ہوگئے۔

معاً بلر ایک بار بھونک کر خاموش ہوگیا۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ میں بےتحاشا دوڑی۔ اس وقت میں سُور و ں سے کھلا ہدف تھی۔ میری بےقرار نگاہیں بلر کو تلاش کررہی

زلزلوں سے پہلے جانوروں پر کیا بیتی

زلزلے کا ملک	تاریخ/مقام اور شدت	مشاہدے کا وقت	کیفیت
چین	18 جولائی 1969ء، تیکن سن زو، 7.4	دو گھنٹے	شیر پریشان اور سست تھے، ہمالیائی ریچھ چیخے چلائے، کچھوے بے چین رہے، یاک نے کھانا پینا چھوڑ دیا، راج ہنس پانی سے دور رہے۔
چین	4 فروری 1975ء، ہے چنگ، 7.3	ڈیڑھ ماہ پہلے ایک دو دن پہلے بیس منٹ پہلے	سُوروں نے کھانا پینا بند کردیا اور دیواروں پر چڑھ گئے۔ کچھوے پانی سے باہر آگئے اور چلانے لگے۔ سانپوں نے بل چھوڑ دیے۔
جاپان	11 نومبر 1855ء	ایک دن پہلے	جنگلی بلیاں چلائیں، چوہے غائب ہوگئے۔
جاپان	3 مارچ 1933ء، سانریکو، 8.5	ایک ہفتہ پہلے دو تین دن پہلے ایک دن پہلے چند گھنٹے پہلے	چوہے بالکل غائب ہوگئے۔ چوہے اور بلیاں خلافِ معمول خاموش اور گم صم تھے۔ مرغابیوں نے اپنے مسکن خالی کردیے۔ بطخیں اپنے دڑبوں سے دور رہیں۔
اٹلی	5 فروری 1783ء، کیلیبریا	وقت نوٹ نہیں کیا گیا	قازیں زور زور سے آوازیں نکالنے لگیں۔ کتے مسلسل اور ناقابلِ برداشت آواز سے بھونکتے رہے حتیٰ کہ انہیں گولی مار کر خاموش کرنا پڑا۔
چلی	20 فروری 1835ء، کنسپشن	ایک گھنٹا چالیس منٹ پہلے	آبی پرندوں کے غول اندرونِ ملک پرواز کرگئے۔
امریکا	18 اپریل 1906ء، سان فرانسسکو، 8.3	ایک رات پہلے چند سیکنڈ پہلے	کتے ساری رات بھونکتے رہے۔ گھوڑے ...... خوفناک آواز میں ہنہنائے اور بھگدڑ مچ گئی! بلیاں لوگوں کے سامنے تڑپنے لگیں۔
جرمنی	3 جولائی 1910ء، لینڈزبرگ	دو منٹ	شہد کی تمام مکھیوں نے بے چین ہوکر چھتے چھوڑ دیے اور زلزلہ آنے کے پندرہ منٹ بعد واپس چھتے میں آگئیں۔

تھیں۔ دوڑتے ہوئے مجھے ایک گرے ہوئے درخت کے تنے کے پیچھے حرکت کا احساس ہوا میں نے جھک کر دیکھا تنے کے نیچے خون کا تالاب سا بنا ہوا تھا اور کچھ دور بلر بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے جسم پر کمر سے سر تک ایک خوفناک چیرا تھا جو یقیناً کسی سؤر کے دانت سے بنا تھا۔ سؤر گھنی جھاڑیوں میں موجود تھے اور تنے کے پیچھے پڑے بلر پر غرا رہے تھے۔ سب سے پہلے ایک بوڑھے سؤر کی نظر مجھ پر پڑی۔ ایک اور شکار کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھل اٹھیں۔ وہ خرخیاتا ہوا میری طرف لپکا۔ میں غیر ارادی طور پر ایک طرف ہٹی اور جیسے ہی وہ میرے نزدیک آیا میں نے اپنا نیزہ ٹھیک اس کے دل میں اتار دیا۔ سؤر گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ اسے تڑپنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ باقی سؤر اس کا انجام دیکھ کر فرار ہو گئے۔ اگر وہ مجھ پر حملہ کرتے تو میرے لیے دفاع کرنا بھی مشکل ہو جاتا۔

میں نیزہ سؤر کے جسم میں چھوڑ کر نم آنکھوں سے بلر کے پاس آ بیٹھی۔ وہ زندہ تھا اور ہوش میں تھا۔ اس نے خود کو گھسیٹ کر اپنا سر میری گود میں رکھ دیا اور دھیرے سے اپنی زبان میرے ہاتھ پر پھیرنے لگا۔ بلر تقریباً نوے پونڈ وزنی تھا اور میرے لیے اسے اٹھا کر سات میل دور فارم تک لے جانا ممکن نہیں تھا اور میں اسے وہاں اکیلا چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتی تھی کیونکہ سورج ڈوبتے ہی اس علاقے پر شیروں اور چیتوں کا راج شروع ہو جاتا تھا۔ وہ بلر کو زخمی اور اکیلا پاکر اسے تر نوالہ سمجھ کر کھا جاتے۔ اگرچہ شیر یا چیتے کے مقابل میں اس کی حفاظت کس طرح کر سکتی تھی لیکن پھر مجھے خود اپنی بقا کا مسئلہ لاحق ہو جاتا۔ اس کے باوجود میں بلر کو تنہا چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ میرے پاپا کا قول تھا کہ مصیبت کے وقت اپنے دوست کو اکیلا چھوڑ دینے والا شخص بزدل ہوتا ہے اور میں بزدل نہیں کہلانا چاہتی تھی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں دوسروں کا انتظار کرتی۔

تاریکی بڑھتی جا رہی تھی، تنے کے عین سامنے مردہ سؤر پڑا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ جلد یا بدیر درندے اس کی طرف متوجہ ہو جائیں گے اور پھر میری خیر نہیں۔ معاً سامنے گھاس سے سرسراہٹ کی آواز آئی جیسے کوئی جاندار اس میں سے گزر رہا ہو۔ بلر خوف کے مارے سکڑ سا گیا۔ میں نے اس کا سر زمین پر رکھا اور سرک کر تنے سے باہر نکل آئی۔ مردہ سؤر کے جسم سے نیزہ نکال کر میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ کوئی دائیں جانب تھا ...... مگر کون؟ جانور یا انسان؟ سرسراہٹ قریب آتی جا رہی تھی، میں نے نیزہ تان لیا۔

"لڑکی! تم کہاں ہو؟" معاً ماٹینا کی آواز گونجی۔ میں مسرت سے اچھل پڑی اور چلا کر بولی۔

"ہم ادھر ہیں ماٹینا!"

فوراً ہی گھاس سے غصے سے بھرا ہوا ماٹینا نمودار ہوا اور غرا کر بولا "تم اکیلی ہو لڑکی!" پھر اس کی نگاہ میرے کپڑوں پر لگے خون پر پڑی اور اس کا لہجہ پُرتشویش ہو گیا "تم زخمی ہو میری بچی! یہ مورانی کہاں مر گیا، اس نے تمہیں اکیلا کیسے چھوڑ دیا؟ میں نے اس پر اعتماد کیا اور وہ تمہیں جنگل میں چھوڑ کر غائب ہو گیا۔"

"وہ بُری طرح زخمی ہے۔ سؤر کے دانت سے اس کی ران پر بڑا زخم لگا ہے۔"

ماٹینا مزید خفا نظر آنے لگا۔ "وہ کوئی بچہ نہیں ہے جو ذرا سا زخم بھی نہ سہہ سکے۔ وہ جوان ہے اور جنگجو ہے اور اسے زیادہ محتاط ہونا چاہیے تھا۔"

کچھ دیر بعد اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو بولا "اب آرام سے بیٹھ جاؤ۔ جب آدھی رات کو چاند چمکنے لگے گا تو ہم بلر کو فارم تک لے جائیں گے۔"

پھر میں نے اسے ساری رُوداد سنا دی اور اس نے میری بہادری کی داد دی مگر ساتھ ہی وہ بار بار واپس جا کر مورانی کی خبر لینے کا اعلان کرتا جو مجھے اکیلا چھوڑ گیا تھا۔ اس نے اپنی تلوار سے گھاس کاٹ کر بستر بنایا جس پر میں لیٹ گئی۔ بلر کا سر میں نے اپنے بازو پر رکھ لیا۔ کچھ دیر بعد شیر کی گرج سنائی دی اور جنگل بھانت بھانت کے جانوروں کی آوازوں سے گونجنے لگا۔

افریقہ میں جنگل جاگ اٹھا تھا۔ اس دوران ماٹینا پوری چوکسی سے پہرا دے رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ آج کا دن بھرپور گزرا اور انہوں نے درجن بھر سؤر شکار کیے تھے۔ ان میں سے چھٹا حصہ میرا تھا۔ معاً ہی دن بھر کی تھکن مجھ پر حملہ آور ہوئی اور میں سو گئی۔ ماٹینا نے مجھے جھنجوڑ کر بیدار کیا۔ وہاں کو سوئی اور کئی دوسرے افراد بھی آ گئے تھے۔ انہوں نے کپڑے اور ڈنڈے کی مدد سے بلر کے لیے جھولا بنایا اور ہم چاندنی کی روشنی میں واپس فارم پر لوٹ آئے۔ پاپا نے بلر کے زخم صاف کر کے اس کی ڈریسنگ کر دی۔ ایک لمبی مدت اس نے لیٹ کر گزاری اور اس کے زخم بھرنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ ایک روز اس نے میرا نیزہ مجھے پکڑایا اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگا، وہ شکار پر چلنے کی فرمائش کر رہا تھا۔ میرا دل رو اٹھا۔ کیونکہ بلر اب شکاری کتا نہیں رہا تھا، اس کی زندگی کا شکاری دور ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ صرف ایک گھریلو کتا تھا۔

قاتل

اے ایس صدیقی

جرم وسزا کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جرم کو کتنا ہی مخفی رکھا جائے لیکن قانون کے ہاتھ سزا دینے کے لیے مجرم کی گردن تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔

وہ ہفتے کی رات تھی۔

اس وقت گیارہ بج کر تیس منٹ ہوئے تھے جب ہلکے سرمئی رنگ میں ملبوس وہ ناٹے قد کا آدمی تھانے میں داخل ہوا تھا۔ وہ سیدھا انسپکٹر کے کمرے میں گیا اور اعتراف کیا کہ سن سیٹ بولی وارڈ کے علاقے میں جن حسین عورتوں کی لاشیں آج دوپہر اور شام میں ملی ہیں، ان کا قاتل وہی ہے۔

ڈیوٹی آفیسر لانگ نے اس سے بات کرتے ہوئے سوچا، یہ شخص کوئی خبطی ہے۔ دنیا کے تمام بڑے شہروں میں ہونے والی قتل کی وارداتوں میں اکثر و بیشتر پولیس کا سابقہ ایسے لوگوں سے پڑتا ہی رہتا ہے جو ذہنی مریض ہوتے ہیں اور علی الاعلان اس بات کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ وہی قاتل ہیں۔ ان کی اس حرکت کے پیچھے بہت سے عوامل ہوتے ہیں۔ بعض محض سستی شہرت کے لیے یہ حرکتیں کرتے ہیں اور کبھی کبھار اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کے ذہن کے نہاں خانوں

میں سزا کی کوئی پوشیدہ خواہش بھی اس کا محرک ہوتی ہے۔

بہرحال یہ کام لانگ کا نہ تھا کہ وہ اس گہرائی میں جائے۔ اس نے اس آدمی کو کانسٹیبل کے پاس چھوڑا جس کا نام رچرڈ تھا پھر وہ میٹر جورڈن کے کمرے میں چلا گیا۔

"جناب، میرے پاس ایک آدمی آیا ہے، وہ اپنے آپ کو آج قتل ہونے والی تین عورتوں کا قاتل کہہ رہا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص واقعی قاتل ہے یا کوئی ذہنی مریض۔"

میٹر جورڈن نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا قلم میز پر رکھ دیا۔ وہ کوئی رپورٹ لکھ رہا تھا۔

"وہ خود یہاں آیا ہے؟"

لانگ نے اثبات میں سر ہلایا "جی ہاں۔"

"نام کیا ہے؟"

"اس کے بیان کے مطابق اس کا نام اینڈریو نیوٹن ہے۔"

"کیا کہتا ہے وہ؟"

"فی الحال تو اس نے بس اسی قدر بتایا ہے کہ یہ تینوں قتل اسی نے کیے ہیں۔ ابھی میں نے زیادہ باتیں نہیں کی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میٹر نے کہا "ذرا ریکارڈ چیک کرلوں، فائلوں میں تو اس کا نام نہیں، اس کے بعد اسے سوال جواب کے کمرے میں پہنچاؤ، میں بات کروں گا اس سے۔"

اس کے جانے کے بعد میٹر جورڈن نے تھکے انداز میں اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ وہ لانبے قد کا جوان العمر آدمی تھا۔

اس نے وہ فولڈر کھینچ کر اپنے سامنے کرلیا جس میں ان تینوں قتل کی وارداتوں کی ابتدائی رپورٹس تھیں۔ یہ رپورٹس سرسری سی تھیں۔ بولی وارڈ تھانے کی ٹیلیفونک گفتگو، مقامی لیب کی رپورٹس وغیرہ۔

پہلی لاش جو دستیاب ہوئی تھی، وہ جینیٹ نامی عورت کی تھی۔ اسے اس کی پڑوسن نے چار بجے کے قریب دیکھا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی رہائش گاہ تھی۔ عورت کے سر پر کسی ایسے آلے سے ضربات لگائی گئی تھیں جو چپٹا اور دھار دار تھا۔

دوسری لاش لیونا نامی عورت کی تھی۔ اسے بھی کوئی پانچ بجے اس کی پڑوسن نے ہی دریافت کیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا کاٹیج تھا جو ساحل سمندر سے نزدیک تھا۔ یہاں بھی عورت کے سر پر جو ضربات تھیں اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آلۂ قتل چپٹے سرے والا کوئی دھار دار سا آلہ تھا۔

تیسری لاش ساڑھے چھ بجے ملی تھی، مقتولہ کا نام ایلن ڈینیل تھا۔ یہ اس کے ایک ملاقاتی نے دیکھی تھی۔ یہ لاش کیبن نما ایک معمولی درجے کے مکان سے ملی تھی جو ساحل سمندر کے مغربی حصے میں بنا ہوا تھا۔ یہاں بھی آلۂ قتل کے طور پر کوئی چپٹے سرے والی چیز استعمال کی گئی تھی۔

ان تینوں وارداتوں کے سلسلے میں انہیں ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ نہ ہی ان کے درمیان کوئی باہمی رشتہ لگتا تھا سوائے اس کے کہ طریقۂ قتل یکساں تھا جس سے شبہ ہوتا تھا کہ قاتل کوئی ایک ہی ہے۔

تینوں عورتیں عمر میں تیس پینتیس سال سے زائد عمر کی نہ تھیں، تینوں کا تعلق مڈل کلاس سے تھا۔

تینوں تنہا رہتی تھیں۔ کسی کے بھی عزیزوں کا کوئی علم ابھی تک نہیں ہوا تھا۔

تینوں کے شوہروں کے بارے میں معلوم ہوا تھا کہ وہ کسی ایسے کام سے منسلک تھے جن میں باہر سفر کرتے رہنا پڑتا تھا۔ تفتیشی آفیسر کی رپورٹ کے مطابق وہ گھروں سے باہر گئے ہوئے تھے۔

اس کیس کی کڑیاں مربوط تھیں۔ اخبار والوں نے اسے کسی جنونی کا کام قرار دیا تھا اور خیال ظاہر کیا تھا کہ اس طرح کے مزید قتل بھی ہونے کے امکانات ہیں۔

میٹر جورڈن ایک ذمے دار اور فرض شناس انسان تھا اس نے فولڈر بند کر کے ایک طویل سانس لی۔

اور...... اب یہ اینڈریو نامی آدمی تھا جس نے آ کر ایک اور معما بنا دیا تھا۔

سوال و جواب کے کمرے میں کانسٹیبل رچرڈ آنے والے آدمی کے ساتھ موجود تھا۔

اندر پہنچ کر لانگ اس شخص اینڈریو کے دائیں جانب جا کھڑا ہوا اور کانسٹیبل بائیں جانب۔ میٹر نے وہاں پڑی ایک لوہے کی تنگ میز کے سرے پر خود کو تھوڑا سا ٹکا لیا۔

اینڈریو کا چہرہ گول تھا اور وہ صورت سے کسی بھی طرح کوئی قاتل نہیں لگتا تھا۔ اس نے سلیقے سے کپڑے پہن رکھے تھے۔ عمر میں وہ کوئی چالیس سال کا تھا۔ اس نے آنکھوں میں سنہرے فریم کا چشمہ لگا رکھا تھا۔

میٹر نے جیب سے ایک بال پوائنٹ نکالا اور اسے اپنے گال سے مس کرتے ہوئے خاموشی توڑی۔ اس کی عادت تھی، سوال و جواب کرتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی چیز ضرور رکھتا تھا۔

"میرا نام جورڈن ہے۔" اس نے کہا "میں یہاں میٹر ہوں۔ مسٹر اینڈریو، تم کسی قانونی مشیر کے بغیر میرے سوالوں کے جواب دینا پسند کرو گے؟"

"جی!"

میٹر نے کہا "ٹھیک ہے تو تمہارا نام اینڈریو نیوٹن ہے۔"

"جی!"

"رہائش!"

"اسی علاقے میں۔"

"پتا؟"

"نائن اسٹریٹ۔ گرین وچ اپارٹمنٹ!"

"ملازمت کرتے ہو؟"

"جی۔"

"کہاں؟"

"میں خود مختار طور پر کام کرتا ہوں، ایک مشیر ہوں۔"

"کس چیز کے؟"

"کمپیوٹر لینگویج ڈیزائن کرتا ہوں۔"

"تمہاری آمدنی کیا ہے؟"

"چالیس پچاس ہزار تک۔"

میٹر کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔ وہ سوچ رہا تھا یہ شخص جس پیشے میں ہے وہاں ذہانت پہلی شرط ہوتی ہے اور یہ ایک معزز کلاس کا آدمی ہے۔ وہ یہاں ایک قاتل بن کر آیا تھا۔ معاملہ بڑا عجیب سا تھا۔ اور ایک اور بات بھی اس کے ذہن میں کلبلا رہی تھی۔ آخر ان عورتوں کو قتل کرنے کی وجہ کیا تھی؟

"مسٹر اینڈریو، تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"اعتراف کے لیے۔ میں یہ بات انہیں بتا چکا ہوں۔"

اس نے لانگ کی طرف اشارہ کیا۔

"کس اعتراف کی بات کر رہے ہو؟"

"وہ قتل جو ہوئے ہیں۔"

"کون سے قتل؟"

اینڈریو نے لمبی سانس لی "میں بولی وارڈ کے علاقے میں مردہ پائی جانے والی تین عورتوں کی بات کر رہا ہوں۔"

"تم تینوں کے سلسلے میں آئے ہو؟"

"ہاں۔"

"ہوسکتا ہے کوئی اور لاش بھی ہو جو ہمیں ابھی نہ ملی ہو؟"

"نہیں، بس یہی تین تھیں۔"

"تم خود کو ہمارے حوالے کرنے آئے ہو؟"

"ہاں، ان کا قاتل میں ہی ہوں۔"

اینڈریو چند لمحے خاموش رہا پھر وہ آہستہ سے بڑبڑایا "مگر شاید بات اسی قدر نہیں۔ میں آج گولڈن پارک میں گیا تھا، سوچ میں غرق تھا، یہ دوپہر کی بات ہے۔ میں سوچ رہا تھا اور پریشان تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں زیادہ عرصے تک بچا نہیں رہوں گا۔ میں بھاگ سکتا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح بھاگوں؟ دراصل میں بہت سے کام محض ترنگ میں آکر کر جاتا ہوں۔ یہ قتل بھی ایسی ہی ذہنی رو میں ہوئے تھے...... اگر میں ذرا سا سوچ لیتا تو یہ حرکت کبھی نہ کرتا کیونکہ یہ ایک نہایت فضول حرکت تھی۔"

پولیس آفیسروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر

میٹرز نے پوچھا "تم نے یہ قتل کس طرح کیے تھے؟"
"کیا مطلب؟"
"تم نے انہیں کس چیز سے ہلاک کیا تھا؟"
"کدو کش سے...... یہ لکڑی کے فریم میں تھا۔ عورتیں اس سے سبزیاں وغیرہ چھیلتی ہیں۔"
کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ تینوں پولیس والوں کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ جو بات آلۂ قتل کے بارے میں اُلجھی ہوئی تھی، وہ اب بہت واضح ہو گئی تھی۔
"تم نے اس کدو کش کا کیا، کیا؟"
"پھینک دیا تھا۔"
"کہاں؟"
"راستے میں، جھاڑیوں کے ادھر۔"
"تمہیں وہ جگہ یاد ہے؟"
"شاید۔"
"تمہیں اس کی نشاندہی کرنی ہوگی۔"
"ٹھیک ہے۔"
"ایلین نامی عورت...... کیا یہ آخری عورت تھی؟"
"ہاں۔"
"تم نے اسے کہاں قتل کیا تھا؟"
"اس کے بیڈ روم میں۔"
"تم نے پہلے کسے مارا تھا؟"
"جینیٹ کو۔"
"تم نے اسے باتھ روم میں ہلاک کیا تھا؟"
"نہیں...... کچن میں۔"
"اس نے کیا پہنا ہوا تھا؟"
"پھول دار ساڑی۔"
"تم نے اسے بے لباس کیوں کیا تھا؟"
"بے لباس... نہیں تو۔"
"آخری عورت کو تم نے کہاں قتل کیا تھا...... وہ بھی کچن میں تھی؟"
"نہیں، وہ کمرے میں بیٹھی قمیص میں بٹن ٹانک رہی تھی۔" اداسی سے اس آدمی نے بتایا۔
میٹرز نے اسے افسردگی سے دیکھا۔ وہ اب مطمئن ہو رہا تھا' یہ آدمی کوئی ذہنی مریض نہ تھا۔ یہ قتل اسی نے کیے ہوں گے۔ اس نے متعدد سوالات ایسے کیے تھے جو انجانے آدمی کے بس کے نہ تھے مگر اس آدمی نے سب کے درست جواب دیے تھے۔ اس نے وہ باتیں بھی صحیح بتائی تھیں جن کے بارے میں پولیس نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ کیس اس طرح ایک بالکل آسان سا کیس کہا جا سکتا تھا۔ تقریباً ہر بھید کھل گیا تھا۔ مستقبل میں کسی دوسری واردات کا امکان بھی نہیں رہا تھا۔
میٹرز کی نگاہیں افسردگی سے اس شخص کو دیکھ رہی تھیں جو معقول سا تھا۔ شریف اور معزز بھی تھا اور خاصا ذہین ہونے کے باوجود اس نے تین عورتوں کو جان سے مار دیا تھا۔
مگر کیوں......؟
میٹرز کا ذہن اب اسی سوال کے اردگرد گھوم رہا تھا۔
"مسٹر اینڈریو! تم نے ان عورتوں کو کس لیے ہلاک کیا؟" بالآخر اس نے یہ سوال پوچھ ہی لیا۔
اس کے مخاطب نے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر اسے تر کیا اور بولا "دیکھیے...... میں بے حد آسودہ تھا، بہت مطمئن...... اور خوش۔ میری زندگی بامعنی زندگی تھی۔ میرے سامنے ایک منزل تھی۔ مجھے ذہنی اور جسمانی آسودگی جو مجھے ملی ہوئی تھی...... پھر...... پھر ایکدم سے مجھے لگا تھا کہ مجھ سے یہ سکون، یہ لطف، یہ آسودگی چھننے والی ہے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ یہ عورتیں مجھ سے وہ سب کچھ چھین لینے والی ہیں جنہیں میں نے بڑے جتن سے حاصل کر رکھا تھا۔" رک کر اس نے اپنے ہاتھوں کو گھورا اور بولا "پھر ان میں سے ایک کو حقیقت کا پتا چل گیا تھا۔ پتا نہیں کس طرح۔ پھر اس نے اسے بقیہ دونوں پر منکشف کر دیا۔ آج جب میں جینیٹ کے پاس گیا تو اس نے مجھ سے کہا کہ وہ تینوں مل کر اب میرے معاملے کو آگے لے جانے والی ہیں۔ بس، میرا دماغ تپ اٹھا تھا۔ میں نے پہلے ہی کہا کہ بعض اوقات میں بہت سے کام کسی ذہنی رو میں بہہ کر کر جاتا ہوں۔ یہاں بھی یہی ہوا تھا۔ میں نے پھر کچھ نہیں سوچا تھا۔ میں نے کدو کش اٹھایا تھا اور پھر اسے مارتا ہی چلا گیا تھا۔ اس کے بعد......" اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور نظریں جھکاتے ہوئے بولا "اس کے بعد میں وہاں سے چلا تھا اور پھر میں نے بقیہ دونوں عورتوں کو بھی مار ڈالا۔ میں یہ سب کچھ اس طرح کرتا گیا تھا جیسے کوئی خواب میں کرتا ہے۔"
"مسٹر اینڈریو! ہم تمہاری بات اچھی طرح سمجھ نہیں سکے۔" میٹرز نے کہا "ان تینوں عورتوں سے تمہارا کیا تعلق تھا؟ اور تم کس حقیقت کے انکشاف کی بات کر رہے ہو؟"
کمرے کی چھت پر لگی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں اینڈریو نیوٹن نامی آدمی کی آنکھوں میں دو آنسو ابھرے۔ جیسے دو ننھے ننھے موتی...... اور اس نے مری مری آواز میں کہا "وہ...... وہ تینوں...... میری بیویاں تھیں۔"

جال

سید احتشام

اس دنیا میں کیسے کیسے لوگ اور کیسی کیسی وارداتیں ہورہی ہیں۔ لوگ خود کو عقلِ کُل سمجھتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ جرم سے قانون بہت بڑا ہے

منوج پارداسانی ایک معزز شخص تھا۔ نیو مارکیٹ میں اس کی موبائل کی بہت بڑی دکان تھی۔ اس کے پاس دولت بھی تھی اور سماج میں اس کی عزت بھی تھی۔ اس کا کاروبار ایسا تھا کہ اس کی دکان پر مرد، عورت بھی آتے تھے۔ شینکی نے جو دھمکی دی تھی اس کا اثر اس کے کاروبار پر بھی پڑ سکتا تھا۔ بات کاروبار اور عزت کی تھی اس لیے منوج بے حد پریشان تھا۔ چنانچہ کافی سوچ بچار کے بعد، اس سے پہلے کہ شینکی تھانے میں رپورٹ درج کرانے جاتی خود اس نے ساری سچائی پولیس سے بیان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
اپنے اس فیصلے کے تحت منوج پارداسانی بھوپال کے تھانے ٹی ٹی نگر جا پہنچا۔ جب اس نے اپنی پریشانی تھانہ انچارج امیش تیواڑی کو بتائی تو وہ بھی ہکا بکا رہ گئے۔
"صاحب، پیسوں کی اتنی چنتا نہیں جتنی چنتا عزت کی ہے۔ شینکی اور اس کے پریمی گریش نے میرے دن کا چین اور رات کی نیند حرام کر دی ہے۔ صاحب، مجھے اس بات کا اتنا دکھ نہیں ہے کہ انہوں نے مجھ سے دو لاکھ روپے ٹھگ لیے ہیں۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ دونوں دوست بن کر میرے جیون میں آئے اور اب اس جیون کو انہوں نے جہنم..."
امیش نے منوج کی بات ختم ہونے پر کہا "ہم ہر طرح سے آپ کی مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اب آپ بتائیے کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟"
"صاحب، میں ان دونوں سے کسی بھی طرح نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ ان دونوں نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔ صاحب، شینکی نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں اسے پچاس ہزار روپے نہیں دوں گا تو وہ چھیڑ چھاڑ کرنے کے الزام میں مجھے جیل میں بند کرا دے گی۔ اس نے کہا ہے کہ روپوں کا بندوبست ہوتے ہی میں اسے فون کروں۔"
"تو پھر دیر کس بات کی۔ ابھی اسے فون ملاؤ اور کہو کہ روپے تیار ہیں، وہ کب لینے آ رہے ہیں؟" امیش تیواڑی نے کہا "اس طرح دونوں رنگے ہاتھوں پکڑے

جائیں گے۔"

منوج نے امیش تیواڑی کے دفتر ہی سے شیتل کو فون ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی تو تھانے دار امیش تیواڑی کی ہدایت پر سب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا گیا اور منوج نے اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف سے جیسے ہی شیتل کی ہیلو کی آواز آئی، منوج نے نمستے کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے رقم کا بندوبست کرلیا ہے۔ اب آپ یہ بتایئے کہ آپ رقم لینے کب آ رہی ہیں؟"

"میں کسی پنڈت سے مہورت پوچھ کر تو کام کرتی نہیں، جب من ہوگا، آ جاؤں گی۔"

شیتل کی اس بات سے امیش تیواڑی پریشان ہو گئے۔ دراصل وہ حتمی وقت جاننا چاہتے تھے جس سے انہیں شیتل اور گریش کو پکڑنے میں آسانی ہوتی۔ اس لیے انہوں نے جب اس بارے میں منوج کو سمجھایا تو اس نے کہا "شیتل، آپ وقت بتا دیتیں تو مجھے آسانی ہوتی کیونکہ دوپہر کے بعد مجھے کاروبار کے سلسلے میں باہر جانا ہے۔"

"تمہیں کاروبار کے سلسلے میں باہر جانے سے تو میں آپ کو روک نہیں سکتی کیونکہ روپے کمانا ضروری ہے۔ روپے کماؤ گے نہیں تو دو گے کہاں سے؟ ٹھیک ہے، میں بارہ بجے تک رقم لینے آ جاؤں گی۔ اگر کسی وجہ سے میں نہ آ سکی تو آپ کو فون کر دوں گی۔" کہہ کر شیتل نے فون کاٹ دیا۔

منوج نے ریسیور رکھ کر امید بھری نظروں سے تھانے دار امیش تیواڑی کو دیکھا۔ انہوں نے اپنا پورا منصوبہ اسے سمجھاتے ہوئے یقین دلایا کہ پولیس اس کی ہر طرح سے مدد کرے گی۔ وہ دونوں کسی بھی طرح پولیس کے ہاتھوں سے بچ نہیں سکیں گے۔

منوج اٹھا اور ان کا شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد امیش تیواڑی نے اپنی کارروائی شروع کی۔ سب سے پہلے تو انہوں نے اس معاملے کی جانکاری پولیس انسپکٹر جے دیپ پرشاد کے ساتھ ساتھ ایس ایس پی روچی سری واستو اور... ایس پی گوپال بھنڈیل کو دی۔ تب پولیس انسپکٹر جے دیپ نے تھانے دار امیش تیواڑی کو ہدایت کی کہ یہ معاملہ پوری طرح بلیک میلنگ کا ہے اس لیے اس بات کا خاص دھیان رکھیں کہ دونوں کسی بھی حالت میں بچ کر جانے نہ پائیں۔ پھر امیش تیواڑی نے پولیس انسپکٹر جے دیپ کی ہدایت کے مطابق شیتل اور گریش کو پکڑنے کی پوری تیاری کرلی۔

اگلے دن 20 جون 2009ء کو شیتل اور گریش کو دبوچنے کی تیاری کرنے کے لیے ایس ایس پی روچی سری واستو صبح ہی تھانہ ٹی ٹی نگر آ گئی تھیں۔ ان کی ہدایت کے مطابق ایک لیڈی پولیس اور ایک مرد کو سادہ کپڑوں میں گاہک کے بھیس میں ہی منوج کی دکان پر بٹھانے کا فیصلہ کیا گیا۔ باقی پولیس ٹیم تھوڑی دوری پر کھڑے رہ کر ان کے اشارے کا انتظار کرتی۔

☆☆☆

ادھر اپنے وقت پر منوج نے اپنی دکان کھول لی تھی۔ گیارہ بجے شیتل نے فون کر کے منوج سے کہا کہ وہ آدھے گھنٹے میں رقم لینے پہنچ رہی ہے۔ منوج نے فون کے ذریعے یہ اطلاع تھانے دار امیش تیواڑی کو دی تو وہ پندرہ منٹ میں پوری تیاری کے ساتھ نیو مارکیٹ پہنچ گئے۔ گاہک کے روپ میں سادہ کپڑوں میں آنے والے دونوں پولیس والے منوج کی دکان میں جا کر بیٹھ گئے۔ باقی لوگ دکان سے تھوڑی دوری پر آڑ میں کھڑے ہو کر شیتل اور گریش کا انتظار کرنے لگے۔

پندرہ، بیس منٹ کے بعد ایک اسمارٹ نوجوان لڑکی ایک خوبرو نوجوان کے ہمراہ منوج کی دکان میں داخل ہوئی۔ پولیس والوں کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ دونوں شیتل اور گریش ہیں پھر پولیس الرٹ ہو کر اشارے کا انتظار کرنے لگی۔ اُدھر شیتل اور گریش نے جیسے ہی منوج کی دکان میں قدم رکھا، منوج نے کھڑے ہو کر بلند آواز میں کہا "آؤ، آؤ گریش بھائی، بیٹھو۔"

گریش کا نام سنتے ہی دکان میں گاہک کے بھیس میں سادہ کپڑوں میں موجود پولیس اہلکاروں کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شکار آ گیا ہے۔ پھر ان میں سے ایک نے اپنے موبائل فون سے تھانے دار امیش تیواڑی کو مس کال دے دی۔ یہ شیتل اور گریش کے دکان میں آنے کا اشارہ تھا۔ اشارہ پاتے ہی پل بھر میں پوری کی پوری پولیس ٹیم نے دکان میں گھس کر شیتل اور گریش کو گھیر لیا۔

خود کو پولیس میں گھرا پا کر شیتل اور گریش حیران رہ گئے۔ گریش کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا لیکن شیتل نے انگریزی میں پوچھا "آپ لوگوں نے ہمیں کیوں گھیر رکھا ہے؟"

"آپ کو حراست میں لینے کے لیے۔" تھانے دار امیش تیواڑی نے جواب دیا۔

"کیوں؟ میں نے ایسا کیا، کیا ہے کہ آپ لوگ مجھے حراست میں لیں گے؟" شیتل فرانٹے سے انگریزی میں بولی۔

"آپ نے ایک بھلے آدمی کو بلیک میل کیا ہے۔ آپ اس وقت بھی اسے ٹھگنے ہی آئی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے نہ جانے کتنے لوگوں کو بلیک میل کیا ہوگا۔ ہم آپ کو ٹھگنے اور بلیک میل کرنے کے الزام میں حراست میں لے رہے ہیں۔"

"شاید آپ مجھے نہیں جانتے، آپ لوگوں کی اس بدتمیزی کی شکایت میں آپ کے ایس پی سے کروں گی۔"

"میڈم! انگریزی بولنے والے کو نہ پکڑا جائے، ایسا کوئی فرمان ہمارے ایس پی صاحب کا نہیں ہے اس لیے آپ چپ چاپ ہماری جیپ میں بیٹھیں اور تھانے چلیں۔" امیش تیواڑی نے کہا "ورنہ ہمیں اپنے حساب سے دونوں کو تھانے لے جانا پڑے گا۔"

تھانے دار امیش تیواڑی کی اس دھمکی سے مجبور ہو کر شیتل اور گریش پولیس جیپ میں جا بیٹھے۔ پولیس انہیں لے کر تھانہ ٹی ٹی نگر پہنچی۔ تھانے میں جب ان سے پوچھ گچھ کی جانے لگی تو دونوں خود کو بے قصور ظاہر کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی گریش نے منوج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ آدمی میری منگیتر کو فون کر کے فحش باتیں کرتا تھا۔ ہم لوگ اسی سلسلے میں بات کرنے کے لیے اس کی دکان پر گئے تھے۔ اپنی غلطی کو چھپانے کے لیے اس نے الٹا ہمیں ہی ٹھگ بنا کر پھنسا دیا ہے۔"

"کون کیا کرتا تھا، کس نے کسے پھنسایا ہے، ہمیں سب پتا ہے۔" امیش تیواڑی نے کہا "اب بھلائی اسی میں ہے کہ آپ لوگ شرافت سے سچائی اگل دیں۔"

تھانے دار امیش تیواڑی کی اس بات کے جواب میں اور اپنے پریمی گریش کی حمایت میں شیتل کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اچانک ایس ایس پی روچی سری واستو کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہیں اپنے سامنے پا کر شیتل چپ ہو گئی۔ روچی سری واستو بھی انہیں دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ انہوں نے شیتل پر نظریں گاڑ کر کہا "اچھا، تو یہ تم دونوں ہو۔ ویسے مجھے پہلے سے ہی اندازہ تھا کہ اس واقعے کے پیچھے تمہی دونوں ہو گے۔"

☆☆☆

روچی سری واستو کے سامنے آنے پر نہ صرف ان دونوں کی بولتی بند ہو گئی تھی بلکہ ان کے چہرے لٹک گئے تھے۔ روچی سری واستو کی باتیں سن کر اور ان کے سامنے آتے ہی شیتل اور گریش کے چپ ہو جانے پر تھانے دار امیش تیواڑی ششدر رہ گئے تھے۔ انہوں نے حیرت سے روچی سری واستو کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوئیں "آپ لوگ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ مجھے دیکھ کر یہ دونوں چپ کیوں ہو گئے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اور میرا اس سے پہلے بھی آمنا سامنا ہو چکا ہے۔ انہیں میں نے پہلے بھی ایک نوجوان کو ٹھگتے دیکھا ہے۔ یہ دونوں شاطر ٹھگ ہیں۔ اسی دن میں ان کے خلاف کوئی کارروائی کر پاتی کہ اس سے پہلے ہی یہ دونوں فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔"

دراصل کچھ دنوں پہلے ایس ایس پی روچی سری واستو تھانے حبیب گنج عام وزٹ کے لیے گئی تھیں۔ وہ اپنی گاڑی سے اتریں تو دیکھا کہ تھانے کی حدود میں شیتل اور گریش ایک موٹر سائیکل سوار کو دھمکا رہے تھے۔ گریش کا کہنا تھا کہ موٹر سائیکل سوار نے اس کی منگیتر شیتل کو زخمی کر دیا تھا جبکہ شیتل کہیں سے بھی گھائل نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ تب روچی سری واستو نے گریش سے کہا تھا کہ وہ واقعہ کی رپورٹ تھانے میں لکھوا دے۔ قانون کے مطابق کارروائی ہوگی۔

اتنا کہہ کر وہ اندر چلی گئی تھیں۔ کافی وقت بیت گیا لیکن شیتل یا گریش اندر نہیں آئے تو انہوں نے دونوں کے بارے میں پتا کروایا۔ تب پتا چلا کہ شیتل اور گریش نے اس موٹر سائیکل سوار کو ڈرا دھمکا کر پانچ ہزار روپے وصول کر لیے تھے۔ اس کے بعد روچی سری واستو نے ان دونوں کی ہی نہیں بلکہ اس موٹر سائیکل سوار کی تلاش میں پورے ضلع کی پولیس لگا دی تھی لیکن کسی کا کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔

روچی سری واستو کے سامنے آنے پر شیتل اور گریش کی بولتی بالکل بند ہو گئی تھی۔ اس کے بعد پولیس نے ان سے پوچھ گچھ کی تو انہوں نے اپنا جرم قبول کر لیا۔ پھر انہوں نے جو کہانی سنائی، وہ چونکا دینے والی ایک الگ طرح کی کہانی تھی۔ شیتل اور گریش کے بیانات کے مطابق ان کا مقصد لوگوں سے رقم اینٹھ کر صرف موج مستی کرنا تھا۔

☆☆☆

شیتل تومر، اندور کے بی سیکٹر کی رہنے والی تھی۔ اس کے باپ مسٹر جگدیش تومر، اندور کے ایک معروف جیولری شوروم میں برسوں سے منیجر تھے۔ اپنی ایمانداری اور اصول پسندی کی وجہ سے ان کا شمار معزز لوگوں میں ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ جگدیش تومر فیملی میں بیوی شانتی کے علاوہ دو بچے تھے، جس میں بیٹا راجندر اور بیٹی شیتل تھی۔ فیملی چھوٹی اور خوشحال تھی جس کی وجہ سے جگدیش اور شانتی نے اپنے بچوں کو بڑے ہی

لاڈ و پیار سے پالا تھا۔ بیس سالہ شیتل اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی اور اس کے سپنے بھی اعلیٰ تھے۔ کہتے ہیں کہ اگر لڑکی میں خوبصورتی کے ساتھ شرم وحیا بھی ہو تو اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگ جاتے ہیں جبکہ اگر لڑکی کو اپنی سندرتا پر گھمنڈ ہو جائے تو یہ گھمنڈ اسے نقصان ہی پہنچاتا ہے۔

شیتل کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ سندر شیتل کانونیٹ میں پڑھی ہوئی تھی اور فراٹے سے انگریزی بولتی تھی۔ وہ محنت کے بغیر ہی دنیا کا سارا عیش وآرام حاصل کرنا چاہتی تھی جبکہ اس کے ماں باپ چاہتے تھے کہ وہ پڑھ لکھ کر کوئی افسر بنے۔ شیتل جیسی تیز طرار تھی اور اس میں جتنی خود اعتمادی تھی، اس سے جگدیش تومر کو پوری امید تھی کہ ایک دن ان کی بیٹی ضرور افسر بنے گی لیکن ہوا اس کے الٹ۔

شیتل کو جتنا اپنی قابلیت پر گھمنڈ تھا، اس سے کہیں زیادہ اپنے حسن وجمال پر فخر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ اسکول سے اپنی تعلیم مکمل کرکے کالج میں گئی تو اونچی اڑان بھرنے لگی۔ اسی دوران اسے یہ احساس ہونے لگا کہ اسے پانے کے لیے اس کے ہم جماعت کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ پھر اس میں مادّی عیش وعشرت کی ہوس جاگ اٹھی۔ مادہ پرستانہ سوچ کی وجہ سے وہ اپنے ہم جماعتوں سے اس طرح مسکرا کر باتیں کرتی کہ اگر وہ اسے گھمائیں پھرائیں، اس پر پیسے خرچ کریں تو وہ ان کی ہو سکتی ہے۔ اس طرح وہ اپنی خوبصورتی کو کیش کرانے لگی۔

لیکن یہ سب کتنے دنوں تک چلتا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کے کلاس فیلو اس کی اس ادا کو بھانپ گئے۔ انہیں احساس ہو گیا کہ وہ صرف پیسے کی یار ہے۔ پھر دھیرے دھیرے ایک ایک کرکے سبھی نے کنارہ کر لیا۔ اسی دوران شیتل کو اس بات کا احساس ہوا کہ اگر وہ چاہے تو اپنے حسن کی بدولت ڈھیروں روپے کما سکتی ہے۔ اب تک اس کے سبھی کلاس فیلو اس سے دور بھاگنے لگے تھے، اس لیے شیتل اب شہر میں ایسے رئیس نوجوانوں کو ڈھونڈنے لگی جو اس پر اپنی دولت لٹا سکتے۔ کسی بھی نوجوان کو اپنے حسن کے جال میں پھنسانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ نوجوان پھنس جاتا تو وہ اس سے اس کے موبائل فون پر باتیں بھی کرتا تھا۔ اسی بات کا شیتل فائدہ اٹھاتی۔ پھر وہ اسے دھمکی دیتی کہ وہ فون پر فحش باتیں کرنے اور چھیڑ چھاڑ کرنے پر اس کے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کرائے گی۔ اگر وہ جیل جانے سے بچنا چاہتا ہے تو اسے موٹی رقم دے۔

شیتل کے جال میں پھنسا نوجوان مجبور ہو جاتا۔ شیتل کے موبائل پر اس کے فون کرنے کا ریکارڈ موجود ہوتا ہی تھا۔ پھر اس نوجوان کو اپنا پنڈ چھڑانے کے لیے شیتل کی مانگ پوری کرنی ہی پڑتی تھی۔ دھیرے دھیرے شیتل کو اس میں مزہ آنے لگا تھا۔ کیوں نہ مزہ آتا؟ گھومنے پھرنے، تفریح کرنے، اعلیٰ ہوٹلوں میں کھانے پینے کے ساتھ اسے موٹی رقم جو مل رہی تھی۔ یہ سب کرتے ہوئے، اس کی اتنی ہمت بڑھ گئی تھی کہ اگر کوئی اس کے خلاف کچھ بولنے کی جرأت کرتا تو وہ مار پیٹ پر اتر آتی۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کے خلاف تھانے میں رپورٹیں درج ہونے لگیں۔ پھر تو وہ نوجوانوں کے حلقوں میں گفتگو کا موضوع بن گئی۔ اب شہر کے نوجوان بھی اس سے بچنے لگے تھے۔ اس طرح وہ اندور میں بدنام ہونے لگی۔ ہر طرف اس کے چرچے ہونے لگے۔

☆☆☆

بات تھانے تک پہنچی تو شیتل کے کارنامے اس کے ماں باپ کے علم میں بھی آگئے۔ شروع میں تو انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ ان کی بیٹی ایسا بھی کر سکتی ہے۔ لیکن سچائی کو کیسے جھٹلایا جا سکتا تھا۔ سچائی معلوم ہونے کے بعد ماں باپ نے اپنا سر پیٹ لیا۔ انہوں نے اپنی نازوں پلی بیٹی کے بارے میں جو سپنے دیکھے تھے، سب بکھر گئے تھے۔ انہوں نے بیٹی کو سمجھانا شروع کیا۔ اس پر دباؤ بھی ڈالنے لگے۔ اب تک شیتل اندور پولیس کی نظروں میں آگئی تھی۔ وہ بھی اس پر دباؤ ڈالنے لگی تھی۔ گھر والوں اور پولیس کے دباؤ سے پریشان ہو کر شیتل نے اندور چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب اس نے ماں باپ کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ شہر سے باہر جا کر شاید شیتل سدھر جائے۔ جگدیش اور شانتی نے بیٹی کو سمجھا بجھا کر بھوپال بھیجا تھا۔ شیتل نے بھی ماں باپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ آئندہ ایسا کوئی کام نہیں کرے گی جس سے ان کے دل کو ٹھیس پہنچے۔ بیٹی کے اس وعدے پر انہیں یہ امید بندھ گئی تھی کہ شیتل اب اپنے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہو جائے گی۔

☆☆☆

پچھلے سال جون کے مہینے میں شیتل اندور چھوڑ کر بھوپال آگئی تھی۔ یہاں وہ اپنے دور کے رشتے کے ایک بھائی دھرمیندر کے ساتھ رہنے لگی.... شیتل نے شہر بھلے بدل دیا تھا لیکن فطرت نہیں بدلی تھی۔ کچھ دن اسے اس نئے شہر کو سمجھنے میں لگے۔ پھر جب وہ شہر کے ماحول کو سمجھ گئی تو پیسے

کمانے کا اپنا پرانا طریقہ اختیار کر لیا۔

یہاں وہ شام کو سڑک پر گھومنے نکلتی پھر کسی موٹر سائیکل یا کار سے اس طرح ٹکرا جاتی جیسے موٹر سائیکل سوار یا کار والے نے ہی غلطی سے اسے ٹکر ماری ہے۔ پھر اس گاڑی والے... کو ڈرا دھمکا کر موٹی رقم وصول کر لیتی۔

اسی طرح آتے جاتے ایک دن شیتل کی نظر گریش رہبانی پر پڑی۔ 26 سالہ گریش، بھوپال کے قصبہ بورا گڑھ کے رہنے والے شیتل داس کا بیٹا تھا۔ شیتل داس کی بورا گڑھ میں اسٹیشنری کی دکان تھی۔ گریش ان کا ہاتھ بٹانے کے لیے دکان پر بیٹھتا تھا۔ شیتل کی نظر گریش پر پڑی تو وہ اسے نرم چارا لگا۔ اس نے گریش کو بھی شکار کرنے کا ارادہ کر لیا لیکن جب وہ اسے شکار کرنے کے لیے اس کے پاس پہنچی تو خود ہی شکار ہو گئی۔ گریش نے اس سے اس انداز سے بات کی کہ شیتل کا اس پر دل آگیا۔ تب اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

دراصل بھوپال میں اسے ایک سہارے کی سخت ضرورت تھی۔ پھر یہ جس طرح راہ گیروں کو اپنا شکار بناتی تھی، اس میں اسے ایک شریک کار کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک سے دو ہونے پر کسی کو دھمکانے میں آسانی رہتی۔ اس کے لیے شیتل کو گریش ایک دم مناسب لگا تھا۔ پھر تو شیتل گریش کی دکان کے چکر لگانے لگی۔ شیتل کے چکر لگانے کا مقصد سمجھنے میں گریش کو دیر نہیں لگی۔ پھر وہ شیتل کے آنے پر گرم جوشی سے اس کا سواگت کرنے لگا۔

دونوں نے ایک دوسرے کے دل کی بات جانی اور پھر انہیں ایک دوسرے کے نزدیک آنے میں دیر نہیں لگی۔ شیتل کو گریش کی ضرورت تھی، اس لیے اس نے اپنی طرف سے تعلقات کی ڈور ڈھیلی چھوڑ دی۔ دونوں ساتھ گھومنے پھرنے لگے اور پھر گریش، شیتل کی لچھے دار باتوں اور اس کے حسن کے جال میں ایسا الجھا کہ اس نے دکان پر بیٹھنا لگ بھگ بند ہی کر دیا۔ شیتل، گریش کو اپنی راہ پر لگانا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے گریش کے سامنے ہی کسی کو لوٹنے کا ارادہ کر لیا۔

☆☆☆

ایک شام شیتل، گریش کے ساتھ سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ گریش تو شیتل سے رومینٹک باتوں میں مصروف تھا جبکہ شیتل کی نظر سڑک پر آنے جانے والی گاڑیوں پر تھی۔ اسی دوران میں اس کی نظر ایک ایسے موٹر سائیکل سوار پر پڑی جو دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا۔ اس کے قریب آتے ہی شیتل جلدی سے گریش سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اس موٹر سائیکل سے اس طرح ٹکرا گئی کہ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر تو شیتل نے چیخ چیخ کر بھیڑ اکٹھا کر لی۔ وہ اس نوجوان پر چھیڑ چھاڑ کرنے کا الزام لگا رہی تھی۔

یہ سب دیکھ کر گریش حیران تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا کیونکہ اس نے دیکھا تھا کہ شیتل جان بوجھ کر اس نوجوان سے ٹکرائی تھی لیکن وہاں صورت حال ایسی تھی کہ وہ سچائی بیان نہیں کر سکتا تھا۔ معاملے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔ موٹر سائیکل سوار، شیتل کے الزامات سے ڈر گیا تھا اس لیے جب شیتل نے اس کا کالر پکڑ کر تھانے چلنے کی دھمکی دی تو وہ کانپنے لگا۔ اس نے گڑگڑا کر کہا "میڈم! آپ کا جو بھی نقصان ہوا ہے، وہ میں پورا کرنے کو تیار ہوں۔ آپ یہ معاملہ یہیں ختم کر دیجیے۔"

اور پھر اس کے پاس جتنی بھی رقم تھی نکال کر اس نے شیتل کو تھما دی۔ اس طرح معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ نوجوان چلا گیا تب شیتل مسکرا کر گریش سے مخاطب ہوئی "روپے کمانے کا یہ بہترین طریقہ ہے ناں؟"

"طریقہ تو بڑھیا ہے، لیکن اس میں خطرہ بھی تو ہے۔" گریش نے حیرانی کے ساتھ کہا۔

"کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہر آدمی اپنی بے عزتی سے ڈرتا ہے۔ دیکھا نہیں، تھانے چلنے کی دھمکی دی تو اس نے جھٹ روپے نکال کر دے دیے۔"

"اگر وہ تھانے چلنے کے لیے تیار ہو جاتا تو...؟" گریش نے کہا۔

"تو پولیس میری نہ سنتی ناکہ اس کی؟ تھانے میں پولیس والے اسی کو دو چار تھپڑ لگاتے۔ اس لیے کوئی بھی بھلا آدمی تھانے جانے سے ڈرتا ہے۔"

شیتل نے اسے سمجھایا پھر گویا ہوئی "اگر تم بھی میرا ساتھ دیتے اور اسے دو چار ہاتھ جڑ دیتے تو وہ کچھ اور بھی دیتا۔"

"تب تو پیسے کمانے کا اس سے بڑھیا اور آسان طریقہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔" گریش نے شیتل سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

اس دن کے بعد شیتل اور گریش روزانہ رات کو ملتے اور پیدل ہی سڑک پر چل دیتے۔ موقع دیکھ کر شیتل کسی گاڑی سے ٹکرا جاتی، اس کے بعد دونوں کار یا موٹر سائیکل سوار پر چھیڑ چھاڑ کا الزام لگا کر تھانے چلنے کی دھمکی دیتے۔ ڈر کر کار یا موٹر سائیکل سوار وہیں معاملہ رفع دفع کرنے کو کہتا اور سمجھوتے کے نام پر شیتل اور گریش اس سے موٹی رقم اینٹھ

لیتے۔ اس طرح ان کی اچھی خاصی کمائی ہو جاتی۔ اس کمائی سے دونوں موج کرتے۔

اس کے علاوہ شیتل نے کمائی کا ایک اور آئیڈیا سوچا۔ دراصل وہ اپنے اس دھندے کو وسعت دینا چاہتی تھی۔ اپنی کمائی بڑھانے کے لیے اس نے جو ترکیب سوچی، وہ یہ تھی کہ وہ کسی رئیس نوجوان سے دوستی گانٹھتی، یہ دوستی تھوڑی بڑھتی تو شیتل اپنا موبائل نمبر اسے دے دیتی۔ پھر اس نوجوان کے فون آنے لگتے۔ اس کے بعد اچانک ایک دن اس نوجوان کے پاس گریش پہنچ جاتا اور اس پر الزام لگاتا کہ وہ اس کی محبوبہ سے فون پر فحش باتیں کرتا ہے۔ وہ نوجوان یہ سن کر گھبرا جاتا اور معاملہ رفع دفع کرنے کو کہتا۔ معاملہ رفع دفع کرنے کے لیے گریش اس سے منہ مانگی رقم وصول کر لیتا۔

اس طرح شیتل اور گریش کی وارداتیں بڑھنے لگیں۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کا چرچا شہر بھر میں ہونے لگا اور بات پولیس تک جا پہنچی۔ شیتل کے گھر والے تو دور سے تھے لیکن گریش تو اپنے ماں باپ کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ بیٹے کے کرتوتوں سے ان کی بدنامی بھی ہو رہی تھی اور پریشانی بھی۔ گریش کی ان حرکتوں سے تنگ آ کر انہوں نے اسے گھر سے نکال دیا لیکن اس بات کا گریش پر کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ اب تک بے فکری کی زندگی جینا اور موج مستی سے رہنا اس کا اصول بن چکا تھا۔ اس کا ایک ہی مقصد تھا، لوگوں کو ٹھگنا اور اس رقم سے موج کرنا۔

☆☆☆

گریش کا ایک شناسا تھا، منوج پاروا سانی۔ گریش کو معلوم تھا کہ منوج بہت پیسے والا ہے۔ نیو مارکیٹ میں منوج کی موبائل کی دکان تھی۔ ایک دن اُدھر سے گزرتے ہوئے گریش اس کی دکان پر چلا گیا۔ شیتل بھی اس کے ساتھ تھی۔ شناسا ہونے کے ناتے منوج نے گریش اور شیتل کی کافی آؤ بھگت کی۔ منوج کی اس آؤ بھگت سے شیتل بہت متاثر ہوئی۔ بات چیت کے دوران شیتل نے منوج کو اپنا موبائل نمبر دے دیا اور اس کا نمبر لے لیا۔

کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد شیتل اور گریش وہاں سے چلے گئے۔ شیتل نے منوج کا ٹھاٹ باٹ دیکھا تھا، اس لیے گریش سے اس کے بارے میں تفصیل سے پوچھا اور سب کچھ جاننے کے بعد اسے شکار کرنے کا ارادہ کر لیا۔ منوج سے اس کی جان پہچان ہو ہی گئی تھی، اس لیے وہ اکثر اس کی دکان پر جانے لگی۔ کبھی وہ اکیلے ہوتی تھی اور کبھی گریش اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ اب تک منوج، شیتل سے کافی متاثر ہو چکا تھا۔ شیتل نے سوچا کہ اب شکار چارا نگلنے کو تیار ہے چنانچہ اس نے ایک دن منوج کو بتایا کہ اس کے ایک شناسا ملک سے باہر جا رہے ہیں اس لیے اپنا سامان اونے پونے دام میں بیچ رہے ہیں۔ ان کے پاس لیٹسٹ ماڈل کی ایک کار بھی ہے جسے وہ دو لاکھ روپے میں بیچ رہے ہیں۔ اگر وہ کار خریدنے کا خواہش مند ہو تو وہ اسے وہ کار دلوا سکتی ہے۔

منوج کار خریدنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اسے گریش اور شیتل کے ساتھ کار دیکھنے جانا تھا لیکن ایک دن اچانک شیتل، منوج کی دکان پر پہنچی۔ اس وقت منوج دکان میں بہت مصروف تھا۔ شیتل نے اس سے کہا کہ اس کا وہ شناسا آج ہی بیرونِ ملک جا رہا ہے۔ اگر اسے کار لینی ہے تو ابھی دو لاکھ روپے دے دے۔ منوج کو شیتل پر اتنا بھروسا تھا کہ اس نے کچھ سوچے سمجھے اور کار دیکھے بغیر دو لاکھ روپے شیتل کو تھما دیے۔ اس کے بعد نہ تو اس کے پاس کار آئی اور نہ ہی شیتل اور گریش نے شکل دکھائی۔

جب منوج کو احساس ہوا کہ اسے ٹھگ لیا گیا ہے تو وہ شیتل سے اپنے روپے واپس مانگنے لگا۔ کچھ عرصے تک شیتل اور گریش اسے ٹالتے رہے لیکن جب منوج نے روپے واپس کرنے کے لیے دونوں پر دباؤ ڈالا تو شیتل نے اسے دھمکی دی کہ وہ اسے پچاس ہزار روپے ادا کرے ورنہ وہ چھیڑ چھاڑ کرنے کے الزام میں اسے جیل بھجوا دے گی۔

اس کی اس دھمکی سے منوج ڈر گیا۔ اپنی رقم کی واپسی کا تقاضا کرنا تو در کنار، وہ خود کو بچانے کی کوشش کرنے لگا لیکن شیتل اور گریش اس کے پیچھے پڑ گئے۔ جب اسے بچنے کی کوئی راہ نظر نہ آئی تو اس نے پولیس کی مدد لینے کا فیصلہ کر لیا اور اسی فیصلے کے تحت وہ تھانہ ٹی ٹی نگر جا پہنچا جہاں تھانے دار امیش تیواڑی نے اپنی سوجھ بوجھ سے شیتل اور گریش کو رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا تھا۔

پولیس نے شیتل اور گریش کو گرفتار کر کے ان کے خلاف مجریہ 658/09 کی دفعات 420,349 اور 34 کے تحت مقدمہ درج کر کے 21 جون 2009ء کو عدالت میں پیش کیا اور پوچھ گچھ کے لیے ان کا جسمانی ریمانڈ مانگا۔ عدالت نے انہیں دو دن کا ریمانڈ دے دیا۔ پوچھ گچھ کے بعد شیتل اور گریش کو دوبارہ عدالت میں پیش کیا گیا جہاں سے دونوں کو قانون کے مطابق جیل بھیج دیا گیا۔

✪

محمد ایار راہی

اللّٰہ تبارک وتعالیٰ نے صراطِ مستقیم واضح کردی ہے۔ پھر بھی کچھ لوگ دانستہ اجتناب کرتے ہیں، شجروحجر کی پرستش شروع کردیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہرخطۂ ارض میں عجیب عجیب سے دیوی دیوتا پوجے جاتے ہیں۔ ایسے ہی چند دیوی دیوتاؤں کا تذکرہ۔

معلومات میں اضافے [illegible] پیش کیے جاتے ہیں

علم الاصنام کے حوالے سے یونانی دیوی دیوتاؤں نے عالمگیر شہرت حاصل کی، دنیا بھر کے مختلف مصنفین نے اپنے اپنے طور پر انہیں اپنی تحریروں میں جگہ دی۔ ان کا تعارف اور تشریح کی اور انہیں اپنے اپنے انداز سے تشبیہوں، استعاروں کی صورت برتا۔ ان خیالی دیویوں اور دیوتاؤں کا اک طویل سلسلہ ہے جو زندگی کے تمام شعبوں سے منسلک ہے۔ یونان کے علاوہ دیگر علاقوں کے ان خیالی اصنام نے مقامی اثرات مرتب کیے۔ مثلاً عرب کے لات ومنات اور ہبل، ایران کے اشاد وغیرہ مگر برصغیر خصوصاً ہندوستان تو اس حوالے سے بہت مالا مال ہے۔ یہاں لاتعداد دیوی دیوتا ہیں جن کے علیحدہ علیحدہ اوصاف اور دائرہ ہائے کار ہیں۔ دراصل ہندومت ہے ہی بت پوجا کا مذہب۔ صنم پرستی کا دین لیکن یہاں صرف دو دیویوں کا ذکر مذکور ہے۔ لکشمی اور سرسوتی۔ ہندو دیومالا کے مطابق لکشمی اور سرسوتی دو دیویاں ہیں اور دونوں ہی آپس میں بہنیں ہیں لیکن دونوں بہنوں میں پیدائشی عداوت ہے۔ نہ تو دونوں ایک جگہ اکٹھی ہوسکتی ہیں نہ ہی ایک دوسرے کو

برداشت کر پاتی ہیں۔ جہاں لکشمی ہوگی وہاں سرسوتی کبھی نہ جائے گی اور جہاں سرسوتی قدم رکھے گی، وہاں سے لکشمی چلی جائے گی۔ ان دونوں کی یہ جنم دشمنی مستقل ہے کیونکہ دونوں کی دنیا یکسر الگ اور مختلف ہے۔ لکشمی دیوی کا دوسرا نام لچھمی بھی ہے، یہ حسن، دولت اور ثروت وحشمت کی دیوی ہے۔ ہندو صنمیات میں دراصل یہ سمندر کی بیٹی اور وشنو دیوتا کی استری یعنی بیوی ہے یا تسلیم کی گئی ہے۔ اس کے دیگر نام بھی ہیں یا اسے یہ نام دیے گئے ہیں مثلاً اندرا، سری، شری، پدما، رما، کملا اور لوک ماتا وغیرہ۔ مال وزر کی یہ دیوی جاہ وجلال، شان وشوکت، حشمت و دبدبہ کی بھی مالک ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ حسن وجمال پر بھی اس کا اجارہ ہے جسے چاہے دے نہ دے۔ خود بھی ان گنوں (حسن، جلال، دولت) سے مزین ہے۔ لوگوں کو بھی نوازتی ہے۔ اس کے پجاریوں کی کثرت ہے۔ ظاہری بات ہے جاہ وجلال کی نسبت سے بہادر آدمی کی بیوی کو بھی لکشمی یا لچھمی کہا جاتا ہے۔ رام چندر کی بیوی سیتا جی کا لقب بھی لکشمی یا لچھمی ہے جس کی پاک دامنی ہندوؤں کے ہاں ضرب المثل ہے۔ ہندو سماج یا گھرانوں میں بیٹی اور بہو کو بھی پیار سے لکشمی یا لچھمی کہہ کر پکارتے ہیں۔ ہندو دکاندار ہلدی کو اور ہندو حکماء زرد لکڑی کو لکشمی یا لچھمی کہتے ہیں۔ ہندو حکما اور اطبا ایک جڑی بوٹی جسے وردھی یا ردھی بھی کہتے ہیں کو لکشمی یا لچھمی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ہندو جوہری موتی، دُر اور مروارید کو لکشمی یا لچھمی کا نام دیتے ہیں۔ ہندو معاشرے میں لکشمی دیوی کا عمل دخل ہمہ گیر ہے۔ ہندو مذہب میں لکشمی دیوی کی پوجا کا مخصوص دن ہوتا ہے جو اندھیرے پاکھ (دوسرا پندرہواڑہ، مہینے یا چاند کا) کا آخری دن ہے یعنی دیوالی کی رات کو یہ پوجا ہوتی ہے، یہ ہندی کا ساتواں مہینا کاتک (پندرہ اکتوبر سے پندرہ نومبر تک) ہوتا ہے۔ دیوالی میں دیپ مالا کی صورت دیے جلا کر خوب روشنی کی جاتی ہے اور لکشمی پوجا کی جاتی ہے۔ گھر اور گھر سے باہر ہر جگہ روشن چراغ جھلملاتے نظر آتے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر ہندو لوگ بڑی رنگ رنگیلی رسمیں مناتے ہیں۔ ناچ گانا تاشے مہندی، برات، بری، جوڑا گھوڑی، سہرا، آرسی ڈھولک، گیت، یہ سب کچھ اور دیگر رسوم ہندو تہذیب کی دین ہیں لہٰذا جب دلہن بیاہ کر لائی جاتی ہے تو دولہا دلہن، دونوں لکشمی یا لچھمی دیوی کی پوجا کرتے ہیں۔ ہندو لوگ کھانا کھانے سے پہلے لکشمی کے نام کا حصہ نکال کر دان کرتے ہیں تاکہ کھانے میں برکت رہے، اسی طرح ہندو خصوصاً کائستھ قوم کے ہندو جو مسلمانوں سے متاثر اور مسلمانوں کے قریب ترین سمجھے جاتے ہیں یہی کائستھ ہندو کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ یا اجازت کے طور پر کچھ الفاظ دہراتے ہیں یا بولتے ہیں جسے سدھ داتا گنیش یا لچھمی نارائن کرنا کہتے ہیں، ایک کہاوت ہے لچھمی بن آدر کون کرے یعنی دولت کے بغیر کوئی نہیں پوچھتا، روپے کی سب عزت کرتے ہیں یا بیوی کے سوا کوئی خاطرداری نہیں کرتا۔ گھر میں بیٹی کا پیدا ہونا مبارک قدم، بہو کا آنا، حسن دولت کا گھر میں آنا، صاحب اقبال ہونا، کسی صاحب اقبال کی گھر میں آمد۔ نو عدد (نو خزانے) بارہ سدھ (بارہ طاقتیں) ہونا لچھمی گھر آنا کہلاتا ہے۔

لکشمی دیوی کی بہن سرسوتی دیوی علم وعرفان کی مالک ہے اسی لیے آپس میں بہنیں ہونے کے باوجود دونوں کی نہیں بنتی، نہ ہی ایک دوسرے کی قربت سہہ سکتی ہیں۔ دونوں کے مزاج ہی الگ ہیں۔ سرسوتی دیوی برہما دیوتا کی استری یعنی بیوی اور جملہ علوم وفنون کی موجد خیال کی جاتی ہے۔ علم سنسکرت کی مخترع بھی ہے۔ اس کی ایجاد کے زمرے میں دیوناگری رسم الخط اور سنسکرت زبان بھی آتی ہے۔ گفتگو کا فن بھی اس کی منت اور دین ہے۔ سرسوتی کے معنی بولنے کی طاقت، نطق، علم، عقل، آسمانی آواز، گائے اور نہایت اچھی عورت کے ہیں۔ ہندوؤں میں ایک سادھو فرقہ بھی ہے جو اپنے نام کے آگے سرسوتی لفظ لگاتا ہے۔ سرسوتی کے ایک معنی یوں بھی ہیں کہ وہ ملک جس میں تالاب اور جھیلیں ہوں۔ سرسوتی دیوی کا تہوار جسے سرسوتی پوجا یا سرسوتی پوجن کہا جاتا ہے ماگھ کے مہینے میں ہوتا ہے جو ہندی تقویم کا دسواں مہینا ہے۔ جب سرد ہوا کے چلنے سے ٹھنڈ پڑتی ہے۔ یہ تہوار اترتے چاند کے پانچویں دن ہوتا ہے یعنی پانچ ماگھ کی تاریخ ہوتی ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ہندی مہینا چاند کے پندرھویں دن سے شروع ہوتا ہے یعنی قمری مہینے کی پندرہ تاریخ کو جب چاند پندرہ دن کا ماہ کامل ہوتا ہے، اس دن ہندی مہینے کا پہلا دن ہوتا ہے۔ سرسوتی پوجا کے تہوار کو عام لوگ بسنت پنچمی کا نام دیتے اور اسی نام سے جانتے پہچانتے ہیں۔ اہل ہنود اس تہوار میں سرسوں کے پھول چن کر آب خورے میں گل دستہ بنا کر سجاتے ہیں۔ آب خورے کے اردگرد پتی وغیرہ لگا کر دیوی کے استھان پر لے جاتے اور بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ ساتھ ساتھ گاتے بجاتے بھی ہیں کیونکہ سرسوتی علم موسیقی کی بھی دیوی ہے۔ اگرچہ تہوار کی اصل رُت بیساکھ کے مہینے میں آتی ہے مگر اس کا میلا آمد بہار میں سرسوں کے پھولتے ہی ماگھ کے مہینے میں شروع ہو جاتا ہے چونکہ موسم سرما میں سردی کے باعث طبیعت کو انقباض ہوتا ہے اور آمد بہار میں سیلان خون کے باعث

طبیعت میں شگفتگی اور ولولہ پیدا ہوتا ہے چنانچہ بسنت پنچمی کو سرسوتی پوجا ہوتی ہے۔ ہندوؤں کی ایک دعا یا آشیرباد ہے کہ سرسوتی سدا اسنے رہے یعنی عقل و دانائی ہمیشہ مدد پر رہے۔ سرسوتی دیوی کے پجاری لکشمی دیوی کے قریب نہیں جاتے، اسے نزدیک نہیں آنے دیتے۔ اس کے لیے ان کا من راضی نہیں ہوتا۔ لکشمی دیوی کو ڈنڈوت کرنے والے بھی سرسوتی دیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

ہندی دیویوں کے بعد اب ذکر ہو جائے یونان کے دو دیوتاؤں کا۔ یونانیوں کے ہاں اپالو دیوتا کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس دیوتا کو یونانی اور رومی دونوں ہی اپالو کے نام سے یاد کرتے ہیں تاہم بعض اہلِ روم اسے سول (sol) اور فیوبس (pheobus) کے ناموں سے بھی پکارتے ہیں۔ اس کا شمار طاقت ور دیوتاؤں میں ہوتا تھا۔

بظاہر یہ سورج دیوتا اور سچائی کے دیوتا کے نام سے مشہور تھا اور جھوٹ نہیں بول سکتا تھا تاہم گناہوں کی سزا دینا، بے گناہوں کو آفات سے بچانا، زخمیوں کا علاج کرنا، مستقبل کی خبریں دینا، دوسروں میں پیش گوئیوں کی صلاحیتیں پیدا کرنا، شہروں کی تعمیر اور طرزِ حکومت کے بارے میں قوانین وضع کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ پورے یونان سے لوگ اپنے مستقبل کے بارے میں باخبر رہنے کے لیے اس کے پاس آیا کرتے تھے۔ یہ موسیقی اور نغمے کا خدا بھی مانا جاتا تھا۔ گلیوں، گھروں، دروازوں اور اجتماعات کی جگہوں کے محافظ کے طور پر اسے اگیوس (aguieus) بھی کہتے ہیں۔

یہ زیوس اور لیٹو کی ناجائز اولاد تھی اور آرٹمس کے ساتھ جڑواں پیدا ہوا لیکن بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ لڑکی نہیں بلکہ لڑکا پیدا ہوا تھا جس کا نام اڈجمس تھا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اپالو اور آرٹمس، زیوس اور لیڈا (ممکن ہے لیٹو کو ہی لیڈا کہا گیا ہو) کی اولاد تھے۔ لیٹو یا لیڈا، ہیرا دیوی کی جلن سے بچنے کے لیے ڈلوس نامی جزیرے پر مقیم تھی اور وہیں زیوس نے اس سے ہم بستری کی جس کے نتیجے میں اپالو اور آرٹمس پیدا ہوئے۔

اس کی تصویر بناتے وقت لباس نیچا اور گھیر عورتوں جیسا دکھایا جاتا ہے۔ یہ تیر انداز تھا اور چاندی کی کمان استعمال کرتا تھا۔ اس کے روزمرہ معمولات میں اپنے چار گھوڑوں کے رتھ پر سوار ہو کر سورج کی سیر کرنا شامل تھا۔ ایک سدابہار درخت بےل اس کا پسندیدہ درخت، کوا پسندیدہ پرندہ اور ڈولفن پسندیدہ جانور تھے۔

یونان کا دوسرا اہم دیوتا ڈایونائسس تھا۔ یونانی اسے ڈایونائسس (dionysos) اور رومی بیکس (bacchus) کے نام سے پکارتے تھے۔ بنیادی طور پر بیکس کے معنی شور مچانے والے کے ہیں لیکن یہ شراب اور رنگ رلیوں کا دیوتا تھا۔ اسی نے انگوروں اور دیگر پھلوں سے شراب بنانے کا فن ایجاد کیا تھا۔

ڈایونائسس کو ایک حسین نوجوان قرار دیا گیا ہے لیکن اس کی زیادہ تر عادتیں عورتوں جیسی تھیں تاہم اسے دُہرے خصائل کا مالک کہا جاتا ہے۔ ایک جانب یہ لطف و سرود اور لذت کا مالک تھا لیکن دوسری جانب یہ انتہائی ظالم، بے عقل اور غصہ ور تھا۔ پرلے درجے کا شرابی تھا اسی لیے بعض کے نزدیک شراب نے ہی اسے متضاد عادات کا حامل بنا دیا تھا۔ یہ کسی کو بھی بہ آسانی پاگل بنا سکتا تھا۔

اس کے باپ کے خانے میں بھی زیوس دیوتا کا نام ہی لکھا ہوا ہے جس کے ڈایونائسس کی ماں سی میلی سے ناجائز تعلقات تھے یوں یہ واحد دیوتا تھا جس کی ماں ایک انسان تھی۔ زیوس نے رات کے وقت سی میلی سے ہم بستری کی۔ سی میلی نہیں جانتی تھی کہ اس کے جسم سے کون کھیل رہا ہے تاہم وہ ایک دیوتا کی محبوبہ بن کر بے حد خوش تھی۔ بات چھپی نہ رہ سکی اور ہیرا دیوی کو جلد ہی پتا چل گیا کہ سی میلی کے پاس جانے والا کون ہے۔ وہ بھیس بدل کر سی میلی کے پاس گئی اور اسے اکسایا کہ وہ اپنے محبوب سے اصل صورت دکھانے کی ضد کرے۔ جب زیوس دوبارہ اس سے ملنے کے لیے آیا تو سی میلی نے اس سے اپنی ایک خواہش پوری کرنے کا وعدہ لے لیا۔ وہ اسے دریائے اسٹکس پر لے گئی اور قسم دی کہ وہ بات ٹالے گا نہیں۔ زیوس اس کی محبت میں اس قدر دیوانہ تھا کہ رضامند ہو گیا۔ تب اس نے زیوس کو اپنی اصل صورت دکھانے کے لیے کہا۔ زیوس اس بات پر بے حد ناخوش ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا تاہم چونکہ وہ وعدہ کر چکا تھا لہٰذا اسے پورا کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ زیوس جونہی اپنی اصل صورت میں آیا سی میلی اس کے جلوے کی تاب نہ لا سکی اور جل کر راکھ ہو گئی۔ زیوس نے بچے کو بچانے کے لیے اپنی ران چیر کر اسے اس میں رکھ لیا۔ وقتِ مقررہ پر بچہ زیوس کی ران سے صحیح سلامت پیدا ہوا۔

لیکن ڈایونائسس کے ساتھ ہیرا کی عداوت کبھی ختم نہ ہو سکی۔ وہ اس سے ہمیشہ جلتی رہی اور ٹیٹان کو بچے کے قتل پر اکساتی رہی۔ ٹیٹان نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا لیکن ریہا دیوی نے اپنے پوتے کو پھر زندگی بخش دی۔ اس کے بعد زیوس نے اس کی حفاظت کا معقول انتظام کر دیا اور اسے کوہ نیمفس پر بھیج دیا جہاں اس نے پرورش پائی۔

ڈایونائسس اپنے مذہب اور رسوم کی ترویج کے لیے دنیا بھر کی سیاحت کرتا رہا۔ وحشی عورتیں مینا ڈز، شراب، آہنی سلاخیں اور دیگر ہتھیار اس کے ساتھ تھے۔ جب دیگر دیوتاؤں کے پیروکار معبدوں میں ان کی پرستش کرتے تھے، ڈایونائسس کے پجاری جنگلوں میں اس کی پوجا کیا کرتے تھے۔ ڈایونائسس اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جگہ جگہ گھومتا رہا اور درندوں کا شکار کرتا رہا اس کے علاوہ وہ جہاں بھی جاتا لوگوں کو انگور کی کاشت سکھاتا۔ یوں دنیا سے خود کو دیوتا منوا کر ڈایونائسس تحت الثریٰ (پاتال) میں آیا۔ کچھ عرصہ اپنے چچا ہیڈس کے پاس مقیم رہا اور پھر دیوتاؤں کے شہر اولمپیا میں جابسا۔

ڈایونائسس ان چند دیوتاؤں میں سے ایک تھا جو مُردوں کو زندہ کر سکتے تھے اور انہیں پاتال سے واپس دنیا میں لا سکتے تھے۔ اس کے باوجود کہ اس نے کبھی اپنی ماں یعنی سی میلی کو نہیں دیکھا وہ ہمیشہ اس کے لیے پریشان رہا۔ بعض کے مطابق وہ اسی کو تلاش کرنے کے لیے تحت الثریٰ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات تھینا ٹوس سے ہوئی اور وہ اسے کو واپس لے آیا۔

رفتہ رفتہ ڈایونائسس روزمرہ زندگی کا اہم ترین دیوتا بن گیا۔ ڈایونائسس کا تہوار موسم بہار میں انگور کی کاشت کے دنوں میں منایا جاتا تھا۔ اسے سال کا اہم ترین موقع کہا جاتا تھا جبکہ تہوار میں شرکت کرنے والے تمام افراد بلا تخصیص خود کو ڈایونائسس کا غلام کہا کرتے تھے۔

اب آخر میں ایک اہم کتاب کا بھی ذکر کہ اسے زبردستی دیوتا کا عطیہ کہا جاتا ہے۔

لیلا! سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کھیل، عیش ونشاط، کرتب، لہو ولعب، رنگ رس، کریڑا، بلاس، رمسی، سیر و تماشا جیسے کرشن لیلا' دان لیلا۔ اس کے علاوہ تماشائے قدرت، مظہر قدرت جیسے رام لیلا' بھگوان لیلا۔ اسی تہ در تہ معنوں والے پہلودار لفظ سے نسوانی نام لیلاوتی مرکب ہے جس سے یہ معنی نکلتے ہیں۔ عیش ونشاط والی عورت، ناز و نعم میں پلی ہوئی، بلاس کرنے والی عورت، کھلنڈری عورت، کھلاڑن، زن بازیچہ پسند، خوبصورت عورت۔

لیلاوتی، ایک باکمال ہندو ریاضی دان کی بیٹی کا بھی نام ہے جس کے نام پر حساب (ریاضی) کی ایک نادر اور گراں قدر کتاب وجود میں آئی اور علم ریاضی کے دامن میں بیش بہا اضافے کا موجب بنی۔ اس انمول اور بیش بہا کتاب کو ہر مسلک اور مذہب کے شائقین ریاضی نے ہاتھوں ہاتھ لیا' سرآنکھوں پر بٹھایا۔ اس کی اہمیت گہرائی و گیرائی اور لازوال خوبیوں کا کھلے ذہن و دل سے اعتراف کیا۔ مصنف کی تخلیقی قوت' اعلیٰ کاوش اور خوبصورت تصنیف کو بے حد سراہا۔ اس کتاب کو کس نے، کب، کیسے اور کیوں کر تخلیق کیا، آیئے دیکھتے ہیں۔

سرزمین ہندوستان شروع ہی سے اعلیٰ علوم کا مرکز و منبع رہی ہے جہاں کی نئی ایجادات اور نت نئی اختراعات گلزار علم میں انوکھے پھول کھلاتی رہی ہیں۔ سلطان محمود غزنوی کے عہد میں ابوریحان البیرونی اور علامہ ابوالفیض فیضی (شہنشاہ اکبر کے نورتنوں میں سے ایک) جیسے علما نے بہ ظاہر ہندو بن کر اور ہندوؤں میں گھل مل کر سنسکرت سیکھی اور پھر ہندی علوم وفنون کو دنیا پر آشکار کیا۔ یوں ذہنِ ہندی کی بلند پروازیوں اور نکتہ رسی نے دنیا بھر سے اپنا لوہا منوایا اور داد سمیٹی، ہندی علوم کے عربی، فارسی اور پھر دیگر زبانوں میں تراجم ہوئے۔ اسی لیے دانائے راز علامہ اقبال کہہ اٹھے۔

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہ ترکمانی' ذہن ہندی' نطق اعرابی

آج سے تقریباً نو صدی پہلے کا ذکر ہے، ملک ہندوستان... اعلیٰ دماغ ریاضی دان، ماہر منجم اور عالم بے بدل کے وجود سے جگمگا رہا تھا جس کا نام نامی شری بھاسکر آچارج تھا۔ سنسکرت میں بھاسکر کے معنی ہیں سورج، سونا، آگ، چمک دار، منور، جبکہ آچارج روحانی مرشد، معلم، استاد، پیر، راہنما، پنڈت، کسی فرقے کا بانی اور پجاری کے معنی دیتا ہے۔

ودیا ساگر شری بھاسکر آچارج کا عہد مختلف بتایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک سلطان محمد غوری (1194عیسوی) کے وقت یہ بے مثل عالم موجود تھا، کچھ اس سے پہلے کا زمانہ قرار دیتے ہیں۔ بہر حال شری بھاسکر آچارج کے ہاں ایک اور اکلوتی بچی نے جنم لیا۔ بڑے پیار اور چاؤ سے گھر آئی لکشمی کا نام لیلاوتی رکھا گیا۔ خوشی کی مختلف رسمیں ادا کرنے کے بعد جب لیلاوتی کی جنم پتری (مستقبل کا زائچہ) بنایا گیا تو آنے والے دنوں کی جھلک سب کو سوگوار اور فکر مند کر گئی۔ جنم پتری کے مطابق نوزائیدہ لیلاوتی کا سہاگن ہونا ناممکن تھا یعنی اسے عمر بھر بن بیاہی (کنواری) ہی رہنا تھا۔ اس انکشاف نے شری بھاسکر آچارج کے دن کا چین اور راتوں کی نیند اڑا دی۔ وہ مسلسل اور مستقل تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ بہت کچھ سوچنے کے باوجود بھی کوئی حل کوئی اپائے یا توڑ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں اک عرصہ گزر گیا تو ایک روز اچانک انہیں یہ خیال آیا کہ پھیروں کے لیے یعنی نکاح کے لیے کوئی ایسی شبھ گھڑی (مبارک لمحہ) مقرر کرنی چاہیے... جس سے گرہ (سیارے کی گردش) کی نحوست جاتی رہے اور اچھا گن بیٹی سہاگن

کر گھر بار والی ہو جائے۔ گود بھرے اور پوتوں تک پہنچائے۔ اہلِ ہنود میں بچپن کی شادی اور آگ کے گرد پھیرے کا رواج ہے۔ اب ایسی شبھ گھڑی (مبارک لمحہ) نہ صرف بلکہ حسنِ اتفاق سے ہی مل پاتی ہے۔ شری بھاسکر آچارج مدتوں منتظر اور چوکنے رہے۔ سیاروں کی گردش اور وقت کے کھیل پر نظریں جمائے رہے۔ بالآخر جب وہ مخصوص دن آیا اور مطلوبہ شبھ گھڑی (مبارک لمحہ) کے آنے میں کچھ ہی دیر رہ گئی تو شری بھاسکر آچارج نے ایک بڑے برتن کو پانی سے آدھا بھرا اور ایک کٹورے کے پیندے میں سوراخ کر کے کٹورا پانی پر بڑے برتن میں چھوڑ دیا۔ اسے آبی گھڑی کہا جاتا ہے یعنی کٹورے میں پیندے کے سوراخ سے تھوڑا تھوڑا پانی آتا اور جس وقت کٹورا پانی سے لبالب ہو کر ڈوب چلتا تو یہ عین وہی شبھ گھڑی (مبارک لمحہ) ہوتی جس کا شری بھاسکر آچارج کو انتظار تھا۔ شری بھاسکر آچارج نے ایک ہوشیار منجم کو کٹورے پر نگہبانی کے لیے کھڑا کر دیا اور نہایت سختی سے تاکید کی جس وقت کٹورا پانی میں ڈوب جائے اسی وقت ترنت آکر مجھے اطلاع دو۔ خود شری بھاسکر آچارج پوجا اور پرارتھنا (دعا وزاری) میں جت گئے۔ مگر تقدیر کا لکھا کب ٹلتا ہے۔ جو گھڑی شری بھاسکر آچارج نے اتنی مدت سے حساب لگا رکھی تھی، جس مبارک لمحے کے لیے وہ عرصے سے اپنا سکھ چین تیاگ کر انتظار کی سولی پر لٹکے ہوئے تھے، وہ آن کی آن میں ہاتھ سے نکل گئی اور سب ہاتھ ملتے رہ گئے۔ تدبیر تقدیر کے ہاتھوں سرپیٹ کر رہ گئی۔ شری بھاسکر آچارج اپنی طویل پوجا، خالص پوجا اور دلی پرارتھنا (دعا) کے باوجود بری طرح ہار گئے۔ کرم کا لکھا پورا ہونا تھا، سو ہو کر رہا۔ بے رحم وقت اپنی سی کر کے ہی رہا۔ ہوا یوں کہ بچوں کی یہ اکثر عادت ہوتی ہے کوئی چیز یا نئے کام کو بڑے چاؤ اور بار بار غور سے دیکھتے ہیں، لیلاوتی گو سمجھدار تھی مگر پھر بھی ابھی بچہ ہی تھی۔ جس بڑے برتن میں شری بھاسکر آچارج نے کٹورا ڈال رکھا تھا۔ لیلاوتی بار بار وہاں جاتی اور بڑے برتن پر جھک کر تیرتے ہوئے کٹورے کو دیکھتی، اور اس عمل کو سمجھنے بوجھنے کی کوشش کرتی۔ ایک بار جھکنے میں اس کی چوڑی کا موتی جھڑ گیا اور کٹورے کے عین سوراخ میں جا ٹھہرا۔ نتیجتاً پانی آنے کا راستہ بند ہو گیا، جب اندازے سے زیادہ وقت گزر گیا اور نگہبان منجم نے آکر کچھ خبر نہ دی تو شری بھاسکر آچارج کا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں لیلاوتی کے ستارے نے کوئی چمتکار نہیں دکھا دیا۔ انہوں نے کٹورے کو دیکھا تو اسے بھرنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ کٹورا باہر نکال کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک چھوٹے سے موتی نے روزن (پیندے کا سوراخ) بند کر رکھا ہے۔ اب کیا ہو سکتا تھا، شری بھاسکر آچارج بے بسی سے اک طویل سانس بھر کر رہ گئے۔ مگر شری بھاسکر آچارج کوئی عام آدمی نہیں تھے کہ بالکل ہی مایوس ہو کر ہاتھ پاؤں ڈال دیتے، وہ بہر حال ایک بلند پایہ عالم، خالص ہنرمند اور ذہین ترین منجم تھے۔ انتہائی ناموافق صورت حال میں بھی اپنی صلاحیتوں اور فن کو مثبت رخ دینا بہ خوبی جانتے تھے سو انہوں نے لیلاوتی کو گلے سے لگایا، پیار کیا اور کہنے لگے۔

"سنو پیاری بیٹی! بیاہ شادی اس لیے کرتے ہیں کہ اولاد ہو اور اس سے دنیا میں نام چلے لہٰذا تقدیر اگر ایسا نہیں چاہتی نہ ہمیں کرنے دیتی ہے تو کوئی بات نہیں، میں تیرے نام کی ایسی کتاب تخلیق کروں گا کہ رہتی دنیا تک تیرا نام روشن رہے گا۔"

شری بھاسکر آچارج نے اپنے اس قول اور وعدے کو یوں نبھایا کہ دن رات ان تھک محنت کی، حساب اور ہندسۂ عملی میں ایک نہایت اعلیٰ درجے کی عمدہ کتاب تخلیق کی اور کتاب کا نام لیلاوتی رکھا۔ اس کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ شروع سے آخر تک باپ بیٹی سے سوال کرتا چلا گیا ہے، یہ شری بھاسکر آچارج کی شبانہ روز محنتوں اور صلاحیتوں کا نچوڑ تھا اس طرح علمی حلقوں میں لیلاوتی کا نام ہمیشہ کے لیے امر ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ علم الاعداد کی درجہ بندی بھی شری بھاسکر آچارج سے منسوب ہے جس کے چار درجے ہیں۔ 1) ایک سے نو تک اکائی درجہ۔ 2) دس سے نوے تک دہائی کا درجہ۔ 3) سو سے نو سو تک سیکڑے کا درجہ۔ 4) اور ہزار سے آگے آخر تک ہزار یے کا درجہ۔ شری بھاسکر آچارج نے اپنی اکلوتی اور چہیتی بیٹی لیلاوتی کو پوری دلجمعی سے ہر طرح کے علوم سکھائے اور بن بیاہی بیٹی کی عمر بھر کی تنہائی کا خوب حل نکالا۔ اس کے تاریک مستقبل میں مختلف علوم کی شمعیں روشن کیں۔ کہتے ہیں کہ لیلاوتی نے حساب میں اس قدر مشق حاصل کی کہ ایک نگاہ ڈال کر بڑے سے بڑے درخت کے پھل اور پتوں کا شمار بتا دیتی تھی جسے مساوات کے جاننے والے بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں۔ لیلاوتی کی اسی مہارت کے سبب کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کتاب لیلاوتی خود لیلاوتی ہی کی تخلیق کی ہوئی کتاب ہے جس کی ندرت اور خوبیوں کا اہلِ ہند تو کیا دنیا بھر کے اہلِ علم نے کھلے ذہن اور دل وجان سے اعتراف کیا اور اسے مستقل اہمیت کی کتاب قرار دیا۔ اس کتاب کا فارسی میں ترجمہ علامہ ابوالفیض فیضی (شہنشاہ اکبر کے نورتنوں میں سے ایک) نے کیا۔ انگریزی ترجمہ ڈاکٹر ٹیلر اور مسٹر کولبرک صاحبان نے کیا۔

ندا بخاری

بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کی توجیہہ مشکل ہے، عقل کی کسوٹی پر اسے پرکھنا ناممکن سی بات ہے لیکن وقت گزاری کے لیے پڑھنا اچھا لگتا ہے۔

یہ حیرت انگیز کہانی 1820ء میں سامنے آئی۔
یہ بھی عشق کی ایک کہانی ہے لیکن اتنی مختلف کہ جس کا تصور بھی محال ہے۔
جینی اور جان دو میاں بیوی جو آئرلینڈ سے ہجرت کرکے امریکا جا رہے تھے۔ ان دونوں کا ایک بیٹا بھی تھا، ولسن، جو اس وقت دس گیارہ برس کا رہا ہوگا۔
وہ ایک پیارا بچہ تھا۔ اس کی باتیں اتنی اچھی تھیں کہ اس جہاز میں سفر کرنے والے اس کے دوست بن گئے تھے۔
یہ سفر کئی ہفتوں کا تھا۔ اس زمانے میں جہاز اتنے تیز رفتار نہیں ہوا کرتے تھے۔ کوئلوں سے چلائے جاتے تھے۔ آلات بھی اتنے مکمل نہیں ہوتے تھے۔ بس قسمت اور ہواؤں پر بھروسا کرنا پڑتا تھا۔
ولسن اس جہاز کے مسافروں میں بہت مقبول ہو گیا تھا۔ اس کی پیاری باتیں سفر کی کوفت کو ختم کرنے کا سبب بن رہی تھیں۔
اس کے ماں باپ اپنے بیٹے کی ایسی پذیرائی پر بہت خوش ہو رہے تھے۔ اب تک کا سفر بہت آرام دہ اور خوش گوار تھا۔ کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔
لیکن ایک رات اس جہاز پر قیامت نازل ہو گئی۔
بجری قزاقوں کے ایک جہاز نے اس جہاز کو گھیر لیا تھا۔
ان لوگوں کا جہاز جنگی نہیں تھا اور نہ ہی اس میں لڑنے والے لوگ موجود تھے۔
یہ سیدھے سادے لوگ تھے جو اپنے بہتر مستقبل کے لیے امریکا جا رہے تھے اور انہیں نہیں معلوم تھا کہ راستے میں انہیں اس طرح گھیر لیا جائے گا۔
یہ لوگ سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ قزاق اپنے جہاز سے کود کود کر ان کے جہاز میں داخل ہو گئے۔ قزاقوں کے سردار کا نام ڈان پیڈرو تھا۔
ایک طویل قامت، مضبوط بدن کا خونخوار انسان۔ جس کے ساتھ سات آٹھ برس کی ایک بچی بھی تھی جس کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ سردار کی بیٹی تھی اور سردار اس سے اتنی محبت کرتا کہ ہر مہم میں اسے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس طرح بچی کی تربیت بھی ہو رہی تھی۔ کیونکہ آگے جا کر اسی کو قزاقوں کی سردار بننا تھا۔
وہ بچی بھی اپنے باپ اور دوسرے ڈاکوؤں کے ساتھ اسی جہاز کے عرشے پر آ گئی تھی۔
ڈاکو اور اس کا سردار تو لوٹ مار میں مصروف تھے لیکن اس کی بچی میری اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی جینی اور جان کے پاس آگئی۔
دونوں میاں بیوی اور ان کا بچہ ولسن اس وقت بہت خوف زدہ، پریشان سے ایک طرف کھڑے ہوئے تھے۔ نہ جانے میری کے دل میں کیا آئی کہ وہ ولسن کے پاس آ گئی۔
''کیا نام ہے تمہارا؟'' اس نے ولسن سے پوچھا۔
''ولسن!'' ولسن نے بتایا ''تم لوگ یہاں کیوں آئے ہو؟''
اسی وقت جہاز کے ایک مسافر نے جان کو اشارہ کیا کہ وہ اس بچی کو پکڑ کر اپنی ڈھال بنا لے۔ اس طرح ڈاکوؤں کو پلٹ جانے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔
لیکن جان کا دل نہیں مانا۔ میری بھی اس کے بیٹے کی طرح بہت پیاری سی بچی تھی۔ اب اس کا کیا قصور تھا کہ اس کا باپ ایک ڈاکو بن گیا تھا۔
''آؤ، میں تمہیں اپنے پاپا سے ملواتی ہوں۔'' میری نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''نہیں۔'' ولسن کی ماں کانپ کر رہ گئی تھی ''اس کو مت لے جاؤ۔ تمہارا باپ اس کو مار دے گا۔''
''نہیں آنٹی! اس کو کچھ نہیں ہوگا۔'' میری پورے اعتماد کے ساتھ بول رہی تھی ''پاپا اس کو کچھ نہیں کہیں گے۔''
جینی نے پھر روکنے کی کوشش کی لیکن جان نے اسے منع کر دیا ''جانے دو اس کو۔ ہو سکتا ہے اسی کی وجہ سے ہمارا کچھ بھلا ہو جائے۔''
''کیسی بات کرتے ہو، اگر اس نے ہمارے بچے کو پکڑ لیا تو......؟'' جینی نے کہا۔
''اسے ہمارے بچے سے کیا لینا دینا۔'' جان اسے سمجھاتے ہوئے بولا ''وہ تو مال لوٹنے آئے ہیں۔ لوٹ کر چلے جائیں گے۔''
اتنی دیر میں میری ولسن کا ہاتھ تھامے اپنے باپ ڈان پیڈرو کے پاس پہنچ چکی تھی ''پاپا، یہ دیکھو، یہ کون آیا ہے؟''
پیڈرو نے حیرت سے دونوں کی طرف دیکھا ''کون ہے یہ؟ اسے کہاں سے لائی ہو؟''
''یہ میرا دوست ہے۔'' میری نے بتایا ''ولسن نام ہے اس کا۔''
''یہ تمہارا دوست کب سے بن گیا؟''
''ابھی اسی جہاز پر۔'' میری نے بتایا ''ہم دونوں بہت پکے دوست ہیں۔''
پیڈرو مسکرا دیا ''چلو ٹھیک ہے۔ مان لیا یہ تمہارا دوست ہے۔ اب تم اپنے جہاز پر واپس جاؤ۔''

''نہیں پاپا، میں اس طرح نہیں جاؤں گی۔'' میری نے کہا ''تم ان لوگوں کو چھوڑ دو۔ جانے دو ان کو۔''
''میری! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''
''ہاں پاپا! جانے دو ان لوگوں کو۔'' میری باقاعدہ ضد کر رہی تھی ''یہ میرا دوست ہے۔ اس کو پریشان نہ کرو۔''
پیڈرو نے کچھ سوچ کر اپنی پیاری بیٹی کی بات مان لی۔ اس نے حکم دینا شروع کر دیا کہ جس جس کا سامان لوٹا گیا ہے، وہ سب واپس کر دیا جائے۔
میری ولسن کا ہاتھ تھام کر اسے ایک طرف لے آئی ''ولسن، دیکھو...... ہم دوست ہیں نا؟''
''ہاں میری!''
''تم مجھے یاد رکھنا۔ میں تم سے ضرور ملوں گی۔ پھر ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے، ٹھیک ہے نا؟''
ڈاکو، سردار اور میری جہاز والوں کو یوں ہی چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ یہ ایک بڑا معجزہ تھا۔ ورنہ یہ بے رحم ڈاکو کسی پر ترس کھانے والے نہیں تھے۔
ولسن تو پہلے ہی سے جہاز والوں میں مقبول تھا۔ سب اس سے پیار کرتے تھے۔ اس واقعے کے بعد تو وہ سب کی آنکھوں کا تارا ہی بن گیا تھا۔
بہرحال، یہ سفر ختم ہوا۔
جینی اور جان بوسٹن آ گئے۔ جہاں انہیں کلیم میں کچھ زمینیں مل گئیں اور انہوں نے زندگی کا آغاز کر دیا۔
بہت دنوں کے بعد انہیں یہ خبر ملی کہ ڈان پیڈرو کے جہاز پر بغاوت ہو گئی تھی اور ڈان پیڈرو مارا گیا جبکہ اس کی بیٹی کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا تھا۔
ولسن کی تعلیم شروع کر دی گئی۔ وہ اسکول کے بعد کالج چلا گیا اور پھر ایک دن ایک لڑکی اس سے آ ٹکرائی۔
وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی، دراز قد، نیلی آنکھیں، خوش لباس۔ اس کے ساتھ ایک عجیب بات یہ تھی کہ اس نے اپنی گردن پر زرد رنگ کی ایک چوڑی سی پٹی باندھ رکھی تھی۔
وہ لڑکی خود ہی ولسن کے پاس آئی تھی۔
''مجھے پہچانتے ہو؟''
''نہیں، میں تمہیں نہیں پہچان سکا ہوں۔''
''تم بے وفا نکلے۔'' وہ لڑکی اُداس ہو گئی تھی ''میں میری ہوں، یاد کرو مجھے...... غور سے دیکھو۔''
''کون میری...... وہ جو جہاز پر ملی تھی مجھے؟'' ولسن بیتاب ہو گیا تھا۔
''ہاں وہی۔''
ولسن نے اسے غور سے دیکھا اور پہچان گیا۔ یہ تو وہی لڑکی تھی، وہی نقش و نگار، وہی خدوخال۔ بس صرف اتنا فرق ہوا تھا کہ جوان ہو گئی تھی اور پہلے سے کہیں زیادہ دلکش تھی۔
''میری تم...... میں نے تو سنا تھا کہ......''
''ہاں، تم نے سنا ہوگا کہ میرے باپ کے جہاز پر بغاوت ہو گئی ہے۔'' میری نے کہا ''بالکل درست۔ ایسا ہی ہوا تھا، میرا باپ مارا گیا جبکہ میں اپنے ماموں کے ساتھ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ میرا ماموں بھی میرے باپ کے ساتھ ہی جہاز پر ہوا کرتا تھا۔
ہم کسی طرح امریکا آ گئے، میں تمہاری تلاش میں تھی۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تم سے ملوں گی اور میں آ گئی ہوں تمہارے پاس۔ ماموں کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں یہیں بوسٹن میں تنہا زندگی گزار رہی ہوں۔''
''میرے خدا!'' ولسن نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا ''میری! کیا تم یقین کرو گی کہ میں ایک لمحے کے لیے بھی تمہیں بھول نہیں پایا ہوں۔ چونکہ تمہارا کوئی سراغ نہیں تھا، اسی لیے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔''
''اب تو آ گئی ہوں نا تمہارے پاس۔''
''آؤ، میرے گھر چلو۔ میرے ماں باپ بوڑھے ہو گئے ہیں لیکن وہ تمہیں پہچان لیں گے، آؤ۔''
ولسن اسی وقت میری کو اپنے گھر لے آیا۔ اس کی توقع کے مطابق اس کے والدین نے میری کو پہچان لیا تھا۔ کیونکہ اس کے خدوخال میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔
وہ سب میری کے احسان مند تھے۔ میری نے ان سبھوں کو اپنے باپ سے چھٹکارا دلوایا تھا۔
اب میری اور ولسن ساتھ ساتھ دیکھے جانے لگے۔
ولسن نے کئی بار دریافت کیا کہ میری اپنی گردن پر پٹی کیوں باندھے رہتی ہے لیکن میری ہر بار اس کے اس سوال کا جواب دینے سے گریز کرتی تھی۔
وہ ہر وقت اور ہر موقعے پر پٹی باندھے رہتی تھی۔
اس پٹی کی وجہ سے گرچہ اس کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا لیکن ولسن کو اُلجھن ہوا کرتی تھی۔ ایک دن میری نے اس سے پوچھا ''ایک بات بتاؤ، کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے یا میری اس پٹی سے؟''
''ظاہر ہے کہ تم سے۔''
''تو پھر تم اس پٹی کی کہانی چھوڑ دو۔'' میری نے کہا ''ایک وقت آئے گا کہ میں تمہیں خود بتا دوں گی۔''
ولسن نے اس کے بعد پھر کبھی کچھ نہیں کہا۔

ماں باپ نے ایک دن دونوں کی شادی طے کر دی۔ بوسٹن کے ایک چھوٹے سے چرچ میں دونوں کی شادی انجام کو پہنچی تھی۔
اب دونوں کو ایک دوسرے کی بھرپور محبت مل رہی تھی۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ شادی کے بعد محبت کی شدت میں کمی آ جاتی ہے لیکن ان کی محبت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔
ولسن نے ایک اسٹور کھول لیا تھا۔ میری اس کا ہاتھ بٹایا کرتی۔ دونوں کے درمیان کبھی بھی کسی بات پر اختلاف نہیں ہوا تھا۔
دونوں ایک دوسرے کے ساتھ سرشار رہا کرتے۔ ولسن کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔
ان کے یہاں تین اولادیں ہوئیں۔ چونکہ وہ دونوں بھی خوبصورت تھے، اسی لیے ان کی اولادیں بھی اسی طرح تھیں، خوبصورت اور شاندار۔
برسوں گزرنے کے باوجود اس زرد پٹی کا معما حل نہیں ہوا تھا۔ ولسن نے بھی اب میری سے پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔ میری نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک دن خود ہی بتا دے گی۔
اس زرد پٹی کے علاوہ اور کوئی خاص بات نہیں تھی، سب کچھ ٹھیک تھا۔
ان کے بچوں نے بھی کبھی میری سے اس پٹی کے بارے میں دریافت نہیں کیا۔ ہو سکتا تھا کہ کسی نے پوچھا بھی ہو لیکن ظاہر ہے میری نے اس کا جواب نہیں دیا ہوگا۔
ایک بار میری سخت بیمار پڑ گئی۔ ولسن اسے فوری طور پر ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے ولسن کو بتایا۔
''تمہاری بیوی کا جگر خراب ہوتا جا رہا ہے...... خون نہیں بن پا رہا۔ وقتی طور پر تو میں دوائیں وغیرہ دے رہا ہوں لیکن آگے چل کر پرابلم ہو سکتی ہے۔''
وہ دن ولسن کے لیے قیامت کا تھا۔
اس نے میری سے بے پناہ محبت کی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے کسی اور کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا اور اب یہ ڈاکٹر نے اس سے ایسی بات کہہ دی تھی۔
میری بھی بہت اُداس تھی۔ اس نے ولسن سے کہا ''میری اداسی اس لیے نہیں ہے کہ میں سخت بیمار ہوں...... یا میری زندگی کے دن بہت کم رہ گئے ہیں۔ بلکہ مجھے تم سے اور بچوں سے جدا ہونے کا دکھ ہو رہا ہے۔''
''مایوسی کی باتیں نہ کرو۔'' ولسن جلدی سے بولا ''تمہیں اپنے بچوں کی جوانی تک زندہ رہنا ہے۔''
لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔

احتیاط

ڈاکٹر صاحب کو ٹیلی فون آیا کہ ''ڈاکٹر صاحب میرے بیٹے نے ریت کھا لی ہے۔ میں نے اسے پانی پلا دیا ہے، بتائیں میں اور کیا کروں؟''
ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ ''اب آپ صرف یہ احتیاط کیجیے کہ وہ سیمنٹ ہرگز نہ کھانے پائے۔''

طریقہ

''ہاں، تو بیٹا! آج تم نے کیا سیکھا؟'' ماں نے بڑے شوق سے پہلے روز اسکول سے واپس آنے پر بچے سے پوچھا۔
بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''مرغا بننے کا طریقہ۔''

مراسلہ نگار: ریحان شیخ، پنڈی

میری کی حالت روز بہ روز خراب ہوتی چلی گئی۔ اور ایک وقت ایسا آیا کہ وہ بستر مرگ پر جا لگی۔ اپنی موت سے ایک گھنٹے پہلے اس نے ولسن کا ہاتھ تھام کر کہا ''میرے محبوب! اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اپنا وہ راز ظاہر کر دوں جس کو جاننے کے لیے تم بے چین رہے ہو۔ میں صرف تمہاری وجہ سے واپس آ گئی ہوں۔ حالانکہ میں تو اسی دن مر چکی تھی جس دن پاپا کے جہاز پر بغاوت ہوئی تھی۔ میرا گلا بھی کاٹ دیا گیا تھا لیکن میری محبت سچی تھی اور میں تم سے ملنا چاہتی تھی اس لیے تمہارے پاس آ گئی۔''
ولسن ترحم آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔
''ولسن! شاید تم مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہو، چلو آج اپنے ہاتھوں سے وہ پٹی کھول دو جو میری گردن کے گرد بندھی رہتی ہے۔''
ولسن نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ زرد پٹی کھول دی اور میری کی گردن اس کے جسم سے الگ ہو کر ایک طرف جا گری۔
اس کی وہ گردن نہ جانے کب کی کٹ چکی تھی۔
یہ حیرت انگیز واقعہ بوسٹن کے ان لوگوں کو عرصہ دراز تک یاد رہا تھا۔ اخبارات نے خوب اُچھالا تھا مگر کوئی بھی اسے جھوٹا ثابت نہیں کر سکا۔
کچھ اخبارات نے لکھا کہ بات صرف اتنی ہے کہ اس کی گردن پر زخم آئے تھے جسے بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔

سراب

راوی : شہریار ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط: 66

وہ پیداشی مہم جو تھا۔ بلند و بالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گردش کرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ
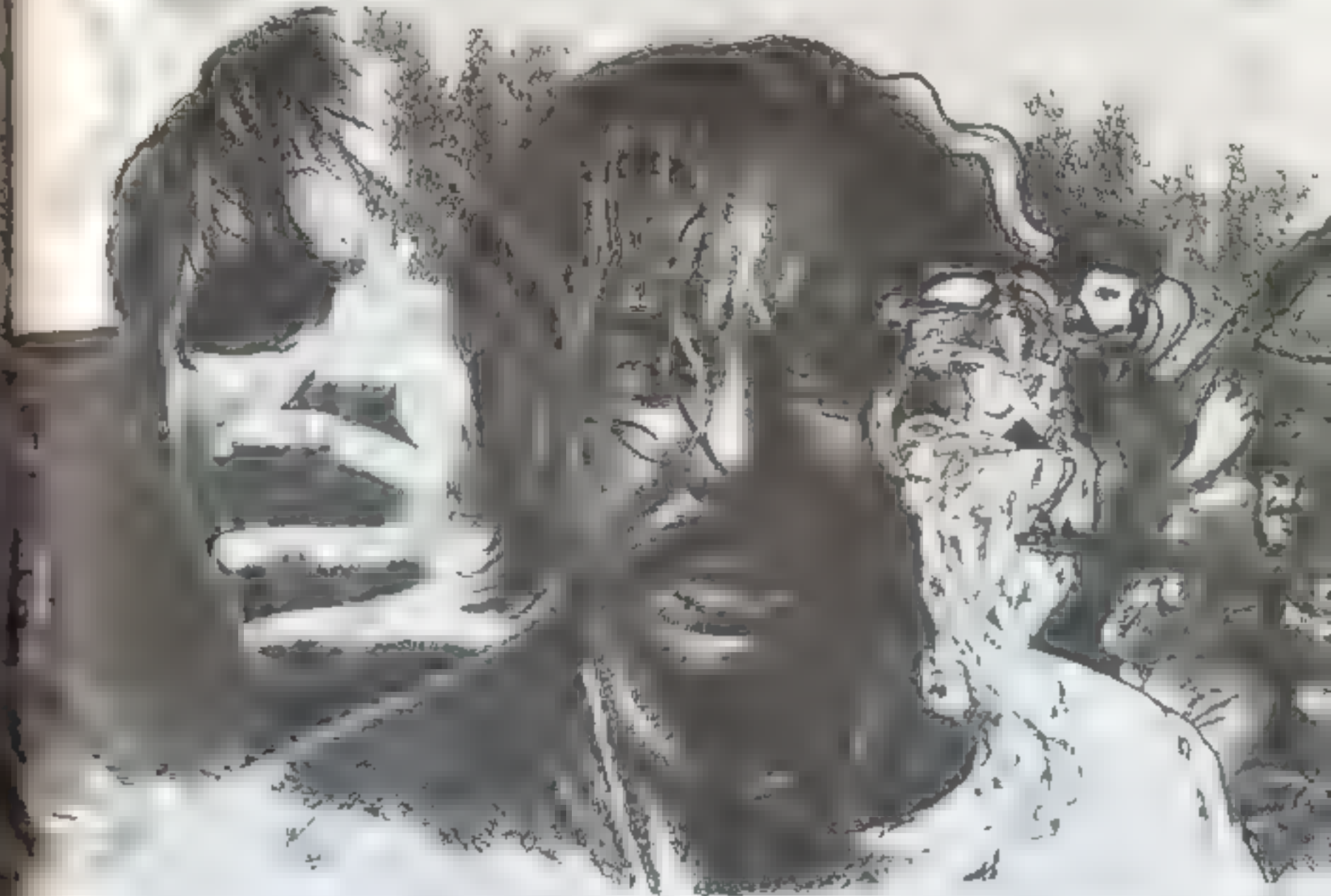
بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ سویرا جو میرے دل کا حصہ تھی وہ میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ یہاں سے زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ میں نے کاروبار شروع کیا۔ ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادرعلی کا ہم سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ دشمنی اور

دربدری کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے لوگ میرے دشمن ہو رہے تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست بھی تھے۔ اس کے بعد ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ اپنے وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ ایک دن میں زرین کو لے کر سیر کے لیے نکلا تھا کہ دشمنوں نے گھیر لیا۔ ان سے بچتے بچاتے ہم نکلے تو راستہ بھٹک کر ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جو مری کی طرف جاتا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے آبادی تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔ جب اس کے بنگلے پر پہنچے تو احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ زرین کی طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکٹر نے ہم پر ایک خطرناک وائرس کا تجربہ کیا ہے۔ زرین جانبر نہ ہو سکی۔ تبھی ڈیوڈ شا آ گیا۔ اس نے مجھے رہا کرایا اور کہا کہ اگر تم مجھے پراسرار وادی تک پہنچا دو تو میں مرشد سے بھی گلوخلاصی کرا دوں گا۔ اس کے بعد شا نے مجھے اپنے ایک آدمی مارشل کے ساتھ کر دیا کہ وہ مجھے شہر چھوڑ آئے مگر راستے میں ہی اس کی نیت بدل گئی۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے کودا۔ وہ پستول سے فائر کرتا کہ ایک کتے نے مارشل کے پستول والے ہاتھ پر منہ مارا — وہ کتا سونا کا تھا۔ سفیر وغیرہ اس کی مدد سے مجھ تک پہنچے تھے۔ ان کے ساتھ میں شہر آ گیا۔ پھر ہم شہلا کی تلاش میں نکلے۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کر لوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ باہر سے اطلاع آئی کہ کچھ لوگ ہمیں گھیر رہے ہیں۔ ہم باہر نکلے تو شہلا نے پستول سے وسیم کو نشانے پر لے لیا۔ تب پتا چلا کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلا لیا ہے۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ وہاں ایک خانہ بدوش عورت کو فتح خان کے آدمی پکڑ لائے تھے اور اس کی عزت سے کھیل رہے تھے کہ خانہ بدوش چڑھ دوڑے، انہوں نے لڑکی کو بھی برآمد کر لیا تھا۔ وہ عورت کی عزت لوٹنے والے کو قتل کر کے ہمیں سزا سنانے آئے تھے کہ ایک جیپ آندھی طوفان کی طرح داخل ہوئی۔ وہ فتح خان کی تھی۔ فتح خان نے خانہ بدوشوں کو بھگا دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ساتھ سویرا بھی ہے۔ وہ اسے اغوا کر لایا تھا۔ پھر اس نے مجھے مجبور کر دیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کر کے دینے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس نے میری جیکٹ پر ایک چپ چپکا دی تھی۔ جو میرے بارے میں مطلع کر رہی تھی۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے میل کر کے ایمن کو بلوا لیا۔ وہ دور رہ کر ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ فتح خان کے آدمیوں پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی مار دی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "نارتھ.... ہکسٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کر دیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں پہنچے تو فون آ گیا۔ آواز مرشد کی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ عبداللہ نے انکار کیا کہ یہاں شہباز نہیں رہتا مگر پیغام پہنچا دیا جائے گا۔ یہ ایک خطرناک بات تھی کہ میری موجودگی سے وہ آگاہ ہو گیا تھا۔ ہم دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ پھر اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے کال کر کے بریف کیس مانگا۔ اس نے بریف کیس دینے کے لیے ویران جگہ مقرر کی۔ ہم وہاں پہنچے اور بریف کیس لے کر چلے تو مجھے شک ہوا اور میں نے بریف کیس ڈھلان پر رکھ دیا۔ اندازہ درست تھا۔ وہ دھماکے سے پھٹ گیا۔ ہم واپس ہو رہے تھے کہ وسیم کا فون آیا کہ سویرا راستے سے لاپتا ہو گئی ہے۔ بعد میں فون آیا کہ اسے فتح خان نے حویلی پہنچا دیا ہے۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کے تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر پھر.... نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تو فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زروسکی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں زخمی فتح خان اور زروسکی کو لے کر چلا۔ راستے میں فتح خان کو اتار دیا۔ کچھ دور جانے کے بعد ایک کوٹھی نظر آئی جو ایک ملیٹری آفیسر کی تھی۔ میں نے اسے حالات بتا کر مدد طلب کی کیپٹن زروسکی کو ملیٹری پولیس کے حوالے کرنے چلا گیا تھا کہ کوٹھی پر حملہ ہو گیا۔ میں نے حملہ پسپا کیا۔ ملیٹری افسر زخمی تھا، مجھے ملیٹری انٹیلی جنس والے ساتھ لے گئے۔ انہی لوگوں نے مجھے پنڈی پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔

(اب آگے پڑھیں)

کوٹھی نادر علی کی تھی۔ مرشد ہاؤس سے نکلنے کے بعد وہیں مقیم تھا۔ ٹی وی رپورٹر بتا رہا تھا کہ دھماکا اس کوٹھی کے ایک حصے میں ہوا تھا اور وہ ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی کم سے کم چار افراد مارے گئے تھے اور دو زخمی تھے۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ مرنے والے اور زخمی ہونے والے کون تھے؟ کیمرا الیو دکھا رہا تھا اور کوٹھی سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں آ گئی تھیں اور آگ بجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ پولیس کی گاڑیاں بھی موجود تھیں لیکن فی الحال کوئی ایسا اعلیٰ افسر نہیں تھا جو صورتِ حال کی وضاحت کر سکتا۔

میں ساکت بیٹھا ہوا خبر دیکھ رہا تھا اور اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ یہ میرے ساتھیوں کا کام نہیں تھا۔ امکان یہی تھا کہ مرشد نے از خود نادر کو مارنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب رہا یا ناکام ابھی اس کا پتا نہیں تھا۔ بہرحال مرشد کا دوسرا قدم یہ ہوگا کہ وہ اس کا الزام مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر لگائے گا۔ پولیس میں میرے خلاف رپورٹ کرائے گا اور اپنے لوگوں کے مطمئن کرنے کے لیے میرے اور میرے ساتھیوں کے خلاف خود کارروائی کرے گا۔ یہ خیال آتے ہی میں بے چین ہو گیا اور میں نے فون اٹھا کر ایک بار پھر آپریٹر سے وسیم کا نمبر ملانے کو کہا اس نے کال ریسیو کی۔ "وسیم میں بات کر رہا ہوں تم ٹی وی دیکھ رہے ہو؟"

"جی بالکل...." اس نے جواب دیا۔

"تب فوراً احتیاطی تدابیر کرو عبداللہ سے کہو سب کو الرٹ کر دے۔"

"یہ کام ہم پہلے ہی کر چکے ہیں بلکہ میں نے حویلی کال کر کے آپ کے والد صاحب سے بھی بات کر لی ہے۔"

اپنے ساتھیوں کی مستعدی پر میں نے سکون کا سانس لیا۔ "خواتین کہاں ہیں؟"

"جہاں ہونی ہیں۔" وسیم نے جواب دیا اس کی مراد عبداللہ کی کوٹھی سے تھی۔

اس فون پر زیادہ کھل کر بات نہیں کی جا سکتی تھی میرا مقصد وسیم اور دوسروں کو خبردار کرنا تھا۔ مختصر بات کر کے میں نے فون رکھ دیا۔ بہ ظاہر معاملات الجھ رہے تھے۔ میرے سارے دشمن حرکت میں آ گئے تھے۔ ایک طرف بھارتی اور ڈیوڈ شا گروپ جس میں فتح خان اور کرنل شامل تھے، دوسری طرف مرشد اینڈ پارٹی تھی۔ یہ سب اپنے اپنے طور پر مجھے قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تیسرا معاملہ اس بریف کیس کا تھا جس کے لیے فتح خان اور شہلا کوشش کر رہے تھے اور یقیناً انہوں نے اس کا کسی سے سودا کر لیا تھا۔ آرمی ریسٹ ہاؤس کے اس پُرسکون اور محفوظ کمرے میں بھی مجھے سکون نہیں مل رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک الجھنیں سامنے آ رہی تھیں۔

میں نے محسوس کیا کہ میں اور میرے ساتھی اب تک غلط سمت میں جدوجہد کر رہے تھے۔ ہم بجائے مرشد اور فتح خان کی طرف توجہ دینے کے نادر علی اور شہلا پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے تھے جب کہ ہمارے مسائل کی اصل جڑ مرشد اور فتح خان ہیں۔ نادر اور شہلا مسائل کی شاخیں ہیں۔ جڑ کٹ جاتی تو یہ خود بیکار ہو جاتے۔ ڈیوڈ شا کے بھی اس سرزمین پر یہی دو آلۂ کار تھے یہ نہ رہتے تو وہ ہمارے خلاف اتنا خطرناک نہیں رہتا۔ اس رات میں سونے کے لیے لیٹا تو فیصلہ کر چکا تھا کہ اب ہمارا نشانہ یہی دو لوگ ہوں گے۔ میں نے آپریٹر کو ہدایت کی کہ مجھے صبح چھ بجے اٹھا دیا جائے۔ اگر ہم سات بجے روانہ ہوتے تو سات آٹھ گھنٹے کے سفر کے بعد اسلام آباد پہنچ جاتے۔

میں سات بجے تک ناشتا کر کے باہر آیا تو ثاقب حسن جیپ کے پاس مستعد موجود تھا۔ اس نے نہ صرف ناشتا کر لیا تھا بلکہ راستے کے لیے کھانا بھی پیک کروا لیا تھا تھرماس میں تازہ چائے موجود تھی۔ میں نے میجر آدم کا دیا ہوا تحفہ زیب تن کر رکھا تھا اپنے پرانے ہو جانے والے کپڑے میں ہوٹل میں ہی چھوڑ آیا تھا صرف جیکٹ اور جوتے لیے تھے۔ میرے بیٹھتے ہی ہم روانہ ہو گئے۔ دوپہر میں ہم نے ایک جگہ رک کر لنچ کیا۔ چائے گرم تھی اور توانائی بخش تھی جس نے ہمیں مزید کئی گھنٹے سفر کے قابل بنا دیا تھا۔ ابھی مزید تین سے چار گھنٹے کا سفر تھا۔ میں نے اس دوران میں سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ بے شک میجر آدم نے میری مدد کی تھی اور میری اتنی جلدی گلوخلاصی اسی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ پھر اس نے تحفہ دے کر ثابت کیا تھا کہ وہ مجھ سے اپنائیت رکھتا تھا لیکن اس کے آدمی کو اپنے کسی ٹھکانے لے جانا مناسب نہیں تھا۔ مجھے عبداللہ کی کوٹھی تک نہیں جانا تھا اور نہ ڈرائیور کو فارم ہاؤس لے جانا چاہتا تھا۔ شام پانچ بجے ہم بھارہ کہو کے پاس تھے میں نے ثاقب حسن سے کہا۔

"مجھے یہیں اتار دو.... میں ٹیکسی لے لوں گا۔"

اس نے کسی قدر تعجب سے کہا۔ "یہاں کیوں جناب.. ؟ میں آپ کو وہاں پہنچا دوں گا جہاں آپ نے جانا ہے۔"

"نہیں، مجھے یہاں کچھ کام بھی ہے بس یہیں روک

لو۔" میں نے کسی قدر تحکمانہ لہجے میں کہا تو وہ مجبور ہو گیا۔ اس نے جیپ وہیں روک لی۔ یہاں ابھی آبادی شروع ہوئی تھی دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگ مجھے یہاں آرمی جیپ سے اترتا دیکھیں اور میں خوامخواہ توجہ کا مرکز بنوں۔ میرے لیے گمنام رہنا بہتر تھا۔ نیچے اتر کر میں نے ثاقب حسن سے ہاتھ ملایا۔ "میں میجر کے ساتھ تمہارا بھی شکر گزار ہوں ممکن ہے زندگی کے کسی موڑ پر ہم دوبارہ ملیں۔"

"انشاءاللہ سر۔" اس نے کہا اور جیپ میں بیٹھ کر واپس روانہ ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ رات مری میں رکے گا اور کل صبح واپس چلا جائے گا۔ ابھی اتنا وقت تھا کہ وہ مری تک پہنچ سکتا تھا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی میں بھی مین روڈ پر آگے چل پڑا۔ ٹیکسیاں کچھ آگے کھڑی ہوئی تھیں۔ یہاں سردی بہت کم تھی اگر میں جیکٹ کے بغیر ہوتا تب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ یہاں بیشتر لوگ اب سوئیٹر اور جیکٹ کے بغیر گھوم رہے تھے۔ کچھ نے ہاف سوئیٹر اور ہاف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ میں نے ایک بڑی یلو کیب کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ اس میں موجود ڈرائیور نے مڑ کر دیکھا اور برہمی سے بولا۔ "ٹیکسی نہیں ہے.... فوراً نیچے اترو۔"

وہ خاتون بلکہ لڑکی خاصی خوب صورت اور فیشن ایبل قسم کی تھی۔ مگر مجھے دفع ہو جانے کا مشورہ دیتے ہوئے اس کی آواز میں سُریلا پن مفقود تھا اور وہ باقاعدہ غرائی تھی۔ میں بوکھلا گیا میں نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ ڈرائیور کی جگہ ایک لڑکی بیٹھی ہے۔ میں نے معذرت کی۔ "سوری میں نے دیکھا نہیں تھا۔"

"سوری کے بچے تم اترتے ہو یا...." لڑکی کا لہجہ مزید خراب ہو گیا اور وہ میری طرف مڑی تو اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں نے بے ساختہ دونوں ہاتھ اوپر کر لیے۔ یہاں اتنی گنجائش تو نہیں تھی کہ میں بالکل ہی ہینڈز اپ ہو جاتا مگر ہاتھ اتنے اوپر اٹھا لیے کہ خاتون کو نظر آ جائے۔ یہاں کسی قدر اندھیرا تھا۔ میں حیران تھا کہ ٹھیک ہے میں غلطی سے ٹیکسی سمجھ کر بیٹھ گیا تھا لیکن اس میں اتنا برافروختہ ہونے کی کیا ضرورت تھی کہ خاتون نے پستول نکال لیا۔

"اوکے... میں اتر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "گولی چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

لیکن اس سے پہلے کہ میں اترتا اچانک ہی دونوں طرف کے دروازے کھلے اور دو مرد اندر گھس آئے۔ جتنی ان کی آمد میرے لیے غیر متوقع تھی اتنی ہی میری موجودگی ان کے لیے غیر متوقع تھی۔ ان میں سے ایک مشتعل ہو کر بولا۔ "یہ کون ہے....؟"

میرے بائیں طرف والا بولا۔ "تم نے کسے بٹھا لیا ہے؟"

"مجھے کیا پتا کون ہے۔" لڑکی غرائی اسے غرانے کا شوق تھا۔ "ٹیکسی سمجھ کر اندر گھس آیا۔"

"اور تم نے بٹھا لیا۔" میرے رائٹ بیٹھے آدمی نے طنز کیا۔ وہ دونوں جوان اور صورت سے ہی جرائم پیشہ نظر رہے تھے۔ "نیا یار بنا لیا.... اتنی جلدی۔"

"بکومت۔" لڑکی مشتعل ہو گئی۔ "یہ ابھی ایک منٹ پہلے آیا ہے اور تم لوگ کہاں مر گئے تھے؟"

لیفٹ والا بولا۔ "ٹھیک ہے ابھی یہاں سے تو نکلو۔"

تب میں نے دیکھا وہ دونوں مسلح تھے اور بائیں والے کے پاس ایک چرمی بیگ بھی تھا۔ میں نے کہا۔ "اے.. ایک منٹ.... مجھے یہاں اتار دو.... پھر جہاں مرضی جاؤ۔"

میں رائٹ سے مخاطب تھا اس لیے دیکھ نہیں سکا کہ لیفٹی نے اچانک میرے سر پر کچھ مارا اور میں کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہو گیا۔ پھر شور اور ہنگامے نے مجھے جھنجوڑا۔ ٹیکسی رکی ہوئی تھی لیکن وہاں نہیں تھی جہاں میں اس میں بیٹھا تھا بلکہ یہ سڑک پر ٹریفک میں پھنسی ہوئی تھی۔ کٹ سے چند گاڑیاں بڑے غلط انداز میں مڑی تھیں اور انہوں نے سارا ٹریفک جام کر کے رکھ دیا تھا۔ میرے لیفٹ رائٹ بیٹھے دونوں بدمعاش چلا رہے تھے اور ان کا ساتھ لڑکی دے رہی تھی۔ ہارنز کے شور نے الگ دماغ خراب کر رکھا تھا۔ لیفٹی بار بار چلا کر کہہ رہا تھا۔ "نکلو یہاں سے...."

"کیا تمہاری.... گاڑی نکال کر لے جاؤں۔" لڑکی نے مردانہ وار جواب دیا۔ اس کی اصل بات ناقابلِ بیان تھی۔ میں بے سدھ تھا اور فی الحال میں نے بے سدھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ وہ لوگ سخت مشتعل اور جذباتی ہو رہے تھے اگر میں کوئی حرکت کرتا تو مجھے گولی بھی مار سکتے تھے۔ اتنے پاس سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک میں ایک سے نمٹتا دوسرا مجھے شوٹ کر دیتا۔

"اس مصیبت کو بھی ساتھ ہی بٹھانا تھا۔" لیفٹی زیادہ بھنایا ہوا تھا۔ "اسے گولی مار کر نیچے پھینکو۔"

"تاکہ جن کو پتا نہ ہو ان کو بھی پتا چل جائے۔" لڑکی بولی اس نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ "گاڑیاں ہٹ رہی ہیں اپنا منہ بند رکھو اور پیچھے دیکھو کہیں جیولر کے گارڈز نہ دوڑے آ رہے ہوں۔"

"لیکن اس کا کیا کریں؟" لیفٹی پھر بولا۔

"اسے اپنا باپ بنا لینا۔" لڑکی نے مشورہ دیا۔ "یتیم

ہو، ورمال بھی ہے تمہاری۔"

اتنی دیر میں ان دونوں کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ وہ کس مشکل میں پھنسے ہیں اس سے صرف میرے ہی نکل سکتے تھے جب گاڑیاں ہٹ جاتیں تو انہیں خود جگہ مل جاتی۔ اس وقت تک انتظار کرنا تھا۔ اصل خطرہ اس جیولر کے گارڈز سے تھا جسے وہ لوٹ کر آئے تھے۔ کم سے کم ان کی باتوں سے تو یہی لگ رہا تھا۔ اتنی دیر میں میرے حواس لوٹ آئے تھے اب میں پوری طرح ہوش میں تھا۔ وہ دونوں مڑ کر دیکھنے لگے۔ لڑکی اپنی باتوں سے ان کی بات نہیں تو برابر کی ضرور لگ رہی تھی کیونکہ وہ دونوں اس کی گالیاں کھا کر بھی بے مزہ نہیں ہوئے تھے۔ ایک زمانہ تھا جب خواتین کی قانون شکنی چند مخصوص شعبوں تک محدود سمجھی جاتی تھی۔ لیکن آج کل خواتین دیگر شعبوں کی طرح جرائم میں بھی مردوں کے شانہ بشانہ سرگرم عمل تھیں۔ اس کا ثبوت اسٹیئرنگ وہیل پر موجود لڑکی تھی۔ وہ گھبرائے بغیر بتدریج اپنی ٹیکسی کو ٹریفک جام سے نکال رہی تھی۔

یقیناً انہوں نے یہ ٹیکسی کسی سے چھینی تھی اور اب اس پر ڈکیتی کے بعد فرار ہو رہے تھے۔ اس سے ان کی چالاکی کا اندازہ ہوتا تھا کسی مخصوص گاڑی کے مقابلے میں ٹیکسیوں کی تعداد سڑک پر سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ بالخصوص اسلام آباد میں رکشا اور کسی حد تک بلیک کیب پر پابندی کی وجہ سے یلو کیب کی بھرمار تھی اور سڑک پر تقریباً ہر تیسری گاڑی یلو کیب ہی ہوتی ہے۔ اگر پولیس کو بروقت اطلاع مل جاتی اور وہ روایتی حرام خوری ترک کر کے فوراً مبینہ ٹیکسی کو تلاش کرنا شروع کرتی تب بھی انہیں تلاش کرنا آسان نہیں تھا لیکن چالاکی کے ساتھ انہوں نے کسی قدر حماقت کا ثبوت بھی دیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر لڑکی کی موجودگی یقیناً پولیس کو متوجہ کرتی۔ مگر اس وجہ سے پولیس انہیں نظر انداز بھی کر سکتی تھی کیونکہ اب خواتین بھی ٹیکسی چلانے لگی ہیں۔

بالآخر ٹریفک جام ختم ہوا اور ٹیکسی اسلام آباد کی طرف روانہ ہو گئی۔ لڑکی نے پوچھا۔ "یہ بے ہوش ہے اسے سیدھا تو کرو ذرا باہر کوئی دیکھ لے گا تو ہم مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

"پڑا رہنے دو۔" لیفٹی بے پروائی سے بولا۔ "اندھیرے میں کس کو نظر آئے گا۔"

"دکان میں تو گڑبڑ نہیں ہوئی تھی؟"

"نہیں.... سب نے فوراً ہاتھ اٹھا لیے تھے اور سب سے پہلے گارڈ نے اپنی گن رکھی تھی دوسرا اندر تھا ہم نے اسے وہیں قابو کر لیا اور پھر سب کو بند کر دیا۔ آخر میں سیلز مین کو بھی بند کر آئے تھے۔" رائٹی نے فخر سے کارروائی بیان کی۔

"تجوری چھوڑ دی تھی؟" لڑکی نے تشویش سے پوچھا۔ "اصل مال تو اس میں تھا۔"

"تجوری چھوڑ سکتے تھے۔" لیفٹی ہنسا۔ "زیادہ دیر اسے کھلوانے میں لگی، کم بخت مالک کے ہاتھ کانپ رہے تھے بار بار غلط نمبر ملا دیتا تھا۔"

"میرا خیال ہے کوئی دو کلو سونا تو ہوگا۔"

"دو کلو۔" لڑکی بد مزگی سے بولی اور پھر گالی دے کر کہا۔ "آج کل اتنا کھوٹ ملانے لگے ہیں کہ ایک کلو بھی نکل آئے تو غنیمت سمجھنا۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے بے ہوش جان کر سکون سے بات کر رہے ہیں لیکن یہ ان کے ذہن میں بھی آ گیا تھا کہ میں ہوش میں ہو سکتا ہوں۔ ان میں سے کسی نے ماچس سے سگریٹ سلگائی اور تیلی اچانک میری گردن پر لگا دی ردِ عمل میں میرا ہاتھ بے ساختہ گردن کی طرف گیا اور لیفٹی نے گالی دے کر اس بار سخت وار کیا اور میں سچ مچ بے ہوش ہو گیا۔ وہ میری توقع سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوئے تھے تبھی کامیاب ڈکیتی کے بعد کامیابی سے فرار ہو رہے تھے۔ میں نے ان کی ہوشیاری کا اندازہ درست نہیں لگایا تھا اور مجھے دوسری بار اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا تھا۔

مجھے ہوش آیا تو میں سخت اور سرد فرش پر کروٹ کے بل پڑا ہوا تھا۔ جیکٹ نے مجھے ٹھٹھرنے سے بچا لیا تھا ورنہ یہاں بہت سردی تھی اور رات بھی ہو چکی تھی۔ میں نے آنکھ کھول کر جائزہ لیا۔ یہ لکڑی کی دیواروں والا کمرا تھا اس کے ایک کونے میں پتھر سے بنا آتش دان تھا اور اس کے اوپر چمنی سے بنی چمنی چھت کی طرف جا رہی تھی۔ آتش دان بجھا ہوا تھا اور اس میں راکھ پڑی تھی۔ صاف ظاہر تھا اسے عرصے سے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ خالی کمرے کی حالت بتا رہی تھی یہ جگہ آباد نہیں تھی۔ فرش پر مٹی تھی اور مٹی پر میں پڑا ہوا تھا۔ فرنیچر کے نام پر کمرے میں صرف ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پڑی تھی جس کے دو پائے غائب تھے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ڈاکو مجھے یہاں لے آئے تھے اور شاید چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے۔ لیکن نہیں وہ دوسرے کمرے میں موجود تھے۔ یہ کمرا بالکل خالی تھا اور یہاں ایک پیلا بلب روشن تھا۔ البتہ دوسرے کمرے میں زیادہ روشنی تھی اور گفتگو کی آواز بھی آ رہی تھی۔ میں اٹھ کر دبے قدموں دروازے تک آیا۔ لڑکی کی آواز آئی۔ "ذرا مضبوطی سے پکڑو پیالی چھلک نہ جائے۔"

"نہیں چھلکے گی تم بھی شعلہ زیادہ مت لہراؤ میرا ہاتھ نہ

جل جائے۔" لیفٹی کی آواز آئی۔

"یہ ایک کلوگرام سونا ہے؟" رائی نے کسی قدر مایوسی سے کہا۔

"ایک کلو سے زیادہ ہی ہے۔" لیفٹی نے یقین سے کہا۔ "میں نے اٹھا رکھا ہے مجھے اندازہ ہے۔"

دروازے میں ایک رخنہ تھا اور اس سے دوسرے کمرے کا منظر کسی قدر واضح تھا۔ وہ کمرا ابھی خالی تھا اور وہ تینوں وسط میں بیٹھے تھے۔ لڑکی نے ویلڈنگ ٹارچ سنبھال رکھی تھی جس کا تیز نیلگوں شعلہ کئی ہزار ڈگری سینٹی گریڈ کا درجہ حرارت رکھتا ہے۔ لیفٹی نے سناروں کی وہ مخصوص دھاتی پیالی ایک پلاس کی مدد سے پکڑ رکھی تھی جس میں سونا پگھلایا جاتا ہے اسے شاید کٹھالی کہتے ہیں۔ رائی سونے کے زیورات کو ایک ایک کرکے اس کٹھالی میں ڈال رہا تھا۔ اس نے آخری زیور ڈالا۔ کٹھالی میں موجود سونا پگھل گیا تھا ورنہ لڑکی چھلکنے کی بات کیوں کرتی۔ شعلہ کے لیے گیسوں والے سلینڈر پاس پڑے تھے یہ خریدے بھی جاسکتے ہیں اور مخصوص دکانوں سے کرائے پر بھی مل جاتے ہیں۔ باقی چیزوں کا حصول کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

کٹھالی زیادہ بڑی نہیں تھی چائے پینے والے ایک درمیانی سائز کے پیالے کے برابر تھی۔ سونا بہت وزنی دھات ہے دنیا میں اس سے زیادہ وزن رکھنے والی چند ایک ہی دھاتیں اور عناصر ہیں۔ ایک کلوگرام سونے کی اینٹ کا سائز مشکل سے چند انچ ہوتا ہے اور اس کی موٹائی ایک انچ سے بھی کم ہوتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا کہ سونا کتنی کم جگہ گھیرتا ہے۔ کٹھالی میں یقیناً ایک کلوگرام سے زیادہ سونا آسکتا تھا۔ سونے میں ملاوٹ تھی خالص سونا حاصل کرنے کے لیے اسے پگھلا کر پانی میں ڈالتے ہیں اس سے سونے کا کھوٹ الگ ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا ڈلا الگ ہو جاتا ہے۔ پانی پاس ہی سلور کے پیالے میں موجود تھا۔ جب سونا پوری طرح پگھل گیا تو لڑکی نے ٹارچ بند کر دی اور لیفٹی نے احتیاط سے سونا پانی میں الٹ دیا۔ چھن کی آواز آئی اور پانی سے بھاپ کا بادل اٹھا جو فوراً سرد فضا میں تحلیل ہو گیا۔ وہ تینوں اشتیاق سے پیالے پر جھک گئے۔

مجھے ان تینوں کی طرف سے فکر نہیں تھی، بے شک انہوں نے عارضی طور پر مجھے بے بس کر دیا تھا لیکن مجھے اعتماد تھا میں ان پر قابو پا سکتا تھا۔ مجھے اس حادثے کی پروا بھی نہیں تھی بس اپنے ساتھیوں کا خیال تھا جو بے تابی سے میرے منتظر ہوں گے اور میں اب تک ان کے پاس نہیں پہنچا تھا۔ بہرحال جہاں آٹھ دن سے غائب تھا وہاں چند گھنٹے ایک رات اور سہی۔ وہ سونے کے ڈلے کے سرد ہونے کا انتظار کر رہے تھے بالآخر لیفٹی نے ڈرتے ڈرتے پلاس سے پکڑ کر اسے باہر نکالا اور بولا۔ "یہ ایک کلو کا ہے؟" اب اسے خود شک ہو گیا تھا۔

"ابھی پتا چل جاتا ہے۔" لڑکی نے اپنے بیگ سے وہ چھوٹا سا ڈیجیٹل ترازو نکالا جو سناروں کے پاس ہوتا ہے۔ اس نے ڈلا اٹھا کر اس پر رکھا۔ بٹن دبا کر ڈلے کا وزن کیا۔ رائی نے جوش سے کہا۔

"یہ تو پندرہ سو گرام کا ہے۔"

"پندرہ سو بائیس گرام۔" لڑکی نے تصحیح کی۔ "ان دنوں سونا چالیس ہزار روپے کا دس گرام ہے ذرا حساب لگانا۔"

لیفٹی کا حساب زیادہ تیز تھا۔ "ساٹھ لاکھ اٹھاسی ہزار روپے۔"

"لیکن ہمیں اس کے پچاس سے زیادہ نہیں ملیں گے۔" رائی نے کہا۔

"ہم اسے پورے دام سے بیچیں گے۔" لڑکی نے کہا۔ "تم لوگ فکر مت کرو یہ میرا کام ہے۔ ہم اس کی سو سو گرام کی بارز بنائیں گے اور پھر انہیں الگ الگ بیچیں گے۔"

"میرا تو مشورہ ہے ابھی سارا مت بیچو۔ سب اپنا اپنا حصہ سونے کی صورت میں کر لیں۔" رائی نے جلدی سے کہا۔ غالباً اسے خطرہ ہو گیا تھا کہ اس طرح کہیں اس کا حصہ نہ مارا جائے۔ لڑکی نے اس کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے بارز بنا کر آپس میں تقسیم کر لیں گے لیکن اس میں ایک خطرہ ہے کوئی پکڑا گیا تو وہ دوسرے کے بارے میں بک دے گا اور سب پکڑے جائیں گے۔"

"کیسے پکڑے جائیں گے؟" لیفٹی نے اعتراض کیا۔

لڑکی نے پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ "اس صورت کے ساتھ تم دلی کتب بھی بیچنے جاؤ گے تو لوگ چوری کی سمجھیں گے۔"

"اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔" لیفٹی خفا ہو گیا۔

لڑکی نے فوراً جواب دیا۔ "اسی صورت کے سہارے میں نے اندر کا سارا سروے کیا تھا اور تمہیں بتایا تھا اسی وجہ سے تم نے کامیاب ڈاکا مارا ورنہ تمہیں تو کوئی دکان میں گھسنے بھی نہ دیتا۔"

"ماہا ٹھیک کہہ رہی ہے۔" رائی نے لڑکی کی تائید کی۔ "ہم سونا بیچنے کی کوشش میں پکڑے بھی جاسکتے ہیں۔ یہ کام ماہا کو کرنے دو۔"

"تاکہ یہ سارا سونا لے کر فرار ہو جائے۔" لیفٹی نے طنز کیا۔ "نہیں سارا سونا اس کے پاس نہیں ہوگا۔ اسے ہم تقسیم کر لیں گے اور جب ماہا فروخت کرنے جائے گی تو بس اسی مالیت کا سونا ہماری تحویل میں دے کر جائے گی۔"

"میں اپنا سونا نہیں دوں گی۔" ماہا نے صاف انکار کر دیا۔ "تم دونوں نے اعتماد کرنا ہے تو کرو ورنہ ..."

"ورنہ ہم خود فروخت کرنے کی کوشش کریں گے اور گر پکڑے گئے تو بچو گی تم بھی نہیں۔" لیفٹی نے اسے دھمکی دی تو وہ فکر مند ہو گئی۔

"اوکے میں فروخت کروں گی لیکن اس صورت میں میرا حصہ زیادہ ہوگا۔ میں چالیس فیصد لوں گی باقی تیس تیس فیصد تم دونوں کو ملے گا۔"

لیفٹی اور رائی معمولی سی بک بک کے بعد اس فارمولے پر راضی ہو گئے۔ یہ معمولی سی بک بک ناقابل اشاعت قسم کی گالیوں اور گفتگو پر مشتمل تھی اور وہ اس کے عادی لگتے تھے گویا تینوں پیشہ ور مجرم تھے۔ یہ ان کی روزمرہ کی گفتگو تھی۔ ابھی ان کے پاس سو گرام کی بار کی ڈائی نہیں تھی۔ اس لیے یہ معاملہ بعد کے لیے اٹھا دیا گیا۔ لیفٹی کو میرا خیال آیا۔ "اس کا کیا کرنا ہے؟"

"اسے یہیں بند چھوڑ جاتے ہیں بعد میں پولیس اسے یہاں ٹیکسی کے ساتھ دریافت کرے گی تو خود سمجھ لے گی کہ ڈاکا اسی نے ڈالا ہے۔" ماہا بولی۔

"اور جو ہمارے حلیے اور ایک لڑکی ٹیکسی والی کی کہانی سنائے گا۔" رائی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "جس کی تصدیق یہ کرے گا۔"

"پھر کیا کریں؟" لیفٹی نے پوچھا۔

"اسے چھوڑ دو یہ پولیس کے پاس جانے کی حماقت نہیں کرے گا۔" رائی نے کہا۔ "ہم اسے ذرا دھمکا کر چھوڑ جاتے ہیں۔"

"کیا یہ ڈرانے سے مان جائے گا۔" ماہا نے جوابی سوال کیا۔ "اگر یہ پھر بھی پولیس کے پاس چلا گیا تو ...."

"تو کیا کریں اسے مار دیں؟" لیفٹی نے خطرناک سوال کیا۔

"میرا خیال ہے اسے جھیل میں ڈال دیتے ہیں بے ہوش ہے پاؤں میں پتھر باندھ دیں گے تو ڈوب کر مر جائے گا اور لاش بھی جلد اوپر نہیں آئے گی۔" ماہا نے یوں تجویز پیش کی جیسے ایک زندہ انسان کے بجائے جھیل میں کچرا پھینکنے کی تجویز دے رہی ہو۔

"یہ .... قتل ہوگا۔" خاصی دیر بعد رائی نے کہا۔ بہ ظاہر وہ اور لیفٹی میرے قتل پر آمادہ نہیں لگ رہے تھے لیکن ماہا ان پر حاوی تھی۔ کسی قدر بحث کے بعد اس نے انہیں راضی کر لیا۔ وہ مجھے جھیل میں ڈالنے پر راضی ہو گئے تھے۔ ماہا نے انہیں ترکیب بھی بتائی اس .... عورت کے سر میں شیطان کا دماغ فٹ تھا اس نے کہا۔ "پتھر باندھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے اس کی پتلون کے پائنچوں اور قمیص میں پتھر بھر دو یہ آرام سے ڈوب جائے گا۔"

میں نے دل ہی دل میں اسے بے نقط سنائیں۔ لیفٹی اور رائی کمرے کی طرف آئے تاکہ مجھے باہر لے جا کر ڈبونے کا انتظام کر سکیں۔ میں ان کے استقبال کے لیے تیار تھا۔ بلب سوئچ دبا کر بند کر دیا اب کمرے میں تاریکی تھی۔ آگے لیفٹی تھا۔ میں نے اسے یوں دبوچا جیسے بلی بے فکری سے ٹہلتے چوزے کو دبوچتی ہے۔ اس کے حلق سے ویسی ہی آواز نکلی جیسی چوزے کے حلق سے نکلتی ہے اس کے ہاتھ سے پستول میں پہلے ہی چھین چکا تھا۔ اس کا بایاں بازو گھما کر اس کی پشت سے لگایا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن پر پستول رکھ کر اسے سامنے کر لیا جب تک رائی اپنا پستول نکالتا میں لیفٹی کو قابو کرکے اپنی ڈھال بنا چکا تھا۔ میں نے دہاڑ کر کہا۔

"خبردار اگر اپنے ساتھی کی زندگی چاہتے ہو تو پستول پھینک دو۔"

رائی یقیناً اپنے دوست کی زندگی چاہتا تھا لیکن ماہا نے اس موقع پر چونکا دینے والا کام کیا جیسے ہی میں لیفٹی کو لیے دوسرے کمرے میں آیا اس نے اچانک پستول نکال کر ہماری طرف فائر جھونک مارا اور پھر کسی چھلاوے کی طرح باہر نکل گئی۔ میں اس کی پھرتی پر ششدر رہ گیا تھا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ میں ایک لاش تھامے کھڑا ہوں کیونکہ بغیر نشانہ لیے کیا جانے والا فائر سیدھا لیفٹی کے دل میں اتر گیا تھا۔ رائی کو احساس ہوا تو اس نے اپنا پستول میری طرف سیدھا کیا۔ مجبوراً مجھے حرکت میں آنا پڑا۔ اس کی چلائی گولی لیفٹی کو لگی اور ظاہر ہے اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا لیکن میری چلائی گولی رائی کے دائیں شانے میں لگی تو اسے خاصا فرق پڑا۔ اس نے حلق پھاڑ کر والدہ صاحبہ کو پکارا اور پستول چھوڑ کر شانہ تھام لیا۔ میں نے لیفٹی کی لاش کو چھوڑا اور رائی کے سر پر پستول کی نال رسید کی۔ اس کی چیخ و پکار ختم ہو گئی اور وہ لڑھک کر نیچے گر گیا۔ اسی لمحے باہر سے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور میں باہر کی طرف لپکا۔ ماہا

فرار ہو رہی تھی جب میں باہر آیا تو ایک سیاہ چھوٹی جیپ کچھ دور جا چکی تھی۔ میں نے اس کے ٹائروں کا نشانہ لے کر کئی فائر کیے مگر وہ بچ گئی۔

یہ جگہ کسی جھیل کے کنارے تھی۔ یہاں چاروں طرف جھاڑ جھنکاڑ تھا اور درمیان میں لکڑی سے بنا یہ کیبن کھڑا تھا۔ جھیل کچھ فاصلے پر تھی۔ وہ یلو کیب ایک طرف موجود تھی جسے انہوں ڈاکا مارنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا چابی اندر نہیں تھی۔ میں واپس کیبن میں آیا۔ چابی کیفنی اور رائی کے پاس بھی نہیں تھی وہ یقیناً ماہا کے پاس تھی۔ وہ نہ صرف یلو کیب کی چابی بلکہ سونے کی ڈلی بھی لے گئی تھی۔ کیفنی مارا جا چکا تھا اور رائی زخمی تھا لازمی بات ہے جلد یا بدیر وہ پولیس کے ہاتھ آجاتا۔ گویا سونے کی ڈلی اب ماہا کی ملکیت تھی اگر وہ ہوشیاری سے کام لیتی تو یہاں سے فرار ہو جاتی اور ہماری پولیس اسے گرفتار نہیں کر سکتی تھی۔ شاید اس کے ذہن میں شروع سے ایسا کوئی ارادہ تھا اور میری مداخلت نے اسے موقع فراہم کر دیا۔

ان لوگوں نے میری جیب سے رقم نہیں نکالی تھی اور نہ کلائی سے گھڑی اتاری تھی۔ میں نے رائی کو اس کے حال پر چھوڑا اور باہر آیا۔ کار کے ڈیش بورڈ سے ایک کثیرالمقاصد اسکروڈکارک مل گیا جس میں ایک چھوٹا سا چاقو بھی تھا۔ میں نے چاقو سے انجن سے آنے والی تاروں کا گچھا کاٹا اور پھر دو تاریں ملا ملا کر دیکھنے لگا۔ بالآخر کنیکشن وائرل گئیں اور انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ میں نے ان تاروں کو ملا رہنے دیا۔ میرے پاس وہ پستول تھا جس سے رائی پر گولی چلائی گئی تھی۔ اسے میں نے وہاں نہیں چھوڑا کیونکہ اس پر میری انگلیوں کے نشانات تھے اسے میں نے صاف کر کے جھیل میں اچھال دیا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ ماہا کو فرار ہوئے دس منٹ ہو چکے تھے اور اس کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ اب اس کے پیچھے جانا بیکار تھا وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر نہ جانے کہاں نکل گئی تھی۔

مگر اس لڑکی کے بارے میں میرا اندازہ درست نہیں تھا۔ وہ فرار نہیں ہوئی تھی۔ میں یلو کیب لے کر اس جگہ سے نکلا اور سڑک کی طرف جانے والا راستہ تلاش کرنے لگا۔ یہ راول جھیل نہیں تھی، اس کا کوئی ایسا حصہ تھا جو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ چاروں طرف جھاڑیاں اور قدِ آدم گھاس تھی اور اس کے درمیان سے کچا راستہ نہ جانے کہاں جا رہا تھا یہ سارا علاقہ جھیل کا کنارہ تھا۔ ایک جگہ یہ راستہ جھیل کے بالکل ساتھ سے گزر رہا تھا اور جھیل یہاں کچھ گہرائی میں تھی۔ میں نے بےفکری سے اس جگہ سے گزرنا چاہا تو اچانک بائیں طرف سے کسی گاڑی کی تیز روشنی چمکی اور انجن غرانے کی آواز آئی۔ فوراً سیاہ جیپ جھاڑیوں کو روندتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اس کے فرنٹ پر فولادی جالی تھی اور اس سے پہلے میں سنبھلتا جیپ نے کسی بلڈوزر کی طرح ٹیکسی کو ٹکر ماری۔

میں اس افتاد کے لیے بالکل تیار نہیں تھا کیونکہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ لڑکی اتنی تیز طرار نکلے گی۔ اس کے اعصاب قابلِ رشک تھے اور جرات قابلِ داد۔ اس نے فرار ہونے کے بجائے مجھے ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا۔ نہ صرف فیصلہ کیا بلکہ پلان بھی بنا لیا اور اس پر عمل بھی کر دیا تھا۔ ٹکر لگتے ہی ٹیکسی جھیل کی طرف لڑھکی اور پھر یک دم الٹ کر پانی میں جا گری۔ میں نے سیٹ بیلٹ نہیں باندھی تھی کیونکہ ٹیکسی میں اس قسم کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ ٹیکسی کے قلابازی کھانے کے دوران میں اندر ہی اندر الٹ پلٹ ہوا۔ میرا مضروب سر کسی چیز سے ٹکرایا اور مجھے تارے نظر آ گئے۔ میرے کانوں نے چھپاکے کی آواز سنی اور میں اپنے ذہن پر حاوی ہوتی تاریکی سے لڑ رہا تھا۔ ٹیکسی میں پانی بھر رہا تھا اور اگر میں بےہوش ہو جاتا تو ڈوب کر مر جاتا۔

میں اپنے حواس بحال رکھنے کی کوشش کے ساتھ ہاتھ پاؤں بھی چلا رہا تھا۔ ٹیکسی الٹ کر گری تھی اور اب پہلو کے بل پانی میں جا رہی تھی۔ پہلو بھی بایاں تھا جہاں میں پھنسا ہوا تھا۔ سر پر لگنے والی چوٹ شدید تھی اور میرا ذہن رفتہ رفتہ تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا میں زیادہ دیر اپنے حواس برقرار نہیں رکھ سکوں گا۔ ایک بار میں بےہوش ہو جاتا تو ڈوبنے سے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا تھا۔ ایسے میں قدرت نے عجیب انداز میں مدد کی۔ وہ چیز جو انسان کی جان لے لیتی ہے اس نے میرے حواس بحال کر دیے۔ ٹیکسی پانی میں گری تو اس کی بیٹری تک پانی نے رسائی حاصل کی۔ بیٹری کے ٹرمنل شارٹ ہوئے اور بیٹری نے بیکار ہونے سے پہلے پانی میں کرنٹ چھوڑا۔

کرنٹ کا یہ جھٹکا مجھے ہوش میں لے آیا۔ مجھے یوں لگا جیسے ایک لمحے کو میرا جسم کسی نے جھنجوڑ دیا ہو۔ میں چونکا اور اس کے ساتھ ہی ذہن پر چھائی تاریکی صاف ہوئی۔ میں سوچنے سمجھنے اور جان بچانے کے لیے حرکت کرنے کے قابل ہو گیا۔ سوائے میرے سر کے پورا جسم سرد پانی میں جا چکا تھا۔ میں نے سیدھا ہونے کی کوشش کی۔ یوں سمجھ لیں کہ ڈرائیونگ سیٹ کے دروازے پر قدم جما کر اٹھنے کی کوشش کی تو یک دم ہی ٹیکسی الٹی ہو گئی۔ اس کے پہیے آسمان کی طرف اٹھ گئے تھے اور چھت پانی میں چلی گئی تھی۔ پیچھے کا ایک شیشہ

کمزور تھا اور وہ پانی کے سامنے مزاحمت نہیں کر سکا تھا۔ اس کے ٹوٹتے ہی پانی بہت تیزی سے اندر بھرنے لگا۔ اب خود کو اندر رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے بچ جانے والی ہوا میں چند گہرے سانس لیے اور پھر سانس روک کر اپنی طرف کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔

عام طور سے کسی حادثے کی صورت میں سب سے پہلے دروازے جام ہو جاتے ہیں مگر خوش قسمتی سے یہ دروازہ جام نہیں ہوا تھا اور پہلی کوشش میں کھل گیا۔ میں فوراً باہر آیا۔ ٹیکسی اب گہرائی میں جا رہی تھی۔ اس جگہ پانی کنارے پر ہی خاصا گہرا تھا۔ یہ بڑی اور وزنی گاڑی تھی اس لیے زیادہ دیر تیر نہیں سکی اور اب ڈوب رہی تھی۔ میں باہر آتے ہی زیرِ آب ہی ٹیکسی سے دور جانے لگا۔ خطرہ تھا وہ مجھ پر ہی نہ چڑھ جائے اور تہ میں اپنے وزن سے دبا دے۔ میں نے سطح کی طرف جانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ مجھے یقین تھا ماہا اپنے کیے کا نتیجہ دیکھنے کے لیے کنارے تک آئے گی اور اگر میں اسے پانی میں تیرتا نظر آ جاتا تو وہ آسانی سے میرا شکار کر لیتی۔ اس کے پاس پستول تھا اور اس کا نشانہ میں دیکھ چکا تھا۔ بہ ظاہر ایسا لگا تھا جیسے اس نے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا بھی امکان تھا کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے اپنا ایک شریک کم کر دیا اور پھر پورا سونا لے کر فرار ہو گئی۔

مگر یہ میری غلط فہمی تھی کہ وہ فرار ہو گئی تھی۔ وہ وہیں تھی پہلے وہ مجھ سے نمٹتی اور پھر واپس جا کر رائی کا کام بھی تمام کر دیتی۔ اس نے دیکھا نہیں تھا لیکن سن لیا تھا کہ رائی زخمی ہوا تھا۔ وہ اپنے خلاف کوئی گواہ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ زیرِ آب تیرتے ہوئے میرے لیے سانس روکنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر میں نے سطح کا رخ کیا اور صرف سر باہر نکال کر چند گہرے سانس لیے۔ اسی لمحے میرے کانوں نے جیپ کے انجن کی آواز سنی اور تاریک کنارے پر اس کی روشنی لہرائی اور وہ دوبارہ کیبن کی طرف روانہ ہو گئی وہ یقیناً رائی کا کام تمام کرنے جا رہی تھی۔ اپنے طور پر مجھے تو ختم کر چکی تھی۔ میں تیرتا ہوا کنارے کی طرف آیا۔ یہاں سے اوپر جانے کی کوئی جگہ نہیں تھی البتہ ایک جگہ جھاڑیاں موجود تھیں میں انہیں پکڑ کر بہ مشکل اوپر آیا۔ سرد پانی کے بعد اب سرد ہوا مزاج پوچھ رہی تھی۔ شام میں اتنی ٹھنڈ نہیں تھی لیکن رات ہوتے ہی درجہ حرارت خاصا گر گیا تھا۔ کچے راستے پر آ کر میں نے کیبن کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

اصولاً مجھے ایک بار بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے یہاں سے بھاگ لینا چاہیے تھا لیکن اب پنگے لینے کی عادت اتنی پختہ ہو گئی تھی کہ مسئلہ سامنے ہو تو فرار ہونے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ میں کیبن کے پاس پہنچا تو اندر سے آنے والی فائر کی آواز نے مجھے رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ماہا نے یقیناً رائی کا بھی خاتمہ کر دیا تھا اور اب کسی لمحے بھی باہر آ سکتی تھی۔ اس کے آنے سے پہلے میں نے جیپ کا بیک ڈور کھولا اور اندر آ گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا تھا کہ ماہا باہر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ چوکنی ہر طرف دیکھ رہی تھی غالباً اس نے جیپ کا دروازہ بند ہونے کی آواز سن لی تھی۔ مگر یہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ یہ آواز کیسی ہے بالآخر وہ جیپ کی طرف آئی۔ اندر بیٹھ کر اس نے جیسے ہی اگنیشن گھمایا میں نے عقب سے اس کی کن پٹی پر ہاتھ مارا۔ وہ تڑپ کر پلٹی لیکن فوراً ہی بےسدھ ہو کر رہ گئی۔ میں نے احتیاطاً دوسرا ہاتھ مارا اور اس کی بےہوشی کو پختہ کر دیا۔ اس جیسی سفاک قاتلہ کے ساتھ رعایت خودکشی بھی ہو سکتی تھی۔

میں اتر کر نیچے آیا اسے کھینچ کر نیچے اتارا اور اس کے عورت ہونے کی پروا کیے بغیر اس کی مکمل تلاشی لی۔ پستول اس نے اپنی جیکٹ میں رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا والٹ تھا۔ میں نے اسے کھول کر جائزہ لیا تو اس میں ماہا کا شناختی کارڈ، اس کا ڈرائیونگ لائسنس، رقم اور کچھ دوسری اشیا کے ساتھ ایک ائر ٹکٹ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ دبئی کا ٹکٹ تھا۔ فلائٹ دو دن بعد کی تھی۔ گویا وہ ملک سے فرار کے لیے بھی تیار تھی۔ جیپ کے پیچھے ایک رسی پڑی تھی جو ہر عقلمند ڈرائیور لازمی رکھتا ہے کہ کہیں گاڑی جواب دے جائے اور اسے ٹو کر کے لے جانا پڑے۔ اس رسی سے میں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے۔ اس کا پستول، پرس اور جیپ کی چابی اپنے قبضے میں لے لی اور کیبن میں آیا۔

رائی کی لاش دیکھ کر افسوس ہوا ماہا نے اس کے سر میں گولی ماری تھی۔ اس عورت کی سفاکی نے مجھے حیران کر دیا تھا اس نے کتنی آسانی سے اپنے دونوں ساتھیوں کو گولی مار دی تھی۔ میں نے اپنے کپڑے اتار کر نچوڑے اور دوبارہ پہن لیے۔ مجبوری تھی ان کے سوا کوئی لباس نہیں تھا۔ ویسے بھی یہاں سردی تھی لیکن جان لیوا قسم کی نہیں تھی۔ میں واپس جیپ کی طرف آیا تو ماہا کسمسا رہی تھی۔ اسے جیپ کے عقبی حصے میں ڈال کر میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور ہیٹر آن کر دیے۔ ذرا دیر میں اندر گرمی ہو گئی اور میں سکون محسوس کرنے لگا۔ اس گرمی کا ماہا پر بھی خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ وہ تیزی سے ہوش میں آ گئی۔ صورتِ حال کا ادراک ہوتے ہی اس کی زبان چل

پڑی تھی۔ میں نے پلٹ کر پستول اس کے منہ پر رکھ دیا اور درشت لہجے میں بولا۔

"بک بک مت کرو ورنہ میں تمہیں شوٹ کر کے یہیں تمہاری لاش چھوڑ جاؤں گا۔"

"جھوٹ مت بولو۔" وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ "اگر تمہیں مجھے قتل کرنا ہوتا تو اب تک میں زندہ نہ ہوتی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے میں نے تمہیں کیوں زندہ رکھا ہے۔"

"کیونکہ میں ایک خوبصورت عورت ہوں اور میرا جسم....." اس کی باقی بکواس ناقابل بیان تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے تھپڑ مارنے کی خواہش پر قابو پایا۔

"تمہارا اندازہ غلط ہے مجھے تمہاری خوب صورتی یا جسم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے تمہیں صرف اس لیے چھوڑا ہے کہ تمہیں چوری کے سونے سمیت پولیس کے حوالے کروں تاکہ تمہیں ڈکیتی اور اپنے دو ساتھیوں کو قتل کرنے کی سزا ملے۔"

اس کی آنکھیں بے یقینی آمیز خوف سے پھیل گئیں۔ "تم.....ایسا نہیں کر سکتے؟"

"کیوں نہیں کر سکتا اور مجھے یا کسی بھی قانون پسند شہری کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔"

"سنو تم سونا لے لو یا جو چاہے کرو لیکن مجھے پولیس کے حوالے مت کرو۔ میں گرفتار ہونے پر موت کو ترجیح دوں گی۔"

"ٹھیک ہے اگر تم کہتی ہو تو میں تمہیں شوٹ کر دیتا ہوں لیکن تمہاری لاش تو پولیس کی تحویل میں جائے گی۔" میں نے کہا اور اس کے سر پر یوں پستول رکھا جیسے گولی چلانے والا ہوں۔ وہ بوکھلا کر بولی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"پھر کیا مطلب تھا؟" میں نے کہا۔ "تم نے ان دو بیوقوفوں کو راضی کر لیا کہ وہ تمہارے لیے ڈاکا ماریں۔"

"ہم ساتھی تھے یہ ان کی پلاننگ تھی۔"

"اس کے بعد تمہاری پلاننگ یہ تھی کہ ان دونوں کو مار کر ان کے حصے پر بھی قابض ہو جاؤ۔"

"حفیظ تمہاری وجہ سے مارا گیا اور ماجد زخمی تھا اگر میں اسے نہیں مارتی تو وہ پولیس کو میرے بارے میں بتا دیتا۔" وہ اپنا دفاع کر رہی تھی۔

"تمہارے پاس سے دبئی کا ٹکٹ نکلا ہے دو دن بعد تمہاری فلائٹ ہے۔"

وہ چونکی۔ "تم نے میری تلاشی لی ہے؟"

"ہاں سونے کی ڈلی سمیت سب میرے قبضے میں ہے۔"

"سنو۔" وہ خوف زدہ ہو کر بولی۔ "تم یہ سب لے لو اور مجھے جانے دو۔"

"مجھے بھی تمہارا اچار نہیں ڈالنا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن آزادی کی ایک ہی قیمت ہے مجھے اپنے بارے میں سب سچ بتا دو۔"

"کیا سچ بتا دوں؟" وہ بدک جانے والے انداز میں بولی۔

"تم دو دن بعد یہاں سے جا رہی ہو کیا تمہیں یقین تھا کہ یہ ڈاکا کامیاب رہے ہیں۔"

"ہاں....."

"کس بنیاد پر یقین تھا؟"

وہ چپ رہی اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ہیٹر کی وجہ سے میرے کپڑے تقریباً خشک ہو گئے تھے اگرچہ ان کی شکل تباہ ہو گئی تھی۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ "تم اس طرح سے جواب نہیں دو گی بہرحال میں نے وہ دونوں پستول محفوظ کر لیے ہیں جن سے یہاں گولیاں چلی ہیں اور دوسرے پستول پر بھی میں نے تمہاری انگلیوں کے نشانات حاصل کر لیے ہیں۔" یہ بات میں نے اسے ڈرانے کے لیے کہی تھی۔ "اگر تم مجھے مطمئن نہیں کر سکیں تو میں وہی کروں گا جو ابھی میں نے کہا ہے۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ کسمسائی۔ "اگر تم نے مجھے نہیں چھوڑا تو میں راستے میں شور مچا دوں گی۔"

"تم نے اچھا کیا جو ہمیں بتا دیا۔" میں نے جیپ روکی اور ایک کپڑے سے اس کا منہ بند کر دیا۔ قریب سے دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بہت دلکش لڑکی ہے۔ لڑکی میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کی جسمانی ساخت لڑکیوں والی تھی ورنہ اس کی گفتگو سے لگتا تھا کہ وہ خاصی تجربے کار ہے۔ اس نے جینز کے ساتھ شرٹ اور اوپر ہلکی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ان میں سے کسی کے پاس سے موبائل فون نہیں نکلا تھا ورنہ میں عبداللہ یا وسیم سے رابطہ کر سکتا تھا۔ انہیں بلا لیتا تو میرا کام آسان ہو جاتا لیکن اب مجھے خود وہاں جانا تھا۔ اس آفت کے ساتھ ہوتے ہوئے میں راستے میں کہیں رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد میں مری روڈ پر نکل آیا۔ یہ ایک ذیلی سڑک تھی جو اس جھیل کو تقریباً چھوتی ہوئی گزر رہی تھی۔ میں نے احتیاطاً اندر کی لائٹس بند کر دیں۔ عبداللہ کی کوٹھی کے بجائے میں نے فارم ہاؤس جانے کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا۔ عبداللہ کی کوٹھی سارے دشمنوں کی نظر میں آ چکی تھی اور وہاں

بار بار جانا ٹھیک نہیں تھا۔ فارم ہاؤس دور تھا مگر دشمنوں سے محفوظ تھا۔ مجھے وہاں پہنچنے میں تقریباً پون گھنٹا لگ گیا۔ جیپ مین گیٹ کے سامنے روکی تاکہ مانی مجھے دیکھ لے پھر اندر سے کوئی نہ کوئی آ جاتا۔ میں نے اپنی صورت نمایاں کی تو اس کا خطر خواہ ردعمل سامنے آیا پہلے بیتو باڑے سے فرار ہونے والے جانور کی طرح دوڑتا ہوا آیا اس کے پیچھے سفیر تھا۔ بیتو مجھ سے لپٹ گیا اور سلام دعا کے بجائے اپنا فیصلہ سنایا۔

"اب ہم آپ کو کہیں اکیلا نہیں جانے دے گا آپ جا کر غائب ہو جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے مت جانے دینا لیکن ابھی تو چھوڑ دو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ اپنوں کے درمیان لوٹ آنے سے جو طمانیت محسوس ہوئی تھی اس نے میرے اعصاب کو ہلکا کر دیا تھا۔ سفیر کے تیور جارحانہ تھے۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "فی الوقت خاکسار بہت دھکے کھا کر آ رہا ہے اور مرتے مرتے بچا ہے مگر ساتھ ہی ایک خاتون بھی ہیں۔"

"خاتون۔" سفیر کا غصہ اشتیاق میں بدل گیا۔ "کون ہیں اور کہاں ہیں۔"

میں جیپ اندر لے آیا باہر رونمائی مناسب نہیں تھی۔ پھر بیک ڈور کھول کر تعارف کرایا۔ "مس ماہا..... پیشہ ور ڈکیت ہیں اور اپنے ہی دو ساتھی مار چکی ہیں..... میری قسمت اچھی تھی ورنہ تیسرا شکار میں ہوتا۔"

"کاش تیری جگہ میں ہوتا۔" سفیر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ساری حسینائیں تجھے ہی ملتی ہیں۔"

وسیم بھی آ گیا مجھ سے مل کر اس نے ماہا کا معائنہ کیا اور پھر اسے کھینچ کر جیپ سے نیچے اتارا۔ ماہا نے مزاحمت نہیں کی تھی اب وہ کچھ خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ "ایسا کریں اسے اندر چلتے ہیں یہاں خاصی سردی ہے۔"

"یہ جیپ پیچھے لے جاؤ پتا نہیں اس کی ہے یا چوری کی ہے۔" میں نے بیتو کو کہا۔ جیپ ابھی تک اسٹارٹ تھی چابی کے بغیر اسے کیسے بند کرتا۔ میں نے بیتو کو وائر کا بھی بتا دیا تھا جس کو الگ کرنے سے انجن بند ہو جاتا۔ اندر آ کر مجھے وہی سکون ملا تھا جو کہیں سے تھکے ہارے انسان کو گھر آنے کے بعد ملتا ہے۔ میں نے اپنے کمرے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ "میں بھوک سے فوت ہونے والا ہوں اس لیے احتیاطاً غسل کرنے جا رہا ہوں۔"

میں نے نہا کر کپڑے بدلے اور نیچے آیا تو سفیر نے بچا کھچا کھانا گرم کر دیا تھا اور یہ بچا کھچا بھی نہایت شاندار قسم کا تھا۔ چکن کڑاہی، پشاوری پراٹھے اور ایک عدد مسلم بکرا تھا جو نہ

جانے کیسے بیتو اور مانی کی دست برد سے بچ گیا تھا۔ کھانے کے اختتام پر لاجواب کافی تھی۔ میں نے خود کو بہت آسودہ محسوس کیا تھا۔ جب تک میں کھاتا رہا وسیم مجھے یہاں کے حالات اور واقعات سے آگاہ کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ ثمینہ ہمارے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ گزشتہ رات ہونے والا دھماکا کسی ٹائم بم کا تھا۔ اس میں نادر کے چار گارڈ مارے گئے تھے اور دو زخمی ہوئے تھے لیکن وہ خود محفوظ رہا تھا۔ نادر کے بچ جانے کی خبر سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا اور اس سے بھی زیادہ اچھی بات یہ تھی کہ اس نے ایف آئی آر میں اپنے بھائی مرشد پر شبہ ظاہر کیا تھا۔ لازمی بات ہے یہ مرشد کا ہی کام تھا۔ وہ اپنے بھائی کو اس دنیا سے رخصت کرنے کے لیے بے قرار تھا۔

"نادر اب کہاں ہے؟"

"یہ معلوم کرنا پڑے گا کیونکہ پولیس کی آمد سے پہلے ہی وہ وہاں سے نکل گیا تھا۔ میرے آدمی نے تعاقب کیا لیکن اس کی گاڑی کو نادر کے محافظوں نے فائرنگ کر کے ناکارہ کر دیا۔"

"نادر نے خود رپورٹ درج کرائی ہے؟"

"ہاں عبداللہ نے معلوم کیا ہے وہ متعلقہ تھانے خود آیا تھا اور اس نے بہ نفس نفیس رپورٹ لکھوائی ہے۔"

"یہ اچھا ہوا کہ نادر زندہ بچ گیا اور اس نے رپورٹ بھی لکھوا دی۔ ورنہ وہ مارا جاتا تو مرشد کو اس سے نجات مل جاتی اور وہ نادر کے قتل کا الزام بھی ہم پر لگا دیتا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے، کوٹھی کے جس حصے میں دھماکا ہوا وہ نادر کا عشرت کدہ ہے اور اس رات وہاں ثمینہ کو بلایا گیا تھا لیکن اس کی طبیعت خراب ہو گئی اور اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ دوسری کو تلاش کرنے میں وقت لگا۔ دھماکا ٹائم بم کا تھا اور وہ یقیناً کئی گھنٹے پہلے وہاں لگا دیا گیا تھا۔ نادر وہاں نہیں پہنچا اور بم اپنے ٹائم پر پھٹ گیا۔"

"اچھا ہوا وہ مرنے سے بچ گیا ورنہ مرشد ایف آئی آر ہمارے خلاف درج کراتا۔" میں نے کہا۔

"البتہ یہ برا ہوا کہ نادر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔" سفیر نے کہا۔

"اسے جہنم میں جھونکو۔" میں نے کہا۔ "کل رات میں نے آری ریسٹ ہاؤس میں غور و فکر فرمایا تو انکشاف ہوا کہ ہم گمراہ تھے۔"

"تیرے بارے میں مجھے یقین ہے۔" سفیر نے کہا۔ "پہلے زرین ملی تھی اور اب یہ نئی گرم کنواری اٹھا لایا

ہے۔ہم ہیں شریف لوگ نکاح کر کے گھر میں ڈالا ہے۔"

"آپ بکواس بند کریں گے یا میں مونا کو آپ کے ارشادات سے آگاہ کروں جو آپ نے ماہا کو دیکھ کر فرمائے تھے۔" میں نے کہا۔" میں دشمنوں کے خلاف اپنی حکمت عملی کی بات کر رہا ہوں۔"

وسیم جو مسکرا رہا تھا سنجیدہ ہو گیا۔" شہباز صاحب بہ خدا چند دن سے میں بھی اسی بات پر غور کر رہا ہوں کہ ہمارا اصل نشانہ فتح خان اور مرشد کو ہونا چاہیے۔ نادر علی اب ایک بے بس سانپ ہے۔ اصل اژدھا مرشد ہے۔ اسی طرح ہم شہلا کے پیچھے لگے رہے اور فتح خان کو نظر انداز کر دیا۔"

"بالکل، نتیجے میں یہ آزاد ہیں ہمارے خلاف کچھ بھی کرنے کے لیے۔" میں نے سر ہلایا۔" مرشد ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہ رہا ہے۔ وہ نادر سے چھٹکارے کے ساتھ اس کے قتل کا الزام ہم پر لگانا چاہ رہا ہے۔ اگر نادر مر جاتا تو وہ اس وقت مکمل کر ہمارا دشمن بنا ہوتا۔ اسی طرح فتح خان مسلسل میرے پیچھے ہے وہ مجھے استعمال کر کے اپنی مقصد براری چاہتا ہے۔"

"کیا چاہتا ہے شوبی بھائی۔" جیتو جو غور سے سن رہا تھا گڑبڑا کر بولا۔

"اپنا مفاد حاصل کرنا چاہتا ہے۔" مانی نے سمجھایا۔

"اب آپ بتائیں کہ آپ پر کیا گزرا۔" جیتو نے پوچھا۔" آپ پورا تو دن بعد آیا ہے۔"

"یار بہت کچھ ہوا اور داستان بڑی لمبی ہے لیکن میں اختصار سے سناتا ہوں۔" میں نے کہا۔" اللہ کا کوئی بندہ اس دوران میں چائے کافی کی سپلائی جاری رکھے۔"

"یہاں سارے اللہ کے بندے ہیں۔" سفیر نے انکار کر دیا۔" میں اکیلا کچن انچارج نہیں ہوں۔"

"میں بنا کر لاتا ہوں۔" مانی نے کہا۔" لیکن تب تک آپ انہیں کچھ نہیں بتائیں گے۔"

"بالکل میں ہونٹ سی لوں گا۔" میں نے کہا اور وسیم سے ماہا کے بارے میں پوچھا۔" اسے کہاں رکھا ہے؟"

"اوپر ایک اسٹور ہے جس کا دروازہ باہر سے بند ہو جاتا ہے اسی میں ہے۔ میں نے کھول دیا تھا اور ایک کمبل اور تکیہ دے دیا ہے۔"

"کھانے کو نہیں دیا؟"

"نہیں .... صبح تک بھوکی پیاسی رہے گی تو دماغ درست ہو جائے گا۔"

"بڑی خطرناک چیز ہے، اس نے اتنے آرام سے دو قتل کیے اور پھر فرار ہونے کے بجائے مجھے بھی قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو زندگی تھی ورنہ اس نے اپنے طور پر کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

"تب میری درخواست ہے، اس پر رحم کھانے کی ضرورت نہیں ہے اگر یہ ہمارے کام کی نہیں ہے تو اسے پولیس کے حوالے کریں وہ خود اس سے نمٹ لے گی۔"

"بالکل خاتون نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ایک جیولر کو لوٹا۔" میں نے ایک سونے کا ڈلا نکال کر میز پر رکھا۔" حاصل ہونے والے زیورات اب اس میں شامل ہیں۔"

سفیر نے ڈلا اٹھایا۔" میرے خدا یہ تو ایک کلو سے زیادہ وزنی ہے۔"

"پندرہ سو بیس گرام اور خالص سونا ہے۔" میں نے تصحیح کی۔" بازار میں اتنے سونے کی قیمت ساٹھ لاکھ روپے سے زیادہ ہے۔"

"ساٹھ لاکھ یعنی انہوں نے لمبا ہاتھ مارا۔" جیتو بولا۔

"لیکن کیا فائدہ .... ان میں سے دو ہمیشہ کے لیے لیے ہو گئے اور تیسری یہاں ہماری قید میں ہے۔ اس کا مقدر بھی جیل یا پھانسی کا پھندا بنے گا۔"

مانی کافی بنا کر لایا تو وہ بھی سونے کا ڈلا دیکھ کر حیران ہوا اس نے اٹھا کر کہا۔" یہ اصلی ہے؟"

"اتنا ہی اصلی جتنا خالص بھوسا تمہارے سر میں بھرا ہے۔" سفیر نے یقین سے کہا۔

"سفیر بھائی آپ میرے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہیں۔" مانی بھنا کر بولا۔" خود آپ کے سر میں کیا ہے؟"

"وہ جو بھوسا کھائے جانے کے بعد وجود میں آتا ہے۔" سفیر نے اطمینان سے جواب دیا۔" ورنہ شادی کیوں کرتا۔"

"شکر کرو مونا دیدی اتنا اچھا کھانا بناتا ہے۔" جیتو نے کہا۔

سفیر نے جیتو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔" ابھی بچے ہو، عورت کا بس یہی فائدہ تمہارے ننھے سے دماغ میں آتا ہے۔"

مانی کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے ٹریک پر لایا گیا اور میں نے اپنی کہانی شروع کی۔ چند منٹ سب اس میں گم ہو گئے تھے۔ واقعات بہت زیادہ تھے اور اختصار کی ساری کوششیں ان سب کے سوالات نے ناکام بنا دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بات ختم ہوتے ہوتے رات کے دو بج

گئے تھے۔ میں تھکن اور نیند محسوس کر رہا تھا لیکن اتنی بھی نہیں کہ اپنی بات پوری کیے بغیر سو جاتا۔ اس دوران میں باری باری سب چائے کافی بناتے رہے تھے۔ مانی کے بعد وسیم نے بنائی اور پھر جیتو نے چائے بنائی جو خلاف توقع بہت اچھی تھی۔ سفیر نے اٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایاز کے بارے میں پتا چلا کہ وہ عبداللہ والی کوٹھی میں تھا اور وہاں سیکورٹی کا انچارج بن گیا تھا۔ کیونکہ سابق انچارج اب وسیم کے ساتھ تھا اور موبائل سیکورٹی وین اس کے پاس ہوتی تھی۔

"وہ بہت اچھا ڈرائیور اور کمپیوٹر استعمال کرنا بھی جانتا ہے۔" وسیم نے بتایا۔" ایاز ڈرائیور اس سے اچھا ہے لیکن کمپیوٹر استعمال نہیں کر سکتا ہے۔"

مانی اسٹڈی کی طرف چلا گیا۔ جیتو وہیں صوفے پر بیٹھے بیٹھے سو گیا اور سفیر نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ سینٹرلی ہیٹڈ ہونے کی وجہ سے اندر سردی کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔ میں وسیم کے ساتھ اوپر آیا۔ فتح خان اور شہلا کے بارے میں بتایا تھا لیکن بریف کیس والا معاملہ میں نے سامنے نہیں رکھا تھا۔ میں وسیم سے اس بارے میں بات کرنا چاہتا تھا اس لیے اسے اپنے ساتھ لے آیا۔" شہلا کا کچھ پتا چلا؟"

"کسی حد تک...." وہ بولا۔" عبداللہ نے اسے ٹریفک میں ایک گاڑی میں دیکھا تھا بدقسمتی سے وہ دوسری طرف جارہی تھی کچھ دیر کے لیے دونوں طرف ٹریفک جام ہوا تو دونوں گاڑیاں بالکل پاس پاس رکیں اور عبداللہ نے شہلا کو دیکھ لیا۔ اس نے بھی عبداللہ کو دیکھ لیا تھا اس لیے نہایت عجلت میں فرار ہوئی۔ عبداللہ بس اس کی کار کا نمبر نوٹ کرنے میں کامیاب ہوا۔ جب تک وہ اگلے کٹ سے گھوم کر اس سڑک پر آتا شہلا غائب ہو چکی تھی۔"

"نمبر سے کیا پتا چلا؟"

"گاڑی صابر ترمذی کے نام پر رجسٹر ہے۔ یہ ایک مقامی بدمعاش ہے۔ میرے آدمی اس کی نگرانی کر رہے ہیں لیکن ابھی تک اس کا شہلا سے کوئی تعلق سامنے نہیں آیا ہے۔"

"تعلق سامنے نہیں آیا ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔" وہ اس کے نام رجسٹر گاڑی میں پھر رہی ہے اور تم کہہ رہے ہو تعلق سامنے نہیں آیا ہے۔"

"میرا مطلب ہے ان کا آپس میں لنک واضح نہیں ہے۔"

"اگر وہ آپس میں رابطہ رکھتے ہیں تو تمہارے یا کسی کے سامنے تو نہیں رکھیں گے۔ یار تمہاری عقل کو کیا ہوا ہے؟ تم نے اس کے فون یا گھر کو بگ کیا ہے؟"

"نہیں .... دراصل آپ کی فکر میں ہم سارے کام بھولے ہوئے تھے۔"

"میری فکر کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس کے بجائے وہ کام کرتے جس کا فائدہ ہوتا۔" مجھے غصہ آ گیا تھا۔

"سوری شہباز صاحب۔" وسیم شرمندہ ہو گیا۔

"خیر آئندہ ان چیزوں کا خیال رکھنا۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔" میں ایک خاص بات کے لیے تمہیں یہاں لایا ہوں۔" میں نے اسے بریف کیس کے بارے میں بتایا۔" مجھے شبہ ہے فتح خان اور شہلا اس کی اہمیت سے واقف ہو گئے ہیں یا ہمارے نئے دشمن کرنل بریسکی عرف عبدالرحمٰن نے انہیں احساس دلایا ہے اور وہ بھاری قیمت کے عوض اس بریف کیس کا سودا کسی ایسی طاقت سے کرنا چاہتے ہیں جسے چین سے دشمنی ہو۔ بلکہ امکان ہے وہ بھارتیوں سے اس کا سودا کر بھی چکے ہیں۔"

"چین کے دشمن ممالک کی کوئی کمی نہیں۔" وسیم بولا۔" امریکا تو دشمن ہے بھارت بھی چین کا بڑا بننے کی کوشش میں چین کے سامنے کھڑا ہونا چاہتا ہے اور روس بھی چین کا بہت اچھا دوست نہیں ہے۔ جب ان دونوں ممالک کا نظریہ ایک ہی تھا تب بھی وہ چین کی پیٹھ میں چھرا گھونپ چکا ہے۔ ان میں سے ہر ملک چین کے فوجی راز حاصل کرنا چاہے گا۔"

"بریف کیس شہلا کے پاس تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ اسے گنوا چکی ہے فتح خان اور کرنل مل کر اسے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"گنوا چکی ہے۔" وسیم چونکا۔" یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔"

"اگر بریف کیس ان کے پاس ہوتا تو وہ اب تک اس کا سودا بھی کر چکے ہوتے۔ مگر وہ اسے کھو چکے ہیں اور اب اسے تلاش کر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے فتح خان نے مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی کہ میں اس کی تلاش میں رکاوٹ نہ بنوں۔"

"اس صورت میں ہمیں پہلے معلوم کرنا چاہیے کہ وہ بریف کیس کہاں ہو سکتا ہے؟"

"یہ بات شاید ہمیں شہلا بتا سکتی ہے۔ فتح خان تک بھی وہی رہنمائی کر سکتی ہے۔ میرا اندازہ ہے بریف کیس کے بارے میں فتح خان ہی جانتا ہے۔"

"یعنی ہمارا پہلا ٹاسک شہلا کو تلاش کرنا ہے؟"

”بالکل۔“ میں نے کہا۔ ”دوسرے کوئی ایسی جگہ تلاش کرنی ہے جہاں ہم بے خوف و خطر اپنے قیدیوں کو رکھ سکیں۔“

وسیم مسکرایا۔ ”یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوں جناب۔“

وسیم نے نوشہرہ جانے والی سڑک پر ایک پرانی حویلی حاصل کر لی تھی۔ یہ زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن ہمارے لیے نہایت موزوں تھی۔ ایک تو یہ تقریباً تمام شہروں کے آس پاس تھی۔ دوسرے اس کے نزدیک کہیں کوئی آبادی نہیں تھی اور تیسرے یہاں بجلی کی سہولت تھی۔ سب سے بڑھ کر اس میں ایک ایسا تہ خانہ تھا جس میں کسی کو بند کیا جاتا تو اس کی روح ہی وہاں سے نکل سکتی تھی۔ وسیم نے اسے ہیڈ کوارٹر کے طور پر منتخب کیا تھا اور سارا سامان وہاں منتقل کر دیا تھا۔ حویلی کا ظاہری روپ ویسا ہی چھوڑ کر اس کے اندر چند کمروں اور تہ خانے کو صاف اور رہائش کے قابل بنا لیا تھا۔ آنے جانے کے لیے سامنے کے بجائے عقب میں موجود چھوٹے گیٹ کا انتخاب کیا تھا۔ گاڑیاں بھی وہیں کھڑی کی جاتی تھیں۔ اگر کوئی سامنے سے آکر دیکھتا تو اسے عمارت اور احاطہ ویران ہی نظر آتا۔ کمپیوٹرائزڈ وین بھی وہیں موجود تھی۔

”تم نے اچھا کام کیا ہے اب سب سے پہلے صابر ترمذی کے گھر کو بگ کرو۔ وہ کرتا کیا ہے؟“

”بہ ظاہر اسٹیٹ کا کام ہے لیکن سنا ہے زمینوں پر قبضے کرتا ہے اور جعلی کاغذات بنوا کر بیچ دیتا ہے۔ کسی زمانے میں بدمعاش بھی رہا ہے لیکن بہ ظاہر شریف ہو گیا ہے۔“

”شہلا کا سراغ اسی سے ملے گا۔“

”میں ابھی روانہ ہوتا ہوں۔“

”اتنی رات گئے؟“

”ایسے کام رات ہی میں ٹھیک ہوتے ہیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”ویسے میں نے سوچا ہے ہمیں دن میں باہر جانے سے گریز کرنا چاہیے اور رات کو اپنے کام نمٹانے چاہئیں کیونکہ اس طرح نظروں میں آنے کا امکان کم ہوتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن مسئلہ یہ ہے کہ حالات پر ہمارا کنٹرول نہیں ہے۔“

”وہ بھی ہو جائے گا اگر ہم چند اصول اپنا لیں‘ اس میں سب سے پہلا اصول حفاظت اور دشمن سے دور رہنے کا ہے۔“ وسیم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے جانے کے بعد میں لیٹ گیا اور کچھ دیر بعد میں سو چکا تھا۔ میری آنکھ صبح سویرے کھلی۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ پھر سفیر اندر آیا اس نے کہا۔

”بھائی اب اٹھ جا سورج سر پر آنے والا ہے۔“

”بکواس نہ کر سورج وہ سامنے طلوع ہو رہا ہے۔“ میں نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”میرا مطلب ہے چار پانچ گھنٹے بعد سر پر آجائے گا۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”دیگر احوال یہ ہے کہ وسیم تجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

میرا موبائل ہمیشہ کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ آخری موبائل میں نے خود کموڈ میں پھینک کر برباد کیا تھا تاکہ دشمن اس میں سے کوئی نمبر نہ حاصل کر سکیں۔ سفیر اپنا موبائل لایا تھا میں نے اس سے موبائل لیتے ہوئے کہا۔ ”یار میرے لیے کسی موبائل کا بندوبست کر۔“

”یہ تیرے لیے ہی لایا ہوں اس میں موجود ہم میں سب کے نمبرز ہیں۔“ سفیر نے جاتے ہوئے وضاحت کی۔ ”آدھے گھنٹے بعد ناشتا تیار ملے گا۔“

میں نے وسیم کا نمبر ملایا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

”کام ہو گیا اب آرام ہو رہا ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”میں صابر ترمذی کے گھر کے پاس ہوں۔ اس کا گھر رات کو بگ کر دیا تھا اس کا فون بھی بگ کیا ہے۔“

”کوئی کام کی بات معلوم ہوئی؟“

”ابھی تک تو نہیں ہوئی، میں خود وین میں ہوں۔“

”رات میں بھول گیا تھا اور اتفاق کی بات ہے کہ دشمن کی قید سے نکل کر جب عبداللہ سے بات کرنے کا موقع ملا تب بھی بھول گیا۔“

”اگر آپ کرنل بریسکی کا بتانا چاہ رہے تھے تو اس کا پول تو آپ کے غائب ہوتے ہی کھل گیا تھا۔ وہ محل کے کنٹرول روم سے فتح خان کو کال کرتا تھا اور اسے علم نہیں تھا کہ سیکریٹری بیگ بھی اس جگہ کی نگرانی کرتا ہے لیکن پول کھل جانے کے بعد وہ چھلاوے کی طرح محل سے فرار ہو گیا۔“

”چلو اچھا ہوا کہ راجا صاحب کو بے خبری میں کوئی نقصان نہیں ہوا۔“ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

”میں چاہتا ہوں کہ آپ اور سفیر فارم سے حویلی میں شفٹ ہو جائیں۔“

”نہیں سفیر کے لیے میں نے کچھ اور سوچا ہے‘ یہاں کے معاملات میں خود دیکھوں گا۔ یہ جگہ بھی بہت ضروری ہے۔ ہمارے پاس ہمیشہ ایک سے زیادہ ٹھکانے ہونے چاہئیں۔ حویلی تم چلے جاؤ۔“

”ٹھیک ہے لیکن فارم میں آمد و رفت کم سے کم ہو تو بہتر ہے۔ یہ معروف جگہ ہے اور دشمن کی نگاہ میں آنے کے امکانات زیادہ ہیں۔“

میں نے وسیم سے اتفاق کیا۔ ”ثمینہ کس طرح قابو میں آئی؟“

”زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔“ وسیم ہنسا۔ ”وہ پہلے ہی نادر سے نفرت کرتی ہے۔ وہ جنس کے معاملے میں ناکارہ ہونے کے بعد نفسیاتی مریض بن گیا ہے۔ اپنی تسکین کے لیے وہ ان عورتوں کو بلواتا ہے اور ان کے ساتھ نہایت ذلت آمیز سلوک کرتا ہے۔ وہ پیسے کی خاطر چلی جاتی ہیں اور اس کی زیادتیاں بھی برداشت کرتی ہیں لیکن اس سے شدید نفرت بھی کرتی ہیں۔“

”ثمینہ نے نادر کے بارے میں کوئی کام کی بات بتائی؟“

”کچھ اہم باتیں بتائی ہیں۔ ایک تو یہ کہ فاضلی اصل میں مرشد کا آدمی ہے لیکن وہ نادر کا اعتماد بھی رکھتا ہے۔“

”یہ حیرت انگیز بات ہے کہ نادر ایک ایسے شخص پر کس طرح اعتماد کر رہا ہے۔“

”پتا نہیں....“ وسیم نے کہا۔ ”مجھے بھی یہ بات سمجھ نہیں آئی ہے‘ نادر ذہنی طور پر پہلے کی طرح شاطر ہے اور اسے اچھی طرح پتا ہے کہ فاضلی مرشد کا خاص آدمی ہے۔ بہرحال .....دوسری بات یہ معلوم ہوئی ہے کہ نادر نے ثمینہ کے ساتھ جانے والی ایک کال گرل کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیا تھا۔ اس کا صبر و ضبط جواب دے گیا تھا اور اس نے نادر کو نہایت گندی گالیاں دی تھیں۔ نہ صرف گالیاں بلکہ دھمکی بھی دی تھی کہ وہ سب کے سامنے اس کا پول کھول دے گی۔ نادر جیسے لوگ کسی کی دھمکی کہاں برداشت کرتے ہیں۔ اس نے کال گرل کو خود کوڑے مار مار کر مار ڈالا تھا اور ثمینہ کو یہ منظر دیکھنے پر مجبور کیا تھا بعد میں فاضلی نے اس کال گرل کی لاش کہیں ٹھکانے لگا دی تھی۔ ثمینہ کا کہنا ہے نادر خطرناک قسم کا نفسیاتی مریض بن گیا ایسے لوگ ساری دنیا کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔“

”تم فاضلی کی نگرانی کراؤ وہ نادر سے رابطے میں ہوا تو اس کا سراغ پھر مل جائے گا۔“

”میں نے یہ کام پہلے ہی کر لیا ہے۔ میرے دو آدمی مرشد ہاؤس کے پاس ہیں اور جیسے ہی فاضلی وہاں سے نکلا اس کی نگرانی شروع ہو جائے گی.... ایک منٹ شہباز صاحب‘ صابر کے گھر میں کوئی سرگرمی ہو رہی ہے۔ میں اسے چیک کرتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے تم اپنا کام کرو میں ناشتا کرتا ہوں۔“

میں نیچے آیا تو سفیر دودھ، ڈبل روٹی، مکھن، شہد اور اورنج جوس کا ناشتا میز پر لگا چکا تھا۔ مانی اور بیتو سو رہے تھے لیکن جب وہ اٹھ کر یہ ناشتا دیکھتے تو ان کی بھوک مر جاتی۔ ”آج تمہیں ان مضرِ صحت چیزوں کا خیال کیسے آگیا؟“

”میری ہمت جواب دے گئی ہے پراٹھے بنا بنا کر۔“ سفیر بولا۔ ”یہ مانی ہی کم نہیں تھا اوپر سے بیتو بھی آگیا اور لگتا ہے دونوں میں خوش خوراکی کا مقابلہ ہو رہا ہے۔“

”یار وہ یہ سب نہیں کھائیں گے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ تیار پراٹھے لے آتے۔ ان کو بس گرم کرنا پڑتا ہے۔“

”گرم تو کرنا پڑتا ہے بھائی۔“ اس نے فریاد کی۔ ”یہ لوگ مل کر پانی پینے کے روادار بھی نہیں ہیں اور سب مجھ پر چھوڑ رکھا ہے۔“

”تب ایسا کر حویلی چلا جا....“

”نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔“ اس نے فوراً انکار کر دیا۔ ”یہاں کم سے کم آرڈر ڈلیور کرنے والے تو آجاتے ہیں۔ اس سے میری تھوڑی بہت بچت ہو جاتی ہے۔“

”بیٹے کسی دن ڈلیور کرنے والوں کے پیچھے دشمن بھی آجائیں گے اور سب کو ایک ساتھ سمیٹ کر لے جائیں گے۔“

”خواہش تو میری بھی یہی ہے۔“ وہ بولا۔ ”ان کم بختوں سے کسی اور طرح جان چھوٹتی نظر نہیں آرہی ہے۔“

اچانک مجھے خیال آیا۔ ”ماہا کا کیا کیا ہے؟“

”اس کا کیا کرنا ہے سیج واش روم کی سیر کرا کے ناشتا ڈال دیا تھا اب آرام سے اپنے قفس میں ہے۔“

ناشتے کے بعد میں اوپر آیا۔ اسٹور کی کنڈی صرف باہر سے لگی تھی اور خاصی مضبوط تھی۔ میں نے کنڈی کھولی۔ ماہا کونے میں ہاتھوں میں دونوں گھٹنے سمیٹ کر بیٹھی تھی۔ اس نے میری آمد کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا اور اسی طرح بیٹھی رہی۔

”میرا خیال ہے تم نے سوچ لیا ہو گا سچ بول کر اپنے لیے آزادی حاصل کرو گی یا جھوٹ بول کر پھانسی کے تختے یا ساری عمر کے لیے جیل جانے کو ترجیح دو گی۔“

”اگر میں کچھ کہوں گی تو تم کیسے فیصلہ کرو گے کہ میں سچ بول رہی ہوں یا جھوٹ؟“ اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”سچ یا جھوٹ کا جاننا کوئی مشکل نہیں ہے صرف ایک دن لگے گا تصدیق ہونے میں۔“

”تمہیں مجھ سے کیا دلچسپی ہے؟“

”کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”لیکن تم نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتی تھی اگر تم پولیس کے پاس چلے جاتے تو میرا اس ملک سے نکلنا ممکن نہ رہتا۔“

میں چونکا۔ ”اس کا مطلب ہے پولیس کے پاس تمہارا ریکارڈ موجود ہے۔“

وہ چپ رہی پھر کچھ دیر بعد کہا۔ ”مجھے جانے دو، مجھے پولیس کے حوالے کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا مجھے عادی مجرم انہوں نے بنایا ہے۔ ورنہ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ میں ایک چور کی بیٹی ہوں۔ ایک دن پولیس والے اسے پکڑنے آئے تو ساتھ میں مجھے بھی لے گئے۔ رات بھر میرے ساتھ وہاں کیا ہوا تم اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔“ اس کے لہجے میں تپش آ گئی۔ ”میرے باپ کے سامنے میری آبروریزی کی گئی اور وہ چور تھا بے غیرت نہیں تھا صدمے سے مر گیا۔ اس کے مرنے کے بعد بھی....“

”مجھے یہ سب بتانے کا فائدہ....“ میں نے اس کی بات کاٹی۔

وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ ”بس ہمت جواب دے گئی۔ تم تو سچ سننا چاہتے تھے۔ میری زندگی میں اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے بعد میں ان تمام پولیس والوں کو ایک ایک کرکے مارا۔ ایک بار پکڑی گئی، کئی مہینے تک تھانوں اور جیل میں اسی عذاب سے گزری پھر کوشش کرکے فرار ہو گئی۔ اب بھی مفرور ہوں۔“

”اسی وجہ سے تم اس ملک سے بھاگنا چاہتی ہو۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے بہت کچھ جمع کر لیا ہے لیکن وہ تم مجھ سے حاصل نہیں کر سکتے وہ سب دبئی میں محفوظ ہے۔ اگر تم یہ سونا رکھنا چاہو تو رکھ لو۔“

سفیر میرے پیچھے آیا تھا۔ اس نے آواز دے کر مجھے باہر بلایا۔ میں نے باہر آ کر کنڈی بند کی۔ سفیر مجھے ایک طرف لے گیا اور آہستہ سے بولا۔ ”اس مصیبت کو بلاوجہ لے آئے اب اس سے جان چھڑاؤ.... یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔“

”کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو مونا کے شوہر۔“

”بس تو اس کا سونا اس کے حوالے کرو اور یہاں سے چلتا کرو۔“

”ایسے نہیں یار، آنکھیں باندھ کر کہیں چھوڑنا ہے تاکہ یہ جگہ نہ دیکھ سکے۔ یہ کام بعد میں کریں گے، ابھی اسے یہاں پڑا رہنے دو اور سونا اس کے حوالے نہیں کرنا یہ چوری کا مال ہے اس کے اصل مالک تک واپس پہنچانا ہے۔“

”چل ٹھیک ہے۔“ سفیر نے سر ہلایا۔ ”اب اس پر وقت مت ضائع کر۔“

”یہ بتا کہ خواتین کو بیرونِ ملک بھیجنے کا جو پروگرام تھا اس کا کیا بنا؟“

”کیا بننا تھا انہوں نے انکار کر دیا ہے۔“ سفیر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتیں۔“

”عبداللہ والی کوٹھی تمام دشمنوں کی نظروں میں آ چکی ہے اور کسی اور جگہ ہم ان کو اتنی سیکورٹی مہیا نہیں کر سکتے۔“

”فارم ہاؤس اور حویلی جیسی جگہیں ان کے لیے نہایت ناموزوں ہیں۔“ سفیر نے سر ہلایا۔ ”مونا تو اس قابل بھی نہیں ہے کہ بھاگ دوڑ کر سکے۔“

میں چونکا۔ ”کیا مطلب....؟“

سفیر شرمیلے انداز میں مسکرایا تو میں سمجھ گیا اور اس کے شانے پر مکا مار کر چلایا۔ ”ابے ہم سے استادی.... چوری چوری باپ بننے جا رہا ہے۔“

شور سن کر جیتو دوڑا آیا اور خوش ہو کر بولا۔ ”کیا ہوا شوبی بھائی.. سفیر بھائی کا مرڈر کر رہا ہے صبح صبح....“

سفیر خفا ہو گیا۔ ”تم سب سالے میرے دشمن ہو رہے ہو میرے بچے کو پیدا ہونے سے پہلے یتیم کرنا چاہتے ہو۔“

”بچہ۔“ جیتو نے غور کیا اور پھر چلایا۔ ”سفیر بھائی آپ باپ بننے والے ہو۔“

”یہ واقعہ کب ہوا.... اور میرا بھتیجا یا بھتیجی کب دنیا میں آئے گی۔“

”یار اتنی تازہ خبر ہے کہ آج کے اخبار میں بھی نہیں ہے۔ مونا نے صبح فون کرکے بتایا ہے رات اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی تو لیڈی ڈاکٹر بلائی گئی تھی اس نے ٹیسٹ کے بعد تصدیق کر دی ہے۔“

”بس یار اتنی تفصیل کافی ہے۔“ میں نے جھینپ کر کہا۔ جیتو بھی کھسیایا ہوا تھا وہ خاموشی سے کھسک گیا۔ سفیر کو جوش جذبات میں احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ کیا بیان کر رہا ہے۔ میں سنجیدہ ہو گیا۔ ”سفیر اب بہت ضروری ہو گیا ہے کہ مونا کسی محفوظ جگہ رہے جہاں اس حوالے سے اس کی مکمل دیکھ بھال کی جائے۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں ایسی جگہ میری حویلی ہو

سکتی ہے۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہاں عام سی سیکیورٹی ہوگی اور تو جانتا ہے ہمارے دشمنوں کے لیے یہ کچھ بھی نہیں۔ مونا کی وجہ سے دوسرے بھی مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔“

”پھر....؟“

”میرا مشورہ مان تو مونا اور سعدیہ کو میری حویلی بھیج دیتے ہیں وہاں سیکیورٹی بھی ہے اور ماں جی بھی ہیں دیکھ بھال کے لیے۔ آپا بھی آ گئی ہیں۔ اتنی خواتین میں ان کا دل بھی لگا رہے گا۔“

”کہہ تو ٹھیک رہا ہے لیکن کیا یہ مانیں گی؟“

”کیوں نہیں مانیں گی۔“ میں نے کسی قدر برہمی سے کہا۔ ”کیا انہیں ہمارے حالات کا اندازہ نہیں ہے وہ نہیں جانتیں کہ ان کی حفاظت کی خاطر ہم بعض اوقات کتنے مجبور ہو جاتے ہیں۔ میری مان تو تو بھی حویلی چلا جا....“

”آپ اپنی تجویز اپنے پاس رکھیں۔“ اس بار سفیر برہم ہو گیا۔ ”میں کہیں نہیں جا رہا۔“

”دیکھ تو مستقل وہاں نہیں رہے گا جب تیری ضرورت ہوگی تجھے واپس بلا لیں گے اور یہ سوچ کہ اس حالت میں عورت کو اپنے شوہر کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ مونا تیرے بغیر نہیں رہ سکتی.... وہ جانے سے انکار کر دے گی اور تو کیا چاہتا ہے وہ مشکل میں رہے۔“

سفیر نرم پڑ گیا۔ ”میں ایسا کب چاہتا ہوں لیکن تیرا ساتھ بھی نہیں چھوڑ سکتا۔“

”تو نے میرا ساتھ دیا ہے اور آئندہ بھی دیتا رہے گا۔ جنگ نہ جانے کب تک چلے۔ ضروری نہیں ہے دورانِ جنگ ہر سپاہی محاذِ جنگ پر رہے۔ وہ آرام کرنے یا کسی وجہ سے پیچھے بھی جا سکتا ہے۔ سمجھ لے تیرے ساتھ بھی ایسا ہی مسئلہ ہے آخر تم لوگ اتنے عرصے دبئی میں رہے ہو اور جب مجھے ضرورت محسوس ہوئی تو واپس آ گئے۔ اسی طرح مونا کو لے کر حویلی چلا جا۔ تیرے ہونے سے وہاں حفاظت بھی ہوگی اور مونا بھی مطمئن رہے گی اسی طرح کچھ عرصے بعد وسیم چلا جائے گا اور تو واپس آ جانا۔“

سفیر خاموش ہو گیا لیکن وہ مطمئن نہیں تھا۔ میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ ”دیکھ سب کا سامنے ہونا ٹھیک بھی نہیں ہے۔ دشمن کا داؤ چل سکتا ہے اور وہ سب کو ایک ہی بار میں مار ڈالے یا سمیٹ کر لے جائے گا۔ ہمارا الگ ہونا اور دور ہونا بھی ضروری ہے۔“

”منتشر ہونے سے ہماری طاقت کمزور پڑ جائے گی۔“ سفیر نے دلیل دی۔

”نہیں تو اتنا دور نہیں ہوگا کہ چند گھنٹوں میں یہاں نہ آ سکے۔ پھر ہمارا مستقل رابطہ رہے گا۔ دیکھ اس وقت سب سے اہم بات ہے کہ ہمیں کسی بھی مہم کے لیے آدمی میسر ہوں لیکن حال یہ ہے کہ نصف درجن آدمی صرف خواتین کی حفاظت پر ہیں اور ہم یہاں ان کی سیکیورٹی میں کسی قسم کی کمی نہیں کر سکتے۔“

”تیری حویلی میں کر سکتے ہیں؟“ سفیر نے سوال اٹھایا۔

”وہاں کی سیکیورٹی بھائی جان نے کرائی ہے وہ ان کے جانے پہچانے لوگ ہیں۔ روٹین کے تحت ایک گروپ جاتا ہے تو دوسرا آ جاتا ہے۔ وہ سب اپنے کام میں ماہر ہیں پھر انہوں نے حویلی کی الیکٹرانک سیکیورٹی بھی کر دی ہے۔ اس لیے وہ جگہ اتنی ہی محفوظ ہے جتنی عبداللہ کی کوٹھی ہے۔ شہر کی نسبت گاؤں میں کسی قسم کی کارروائی آسان کام نہیں ہے۔“

سفیر سنجیدہ ہو گیا۔ ”تو سچ مچ ایسا ہی چاہتا ہے۔“

”نہیں میں مذاق کر رہا ہوں۔“ میں نے جھنجلا کر کہا۔

سفیر ہنسا۔ ”اب تو سنجیدہ ہو گیا ہے۔“

”سفیر یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ ہم انتظار کرنے کے بجائے خود اپنے دشمنوں سے نمٹنے کی کوشش کریں۔ اس طرح فائدہ صرف ان کو ہوتا ہے وہ حملہ کرتے ہیں اور ہمیں دفاع پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ہماری مجبوری ہے کہ ہم ایک حد سے زیادہ کھل کر کارروائی نہیں کر سکتے کہ دشمن آخری حد تک نہ چلے جائیں۔ اس کے باوجود وہ آخری حد تک جاتے رہے ہیں۔ میرے گھر پر حملہ ہوا میرے بھائی کو مار دیا سویرا کو اغوا کیا۔ پھر مجھے احساسِ بے بسی میں مبتلا کرنے کے لیے سویرا کو دوبارہ اغوا کیا اور حویلی پہنچا دیا۔ لیکن اب بہت ہو گیا ہے۔“

میرا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور غصے سے میری آواز بھی بلند ہونے لگی تھی۔ اس جدوجہد کے دوران بہت کم مواقع ایسے آئے جب صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹا ہو۔ اپنی صبر و تحمل والی پالیسی کی وجہ سے میں مشکل ترین مراحل سے گزر گیا تھا۔ مگر اب مجھ میں شاید برداشت نہیں رہی تھی۔ مسلسل مشکلوں نے میرے اعصاب پر اثر ڈالا تھا۔ سفیر نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”وہ ہمیں سبق سکھاتا ہے اور خود تیرا ریڈی ایٹر گرم ہو رہا ہے ایسے گاڑی نہیں چلے گی۔“

ہم پیچھے آئے سفیر نے مجھے پانی پیش کیا اور ایک

گلاس ٹھنڈا پانی نوش کر کے میں نے سکون محسوس کیا تھا چند گہرے سانس لے کر میں نے اپنے اعصاب پر قابو پا لیا۔ اس دوران میں سفیر نے چائے نکالی۔ تھرماس میں گرم چائے موجود تھی۔ مانی آنکھیں ملتا ہوا آیا اور میز پر موجود ڈبل روٹی اور مکھن کو دیکھ کر برا سا منہ بنایا۔ ”پھر وہی ڈبل روٹی مکھن.....“

”تو کیا روز پراٹھے پیش کروں؟“ سفیر نے آنکھیں نکال کر کہا۔

مانی ٹھنڈی سانس لے کر میز پر بیٹھ گیا۔ ”سفیر بھائی آپ اتنے اچھے پراٹھے بناتے ہو کہ لڑکی ہوتا تو میں آپ سے شادی کر لیتا۔“

سفیر جھینپ گیا اور میں نے قہقہہ لگایا۔ ”بدمعاش۔“ سفیر نے فوراً موضوع بدل دیا۔ ”وسیم کہاں ہے؟“

”وہ صابر ترمذی کے گھر کے باہر مورچہ بنائے بیٹھا ہے۔ اس نے گھر کو بگ کر دیا ہے اور ممکن ہے اس سے ہمیں شہلا یا فتح خان کا پتا مل جائے۔“

جیتو سن رہا تھا اس نے کہا۔ ”شوبی بھائی..... ہم کب تک دشمن سے اس طرح دب کر رہے گا۔ اُدھر انڈیا میں دشمن اتنا زیادہ تھا اور ہم تین چار ہوتا تھا اُدھر بھی ہم کبھی دب کر نہیں رہا تو پھر یہ آپ کا اپنا ملک ہے.....اِدھر اتنا ساتھی ہے سب کچھ ہے۔“

”جیتو اپنا ملک ہونے کا احساس ہے اسی لیے میں اب تک صرف اپنا دفاع کر رہا تھا لیکن اب میں نے سوچ لیا ہے دشمن کو مزید مہلت نہیں دینی ہے۔“

”ٹھیک ورنہ وہ وار کرتا رہے گا۔“ مانی نے مکھن لگی ڈبل روٹی نگلتے ہوئے کہا۔ ”دشمن سے کبھی اچھائی کی توقع نہ رکھیں۔“

”سفیر، مونا اور سعدیہ کے ساتھ میری حویلی جا رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”خواتین یہاں محفوظ نہیں ہیں۔“

”آپ نے ٹھیک فیصلہ کیا۔“ مانی خوش ہو کر بولا۔ ”سفیر بھائی حویلی میں بالکل محفوظ ہوں گے۔“

”اور یہاں ہم ان سے محفوظ ہو گا۔“ جیتو نے اس کی تائید کی۔

اس سے پہلے سفیر انہیں کچھ کہتا میں نے ہاتھ اٹھایا۔ ”لڑائی بعد میں ابھی چند معاملات طے کرنے ہیں۔ مانی یہ بتاؤ کہ اگر ہمیں یہاں سے فرار ہونا پڑے تو تمہارا اہم سامان کتنا ہے؟“

”بس اتنا ہے کہ ایک بڑے سوٹ کیس میں آ جائے گا۔ کپڑے اور مانگ چھوٹے ہوتے ہیں اگر انہیں اتارنے کی مہلت نہ ملے تو بازار سے اور مل جاتے ہیں۔ میرے کمپیوٹر اور سیٹلائٹ ریسیور تو ایک منٹ میں پیک ہو جائے گا۔“

”بس تو سب اس پوزیشن میں رکھو کہ ہم کسی بھی وقت یہاں سے نکل سکیں۔“ میں نے کہا تو وہ سب تشویش زدہ ہو گئے۔

”خیریت شوبی کیا دشمن یہاں تک آ گیا ہے؟“

”آیا تو نہیں ہے مگر ہمیں اس لحاظ سے تیار بھی رہنا چاہیے تاکہ اگر ایسا موقع آئے تو بہ حفاظت فرار میں مشکل نہ پیش آئے۔“ میں نے وضاحت کی۔ ”یہ جگہ کسی قدر غیر محفوظ ہے کیونکہ ایک معروف سڑک کے ساتھ ہے اور اتفاق سے بھی دشمنوں کی نظر میں آ سکتی ہے۔ اسی وجہ سے اہم اشیا یہاں سے منتقل کر دی گئی ہیں۔“

”اہم اشیا۔“ مانی نے غور کیا۔ ”یعنی میں اور جیتو فالتو چیزیں ہیں۔“

”بیٹے نتائج اخذ کرنے میں اتنی جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ سفیر نے چمکار کر کہا۔ ”شوبی نے اہم چیزوں کا ذکر کیا ہے۔“

جیتو خوش ہو گیا۔ ”ہم تو انسان ہے۔“

سفیر نے پھر چھیڑا۔ ”اگرچہ یہ جھوٹ ہے لیکن تمہارا دل رکھنے کو ہم مان لیتے ہیں۔“

”آپ کو ماننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔“ مانی جل بھن کر بولا۔ ”انسان ہونے کے لیے آپ کا سرٹیفکیٹ نہیں چاہیے۔“

سفیر نے اس کی تائید کی۔ ”ٹھیک کہا تمہارے لیے تو کم سے کم ایک میڈیکل بورڈ چاہیے جس میں آدھے ماہرین زولوجی کے ہوں گے اور وہ فیصلہ کریں گے کہ تم اصل میں کیا ہو۔“

ان لوگوں کو جھگڑتا چھوڑ کر میں اسٹڈی میں آیا کیونکہ وسیم کی کال آ رہی تھی۔ میں نے کال ریسیو کی تو اس کی پُرجوش آواز آئی۔ ”شہباز صاحب کام بن گیا ہے۔“

”کیسے؟“

”ابھی شہلا نے اس صابر کو کال کی ہے اور ان کی گفتگو سے ظاہر ہے کہ کسی زمانے میں شہلا کے اس سے بھی غلط قسم کے تعلقات تھے۔“

”اب تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ آدھا اسلام آباد اس کے عشاق میں شامل رہا ہے۔“ میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”پتی

نصف عورتوں پر مشتمل ہے۔“

”کام کی بات یہ ہے کہ شہلا دوپہر اس سے کہیں ملے گی؟“

”کہیں سے کیا مراد ہے؟“

”باہر کہیں..... جگہ پہلے سے طے ہے اس لیے اس نے یا صابر نے نام نہیں لیا۔ وقت کے بارے میں بھی نہیں بتایا ہے۔“

”ٹھیک ہے تب کم سے کم دو یا تین افراد اس کے تعاقب کے لیے تیار رکھو۔ ایک گاڑی میں میں اور تم ہوں گے۔“

”میں نے پہلے ہی تین بائک سوار بلوا لیے ہیں، وہ ہم سے رابطہ رکھ کر گائیڈ کریں گے اور ہم ان کے پیچھے چلیں گے۔“

”ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں مجھے پتا سمجھاؤ۔“

وسیم نے مجھے پتا بتایا۔ یہ سیکٹر ایف سکس کا تھا۔ میں نشست گاہ میں آیا اور ان تینوں کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ ”میں وسیم کی طرف جا رہا ہوں۔“

”شوبی ہم بھی چلے گا۔“ جیتو نے کہا۔

”ٹھیک ہے تم چلو اور تم۔“ میں نے سفیر کی طرف دیکھا۔ ”عبداللہ سے بات کر کے خواتین کی حویلی منتقلی کا بندوبست کرو۔“

”میرا خیال ہے وہی طریقہ بہتر رہے گا جو تم نے راجا عمر دراز سے ملنے کے لیے استعمال کیا تھا۔“

”ہائی ایئر۔“ میں نے کہا۔ ”یہ ٹھیک رہے گا ہیلی کاپٹر تم سب کو مشکل سے آدھے گھنٹے میں حویلی پہنچا دے گا۔ بائی روڈ یہ فاصلہ کسی طرح پانچ گھنٹے سے پہلے طے نہیں ہو گا۔ راستے میں خطرات الگ ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے میں عبداللہ سے بات کرتا ہوں۔“

میں اور جیتو روانہ ہوئے۔ فارم ہاؤس میں سفیر کی سفاری جیپ کے ساتھ ایک عدد بائک بھی تھی۔ میں اور جیتو اسی پر روانہ ہوئے۔ ہیلمٹ نے ہمیں چھپا لیا تھا۔ یہ وہی ون ٹو فائیو تھی جو میں نے ایاز کے جاننے والے آٹو ڈیلر سے لی تھی۔ ایاز نے اس کی نمبر پلیٹیں بدل دی تھیں۔ اس کی اصل نمبر پلیٹیں نیچے اوزاروں والے خانے میں موجود تھیں اور ضرورت پڑنے پر صرف دو دو اسکرو کھول کر انہیں لگایا جا سکتا تھا۔ ٹنکی فل تھی۔ ایاز نے فارم ہاؤس پر بھی پیٹرول کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع کر دیا تھا۔ دس دس لیٹر والے کوئی بیس کین وہاں رکھے تھے مقصد یہی تھا کہ ہم جب کسی مہم پر روانہ ہوں تو اپنی گاڑیوں کے ٹینک فل کر لیں۔ بائک کا ٹینک پہلے ہی فل تھا اس لیے ضرورت نہیں پڑی۔ سردی بہت کم رہ گئی تھی اس لیے میں نے ذرا ڈھیلی پوری آستین کی شرٹ پہن لی اور میرا پستول اس کے نیچے چھپ گیا جو پتلون کی بیلٹ میں لگا رکھا تھا۔ اس کے دو عدد اضافی میگزین پتلون کی جیبوں میں تھے۔ میں نے روانگی سے پہلے وسیم کو اطلاع دی کہ میں آ رہا ہوں۔

آدھے گھنٹے بعد ہم ایک پارک کے ساتھ پارک وین کے پیچھے رکے، بائک کی آواز سن کر وسیم نے عقبی دروازے کے اوپری شیشے سے جھانکا اور دروازہ کھول دیا۔ ہم اندر آ گئے۔ میں نے ہیلمٹ اتارا۔ وسیم کے ساتھ وہاں وین انچارج شہاب الدین بھی تھا۔ میں نے اسے عبداللہ والی کوٹھی میں کئی بار دیکھا تھا لیکن بات کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس نے گرم جوشی سے ہم سے ہاتھ ملایا۔ ”شہباز صاحب آپ سے مل کر ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔“

”یہ تم لوگوں کی محبت ہے۔“ میں نے جواب دیا اور رسمی باتوں کے بعد وسیم سے پوچھا۔ ”کوئی نئی پروگریس ہوئی ہے؟“

”نہیں..... لیکن شہلا سے بات کر کے صابر نے کسی اور کو کال کی ہے اور اسے اس ملاقات کے حوالے سے تیار رہنے کا حکم دیا ہے۔“

”تیار رہنے کا حکم.....؟“

وسیم نے شانے اچکائے۔ ”اس نے صرف ایک جملہ کہا تھا کہ شہلا سے ملنے اسی جگہ جا رہا ہے وہ تیار رہے۔“

”دوسرا آدمی کون تھا؟“

”مرد ہے کوئی اور آواز سے جوان ہی لگ رہا ہے۔ اس نے صرف ہامی بھری تھی کہ وہ تیار رہے گا اس کے بعد کال کاٹ دی گئی۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ”کیا خیال ہے یہ صابر شہلا کو چکر تو نہیں دے رہا ہے؟“

”یہ پورا کھیل ہی چکر ہے۔“ وسیم نے سر ہلایا۔ ”معاملہ کروڑوں ڈالرز مالیت کے اس قیمتی بریف کیس کا ہے جو شہلا کے پاس ہے یا کم سے کم اسے معلوم ہے کہ بریف کیس کہاں ہے۔ اس کھیل میں جو حلیف ہیں..... وہی فریق بھی ہیں۔“

”یعنی سب ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے ہیں۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”دیکھو شہلا اور فتح خان میں اتنی اہلیت نہیں ہے کہ وہ اس قسم کا سودا کر سکیں یہ ان کی اوقات سے بڑا کھیل ہے۔ اسی لیے فتح خان کرنل زریسکی کی مدد حاصل کرنے پر

مجبور ہوا۔ مہرو کی یہاں موجودگی ثابت کرتی ہے کہ وہ بھی اس معاملے میں ملوث ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ کرنل سودا کرا رہا ہے؟"

"لازمی بات ہے مجھے بھارتیوں کے حوالے کرنے کا صاف مطلب ہے کہ اس کے بھارتیوں سے روابط ہیں۔ اگر معاملہ اس کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ بغیر کسی رعایت کے مجھے بھارتیوں کے حوالے کر دیتا لیکن فتح خان نے مجھے اس شرط کے ساتھ اس کے حوالے کیا تھا کہ میں بھارتیوں کے ہاتھ میں جا کر بھی بچ نکلوں۔"

"آپ نے پھر فتح خان کو چھوٹ دی۔" وسیم سنجیدگی سے بولا۔ "وہ ہمارا سر درد بن گیا ہے اس کی وجہ سے ہم مرشد کی طرف پوری توجہ نہیں دے پا رہے ہیں ورنہ شاید اب تک اس کا کانٹا نکل گیا ہوتا۔"

"یار اس نے مجھ پر دو بوجھ لاد دیے، ایک تو اس نے ایمن کو چھوڑ دیا اور دوسرے مجھے بھارتیوں کے ہاتھ جانے سے بچایا، اسی وجہ سے میں اسے بھی چھوٹ دینے پر مجبور ہوا لیکن ساتھ ہی میں نے اسے بتا دیا کہ اب وہ مجھ سے یا میرے ساتھیوں سے کسی رعایت کی توقع نہیں رکھے وہ جہاں ملا ہم اسے مار دیں گے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے اسے مزید رعایت دینا سانپ کو دودھ پلانے کے مترادف ہے۔"

وسیم فتح خان کا شدید دشمن بن گیا تھا اس کا بس چلتا تو وہ اسے پہلے ہی دوسری دنیا بھیج چکا ہوتا لیکن میری وجہ سے وہ بھی مجبور ہو جاتا تھا۔ تقریباً ہر معاملے میں میری اور وسیم کی سوچ ایک جیسی ہوتی ہے سوائے فتح خان کے۔ اس نے کبھی کھل کر تو نہیں کہا لیکن وسیم کے انداز سے لگتا تھا کہ اسے فتح خان کے لیے میری پالیسی سے اختلاف ہے۔

فتح خان نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اس کی جان کا دشمن نہیں ہوں۔ اسی سے اس نے اکثر فائدہ اٹھایا اور مجھے اغوا کرنے سے لے کر میرے ہوتے کاموں میں ٹانگ اڑائی۔ اس کی وجہ سے مجھے بارہا نقصان ہوا بس اتنا تھا کہ اس کی دشمنی میں، میں اور میرے ساتھی کسی جانی نقصان سے محفوظ رہے تھے اور یہی وجہ تھی کئی بار قابو میں آنے کے بعد میں نے اسے بخش دیا۔ لیکن اس بار اس نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی اور سابق مروت بالائے طاق رکھ دی تھی، اس وقت میں سمجھا نہیں تھا کہ فتح خان اچانک میری جان کا گاہک کیوں بن گیا ہے لیکن اب یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی۔

فتح خان یک دم شریف یا رحم دل نہیں ہو گیا تھا۔ بہت

شا اور ایمن کے لیے تو اس کے دل میں پہلے ہی کدورت تھی۔ بلکہ اس کی وجہ بریف کیس تھا۔ اسے پہلے بھی علم تھا کہ شہلا پروفیسر نفیس کے لاکر کے چکر میں ہے اس وقت فتح خان صرف شہلا کے چکر میں تھا اور اسے لاکر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر بعد میں کسی طرح فتح خان کو علم ہو گیا کہ لاکر میں ایک بریف کیس ہے جس میں چین کے فوجی راز ہیں اور وہ اس بریف کیس کے چکر میں پڑ گیا۔ اس کے شاطر دماغ نے اندازہ لگا لیا کہ اس بریف کیس کے بدلے بھاری رقم مل سکتی ہے۔ کوئی بھی چین دشمن مملکت بخوشی اسے خریدنے کے لیے تیار ہو جاتی۔ مگر ساتھ ہی فتح خان نے بجا طور پر درست اندازہ لگایا کہ اس میں اتنی اہلیت نہیں ہے کہ اس بریف کیس کو فروخت کر سکے۔

مجھے نہیں معلوم کہ کرنل بریسکی سے فتح خان کا پہلے بھی رابطہ تھا میں اس کی اور کرنل کی بات پر یقین نہیں کر سکتا۔ وہ دونوں جھوٹ بولنے کے ماہر تھے بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ بریف کیس کی حد تک ان میں اشتراک تھا اور مالی مفاد اتنا بڑا تھا کہ کرنل نے مہرو کی بے حرمتی بھی فراموش کر دی جو فتح خان کے ساتھیوں نے کی تھی۔ بے شک مہرو نے اپنے مجرموں کو مار کر کسی حد تک بدلہ لے لیا تھا لیکن اصل مجرم فتح خان تھا اور وہ ابھی زندہ تھا۔ فتح خان کو یقین تھا کہ میں اس معاملے میں ٹانگ اڑاؤں گا کیونکہ میں نے پہلے بھی صرف اس بریف کیس کے لیے شہلا سے اشتراک کیا تھا اور بینک لاکر کھولنے کے لیے واردات میں شامل ہوا تھا لیکن شہلا نے عین موقع پر چالاکی سے بساط الٹ دی اور لاکر سے نکلنے والے دوسرے سامان کے ساتھ بریف کیس بھی لے گئی تھی۔ اس کے بعد ہی فتح خان کے علم میں بریف کیس کی اہمیت آئی۔

"کافی جناب۔" وسیم نے مگ میری طرف بڑھایا تو میں چونکا وین میں کافی کا تھرماس موجود تھا۔

"شکریہ.... یہ صاحب کس قسم کا شخص ہے؟"

"قبضہ گروپ سے تعلق رکھتا ہے، راولپنڈی میں کئی جگہوں پر اس گروپ نے سرکاری املاک یا عام لوگوں کی زمینوں پر قبضے کر کے ان کے جعلی کاغذات بنوائے اور دوسروں کو فروخت کر دیں۔ دیکھنے میں تقریباً پچاس برس کا متوسط جسامت اور قامت کا شخص ہے رنگ سرخ و سفید ہے لیکن چہرے پر چیچک کے پرانے داغ ہیں۔ بال سرخی مائل ہیں یا وہ انہیں اسی رنگ میں رکھتا ہے۔"

"اتنا کافی ہے۔" میں نے کہا۔ "شاید ہمارے دشمنوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔"

"کیونکہ آپ ان میں کمی نہیں کرتا۔" جیتو نے بے ساختہ کہا تو میں حیران رہ گیا۔ اس نے پتے کی بات کی تھی۔ دشمن ختم کرنے کے دو طریقے ہیں ایک دشمنی ختم کر دی جائے اور دوسرا طریقہ ہے کہ دشمن کو ختم کر دیا جائے۔ مرشد جیسے لوگ دشمنی پالتے ہیں اسے ختم نہیں کرتے اور نہ میں ان سے یہ توقع کر سکتا تھا۔ دوسرا طریقہ بھی زیادہ کارآمد نہیں تھا اگر مرشد یا نادر کو مارتے تو ان کی گدی کے جانشین گدی کے آداب کے مطابق مجھ سے دشمنی نبھانے پر مجبور ہو جاتے۔ ورنہ ان کے مرید نہیں چھوڑتے۔ نعوذ باللہ یہ لوگ ان پیروں کو زمین پر خدا سے کم نہیں سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود جیتو کی بات درست تھی۔ میں دشمن کم کرنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا اور اس بات کو فراموش کر بیٹھا تھا کہ میرے دوست میرا ہمیشہ ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔

وسیم، سفیر، جیتو، عبداللہ اور ایاز کی اپنی زندگی تھی، اس میں صرف جیتو اکیلا تھا اور مجھ سے منسلک تھا لیکن باقی سب کی اپنی فیملی اور اپنی زندگی تھی۔ مجھے کیا حق تھا کہ میں اپنی دشمنی میں انہیں استعمال کروں اور یہ بات بھول جاؤں کہ میں انہیں ہمیشہ ساتھ دینے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ میں انہیں ساتھ دینے سے روک نہیں سکتا تھا۔ کسی مشکل اور آزمائش میں وہ مجھے اکیلا نہیں چھوڑتے اور اگر میں چاہتا کہ وہ مجھ سے الگ ہو کر اپنی زندگی سکون سے اور بغیر کسی خطرے کے گزاریں تو وہ یہ بھی نہ مانتے۔ جیتو کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ میں کب تک اپنے دوستوں کا امتحان لیتا رہوں گا۔ وہ اپنے خلوص میں آخر تک میرے ساتھ رہیں گے اور اپنی زندگی کو فراموش کر دیں گے۔

"کیا بات ہے آج آپ بار بار کہاں غائب ہو رہے ہیں۔" وسیم نے کہا تو میں چونکا۔

"کچھ نہیں یار۔" میں نے کہا اور بات بدل دی۔ "کچھ اندازہ ہے وہ کب تک روانہ ہوگا۔"

"کسی وقت بھی.... میرے آدمی بالکل تیار ہیں۔"

"ہم بائک پر آئے ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیا بائک یہیں چھوڑنی پڑے گی؟"

"ہم بائک پر آ جائے گا۔" جیتو نے حل پیش کیا۔ "پھر اسی پر اسی طرح واپس چلا جائے گا۔"

"مکان کس طرف ہے؟"

"پچھلی گلی میں۔" وسیم نے پارک کے سامنے والی لائن کی طرف اشارہ کیا۔ "گلی کے دونوں سروں پر میرے آدمی موجود ہیں اور وہ کسی بھی طرف سے نکلے گا ہمیں پتا چل جائے گا۔"

وین میں وسیم اور شہاب ہی تھے۔ ضرورت پڑنے پر شہاب ڈرائیو کرتا وسیم اور شہاب وین کے سارے سسٹم سیکھ چکے تھے وہ مانی کے ساتھ گھنٹوں اس میں سر کھپاتے رہے تھے۔ وہ مجھے بھی بتانے لگا کہ وین کے دوسرے نظام کس طرح اور کیا کام کرتے ہیں۔ میں دیکھتا اور ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ بہت زیادہ مشکل چیز نہیں تھی بس پریکٹس کی ضرورت تھی آدمی ایک دو دن میں سب سیکھ لیتا۔ اچانک اسپیکر سے آواز آئی۔ "نمبر دو سر.... وہ نکل رہا ہے۔"

"لوکیشن۔" وسیم نے پوچھا۔ شہاب تیزی سے ڈرائیونگ کمپارٹ میں چلا گیا۔ ڈرائیونگ کمپارٹ اور پچھلے حصے کے درمیان ایک فائبر کا پردہ تھا اس سے آگے تو نظر آتا تھا لیکن کوئی ونڈ اسکرین یا کھڑکی سے دیکھتا تو اسے پردے کے پیچھے کچھ نظر نہیں آتا۔

"وہ شمالی طرف سے نکلا ہے.... نمبر ون اس سے آگے جا چکا ہے میں اس کے پیچھے ہوں۔"

"تھری کہاں ہے؟"

"میرے پیچھے ہے۔" دو نمبر نے بتایا وہ سب آپس میں چھوٹے اور جدید قسم کی واکی ٹاکی سے رابطے میں تھے۔ وسیم نے بتایا تھا کہ اس وین میں ایک ایسا سسٹم بھی تھا جو چھوٹے واکی ٹاکی سے ایک کلومیٹر کی دوری سے بھی رابطہ کر لیتا تھا اور سارے واکی ٹاکیز کو آپس میں ملا دیتا تھا۔ لیکن پانچ سو میٹر کے دائرے میں تمام واکی ٹاکیز خود کام کرتے تھے یہ پہلے سے طے شدہ فریکوئنسی پر کام کرتے تھے۔ وسیم نے ایک ایک واکی ٹاکی مجھے اور جیتو کو دیا۔ ان کا ایک حصہ کان میں لگا لیا جاتا تھا اور اصل سیٹ چھوٹے موبائل کے برابر تھا اسے سامنے جیب میں رکھا جا سکتا تھا۔ جیتو ہیلمٹ پہنتے ہوئے وین سے اتر گیا وہ بائک پر آتا۔

"بہت ہوشیاری سے پیچھا کرنا ہے۔" وسیم نے اپنے آدمیوں کو ہدایت دی۔ "یہ شاطر آدمی ہے اسے شک نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں۔" نمبر دو نے کہا۔ جب کوئی بات کرتا تو پہلے اپنا نمبر بتاتا اور پھر بات کرتا۔ "ہم اس کے آگے پیچھے رول ہو رہے ہیں۔"

نمبر دو اپنے ساتھیوں کا انچارج تھا اور وہی تعاقب کا طریقہ کار طے کر رہا تھا۔ وسیم نے ان کی تربیت اس طرح

سے کی تھی کہ ان میں ذمے داریاں بانٹ کر ان کو اپنے اپنے شعبے کا انچارج بنا دیا تھا اور وہ نتائج کے ذمے دار بھی ہوتے۔ اس لیے ہر ایک اپنا کام پوری آزادی اور پوری ذمے داری سے کرتا تھا۔ شہاب نے وین آگے بڑھا دی۔ ایک ہیڈ سیٹ اس کے کان پر بھی تھا اور وہ نمبر دو کی رہنمائی میں تعاقب کرنے لگا۔ اصلی گاڑی کہیں آگے اور ہماری نظروں سے اوجھل تھی۔ مگر اپنے رائیڈرز کی رہنمائی میں ہم کامیابی سے ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ یہ جدید الیکٹرانکس کا کمال تھا۔ صابر ترمذی کو پتا ہی نہیں تھا کہ کتنے لوگ اس کے تعاقب میں ہیں۔ کچھ دیر میں واضح ہو گیا کہ صابر دامنِ کوہ کی طرف جا رہا ہے۔ ہمیں دو سگنل پر رکنا پڑا اور صابر اور وسیم کے ساتھی آگے نکل گئے ان سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ وسیم نے وین کا مخصوص مواصلاتی نظام آن کیا اور رابطہ دوبارہ بحال ہو گیا اب سب وین کے طاقتور مواصلاتی نظام کی مدد سے آپس میں منسلک تھے۔ یہ ایک کلومیٹر تک بہ خوبی کام کرتا تھا۔

سگنل سے نکل کر ہم دامنِ کوہ والی سڑک پر آئے۔ نمبر دو نے بتایا۔ "یہ دامنِ کوہ سے اوپر جا رہا ہے۔"

"اوپر کہاں.... مارگلہ پر....؟" وسیم نے کہا۔

"اوپر پیر سوہاوا نامی جگہ ہے۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔

ذرا دیر میں پہاڑی قسم کی چڑھائی شروع ہوئی اور وین کا منہ آسمان کی طرف ہو گیا۔ اس راستے پر گھماؤ بہت زیادہ تھے۔ مجھے جیتو کی فکر ہوئی اور میں نے اس سے کہا۔ "تم پیچھے رک جاؤ۔ تمہیں اس قسم کے راستوں پر ڈرائیو کا تجربہ نہیں ہے۔"

"آپ فکر مت کرو ہم کر سکتا ہے۔"

"اچھا لیکن تم نے خیال رکھ کر آنا ہے یہ ایک ہی سڑک ہے اگر ہم آگے نکل جائیں تب بھی تم ہماری طرف ہی آؤ گے۔"

"ٹھیک ہے۔" جیتو نے جواب دیا وہ دیکھ چکا تھا کہ واکی ٹاکی پر بات کرتے ہوئے کوئی کسی کا نام نہیں لے رہا ہے۔ اس لیے اس نے بھی میرا نام نہیں لیا۔ سفر مسلسل بلندی کی طرف جاری تھا۔ یہاں دامنِ کوہ پر اسلام آباد کی بلندی چندرہ سو فٹ تھی لیکن صرف چند کلومیٹرز کے اندر پیر سوہاوا پر یہ بلندی بڑھ کر چار ہزار فٹ سے زیادہ ہو جاتی تھی بلکہ بالکل اوپری حصے میں بلندی پانچ ہزار فٹ سے زیادہ چلی جاتی تھی اس سے آگے سڑک مانسہرہ کی طرف چلی جاتی تھی۔ اسلام آباد کی حدود یہیں تک تھی۔ پیر سوہاوا تک آتے آتے موسم اتنا سرد ہو چلا تھا کہ ہمیں باقاعدہ سردی محسوس ہونے لگی۔ مگر یہ سردی اتنی بھی نہیں تھی کہ وین کا ہیٹر آن کرنا پڑتا۔

"یہ کہاں جا رہا ہے؟" وسیم نے پوچھا۔

"ممکن ہے شہلا نے اسے یہیں کہیں بلایا ہو یا اس نے جگہ طے کی ہو۔" میں نے کہا۔ "سردیوں میں یہ جگہ ویران ہوتی ہے اور یہاں کوئی نہیں آتا ہے۔"

"سر یہ آرمی چیک پوسٹ سے آگے نکل گیا ہے۔"

"اب تم لوگ ذرا پیچھے ہو جاؤ۔" وسیم نے اسے ہدایت دی۔ "اتنی دور رہ کر تعاقب کرو کہ وہ تمہیں دیکھ نہ پائے۔"

"اس صورت میں وہ بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔"

"نہیں ہوگا، سڑک کے پیچ وخم میں وہ تمہیں اوپر جاتا نظر آئے گا۔"

"میں سمجھ گیا سر۔" نمبر دو نے مستعدی سے کہا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو ہدایت دینے لگا۔ کیونکہ سب ایک ہی فریکوئنسی پر تھے اس لیے سب ایک دوسرے کی بات سن رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم چیک پوسٹ پہنچ گئے تھے۔ وسیم بات کرنے کے لیے پہلے ہی آگے جا چکا تھا اور اس نے درمیانی پردہ بند کر لیا تھا۔ یہ معمول کی چیک پوسٹ تھی اور یہاں سرسری سی پوچھ گچھ ہوتی تھی۔ گاڑیوں کے نمبر اور کاغذات دیکھے جاتے تھے۔ ایک منٹ بعد وین کو جانے کی اجازت مل گئی۔ وین کے آگے بڑھتے ہی وسیم واپس آ گیا۔ اس دوران میں صابر ترمذی کی گاڑی پہاڑ کے دوسری طرف اترنا شروع ہو گئی تھی۔ وسیم تشویش زدہ ہو گیا۔

"یہ نہ جانے کہاں جا رہا ہے؟"

"کہیں بھی جا رہا ہو اگر یہ شہلا سے ملنے جا رہا ہے تو ہم پاکستان کے آخری کونے تک اس کا پیچھا کریں گے۔" میں نے کہا۔

"آپ بھول رہے ہیں اس نے اپنے آدمیوں کو آنے کو کہا تھا لیکن ابھی تک ہمیں راستے میں کوئی آدمی نظر نہیں آیا ہے اور نہ ہی شہلا نظر آئی ہے۔" وسیم نے کہا۔

"اپنے آدمیوں سے پوچھو.... جب صابر روانہ ہوا تو اکیلا تھا یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟"

نمبر دو نے فوری جواب دیا۔ "اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا اور وہی ڈرائیو کر رہا تھا۔"

"یہ بات تم اب بتا رہے ہو۔" میں نے برہمی سے

کہا۔ "فوراً آگے جا کر دیکھو گاڑی میں صابر ہے یا نہیں۔"

وسیم بھی چونکا تھا۔ "شہباز صاحب کوئی چکر ہے؟"

"ہاں میرا خیال ہے وہ چالاک آدمی تعاقب بھانپ گیا اور جان بوجھ کر اس طرف آیا تھا۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ راستے میں کہیں اتر گیا ہے؟"

"اندازہ ہے ابھی پتا چل جاتا ہے۔"

"جناب جیسے ہی ہم نے گاڑی کے نزدیک جانے کی کوشش کی اس نے رفتار بڑھا دی ہے وہ پاس نہیں آنے دے رہا ہے۔"

"کوشش کرو۔" وسیم غرایا۔ "نہیں رک رہا تو فائر کر کے ٹائر پھاڑ دو۔"

"نہیں یہاں فائر مت کرنا اور ٹائر پھٹا تو وہ کسی کھائی میں گر جائے گا اس کے پاس جانے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا اور اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ جیتو کچھ دیر سے خاموش ہے۔ میں نے اسے آواز دی۔ "جیتو تم کہاں ہو؟"

لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ میں نے دو تین بار پکارا۔ اس کی طرف بدستور خاموشی تھی۔ میں نے وسیم کی طرف دیکھا۔ "وین واپس موڑو.... جیتو کسی مشکل میں پڑ گیا ہے۔"

وسیم نے نمبر دو کو ہدایت کی کہ وہ تصدیق کرے کہ گاڑی میں صابر ترمذی ہے یا نہیں اور موبائل سے اسے کال کرے جب تک تصدیق نہ ہو جائے وہ تعاقب جاری رکھے۔ اس دوران میں شہاب نے وین واپس موڑ دی تھی۔ کچھ دیر بعد ہم تیزی سے نیچے کی طرف جا رہے تھے ابھی ہم نے پہاڑ کے دوسری طرف قدم نہیں رکھا تھا۔ واپسی کے سفر میں وقفے وقفے سے میں جیتو کو پکار رہا تھا۔ مگر ابھی اس کی طرف سے خاموشی تھی نہ جانے وہ کہاں رہ گیا تھا اور اس سے ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ وین کا طاقتور مواصلاتی سسٹم پہلے ہی آن تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ جیتو جوش میں آ کر حد رفتار سے تیز بائک نہ چلائے۔ یہ سڑک درحقیقت مری جانے والی سڑک سے زیادہ خطرناک تھی۔ مگر ساتھ ہی میں ایک دوسرا خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ صابر نے ہمیں دھوکا دیا اور خاموشی سے راستے میں کہیں اتر گیا ہو۔ اسے وین کا بھی علم تھا اور تین عدد بائک والوں کا بھی لیکن اسے ایک چوتھے بائک سوار کا پتا نہیں تھا جیتو پیچھے آ رہا تھا۔

آرمی چیک پوسٹ سے گزرنے کے بعد میں مسلسل جیتو کو پکار رہا تھا اور اس کی طرف سے خاموشی میرے خدشات کو بڑھا رہی تھی۔ اچانک اس کی طرف سے جواب ملا۔ "میں ٹھیک ہوں۔"

"تم کہاں ہو؟"

"میں یہاں جنگل میں ہے آپ کہاں ہو؟"

"ہم واپس نیچے آ رہے ہیں۔"

"بائیں طرف دیکھتے رہو میرا بائک نظر آئے گا درختوں کے درمیان۔"

اتفاق سے اسی وقت بائک نظر آ گئی۔ وسیم آگے چلا گیا تھا اس نے وین رکوائی۔ میں نیچے اتر آیا۔ وسیم نے ایک خود کار رائفل نکال لی تھی۔ یہاں سڑک ایسی نہیں تھی کہ اس پر وین روکی جا سکتی۔ وسیم نے شہاب کو کہیں آگے جا کر رکنے کو کہا۔ میں نے جیتو کو بتایا۔ "تمہاری بائک دیکھ لی ہے لیکن تم یہاں کیوں رکے ہو؟"

"میرے کو ایک آدمی دکھائی دیا تھا۔ وہ چھپ کر اوپر وین کو دیکھ رہا تھا ہم پیچھے تھا اسے دیکھ کر رک گیا۔ پھر اس نے فون نکال کر کسی سے رابطہ کیا اور جنگل میں داخل ہو گیا۔"

"ابھی کہاں ہو؟"

"اس آدمی سے کچھ دور ہے وہ ایک چٹان پر بیٹھا ہے اور ایسا لگتا ہے کسی کا انتظار کر رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں اور وسیم آ رہے ہیں۔"

میں اور وسیم محتاط قدموں سے آگے بڑھے۔ یہاں سناٹا تھا اور پیروں تلے آ کر پتے چرمرانے کی آواز بھی ابھر رہی تھی کوئی شاخ چٹختی تو بہت دور تک آواز جاتی۔ اس لیے ہم پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ اچانک جیتو کی سرگوشی کان میں گونجی۔ "شوبی یہ تو وہی حرافہ ہے شہلا ادھر آئی ہے۔"

"شہلا وہ کہاں سے آئی؟"

"پتا نہیں نیچے سے آئی ہے۔ اب وہ اس آدمی سے بات کر رہی ہے۔"

وہ پہلے وسیم کو نظر آئے اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں نے دیکھ لیا یہ سرخ پتھر کی چٹان تھی اور اس کے نیچے ایک ادھیڑ عمر شخص شہلا کے ساتھ موجود تھا۔ حلیے سے وہ صابر لگ رہا تھا اور وسیم نے تصدیق کی۔ "یہ صابر ہے۔"

شہلا حسبِ معمول تر و تازہ اور بہت نمایاں کرنے والے لباس میں تھی۔ اس نے تنگ جینز کے ساتھ تقریباً جسم سے چپکی پوری آستین کی ہائی نیک ریڈ جرسی پہن رکھی تھی جس میں اس کے جسمانی خدوخال کچھ زیادہ ہی نمایاں تھے۔ جیتو نے کہا۔ "شوبی آپ نے دیکھ لیا کتنا واہیات عورت ہے۔"

"ہم نے دیکھ لیا ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ تم کیا دیکھ رہے ہو۔" وسیم نے اسے ڈانٹا۔ "تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"شرم اس عورت کو آنی چاہیے۔ ہم اسے نہیں دیکھ رہا۔"

میں نے بیتو کو دیکھ لیا وہ ایک درخت کے پیچھے تھا۔ شہلا اور صابر ہم سے اتنے فاصلے پر تھے کہ ہم ان کی آواز نہیں سن سکتے تھے۔ میں نے وسیم کو اشارہ کیا کہ وہ دوسری طرف چلا جائے اور میں اس سے مخالف سمت جاتا ہوں اس طرح ہم شہلا اور صابر کو گھیر سکتے تھے۔ ساتھ ہی میں نے انہیں صابر کے آدمیوں سے ہوشیار رہنے کو کہا۔ ان دونوں میں کسی بات پر بحث چل رہی تھی۔ شہلا کے چہرے پر نفرت اور ناپسندیدگی کے تاثرات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "شاید ان میں کوئی اختلاف ہے۔"

"یقیناً صابر کی نیت خراب ہے اور اس نے اپنے آدمیوں کو بلوایا ہے۔"

"لیکن ادھر کوئی اور نظر نہیں آ رہا ہے۔" بیتو نے کہا۔

"تم آس پاس بھی نظر رکھو۔" میں نے اسے ہدایت دی۔ اسی لمحے شہلا پلٹ کر واپس جانے لگی۔ صابر وہیں کھڑا رہا جیسے اس کا ارادہ سڑک کی طرف جانے کا ہو۔

"وہ واپس جا رہی ہے۔" وسیم نے کہا۔

"سنو تم دونوں صابر کے پیچھے جاؤ اور اسے وین میں لے کر نیچے آؤ میں شہلا کے پیچھے جاتا ہوں۔"

وسیم اور بیتو نے اوکے کہا اور میں چٹان کے پیچھے سے گھوم کر جانے لگا سامنے سے تو میں صابر کی نظر میں آ جاتا۔ اب صابر واپس سڑک کی طرف جا رہا تھا۔ جب میں چٹان کے پیچھے سے نکلا تو کچھ دور جاگنگ ٹریک دکھائی دیا اور شہلا غائب تھی۔ وہ اسی جاگنگ ٹریک سے آئی تھی میں اس طرف لپکا۔ کوئی سو گز بعد وہ مجھے نیچے جاتی دکھائی دی۔ دامنِ کوہ میں اس قسم کے واک ٹریک بنے ہوئے ہیں جن پر صبح سے شام تک لوگ واک کرتے یا جاگنگ کرتے نظر آتے ہیں۔ زیادہ زور صبح اور شام کو ہوتا ہے ابھی دوپہر کا وقت تھا اس لیے بہت کم لوگ نظر آ رہے تھے۔ شہلا اپنی سرخ جرسی کی وجہ سے نمایاں تھی۔ ہر آتا جاتا اسے بہ غور دیکھ رہا تھا اور اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ ایک بڑے میاں جو بہ ظاہر کوئی ریٹائرڈ اور معزز بیورو کریٹ لگ رہے تھے شہلا کے پاس سے گزرے تو اس وقت تک اسے مڑ کر دیکھتے رہے جب تک مجھ سے نہیں ٹکرا گئے اور پھر کھسیا کر تیز قدموں سے آگے چلے گئے۔ شہلا یقیناً نیچے دامنِ کوہ کی طرف جا رہی تھی۔

میں نے بیتو اور وسیم کو پکارا لیکن وہ شاید ایک کلومیٹر سے زیادہ دور جا چکے تھے ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ بہرحال انہیں وہیں آنا تھا اور جیسے ہی میرا رابطہ ہوتا میں انہیں گائیڈ کر سکتا تھا۔ نیچے ریسٹوران تھے اور تفریحی پارک تھے یہاں فیملیز آتی تھیں اور بچوں کا رش ہوتا تھا جیسے ہی ہم پارک میں داخل ہوئے شہلا نے پارکنگ کا رخ کیا۔ اچانک مجھے خیال آیا پارکنگ میں اس کی گاڑی ہوگی اور وہ اس میں بیٹھ کر یہاں سے رخصت ہو جائے گی اور میں ناچار رہ جاؤں گا۔ میں نے رفتار تیز کی۔ وہ پارک کے دروازے سے نکلی تھی۔ سامنے ہی پارکنگ تھی میں دروازے کی طرف لپکا لیکن بدقسمتی سے اسی لمحے باہر سے لڑکیوں کا ایک ریلا آیا۔ وہ کسی کالج کی لڑکیاں تھیں کیونکہ سب یونیفارم میں تھیں اور یقیناً کالج کی طرف سے تفریح پر آئی ہوئی تھیں۔ شوخ و شنگ، ہنستی کھلکھلاتی لڑکیاں جو بچپن کی شوخی کے ساتھ جوانی کے احساس سے سرشار تھیں۔

انہیں راستہ دینے کی کوئی جلدی نہیں تھی بلکہ کچھ شریر لڑکیوں نے بھانپ لیا کہ مجھے گزرنے کی جلدی ہے اور میں ان کی وجہ سے رکا ہوا ہوں اس لیے وہ رک گئیں اور آپس میں بات کرنے لگیں۔ ان کے رکنے سے جو ریلا پیچھے آ رہا تھا اس نے راستہ مزید جام کر دیا اور وہ شور کرنے لگیں۔ مگر شریر لڑکیوں کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ شہلا پارکنگ میں پہنچ گئی تھی۔ میں نے بے تابی سے کہا۔ "لڑکیو..... مجھے جانے دو..."

لڑکیاں اب پوری طرح شرارت پر آمادہ تھیں۔ انہوں نے یوں ظاہر کیا جیسے میری آواز سنی ہی نہ ہو۔ شہلا اب ایک مسٹرڈ رنگ کی نئی کار کے پاس رکی تھی۔ اسی لمحے میرے کانوں میں وسیم کی آواز آئی۔ "آپ کہاں ہیں؟"

"یار میں یہاں پھنس گیا ہوں دروازے پر لڑکیاں جمع ہیں اور راستہ دینے کو تیار نہیں ہیں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "شہلا نیچے ریسٹورانت والی پارکنگ میں ہے اور ایک مسٹرڈ کار میں بیٹھ رہی ہے۔"

میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اسی لمحے میں نے دو آدمیوں کو شہلا کی طرف جھپٹتے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے شہلا سے تقریباً چپک کر کچھ کہا تو اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ صاف ظاہر تھا وہ صابر کے آدمی تھے اور انہوں نے اسے اسلحے کے زور پر یرغمال بنا لیا تھا۔ انہوں نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور ایک ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ میں ان لڑکیوں کو

...قط بتاتا ہوا دوسرے دروازے کی طرف بھاگا۔ "وسیم ...کے آدمی شہلا کو اسی کی گاڑی میں لے جا رہے ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں وہ ہمارے پاس ہے۔" وسیم نے ...ب دیا۔

"لیکن تم کہاں ہو؟"

"ہم نیچے آ رہے ہیں۔"

جب تک میں دوسرے دروازے سے نکل کر اور گھوم کر ...نگ میں آیا مسٹرڈ کار سڑک کی طرف جا چکی تھی میں نے ...س کی ایک جھلک دیکھی اور پھر تیز قدموں سے سڑک کی طرف بڑھا۔ "وہ نکل گئی ہے جلدی کرو۔"

"یہاں بھی ایک مصیبت ہے جناب ایک ٹرک ہے آگے جو نہایت سست روی سے جا رہا ہے اور رفتار بڑھانے پر آمادہ نہیں ہے۔"

"لعنت ہو۔" میں نے سڑک پر آ کر بے بسی سے مسٹرڈ کار کو دیکھا جو مین ہائی وے پر بائیں طرف گھوم گئی تھی۔ مگر یہ واضح نہیں تھا کہ اس کا رخ کس طرف تھا۔ ممکن ہے وہ آگے سگنل سے گھوم کر دوسری سمت میں چلی جاتی یا اسی سڑک پر آگے جاتی جہاں بے شمار سڑکیں نکل رہی تھیں وہ کہیں بھی جا سکتی تھی۔ وین کوئی پانچ منٹ بعد نمودار ہوئی اور میرے پاس رکی۔ عقبی دروازہ کھلا۔ میں اندر گھس گیا اور بے بسی سے بولا۔ "بیتو کہاں ہے وہ آگے کیوں نہیں آیا؟"

"بائک نہیں اسٹارٹ ہو رہی تھی۔" وسیم نے کہا۔ اسی لمحے پیچھے سے بیتو بھی آ گیا۔

"وہ بائیں طرف گئے ہیں۔ مسٹرڈ رنگ کی نئی کار ہے۔"

"یہ صابر ہے۔" وسیم نے فرش پر بے سدھ پڑے صابر کی طرف اشارہ کیا اس کے سر پر ایک ابھار بتا رہا تھا کہ وہ کیسے بے ہوش ہوا تھا اس نے یقیناً مزاحمت کی تھی۔ "اگر ہم نے اسے مس بھی کر دیا تو یہ بتائے گا کہ شہلا کو کہاں لے جایا گیا ہے۔"

"مگر ابھی ہمیں کوشش کرنی ہے۔" میں نے شہاب کی طرف دیکھا۔ "وہ زیادہ سے زیادہ دو کلومیٹر آگے نکلے ہوں گے اور مسٹرڈ رنگ دور سے نمایاں ہوگا۔"

شہاب نے سر ہلاتے ہوئے رفتار بڑھا دی۔ بیتو اس سے پہلے نکل گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "سوری بائک مسئلہ کر رہا تھا ورنہ میں پہلے نکل جاتا۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا اور وسیم سے پوچھا۔ "تمہارے آدمیوں نے رابطہ کیا؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ان کی کال آئی تھی اگلی کار میں ایک ہی آدمی تھا اور وہ صابر کا ڈرائیور ہے۔"

"اس کا کیا کیا؟"

"میرا ایک آدمی اس کے ساتھ آ رہا ہے۔ ایک بائک پر ہے اور تیسرا بائک سمیت وہیں رہ جانے والی بائک کے ساتھ ہے۔ صابر کے ڈرائیور کو حویلی پہنچا کر وہ پھر بائک لے جائیں گے۔"

"نہیں بائک کی نگرانی کرنے والے سے کہو وہ بھی آ جائے بائک وہیں کہیں چھوڑ دے۔ ممکن ہے یہاں اس کی ضرورت ہو۔"

شہاب نے رفتار خاصی تیز رکھی تھی لیکن مسٹرڈ کار کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے صابر کی طرف دیکھا۔ "یہ ہوش میں ہوتا تو اس سے پوچھ سکتے تھے کہ شہلا کو کہاں لے جایا گیا ہے۔"

"آدمی تیز ہے لڑنے مرنے پر تیار ہو گیا تھا، قابو میں نہیں آ رہا تھا مجبوراً مجھے پیچھے سے سر پر وار کرنا پڑا۔"

کچھ آگے جا کر ایک سڑک بائیں طرف نکل رہی تھی یہ آگے جا کر شاہ فیصل مسجد یا اس کے گرد و نواح میں نکلتی تھی اور شاید مارگلہ کے دامن میں گھومتی تھی اس طرف کئی دیہات اور بستیاں تھیں۔ شہاب نے مڑ کر پوچھا۔ "اب کس طرف جانا ہے؟"

"ذیلی سڑک پر نکلو ممکن ہے انہوں نے چانس لیا ہو۔" میں نے کہا اور واکی ٹاکی میں بیتو سے پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟"

"ہم بہت آگے دیکھ چکا ہے کار نہیں ہے۔"

"سروس روڈ ہے تو اس سے مڑ کر واپس آ جاؤ۔ ہم بائیں ہاتھ پر نکلنے والے پہلے کٹ پر جا رہے ہیں۔"

"ہم سمجھ گیا ابھی واپس آتا ہے آپ آگے جاؤ۔"

شہاب نے وین اس طرف موڑ لی۔ مجھے مایوسی ہو رہی تھی شہلا سامنے آ کر ایک بار پھر ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ مایوسی اس لیے تھی کہ یہ پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔ شہلا اس سے پہلے بھی کئی بار چکنی مچھلی کی طرح ہمارے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔ اس بار یہ اس کا کمال نہیں تھا بلکہ اسے اغوا کر لیا گیا تھا۔ اس ذیلی سڑک پر خاصی دیر تک تیز رفتاری سے سفر کے باوجود ہم مسٹرڈ کار کو نہیں پا سکے تھے۔ وہ کسی اور طرف مڑ گئی تھی اور ہم غلط سمت میں اسے تلاش کر رہے تھے۔ وسیم نے مایوسی سے کہا۔

"اب ہمارے پاس بس یہی ہے۔"

"وسیم واپس چلو فی الحال ہم حویلی نہیں جاسکتے... اسے فارم ہاؤس لیے چلتے ہیں۔ اس سے شہلا کا پتا معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔"

وسیم نے میری طرف دیکھا۔ "آپ کے خیال میں اس کی جان خطرے میں ہے؟"

"مجھے لگ رہا ہے صابر کے ارادے اس کے بارے میں ٹھیک نہیں ہیں۔"

شہاب نے وین واپس موڑ دی تھی۔ وسیم نے پوچھا۔ "اس کے ڈرائیور کا کیا کرنا ہے؟"

"ڈرائیور محرم راز ہوتے ہیں۔ وہ بہت کچھ جانتا ہوگا اسے بھی فارم ہاؤس پر بلوالو۔"

وسیم اپنے آدمیوں کو ہدایت دینے لگا۔ پھر اس نے ایک خانے سے ایک عدد مضبوط پلاسٹک ٹیپ برآمد کیا اور اس سے صابر کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے آخر میں ٹیپ کا ایک ٹکڑا اس کے منہ پر بھی چپکا دیا۔ اب وہ ہوش میں آجاتا تب بھی کوئی حرکت نہیں کرسکتا تھا۔ دو بج رہے تھے اور ہم ڈھائی بجے واپس فارم ہاؤس پہنچ گئے۔ صابر کا ڈرائیور اسی کی گاڑی میں لایا گیا تھا اور اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ اسے ہاتھ پاؤں باندھ کر تہ خانے میں منتقل کردیا گیا۔ صابر کی گاڑی لے کر وسیم کے بائک سوار واپس چلے گئے تھے وہ اسے کہیں چھوڑ دیتے۔ ابھی انہیں اپنی بائک بھی لانی تھی۔ وسیم نے بے ہوش صابر کو اٹھایا اور مکان کے اندر لے آیا۔ سفیر نے اسے دیکھ کر کہا۔ "یہ کیا چیز ہے اور یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ بڑی صابر چیز ہے اور اس سے جلد از جلد پوچھ گچھ کرنی ہے اس لیے یہاں لائے ہیں۔"

وسیم اور بیتو صابر کو اوپر ایک خالی کمرے میں لے گئے اور پھر اس کے ہاتھ پاؤں کھول کر اس کے تمام کپڑے اتار کر اسے بالکل برہنہ کرکے ڈال دیا۔ اس کے ہوش میں آنے کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ سفیر نے کھانا لگا لیا تھا۔ کھانے کے دوران میں اسے واقعات بتاتا رہا۔ شہلا کے ایک بار پھر نکلنے کا سن کر اس نے سرد آہ بھری۔ "کاش کے وہ ہاتھ آجاتی بہت عرصہ ہوا اسے دیکھے ہوئے۔"

"ہم بتائے گا موٹا ڈیڈی کو۔" بیتو نے آگاہ کیا۔

"ہم مکر جائے گا۔" سفیر اطمینان سے بولا۔

"آپ ڈیڈی سے جھوٹ بولے گا؟"

"بیٹا یہ شادی شدہ لوگوں کی پالیسی ہے ابھی تمہیں سمجھ نہیں آئے گی۔"

وسیم نے سر ہلایا۔ "جب تک تم خود شادی شدہ نہیں ہو جاتے۔ اگر بیوی سے سو فیصد سچ بولو تو وہ یقین نہیں کرتی ہے اگر جھوٹ بولو گے تب بھی بات نہیں بنے گی۔"

"یہ شوہر کی مہارت پر منحصر ہے کہ وہ کتنی مہارت سے جھوٹ میں سچ کی یا سچ میں جھوٹ کی آمیزش کرتا ہے جس سے بیوی سو فیصد مطمئن ہوجائے۔"

"میرا خیال ہے آج کا ایجنڈا میاں بیوی نہیں ہیں۔" میں نے انہیں یاد دلایا۔ "اوپر دو عدد چیزیں ہیں ان کا کچھ کرنا ہے۔"

"ایک چیز تو آپ لائے تھے اس لیے اس کا فیصلہ آپ خود کرلیں۔" سفیر نے جواب دیا۔ "دوسری چیز بھی آپ دونوں لائے ہیں۔"

"تم نے عبداللہ سے بات کی ہے؟"

"ہاں لیکن اس کا کہنا ہے اس قسم کی گفتگو فون یا موبائل پر مناسب نہیں ہے وہ خود آکر بات کرے گا وہ رات میں کسی وقت آئے گا۔"

"تب تک ہم صابر سے نمٹتے ہیں۔" میں نے میز سے اٹھتے ہوئے کہا۔ جب تک میں واش روم سے آیا وسیم دو عدد نقاب لے آیا تھا۔ یہ نقاب اس قسم کے تھے جو بچے لگائے پھرتے ہیں ایک گوریلے کا نقاب تھا جو میرے حصے میں آیا۔ سفیر نے ہنس کر کہا۔ "اب ذرا صورت نکلی ہے تیری۔"

"تیری پیدائشی نکل آئی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

وسیم شیر کا نقاب پہن چکا تھا۔ اب سفیر نے اسے چھیڑا۔

"اس کے لیے بس دم کی کمی رہ گئی ہے۔"

مانی محظوظ ہورہا تھا۔ "ممکن ہے بادشاہ سلامت کی دم کٹ گئی ہو کسی حادثے میں۔"

"شیر بغیر دم کا بھی شیر ہی ہوتا ہے۔" وسیم نے متانت سے جواب دیا۔ "اب چلیں۔"

صابر ہوش میں آگیا تھا اور اندر سے دروازہ پیٹ پیٹ کر گالیاں دے رہا تھا۔ ہم نے دروازہ کھولا تو وہ جلدی سے کونے میں جا کر سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا اور کپکپاتی آواز میں بولا۔ "میرے کپڑے دے دو ورنہ...."

"ورنہ تم کیا کرلو گے۔" میں نے اندر آکر کہا۔ "تم کچھ نہیں کرسکتے۔"

"میں تم سب کو جہنم رسید کرسکتا ہوں سؤر کے بچو....!" وہ حلق پھاڑ کر چلایا۔ صاف ظاہر تھا غصے نے اسے پاگل کردیا تھا۔

وسیم ہنسا۔ "اسے دیکھو تن پر کپڑے نہیں ہیں اور ہمیں

ہم جیسے کی بات کررہا ہے۔"

"اگر تمہیں اسی حالت میں باہر نکال دیا جائے تو لوگ پتھر مار مار کر تمہیں ہی جہنم بھیج دیں گے۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کپڑوں کے ساتھ ہم تمہیں تمہارے کسی جسمانی اعضا سے بھی محروم کردیں۔ مثلاً آنکھیں... آدمی بغیر بینائی کے کچھ نہیں ہوتا ہے۔" وسیم بولا۔

"یا تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ دیں یا ایک پیر سے محروم کردیں۔"

"تمہارے ساتھ ایسی سرجری بھی کی جاسکتی ہے جس کے بعد تم صرف نام کے مرد رہ جاؤ گے سرجری کے بعد ہم تمہاری تصاویر شہر میں مفت بانٹیں گے۔"

"جہاں ابھی تمہاری دہشت ہے اور پھر لوگ تمہیں کیا کہیں گے تمہیں بھی اچھی طرح علم ہے۔"

میں اور وسیم مسلسل بول رہے تھے اور آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر خوف نمودار ہونے لگا۔ اس نے تسلیم کرلیا کہ وہ بہت مشکل میں گھر گیا ہے اور کسی قسم کی جذباتیت اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتی تھی۔ وہ ہمارے قبضے میں تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ ہم جو کہہ رہے تھے وہ اس کے ساتھ کر بھی سکتے تھے۔ جب ہم خاموش ہوئے تو اس نے کسی قدر معقول لہجے میں کہا۔ "تم لوگ کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"ہم کون ہیں اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔" وسیم نے کہا۔ "ہاں یہ بتا سکتے ہیں کہ تم سے کیا چاہتے ہیں۔"

"شہلا کو تمہارے آدمی کہاں لے گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس کا چہرہ ایک لمحے متغیر ہوا تھا پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور انجان بن کر بولا۔ "کون شہلا....؟"

میں اس کی طرف بڑھا تو اس نے اچانک اٹھ کر اتنی پھرتی سے مجھ پر حملہ کیا کہ میں حیران رہ گیا۔ مجھے اس پچاس سالہ شخص سے اتنی پھرتی کی توقع نہیں تھی۔ وہ اچھل کر میری طرف آیا اور سینے پر سر سے ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ میں نے ذرا ترچھا ہوتے ہوئے اس کا سر اپنی بغل میں لیا اور پھر اسے گھما کر فرش پر دے مارا۔ وہ اذیت سے چلایا۔ اس سے پہلے وہ اٹھتا میں نے اسے الٹا کرکے گھٹنا اس کی کمر پر رکھا اور اس کے بال پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچا۔ اس کی گردن اوپر ہوئی تو ریڑھ کی ہڈی کمان کی صورت اختیار کرگئی۔ وسیم نے اس کے سیدھے ہاتھ پر اپنا جوتا رکھ دیا۔ اب وہ اذیت سے بل کھا رہا تھا اور خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ خاصا جاندار آدمی تھا اور لڑنے بھڑنے سے بھی واقف تھا لیکن شراب اور تمباکو نے اسے اندر سے کھوکھلا کردیا تھا ذرا سی جدوجہد نے اسے ہانپنے پر مجبور کردیا تھا۔ میں نے سکون سے کہا۔

"اس طرح اپنی ریڑھ کی ہڈی تم خود توڑ لو گے اور اس کے بعد ساری عمر بستر یا وہیل چیئر پر رہو گے۔"

"چھوڑو مجھے...." وہ چلایا۔ "زبان سے بات کرو۔"

"ہم نے زبان سے بات کی تھی۔" میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا۔ "لیکن تم نے سمجھی نہیں...."

ریڑھ کی ہڈی پر دباؤ ناقابل برداشت ہوتا جارہا تھا۔ وہ زیادہ دیر مزاحمت نہیں کرسکتا تھا۔ بالآخر اس کی اکڑ جواب دے گئی اور وہ بلبلانے لگا کہ اسے چھوڑ دیا جائے وہ ہر سوال کا جواب دے گا لیکن مجھے معلوم تھا وہ کتے کی دم تھی نکلتے ہی پھر ٹیڑھی ہوجاتی۔ میں نے سر کو ذرا ڈھیلا چھوڑا اور کہا۔ "سوال تمہیں یاد ہوگا اس کا جواب چاہیے۔"

"مجھے نہیں معلوم..... وہ اسے کہاں لے.... آہ...."

وہ بولتے ہوئے تڑپا کیونکہ میں نے سر کو دوبارہ پیچھے کھینچ لیا تھا۔ اس بار دباؤ شدید تھا اس کی ریڑھ کی ہڈی چٹخنے لگی تھی۔ وہ فرش پر پاؤں پٹخ رہا تھا اور بائیں ہاتھ سے مجھے خود سے ہٹانے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔ اس بار میری گرفت پہلے سے زیادہ سخت تھی۔ میں نے غرا کر کہا۔ "اپنا نقصان کرلو گے تو پھر کیا فائدہ! میں جواب تو حاصل کرکے رہوں گا۔ اگر تم سے نہیں ملا تو تمہارے گھر والوں کو لے آؤں گا اور پھر پوچھوں گا۔"

"اس کی بیٹی ہے کالج میں پڑھتی ہے اور دیکھنے میں بھی خوبصورت ہے۔" وسیم نے اوباشوں والے انداز میں کہا۔

"نہیں۔" اس نے تڑپ کر کہا۔ "بتاتا ہوں.... بتاتا ہوں۔"

"بتاؤ... تمہارے پاس صرف ایک منٹ ہے۔"

"وہ شہلا.... کو...." اس نے ایک نئی آباد ہونے والی بستی کا نام لیا۔ یہ پنڈی کی حدود میں تھی اور دوسری کسی آبادی سے خاصے فاصلے پر تھی۔

"وہاں کس جگہ؟"

"وہاں ایک کوٹھی ہے جو کالی کوٹھی کہلاتی ہے۔"

"یہ کس کی ہے؟"

اس نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ "تم نہیں جانتے

.....وہ مرشد علی کی کوٹھی ہے۔"

مجھے واقعی نہیں معلوم تھا اور مرشد کا نام سن کر مجھے جھٹکا لگا تھا۔ "مرشد... کا شہلا سے کیا تعلق ہے؟"

"میں نہیں.... جانتا۔" اس نے تڑپ کر کہا۔ میری گرفت غیر ارادی طور پر سخت ہو گئی تھی۔

"پھر تمہارے آدمی اسے وہاں کیوں لے گئے؟"

"مجھ سے مرشد نے کہا تھا اسے شہلا اور فتح خان کی تلاش ہے۔"

"شہلا کا تم سے کیا تعلق ہے؟"

"پرانا تعلق ہے ایک زمانے میں ہم کچھ عرصہ ساتھ بھی رہے پھر اس نے شادی کر لی۔" اس نے مبہم انداز میں کہا۔ "کچھ عرصے پہلے اس نے مجھ سے رابطہ کر کے مدد مانگی تھی۔"

"اور تم نے اس کی یوں مدد کی کہ اسے مرشد کے حوالے کر دیا۔" میں نے ایک جھٹکا دے کر کہا۔ "کیا لیا تم نے مرشد سے اس کے بدلے؟"

"میری کیا مجال۔" وہ کراہ کر بولا۔ "شہر کے تمام بدمعاش مرشد کے غلام ہیں وہ جس کو حکم دیتا ہے وہ بلا چون و چرا تعمیل کرتا ہے ورنہ پولیس حرکت میں آ جاتی ہے اور اس کے خلاف کیس کھل جاتے ہیں۔"

"گویا مرشد اب بدمعاشوں کا بدمعاش بن گیا ہے۔" میں نے کہا اور اسے چھوڑ دیا۔ وہ فرش پر گر گیا۔ اس کی کمر اتنی دیر تک ٹیڑھی رہی تھی کہ اب فوری طور پر اس کے لیے سیدھا ہونا ممکن نہیں تھا۔

"ایک معاملہ اور بھی ہے۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "مرشد نے کچھ عرصے پہلے مجھ سے میری بیٹی سارہ کا رشتہ مانگا تھا اور میں نے اس کا جواب نہیں دیا تھا۔"

"تم نے انکار کر دیا تھا؟"

"نہیں میں انجان بن گیا تھا چپ کر کے بیٹھ گیا۔"

"جیسے شتر مرغ ریت میں سر دبا کر سمجھتا ہے کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔" میں نے طنز کیا۔ "لیکن خطرہ ٹلا نہیں۔"

اس نے سر ہلایا۔ "مرشد نے مجھ سے رابطہ کر کے کہا کہ اگر میں شہلا یا فتح خان میں سے کسی ایک کو تلاش کر دوں تو وہ میری خطا بھول جائے گا۔"

"حالانکہ وہ بھولنے والا شخص نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ مجھے اب اس شخص پر ترس آنے لگا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مرشد اس سے کام بھی نکلوائے گا اور اس کی بیٹی کو بھی اٹھوا لے گا۔ وہ معاف کرنے کا قائل نہیں تھا۔ "شہلا تم پر بھروسا کرتی تھی اور تم نے اس کے اعتماد کو دھوکا دیا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ بھروسا نہیں کرتی تھی۔ میں نے اس کی مدد کی اور اس نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ مرشد جیسے خطرناک آدمی سے دشمنی مول لے بیٹھی ہے۔ اس نے مجھے بھی مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔"

اس نے شہلا کے بارے میں بالکل ٹھیک کہا تھا کہ وہ صرف اپنا مطلب نکالنا جانتی تھی۔ "تم نے اسے کس بہانے سے بلایا؟"

"میں نے اس سے کہا کہ میں نے اسے جو گاڑی دی تھی اس میں کچھ مسئلہ ہے کاغذات کا چکر ہے وہ مشکل میں پڑ سکتی ہے اس لیے یہ گاڑی واپس کر کے دوسری لے جائے۔"

"اس کام کے لیے تم نے اسے دامن کوہ بلایا تھا؟" میں نے شک سے کہا۔ "یہ کام تو وہ تمہارے گھر آ کر بھی کر سکتی تھی؟"

"اسے شک ہو گیا شاید اس لیے اس نے کسی ایسی جگہ ملنے سے انکار کر دیا جہاں میں اس پر قابو پا سکوں۔"

"اور اس ویرانے میں چلی آئی۔" میں نے طنز کیا۔ "صابر تم ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو اس وقت جھوٹ بول کر بچ جاؤ گے۔ نہیں تمہارے ایک ایک لفظ کی تصدیق کی جائے گی اور سچ جھوٹ کو کھنگال کر تمہارے اور تمہارے گھر والوں کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔"

"میں نے سچ کہا ہے۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ وہ بدستور اوندھے منہ پڑا تھا تاکہ اپنی ستر پوشی کر سکے۔

"کالی کوٹھی کہاں ہے؟"

صابر نے اس کا تفصیلی پتا بتایا۔ "اس جگہ کے بارے میں ہر کوئی نہیں جانتا ہے کہ یہ مرشد کے استعمال میں ہوتی ہے۔ وہ اسے خاص مقاصد کے لیے ہی استعمال کرتا ہے۔"

"مرشد کی شہلا سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔"

"میں نہیں جانتا لیکن یہ دشمنی کا معاملہ نہیں ہے۔ دشمنی ہوتی ہے برابر کے لوگوں میں اور شہلا کا مرشد سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔"

"چلو دشمنی نہ سہی لیکن مرشد کو کوئی تکلیف تو ہو گی شہلا سے تبھی اس نے اسے اغوا کرایا ہے۔"

"میں نہیں جانتا مرشد نے مجھے کچھ نہیں بتایا بس اس نے مجھے حکم دیا کہ میں شہلا کو تلاش کر کے کالی کوٹھی پہنچا دوں۔"

"تم نے ہمیں چکر دیا تمہارا ڈرائیور گاڑی دامن کوہ کے اوپر لے گیا اور اس نے چالاکی سے تمہیں راستے میں اتار دیا۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ تمہارا تعاقب ہو رہا ہے؟"

"مسلسل ایک ہی جیسے تین بائک والے اپنی گاڑی کے آس پاس دیکھ کر مجھے شک ہو گیا تھا اس لیے میں نے ریستوران جانے کے بجائے اوپر کا رخ کیا اور ایک جگہ اتر گیا۔"

"شہلا کو پروگرام کی تبدیلی کی اطلاع کیسے دی؟"

"کال کر کے... لیکن تم لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ میں اتر گیا ہوں؟"

"ہمارا ایک آدمی پیچھے بھی تھا۔ اس نے تمہیں دیکھ لیا۔"

اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ "جب آدمی کی شامت آتی ہے تو اس کی چالاکی بھی دھری رہ جاتی ہے۔"

"صابر ترمذی.... تم نے جو بتایا ہے ہم اس کی تصدیق کریں گے اور اگر اس میں سے کوئی بات غلط نکلی تو ہم اپنی دھمکی پر عمل کریں گے اور تمہیں نمونۂ عبرت بنا کر چھوڑ دیں گے۔" میں نے اسے دھمکایا۔

وسیم نے مجھے اشارہ کیا اور ہم کمرے سے باہر آ گئے۔ پیچھے سے صابر چلاتا رہ گیا تھا کہ اس کے کپڑے دے دیے جائیں لیکن ہم نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ باہر آ کر وسیم نے تشویش سے کہا۔ "یہ مسئلہ تو مزید الجھ گیا ہے شہلا کے مرشد کے ہاتھ لگنے کا مطلب ہے بریف کیس بھی اس کے علم میں آ جائے گا۔"

"تم نے ٹھیک کہا ہے اور ساتھ ہی مجھے شک ہے صابر نے شہلا کو صرف کار تبدیل کرنے کے بہانے نہیں بلایا تھا اس کے پس پشت کوئی اور چکر بھی ہے وہ بتا نہیں رہا ہے۔"

"اس سے ہم بعد میں پوچھ لیں گے۔" وسیم بولا۔ "اب بتائیں کیا کرنا ہے۔"

"میرا خیال ہے ہمیں کالی کوٹھی پر دھاوا بول دینا چاہیے۔ اگر فوری طور پر نہیں تب بھی ہمیں اس کی نگرانی شروع کر دینی چاہیے۔" میں نے کہا اور کہتے ہوئے مجھے یہ خیال آیا۔ "مانی کے پاس گوگل ارتھ کا اکاؤنٹ ہے وہ اس کی مدد سے کالی کوٹھی کی مکمل تصویر دکھا سکتا ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے ہم ابھی دیکھ سکتے ہیں۔"

ہم نیچے آئے تو مانی میز پر ٹانگ رکھے اور ہیڈ فون چڑھائے ایک نئے کالے راک اسٹار کا نہایت سنسنی خیز ویڈیو دیکھ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے جلدی سے ویڈیو بند کر دی اور ہیڈ فون اتار دیا۔ وسیم نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "ماشاءاللہ بچہ خاصی ترقی کر رہا ہے۔"

"وہ تو میں بس ایسے ہی...." مانی نے جھینپ کر کہا۔

میں نے مطلب کی بات کی۔ "مانی گوگل ارتھ پر ایک کوٹھی کی مکمل تصویر دیکھنی ہے۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے کہاں پر ہے۔" مانی مستعدی سے بولا۔ اس نے گوگل ارتھ کھول لیا تھا اس کے پاس لائیو اکاؤنٹ تھا یا اس نے کسی کا اکاؤنٹ ہیک کیا تھا اور اب دھڑلے سے استعمال کر رہا تھا۔ صابر نے کالونی کا نام اور کالی کوٹھی کی لوکیشن بیان کی تھی۔ میں نے اسے کالونی کا نام بتایا جو اس نے ایک منٹ میں نکال لی۔ یہ کالونی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ مشکل سے چند سو ایکڑ پر ہوگی اور اس کے گرد باؤنڈری وال بھی تھی۔ کالی کوٹھی کالونی کی مسجد سے شمال میں کوئی سو گز کے فاصلے پر تھی اور اس کے آس پاس کوئی اور کوٹھی یا تعمیر نہیں تھی۔ مانی کو کالی کوٹھی تلاش کرنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

"یہ ہے آپ کی کالی کوٹھی۔" مانی نے لیپ ٹاپ میری طرف گھما دیا۔

"اسے بڑا اور واضح کرو۔" میں نے کہا۔

"انٹر کا بٹن دبانے سے تصویر بڑی اور واضح ہو گی اور اسکیپ کا بٹن دبانے سے چھوٹی ہو جائے گی۔" اس نے آسان ترکیب بتا دی۔ میں نے انٹر کیا تو تصویر بڑی ہو گئی۔ یہ تقریباً چار کنال پر بنی کوٹھی تھی اور اصل عمارت کے چاروں طرف اونچی اور خاردار تاروں سے بھری باؤنڈری وال تھی۔ یہ باؤنڈری وال بتانے کے لیے کافی تھی کہ یہ مرشد جیسے کسی شخص کا ٹھکانا ہے۔ عمارت بہت بڑی نہیں تھی لیکن یہ دو منزلہ تھی۔ میں نے مانی سے پوچھا۔

"کیا یہ لائیو ہے؟"

"نہیں تصویر ہے اس لیے اتنی واضح ہے۔ لائیو میں اتنا واضح نہیں آئے گی۔"

"تم اسے لائیو کر دو۔"

مانی نے چند بٹن دبائے اور اسکرین دوبارہ میری طرف کر دی۔ "اب یہ لائیو ہے۔"

کوٹھی دھندلا گئی تھی لیکن اس کے صحن میں موجود دو افراد صاف محسوس ہو رہے تھے۔ وہ چہل قدمی کر رہے تھے۔ ایسا ہی ایک آدمی کوٹھی کی چھت پر تھا۔ پورچ میں دو بڑی سیاہ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ صحن میں ٹہلتے دو افراد اصل میں گیٹ کے محافظ تھے۔ وہ اتنے واضح نہیں تھے کہ ان کے پاس اسلحہ

نظر آتا لیکن ان کا مسلح ہونا یقینی تھا۔ کوٹھی میں داخلے کا ایک ہی راستہ تھا۔ کوٹھی کا نقشہ دیکھتے ہوئے میرا ذہن مسلسل سوچ رہا تھا۔ سامنے کی طرف سے داخل ہونا مشکل تھا۔ لازمی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا اور ناکامی کا امکان بھی تھا۔ سب سے بڑھ کر جانی نقصان کا اندیشہ تھا۔ ہمارے لیے ہمارا ایک ایک فرد قیمتی تھا۔ وسیم میرے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ اس نے اچانک کہا۔

''میں اپنے آدمیوں کو کال کر دیتا ہوں وہ پوری طرح تیار ہو کر آجائیں گے اور اگر آپ نے کوئی فیصلہ کیا تو اس پر عمل درآمد میں دیر نہیں لگے گی۔''

''ٹھیک ہے ویسے میرے ذہن میں ایک خیال آرہا ہے۔'' میں نے اسکرین پر کالی کوٹھی کے عقبی حصے پر ہاتھ رکھا۔ ''یہ دیکھو یہاں سے ایک نالا گزر رہا ہے۔ یہ برساتی نالا ہے اور اس کی مدد سے کوٹھی کے پاس پہنچا جا سکتا ہے۔ آج چاند کی کون سی تاریخ ہے؟''

''شاید چار۔'' وسیم نے کہا۔ ''لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ رات کے وقت یہاں یقیناً لائٹنگ کی جاتی ہوگی۔''

''چھت پر موجود شخص خطرناک ہے کیونکہ وہ اوپر سے چاروں طرف اور دور تک دیکھ سکتا ہے۔''

''ممکن ہے اس کے پاس نائٹ وژن ہو۔'' وسیم نے سر ہلایا۔ ''اسے اڑانا ہوگا آپ کے ذہن میں کیا پلان ہے۔''

''اگر ہم ایک چھوٹا فکس بم استعمال کر کے دیوار میں سوراخ کر دیں اور اس کے راستے اندر داخل ہوتے ہیں تو یہ کوٹھی کا عقبی حصہ ہوگا اور ان کی توجہ سامنے کی طرف ہے۔ میرا خیال ہے ہم کوٹھی میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ایک بار اندر پہنچ گئے تو سب پر قابو پا سکتے ہیں۔''

''ہمارے پاس جدید قسم کے فکس کیے جانے والے بم ہیں۔'' وسیم نے سر ہلایا۔ ''اگر اندر بھی اتنے ہی گارڈز اور ہوئے تو ان پر قابو پانا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ البتہ ہمیں رعایت سے گریز کرنا ہوگا کیونکہ وہ بھی ہمارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کریں گے۔''

میں نے سوچ کر سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے۔''

''ہمارے پاس ہم سب کے علاوہ دس افراد ہیں۔''

''میں، تم، بیٹو اور ایاز کے علاوہ چھ افراد بلا لو۔ ان کے پاس فکس کرنے والے بم ہوں اور خودکار رائفلوں کے ساتھ کم سے کم ایک اسنائپر رائفل بھی ہو۔ باقی ہینڈ گرنیڈ اور دھویں کے بم ہوں۔''

مانی کا رنگ اڑ گیا تھا اس نے کبھی اس قسم کی باتیں سامنے نہیں سنی تھیں جن سے آگ و خون کی بو آتی ہو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''شوبی کیا یہ سب سچ مچ ہوگا؟''

''تو برخوردار کیا تم مذاق سمجھ رہے ہو؟'' وسیم نے سنجیدگی سے کہا۔ ''کبھی ہمارے دشمن یہاں آئے تو وہ اس سے زیادہ خطرناک ہتھیاروں سے مسلح ہوں گے۔''

مانی فکرمند ہو گیا۔ ''کیا وہ ایٹم بم ماریں گے؟''

''نہیں لیکن اس سے کچھ ہی چھوٹا بم استعمال کریں گے۔ یہ فارم تو سمجھو یوں غائب ہو جائے گا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔''

''اور جو اِدھر ہوں گے؟''

''وہ بھی غائب....'' وسیم اسے ڈرا رہا تھا۔

''تب مجھے معاف رکھیں۔ میں یہاں اکیلا نہیں رہوں گا۔'' مانی نے انکار کر دیا۔ ''میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔''

''نہیں تمہیں یہیں رہنا ہے۔'' وسیم نے کہا۔ ''یہ شہباز صاحب کا حکم ہے اور فارم کا دفاع بھی تمہیں کرنا ہے۔''

''تمہیں پستول یا رائفل چلانی آتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''صرف گیمز کی حد تک۔'' مانی نے مردہ لہجے میں کہا۔

''تمہیں صرف زبان چلانی آتی ہے لیکن افسوس ہمارے دشمن یہ زبان سمجھتے نہیں ہیں۔''

''آپ مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔'' مانی نے رو دینے والے انداز میں کہا تو مجھے ہنسی آگئی۔

''برخوردار اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ جگہ محفوظ ہے، دشمن کو ابھی اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے دوسرے وہ اگر آئے تو تمہیں پہلے علم ہو جائے گا اور تم اپنا مال سمیٹ کر پیچھے سے فرار ہو جانا۔''

''اور اگر وہ پیچھے بھی آگئے۔''

''تب تمہیں شہادت نصیب ہوگی۔'' وسیم نے زبردستی اس سے ہاتھ ملایا۔ ''یہ اعزاز سب سے پہلے تمہیں ملے گا۔''

''مجھے کیوں، آپ لے لیں۔'' اس نے ہاتھ چھڑایا۔

مجھے مانی کی بات نے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ہم اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے تھے کیونکہ اس میں اپنا دفاع کرنے کی صلاحیت نہیں تھی یہاں اس کے ساتھ کسی کا ہونا ضروری تھا۔ سفیر فوری نہیں جا رہا تھا۔ ''سفیر تمہارے ساتھ رہے گا۔''

''اچھا۔'' وہ بے دلی سے بولا۔ ''یہ دشمن کے آنے سے کچھ ہی بہتر ہوگا۔''

''تم دونوں کا وقت اچھا گزرتا ہے۔'' وسیم ہنسا اور باہر چلا گیا وہ اپنے آدمیوں سے رابطہ کر کے انہیں بلا رہا تھا۔ فارم ہاؤس میں معمول کا اسلحہ تھا جیسے پستول اور رائفلیں وغیرہ۔ لیکن اس مہم کے لیے جو اسلحہ درکار تھا وہ حویلی میں تھا۔ میں نے عبداللہ کو کال کی۔ ''ایاز کہاں ہے؟''

''یہاں موجود ہے جناب۔'' اس نے کہا۔ ''کیا اسے بھی ساتھ لے آؤں؟''

''ہاں اسے ابھی بھیج دو اور ہو سکے تو تم بھی آجاؤ۔''

''میں آجاتا ہوں۔''

''ایک کام ہے تیار ہو کر آنا۔''

''میں سمجھ گیا۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کی ایاز سے بات کراؤں؟''

''نہیں اب تم دونوں آؤ گے تو بات بھی ہو جائے گی۔''

سفیر کو پتا چلا تو وہ دوڑا آیا۔ ''یار کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ یہ تیاریاں کس لیے۔''

''بہت دنوں سے کچھ کیا نہیں ہے ہاتھ میں کھجلی ہو رہی ہے۔''

''لیکن اس طرح مرشد سے براہِ راست پنگا....''

''براہِ راست نہیں.... ہم شہلا کو لینے جا رہے ہیں اب وہ مرشد کے پاس ہے تو یہ اس کا قصور ہے ویسے ہم کامیاب رہے تو اسے پتا بھی نہیں چلے گا کہ کس نے کام کیا ہے۔''

سفیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اسے احمق مت سمجھو ...وہ کارروائی کے انداز سے جان جائے گا کہ یہ کس کی کارروائی ہے۔''

''وہ احمق نہیں ہے لیکن اتنا عقل مند بھی نہیں ہے وہ شک کر سکتا ہے لیکن ہم پر الزام نہیں لگا سکتا.... اور ابھی تو اسے شک ہوگا کہ یہ نادر یا اس کے ہمدردوں کی جوابی کارروائی ہے۔''

سفیر کے خدشات کم نہیں ہوئے تھے۔ ''تم بہت عجلت میں بہت بڑا قدم اٹھانے جا رہے ہو۔''

''یار ہم تمام حفاظتی تدابیر کریں گے اور دشمن کو وار کرنے کا موقع ہی نہیں دیں گے۔ دوسرے خطرے میں تو ہم سب ہمہ وقت ہوتے ہیں۔ ہم صرف دفاع کر کے بچ نہیں سکتے۔''

سفیر سمجھ گیا کہ میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ ''ٹھیک ہے یار اب میرے لیے کیا حکم ہے۔''

''عبداللہ آرہا ہے تم اس کے ساتھ مل کر خواتین کو حویلی منتقل کرنے کا پروگرام بناؤ گے۔ یہ بات یقینی ہے کہ عبداللہ والی کوٹھی کی نگرانی کی جا رہی ہوگی۔ یہ منتقلی آنے والے ایک دو دن میں ہو جانی چاہیے۔''

جو خدشات سفیر کی زبان پر تھے وہی میرے دل میں بھی تھے لیکن میں سمجھ رہا تھا اگر شہلا ماری جاتی یا ہمارے ہاتھ سے نکل جاتی تو ایک اہم مہرہ مرشد کے ہاتھ میں چلا جاتا اور وہ بریف کیس حاصل کر لیتا تو ہمارے خلاف پہلے سے زیادہ مضبوط پوزیشن میں آجاتا۔ پھر فتح خان کے بارے میں بھی صرف شہلا سے پتا چلایا جا سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شہلا کی مرشد سے براہِ راست کوئی دشمنی نہیں تھی بلکہ اس نے اسے فتح خان کا پتا چلانے کے لیے اٹھوایا تھا۔ مرشد کو فتح خان سے جو نقصان ہوئے تھے وہ یقیناً پاگل ہو گیا تھا۔ شہلا کو اس کے قبضے میں گئے خاصی دیر ہو گئی تھی اور مجھے خدشہ تھا کہ اگر وہ زندہ بھی ہوئی تو مرشد کے درندوں نے اسے ادھیڑ کر رکھ دیا ہوگا۔ رحم و مروت کے الفاظ ان کی لغت میں شامل نہیں تھے اور میں کئی بار ان کی درندگی کے نمونے دیکھ چکا تھا۔

شہلا کو آزاد کرانے کے ساتھ میں مرشد کو احساس دلانا چاہتا تھا کہ وہ اور اس کے ٹھکانے اتنے محفوظ نہیں تھے جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔ باہر سے عبداللہ اور ایاز کی آوازیں آرہی تھیں میں باہر نکل آیا۔ سلام دعا کے بعد میں نے اپنا مقصد بیان کیا تو ایاز خوش ہو گیا۔ ''بہت دنوں سے ہاتھ پاؤں چلانے کا موقع نہیں ملا ہے۔''

''جناب میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''نہیں تم سفیر کے ساتھ مل کر لیڈیز کو حویلی منتقل کرنے کی تیاری کرو۔''

عبداللہ مایوس ہوا۔ ''اچھا میں تو سمجھا تھا کہ آپ مجھے بھی ساتھ لے کر جائیں گے۔''

''تم بیک اپ میں رہو گے اور اپنے ساتھیوں کو بھی تیار رکھنا۔'' میں نے کہا۔ ''ممکن ہے تمہاری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔''

''تب میں انہیں تیار رہنے کا حکم دیتا ہوں بلکہ بلوا لیتا ہوں۔''

''گارڈز میں سے مت بلوانا۔''

''نہیں، چار آدمی الگ سے ہیں۔ انہیں کہاں بلاؤں؟''

میں نے عبداللہ کو کالونی کے بارے میں بتایا جہاں مرشد کی کالی کوٹھی تھی وہ کوٹھی کا نام سن کر حیران ہوا۔ "یہ کیسا نام ہے؟"

"جیسے مرشد کے کرتوت ہیں ویسا ہی نام ہے.....ویسے میرا خیال ہے کسی وجہ سے مشہور ہو گیا ہوگا اور مرشد نے دہشت قائم کرنے کے لیے یہی نام رکھ لیا ہوگا۔"

ایک گھنٹے بعد وسیم نے اطلاع دی۔ "آدمی اور گاڑیاں پہنچ گئی ہیں۔"

اس دوران عبداللہ کے آدمی بھی اپنی گاڑی میں کالونی کے پاس پہنچ گئے تھے۔ اس نے کہا۔ "میں بھی چلتا ہوں میں اپنے آدمیوں کے ساتھ باہر رہوں گا اپنا کام میں یہاں واپسی کے بعد کرلوں گا۔"

"ٹھیک ہے تم بھی چلو۔" میں نے کہا اور وسیم کی طرف دیکھا۔ "وین بھی جائے گی؟"

"بالکل.....یہ آپس میں سب کا رابطہ رکھے گی۔" وسیم نے جواب دیا۔ "یہاں سے ہم اسی میں جائیں گے۔"

"پھر بھی وین اس جگہ سے دور کھڑی کرنا یہ کسی کی نظروں میں نہ آئے۔"

چھ بجے ہم فارم ہاؤس سے نکلے تو باہر تاریکی چھا رہی تھی۔ عبداللہ اور ایاز تعاقب سے بچنے کے لیے ایک متبادل راستے سے آئے تھے۔ ایاز اور عبداللہ ہمارے ساتھ آ گئے۔ ڈرائیونگ کمپارٹ میں شہاب اور وسیم تھے جب کہ میں، عبداللہ، جیتو اور ایاز پیچھے تھے۔ حویلی سے دو گاڑیوں میں وسیم کے چھ آدمی آئے تھے میرے خیال میں یہ تسلی بخش نفری تھی۔ چھ ہم تھے اور چار عبداللہ کے آدمی تھے۔ جو اس کے ساتھ پک اپ میں رہتے اور ضرورت پڑنے پر ہماری مدد کو آ جاتے۔ راستے میں عبداللہ کو اس کے آدمیوں کے پاس اتار کر ہم ساڑھے چھ بجے کالونی میں داخل ہو گئے تھے۔ ایک چوکیدار بیریئر بند کیے بیٹھا تھا لیکن اس نے گاڑیاں دیکھ کر بغیر کوئی سوال کیے ہوئے بیریئر ہٹا دیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ وسیم نے وین کا سیٹلائیٹ میپ سسٹم آن کیا اور اب یہ ہماری رہنمائی کرنے لگا۔ کالی کوٹھی سے کوئی ایک فرلانگ دور نالے کے ساتھ گاڑیاں روک لیں۔ یہاں تاریکی تھی اور گاڑیوں کی تمام لائٹس بند تھیں اس لیے امید تھی کہ کوٹھی کی چھت سے یہ گاڑیاں نظر نہیں آئیں گی۔

وسیم نے وین کی چھت پر موجود دوربین کا رخ کوٹھی کی طرف کر دیا اور اس کا رات کو دیکھنے والا نظام آن کیا فوراً ہی بڑے ایل سی ڈی اسکرین پر کوٹھی نمودار ہوئی اور یہ بڑی ہونے لگی۔ وسیم چھت کو فوکس کر رہا تھا۔ ماحول ہرے رنگ کا تھا اور اس میں فوراً ہی وہ سرخ دھبا نظر آ گیا جو کسی "ذی روح" کا تھا۔ وہ چھت پر ٹہل رہا تھا۔ وسیم نے دوسری گاڑی میں موجود اپنے ایک آدمی سے کہا۔ "اسے احتیاط سے نشانہ بناؤ۔ ایک فائر میں اس کا کام تمام ہو جانا چاہیے۔"

مجھے عجیب سا لگا۔ میری جدوجہد کے دوران بہت مواقع ایسے آئے تھے جب میں نے کسی آدمی کو یوں مارا ہو یا مارنے کو کہا ہو جسے میں جانتا بھی نہیں تھا حالانکہ وہ مرشد جیسے شیطان کا خاص ملازم تھا اور اس سے شریف ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ مرشد اس قسم کے کاموں کے لیے چھٹے ہوئے سفاک بدمعاش رکھتا تھا جو اکثر پولیس کو بھی مطلوب ہوتے تھے۔ اس کے باوجود میرے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ ہم سب دم سادھے اسکرین پر نظر جمائے بیٹھے تھے۔ فائر کی آواز نہیں آئی لیکن چھت پر ٹہلتا آدمی اچانک غائب ہو گیا۔ وہ جس طرح جھٹکے سے گرا تھا صاف لگ رہا تھا اسے گولی لگی ہے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا تھا اور اس کے گرنے سے نیچے والوں کی طرف سے کوئی ردعمل سامنے آتا ہے یا نہیں۔

"ہمیں پانچ منٹ انتظار کرنا ہوگا۔" وسیم نے آہستہ سے کہا۔ "اس کے بعد سب حرکت میں آ جائیں گے۔ شہباز صاحب آپ وین میں....."

"میں ساتھ چلوں گا۔"

"او کے جیتو وین میں رہے گا۔" وسیم نے فیصلہ سنایا وہ مشن کمانڈر تھا۔ وہ گھڑی پر نظر جمائے بیٹھا تھا۔ جیسے ہی پانچ منٹ پورے ہوئے اس نے اشارہ کیا اور ہم وین سے نیچے اتر آئے۔ جیتو نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اب نگرانی کی ذمے داری شہاب کی تھی۔ وہ ہمیں گائیڈ کرتا۔ ہم نو افراد خاموشی سے نالے میں اتر گئے۔ یہ بہت گہرا نالا نہیں تھا لیکن ہم جھک کر چلتے تو دور سے نظر نہیں آتے۔ وسیم اور آگے چلنے والے اس کے ایک ساتھی نے نائٹ وژن لگا رکھی تھی۔ وہی ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ ورنہ یہاں اتنی تاریکی تھی کہ مشکل سے ہی کچھ نظر آ رہا تھا۔ میں درمیان میں تھا اور نصف راستے کے بعد ہمیں کوٹھی کی عقبی دیوار نظر آنے لگی تھی توقع کے عین مطابق یہاں دیوار پر لائٹیں روشن تھیں اور آس پاس سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے وسیم سے کہا۔

"اگر یہاں کیمرے ہوئے تو ہم فوراً نظر میں آ جائیں گے۔"

"کیمرے نہیں ہیں۔" اس نے کہا۔ "وین کا کمپیوٹر

اس کی نشان دہی کر سکتا ہے اور اس نے بتایا کہ یہاں کوئی کیمرا نہیں ہے۔"

میں مطمئن ہو گیا۔ وسیم نے دو آدمی کوٹھی کے سامنے کی طرف بھیج دیے۔ وہ مسلح تھے اور اگر کوئی اس طرف سے نکلنے کی کوشش کرتا تو وہ اسے مار گراتے۔ گاڑی ہوتی تو اس کا ٹائر برسٹ کر دیتے۔ وہ اسی نالے میں آگے روانہ ہو گئے۔ وسیم کا وہ آدمی جو بم لگانے کا ماہر تھا ایک چھوٹا سا بیگ لے کر نالے سے نکلا اور کوئی دس گز دور کوٹھی کی دیوار کے پاس جا پہنچا۔ وسیم نے بتایا کہ اس نے کچھ جدید قسم کے چھوٹے لیکن تباہ کن بم منگوائے تھے۔ اس کا یہ آدمی انہیں استعمال کرنے کا ماہر تھا۔ اس نے دیوار کی جڑ میں بیٹھ کر اپنی کارروائی کی اور مشکل سے دو منٹ بعد واپس آ گیا۔ اس نے آتے ہی مطلع کیا۔

"ایک منٹ بعد دھماکا ہوگا۔"

"اندر جاتے ہی تمام افراد تین پارٹیوں میں بٹ جائیں گے۔ تم میں سے دو میرے ساتھ ہوں گے، ایک ایاز اور ایک شہباز صاحب کے ساتھ ہوگا۔"

ابھی اس کی بات مکمل ہوئی تھی کہ دھماکا ہوا اور گرد و غبار کا ایک چھوٹا سا طوفان اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی اس طرف کی تمام روشنیاں بند ہو گئیں۔ دھماکا دبا ہوا تھا لیکن اتنا دبا ہوا بھی نہیں تھا کہ اندر والوں کو اس کی خبر نہ ہوتی۔ ہم ایک ساتھ اٹھ کر بھاگے اور باری باری دیوار میں بننے والے خلا سے گزر کر اندر داخل ہو گئے۔ ہم تین حصوں میں بٹ گئے تھے۔ وسیم دو آدمیوں کے ساتھ کوٹھی کے بائیں طرف سے اگلے والے حصے کی طرف بڑھا۔ ایاز کے ساتھ ایک نے وہیں درختوں میں مورچہ بنا لیا جب کہ میں ایک آدمی کے ساتھ دائیں طرف بڑھا۔ یہ وہی بم ماہر تھا۔ یہاں کوٹھی کا پچھلا حصہ محدود اور کچا تھا۔ میں نے اندر آتے ہی دیکھ لیا تھا کہ عقب میں کوئی دروازہ نہیں ہے صرف کھڑکیاں ہیں اور ان پر بھی فولادی گرل تھی۔ ابھی میں اور میرا ساتھی عمارت کے پاس پہنچے تھے کہ اوپر سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور کسی نے مشین گن سے برسٹ مارا۔

ایک لمحے کو میرا دل رک گیا کہ شاید اوپر سے کسی نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور برسٹ ہماری طرف مارا گیا تھا۔ مگر صرف آواز پاس سے آئی تھی گولیاں کہیں اور گئیں۔ وسیم اور اس کے دونوں ساتھی آگے جا چکے تھے۔ مجھے ایاز اور اس کے ساتھی کا خیال آیا میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ "ایاز تم دونوں ٹھیک ہو؟"

"بال بال بچے ہیں جناب۔" اس نے جواب دیا۔ "برسٹ ہماری طرف آیا تھا اگر تنوں کے پیچھے نہ ہوتے تو گولی لگ سکتی تھی۔"

"ہوشیار رہنا اس برسٹ نے ثابت کر دیا ہے اندر بھی پوری طرح مسلح لوگ موجود ہیں۔"

اسی لمحے ایک ہلکی سی آواز آئی اور اوپر کوئی بھیانک انداز میں چلایا۔ میرے ہیڈ سیٹ میں شہاب کی آواز آئی۔ "میں نے مشین گن والے کو گرا دیا ہے۔"

شہاب نے دور مار رائفل سے نشانہ لیا تھا اور اس کا نشانہ بہترین نکلا تھا۔ وین یہاں سے کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ وہ وین کی دوربین سے معائنہ بھی کر رہا ہوگا۔ "گڈ.....اور کتنے لوگ نظر آ رہے ہیں؟"

"مختلف کھڑکیوں میں کم سے کم تین افراد ہیں۔" شہاب نے جواب دیا۔ "ان میں سے ایک مارا گیا ہے۔"

اسی لمحے کوٹھی کے سامنے والے حصے سے فائرنگ کی تیز آواز آئی۔ یہ ملے جلے ہتھیار تھے جو بیک وقت چل رہے تھے۔ وسیم اور اس کے ساتھیوں نے اپنی کارروائی شروع کر دی تھی۔ میں کھسکتا ہوا ایک کھڑکی تک پہنچا۔ یہ بڑے پٹ والی کھڑکی تھی لیکن اس پر مضبوط فولادی گرل تھی۔ میں نے اپنے ساتھی کو اشارے سے پاس بلایا۔ "اسے توڑنے کا کوئی طریقہ ہے؟"

"بالکل ہے جناب۔" اس نے کہا اور اپنے بیگ سے ایک چھوٹا سا سیاہ ڈبا نکالا۔ یہ مشکل سے سگریٹ والے پیکٹ کے برابر تھا۔ اس نے اسے ایک جگہ سے دبایا اور فولادی گرل پر رکھ کر تیزی سے دیوار کے کونے کی طرف بڑھا۔ یہ وہی ایک منٹ بعد خود بہ خود پھٹ جانے والا بم تھا۔ جیسے ہی ہم دیوار کی آڑ میں ہوئے دھماکا ہوا اور فولادی گرل دیوار سے نکل کر نیچے گری ہم دونوں بیک وقت اس طرف دوڑے۔ میرے ساتھی نے مجھے پیچھے رکھا اور خود تیزی سے اندر کود گیا۔ ایک منٹ بعد اس کی آواز آئی۔ "آل کلیئر سر۔"

میں بھی اندر کود گیا اور ریڈیو پر سب کو اطلاع دی۔ "ہم اندر داخل ہو گئے ہیں۔"

"ہمیں سامنے مزاحمت کا سامنا ہے۔" وسیم کی آواز آئی۔ "کم سے کم ایک آدمی مارا گیا ہے اور اندر دو اور موجود ہیں۔"

گویا کوٹھی کے اندر پانچ افراد تو تھے اور ممکن ہے اس سے زیادہ ہوں۔ ہم جس کمرے میں تھے یہ خواب گاہ تھی مگر اس وقت یہاں کوئی نہیں تھا۔ میرے ساتھی نے ملحقہ دروازے کو کھول کر دیکھا تو یہ واش روم نکلا تھا۔ ڈریسنگ

مخمل پر ایک چھوٹا آئینہ رکھا تھا میں نے وہ اٹھایا اور کمرے کی لائٹس بند کرتے ہوئے باہر کا دروازہ کھولا اور آئینہ باہر نکال کر دیکھا۔ یہ راہداری تنگ اور خالی لگ رہی تھی لیکن یہ دھوکا بھی ہو سکتا تھا دشمن کہیں تاک میں بیٹھا ہو سکتا تھا اور جیسے ہی ہم باہر جاتے وہ اپنا کام کر جاتا۔ میں نے بستر سے تکیہ اٹھایا اور اسے راہداری میں پھینکا فوراً ہی ایک طرف سے کسی نے شاٹ گن کا فائر کیا۔ محدود جگہ میں اس کا دھماکا کچھ زیادہ ہی محسوس ہوا۔ فائر کرنے والا دائیں طرف اسی قطار میں کسی کمرے میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے اضطراری طور پر فائر کیا تھا ورنہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی رکتا تو انسان اور تکیے میں فرق محسوس کر لیتا۔ میں نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔

"اس کا کوئی حل ہے۔"

اس نے سر ہلایا اور اپنے بیگ سے دو عدد مختصر اور آسان سے گیس ماسک نکالے ایک اپنے چہرے پر چڑھایا اور دوسرا مجھے دے دیا۔ میں نے بھی پہن لیا تو اس نے بیگ سے ایک چھوٹی باڈی اسپرے قسم کی دھاتی بوتل نکالی اور اس کی اوپری چابی گھما کر اسے راہداری میں اس طرف پھینک دیا جہاں سے فائر ہوا تھا۔ چابی گھماتے ہی اس سے دھواں نکلنے لگا تھا۔ ایک منٹ کے اندر راہداری دھواں دھار ہو گئی تھی اور شاٹ گن چلانے والا کھانستا ہوا کمرے میں روپوش ہو گیا تھا۔ ہم باہر نکل آئے جس کمرے سے آدمی کے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی میں نے اس کے دروازے کا لاک فائر کر کے توڑ دیا اور پھر پیچھے ہو گئے فوراً ہی اندر سے شاٹ گن کا فائر آیا تھا۔ اس نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور دروازہ کھل گیا۔ میرے ساتھی نے فرش پر پڑا گیس بم پاؤں کی ٹھوکر سے اندر پھینک دیا جس سے بدستور دھواں خارج ہو رہا تھا۔ اندر موجود آدمی کھانستے اور گالیاں دیتے ہوئے بالآخر ڈھیر ہو گیا۔

باہر اور سامنے سے فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ میں نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا کہ وہ سامنے کی طرف جائے اور اندر موجود مزاحمت کو صاف کر دے میں خود پلٹ کر واپس آیا۔ میرا رخ کوٹھی کے وسطی حصے کی طرف تھا۔ کوٹھی اندر سے بھی خاصی بڑی ثابت ہوئی تھی۔ ابھی تک ہمیں کوئی ایسا فرد ہاتھ نہیں لگا تھا جس سے مرشد کا تعلق جوڑا جا سکتا۔ خود مرشد یہاں نہیں تھا اگر وہ ہوتا تو اس کے درجنوں محافظ بھی یہاں ہوتے جب کہ یہاں دس سے بھی کم لوگ تھے۔ مگر شہلا کی یہاں موجودگی کا امکان تھا۔ میں اسے ہی تلاش کر رہا تھا۔ میرے ساتھی وقفے وقفے سے اطلاع دے رہے تھے کہ مزید مزاحمت کرنے والے مارے جا چکے تھے۔ ہمیں کوٹھی میں داخل ہوئے دس منٹ ہونے والے تھے اور ہمیں آدھے گھنٹے کے اندر اپنا کام کر کے یہاں سے نکل جانا تھا۔ شہاب کا رابطہ موبائل پر عبداللہ سے تھا جو کالونی کے باہر مین روڈ پر موجود تھا اگر پولیس آ جاتی تو وہ ہمیں خبردار کرتا اور پولیس کو روکتا۔ اگرچہ ہماری پولیس سے منٹوں والی مستعدی کی توقع نہیں تھی لیکن معاملہ مرشد کا تھا اس لیے آدھے گھنٹے میں اس کی آمد متوقع تھی۔ اس سے پہلے ہمارا یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔

دو آدمی شہاب نے مار گرائے تھے۔ ایک ایاز کا نشانہ بنا تھا اور ایک کو ہم نے بے بس کر دیا تھا۔ وسیم اور اس کے ساتھیوں نے سامنے موجود دونوں گارڈز کو نشانہ بنایا تھا لیکن ابھی سامنے والے حصے میں موجود کم سے کم دو افراد مزاحمت کر رہے تھے۔ راہداری آگے جا کر گھوم رہی تھی۔ میں نے آگے جھانکا۔ کوٹھی کی اندرونی روشنیاں جل رہی تھیں۔ دھماکے سے صرف متعلقہ حصوں کی لائٹ متاثر ہوئی تھی اس کا مطلب تھا کہ ہر حصے کے لیے الگ وائرنگ تھی۔ اس قسم کی کوٹھی میں اس قسم کا انتظام ہونا چاہیے تھا۔ میں پوری طرح محتاط تھا جس طرح اس کمرے میں ایک آدمی موجود تھا اسی طرح اس راہداری کے کسی کمرے میں کسی دشمن کی موجودگی ممکن تھی۔ میرا ہاتھ رائفل کے ٹریگر پر تھا اور میں ایک لمحے کے چوتھے حصے میں فائر کرنے کے لیے تیار تھا۔

میں راہداری میں آگے بڑھ رہا تھا کہ مجھے عجیب سی آواز آئی جیسے کوئی کراہا ہو۔ میں رک گیا۔ آواز قریب سے آئی تھی لیکن میں اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ کس طرف سے آئی تھی۔ میں ساکت تھا اور اس بار پوری طرح مستعد بھی تھا۔ لیکن آواز دوبارہ نہیں آئی جب میں آگے بڑھنے کا ارادہ کر رہا تھا تو آواز دوبارہ آئی اور اس بار واضح تھی۔ میں نے سمت کا تعین بھی کر لیا یہ میرے بائیں طرف موجود کمرے سے آئی تھی۔ میں نے اس کا دروازہ کھولنا چاہا لیکن وہ لاک نکلا۔ میں نے پستول کی نال لاک پر رکھ کر فائر کیا اور لاک ٹوٹ کر کھل گیا۔ میں نے ایک طرف ہوتے ہوئے دروازے کو اندر دھکیلا۔ اندر تاریکی تھی اور خلافِ توقع کسی نے فائر بھی نہیں کیا اس کے باوجود میں نے پستول اوپر کی طرف کر کے ایک فائر کیا کہ اندر کوئی موجود ہوا تو بھڑک کر ردعمل ظاہر کر سکتا تھا۔ مگر جب کوئی جواب نہیں آیا تو میں نے گیس ماسک اتارتے ہوئے اندر ہاتھ مارا اور سوئچ مل جانے پر اس کے سارے بٹن آزمائے بالآخر ایک سوئچ کام آیا اور اسے دباتے ہی اندر روشنی ہو گئی تھی۔ مگر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ روشنی ہوتے ہی اتنا خوفناک اور رگوں میں خون

خشک کر دینے والا منظر سامنے آئے گا۔

میرے سامنے ننگے فرش پر ایک عورت کا بے لباس وجود یوں پڑا تھا کہ زخموں نے اس کی ستر پوشی کر دی تھی سر سے پاؤں تک جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو زخموں سے خالی ہو۔ اس کے زخموں سے بہنے والا لہو فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے بال جلا دیے گئے تھے اور آنکھیں نکال دی گئی تھیں۔ بلیڈ جیسے تیز دھار والے کے زخم تھے یا سگریٹ سے جلائے جانے کے نشانات تھے۔ اس قدر زخم سہہ کر وہ نہ جانے کیسے زندہ تھی فرش پر پھیلا ہوا خون بھی کم نہیں تھا اور صاف پتا چل رہا تھا کہ اس کے جسم سے بیشتر خون نکل چکا ہے۔ وہ سخت تکلیف میں تھی اس کے باوجود زندہ تھی۔ کیونکہ وہ کوئی عام عورت نہیں.... بلکہ شہلا تھی۔ جب ہم کالی کوٹھی کی طرف آ رہے تھے تب بھی مجھے امید نہیں تھی کہ میں شہلا کو صحیح سالم یا زندہ پا سکوں گا لیکن جس حال میں اسے دیکھ رہا تھا اس کا تو میں نے سوچا نہیں تھا۔

اسے اس حال تک پہنچانے سے پہلے مرشد کے کتوں نے اس کے جسم کو بھی روندا تھا۔ شہلا کوئی پاک باز عورت نہیں تھی لیکن عورت تو تھی اس کے ساتھ یہ سلوک کرنے والوں کے لیے شہلا اور کوئی بھی عورت برابر تھی کیونکہ ان کے آقا نے اسے ایسے ان کے سامنے ڈال دیا تھا جیسے کتوں کے سامنے راتب ڈالا جاتا ہے اور انہوں نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا تھا جو کتے راتب کے ساتھ کرتے ہیں۔ شہلا میری دشمن تھی آخری بار اس نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی بریف کیس میں بم تھا اور اللہ نے مجھے عقل دی ورنہ میں مارا جاتا۔ اس کے علاوہ بھی شہلا نے مجھ سے دشمنی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ موقع ملنے پر ہمیشہ مجھے دھوکا دیا اور نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود اسے اس حال میں دیکھ کر میرا دل دکھی ہونے لگا تھا اور ان لوگوں کے لیے میرے اندر آتش فشاں سا پھٹنے لگا تھا جو شہلا کی اس حالت کے ذمے دار تھے۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہے اور لاشعوری طور پر تکلیف سے کراہ رہی ہے لیکن بیٹھتے ہوئے رائفل کا دستہ فرش پر لگا تو وہ چونکی۔

"کک.... کون؟" وہ دھیمی اور تقریباً کراہتی آواز میں بولی جسے بہ مشکل میرے کانوں نے سنا تھا۔

"ڈرو نہیں.... شہلا یہ میں ہوں۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"شہباز؟" اس نے بہت مشکل اور بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں یہ میں ہوں .... مجھے دیر ہو گئی۔" میں نے دکھ سے کہا۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا مرشد کے کتے اتنی جلدی.."

"میں.... مر رہی ہوں۔" وہ کراہی۔ "شہباز تم اچھے آدمی ہو.... میری آخری خواہش پوری کرو گے؟"

میں اس کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا خواہش ظاہر کرنے والی تھی۔ "نہیں شہلا یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔ جب تک تم دشمن تھیں میں شاید تمہیں مار دیتا لیکن اب...."

"میں اب بھی دشمن ہوں۔"

"میں مرتے شخص سے دشمنی نہیں نبھاتا۔" میں نے کہا۔

"پلیز شہباز۔" وہ گڑگڑائی۔ "تم نہیں جانتے.... میں کتنی اذیت میں ہوں۔"

میں دیکھ رہا تھا وہ کتنی اذیت میں تھی۔ وہ چاہتی تھی میں اسے گولی مار کر اس اذیت سے نجات دلا دوں اور یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ "مرشد تم سے کیا چاہتا تھا اس نے تمہیں کیوں اٹھوایا؟"

"میں بتاؤں گی۔" وہ رونے والے انداز میں بولی۔ "لیکن تمہیں وعدہ کرنا ہو گا مجھے مار دو گے.... بولو شہباز مجھے شوٹ کرو گے؟"

"میں ایسا وعدہ نہیں کر سکتا۔"

"بریف کیس۔" وہ جلدی سے بولی۔ "تمہیں بریف کیس چاہیے نا.... تم اس کی خاطر میری تلاش میں تھے میں تمہیں بتاؤں گی وہ بریف کیس کہاں ہے؟"

شہلا نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا لیکن اگر میں اس سے وعدہ کر لیتا تو مجھے یہ وعدہ نبھانا ہی پڑتا۔ دوسری طرف بریف کیس تھا وہ لازمی تھا۔ میں نے اس کے حصول کے لیے بہت کوشش کی تھی اور بہت ساری مشکلات برداشت کی تھیں۔ میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا اور دل کڑا کر کے شہلا سے وعدہ کیا۔ "ٹھیک ہے اگر تم مجھے بریف کیس کے بارے میں بتا دو گی تو میں تمہیں اس اذیت سے نجات دلا دوں گا۔"

اس نے گہرا سانس لیا۔ "مجھے تمہارے وعدے پر اعتبار ہے۔ شہباز میرے پاس آ جاؤ اس بریف کیس کے بارے میں کسی اور کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے آئے؟"

"ہم نے حملہ کیا ہے اور یہاں قبضہ کر لیا ہے۔"

"سنو یہاں مائک لگے ہیں اور ایسے خفیہ الارم ہیں جو کہیں اور اطلاع دیتے ہیں۔"

شہلا کا انکشاف تشویش ناک تھا میں نے فوراً ریڈیو پر وسیم کو اس خطرے سے آگاہ کیا۔ پھر میں شہلا کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم فکر مت کرو تم جو بتاؤ گی وہ صرف مجھ تک

محدود رہے گا۔"

"تمہیں یاد ہے جب ہم تمہیں اور سویرا کو اغوا کر کے لے گئے تھے اور ویران جگہ رکھا تھا پھر وہاں خانہ بدوشوں نے حملہ کیا تھا؟"

"ہاں وہ سب فتح خان کے آدمیوں کی وجہ سے ہوا تھا۔"

"خانہ بدوشوں نے سب کو یرغمال بنا لیا تھا پھر فتح خان اور اس کے ساتھیوں نے حملہ کیا تو وہ افراتفری میں فرار ہو گئے۔ اس وقت ہمیں بھی خیال نہیں رہا تھا بعد میں پتا چلا کہ بریف کیس اور بلیک میلنگ کا دوسرا اسٹف غائب ہے۔ وہ خانہ بدوش لے گئے تھے۔"

میں دم بہ خود رہ گیا تھا۔ وہ بریف کیس اتنے عرصے سے غائب تھا اور میں یہ سوچ کر شہلا کے پیچھے پڑا رہا کہ بریف کیس اس کے پاس ہے۔ اس نے اور فتح خان مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی کہ بریف کیس ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اس کے بجائے وہ مجھے ایسا تاثر دیتے رہے تھے کہ بریف کیس ان کے پاس ہے۔ "تم لوگوں نے اسے خانہ بدوشوں سے واپس حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"کی تھی لیکن اتنی دیر میں خانہ بدوش غائب ہو چکے تھے۔"

"یہ غلط ہے کیونکہ اس واقعے کے کوئی ایک ہفتے بعد فتح خان نے جب مجھے اور مہرو کو اسلام آباد میں آزاد کیا تو ساتھ ہی اس نے خانہ بدوشوں کو اطلاع کر دی تھی کہ میں کہاں ہوں اس کا مطلب ہے اس کا ان سے رابطہ تھا۔"

"تم سمجھ نہیں رہے ہو، فتح خان نے خانہ بدوشوں کو اس وقت تلاش کرنے کی کوشش کی جب اسے بریف کیس کی اہمیت کا علم ہوا اور اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ قبیلہ یہاں سے غائب ہو گیا تھا۔"

اچانک میں سمجھ گیا کہ میں نے ایک دوسرے خانہ بدوش قبیلے میں مہرو کی جھلک دیکھی تھی۔ اس کی یہاں آمد کا مقصد کیا تھا۔ وہ اصل میں اپنے قبیلے کی تلاش میں تھی۔ میں نے پوچھا۔ "مہرو کو اسی مقصد کے لیے یہاں لایا گیا تھا؟"

"ہاں۔" وہ کسی قدر بے چینی سے بولی۔ "شہباز جو پوچھنا ہے جلد پوچھ لو اور اپنا وعدہ پورا کرو۔"

"لیکن تم نے مجھے بریف کیس کا پتا تو نہیں بتایا ہے۔ جب اس خانہ بدوش قبیلے کو تم لوگ تلاش نہیں کر سکے تو میں کیسے تلاش کروں گا؟"

"سنو مجھے ان کے بارے میں پتا چل گیا تھا اور میں نے فتح خان کو نہیں بتایا۔ وہ وادی نیلم سے آگے کہیں پہاڑوں میں ہے۔"

"لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"مجھے مہرو نے اطلاع دی ہے وہ اس قبیلے کے پیچھے ہے۔"

"اس نے اپنے شوہر کرنل کو کیوں نہیں بتایا؟"

"کیونکہ وہ اس سے نفرت کرنے لگی ہے۔ کرنل دھوکے باز شخص ہے اس نے مہرو کو بھی مسلمان ہونے کا دھوکا دیا تھا۔ اب وہ واپس اس کے پاس جانا نہیں چاہتی۔"

"مہرو کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتی اس کی کال آئی تھی۔" وہ سر پٹخنے لگی اور چلانے لگی۔ "اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔"

"شہلا بس ایک سوال اور ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "مرشد نے تمہیں کیوں اغوا کرایا ہے؟"

"اسے فتح خان کی تلاش ہے۔"

"تو تم اسے بتا دیتیں کہ فتح خان کہاں ہے اس حال کو تو نہ پہنچتیں۔"

"مجھے اس حرامی کا پتا ہوتا تو بتا نہ دیتی.... وہ ذلیل شخص خود مجھ سے رابطہ کرتا تھا۔" شہلا کا لہجہ ہذیانی ہو گیا۔ "تم بھی اسی کی طرح ذلیل اور اذیت پسند ہو.... مجھے مار دو۔"

اسی لمحے وسیم اندر آیا وہ بھی ساکت رہ گیا جب اس نے شہلا کو پہچانا۔ "یہ اس حال میں....؟"

"مرشد کے کتوں کا کمال ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "ان کے ساتھ کیا کیا ہے؟"

"کوئی نہیں بچا سب مارے گئے۔"

میں نے شہلا سے کہا۔ "سنا تم نے تمہارے تمام مجرم مارے گئے ہیں۔"

"مرشد زندہ ہے۔" وہ بولی۔ "شہباز اپنا وعدہ پورا کرو.... پلیز....!"

اس کے لہجے میں ایسا درد تھا کہ میں انکار نہیں کر سکا۔.... میں نے پستول نکال کر اس کی طرف سیدھا کیا وہ اکھڑے انداز میں سانس لے رہی تھی۔ نال کا رخ اس کی کنپٹی کی طرف کر کے میں نے منہ پھیر لیا۔ میں کوشش کے باوجود فائر نہیں کر پا رہا تھا اسی کشمکش میں نہ جانے کتنی دیر گزری اور پھر وسیم نے کہا۔ "شہباز صاحب اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو شہلا کی سانس رک چکی تھی۔ وہ مر گئی تھی۔ اسی لمحے فضا میں پولیس سائرن کی آواز گونجی۔

جاری ہے

بیت بازی

(فہیم گریز خان کوٹ ادو کا جواب)

ناہید خان ..... اسلام آباد

زرم دھاگے کو مسلتا ہے کوئی چٹکی میں
سخت ہو جائے تو موتی میں پرویا جائے

جاوید بٹ، فیصل آباد

نہ دو کسی کو اپنی زندگی کا اتنا حق ساگر
کہ کچھ نہ رہے باقی اس کے روٹھ جانے سے

(حسین جاوید، اسلام آباد کا جواب)

نذر احمد، لاہور

ہم پس پشت دیا کرتے ہیں جن کو گالی
"ان کی صورت نظر آئے تو غزل کہتے ہیں۔"

(نعمان اسعد، لاڑکانہ کا جواب)

مقبول خالد......... لاڑکانہ

دلوں کو اپنی جانب کھینچتا ہوں
کسی گھائل پرندے کی صدا ہوں

محمد واحد .... پشاور

دن کا دیدار بھی فردوس نظر تھا لیکن
رات چمکی تو عجب نقش نمودار ہوئے

طاہر خان ... کراچی

دیکھا تو ہر تبسم لب والہانہ تھا
تھا تو ایک حیلۂ صنعت گرانہ تھا

فتح علی .... میانوالی

ان کے سینوں میں بھی جھانک کے دیکھو محسن
کتنے افسردہ ہیں اوروں کو ہنسانے والے

جنید افسر ...... حسن ابدال

محبت، عداوت، وفا، بے رخی
کرائے کے گھر تھے بدلتے رہے

(نصرت جاوید، چنیوٹ کا جواب)

محمد افسر الدین ......پشاور

یہ جو ہم کبھی کبھی سوچتے ہیں رات کو
رات کیا سمجھ سکے ان معاملات کو

امتیاز ملک......... سبی

یہ کیسی دھوپ نفرت کی پڑی ہے
محبت بھاپ بن کر اڑ گئی ہے

(نوشین صاد، کراچی کا جواب)

فتح علی خان ... چکوال

زندگی ایک ہجوم گزراں ہے لیکن
آدمی اپنی جگہ عالم صد تنہائی

(محبوب علی خان، فیصل آباد کا جواب)

عزیز احمد.........لاہور

وطن کے بارے میں سوچا کسی نے بھی نہیں راہی
نمک کھاتے رہے ہیں لیڈران قوم گوروں کا

تمکین زیدی ...... ملتان

وہ اور چیز ہے ہوتے ہیں جس سے دل شاداب
تیری بہار سے ویرانی خزاں نہ گئی

کاوش اختر......... جہلم

وہ ہاتھ آنکھوں پہ رکھ لوں تو ٹھنڈ پڑ جائے
اگرچہ لاکھ رم شعلۂ حنا دیکھوں

(شہادت حسین، لڈن وہاڑی)

نسرین امتیاز.........کاموکی

ساون آیا بھادو بیتا چیت اساڑھ کی دھوپ جو دکھی
وصل کے سب گل بوٹے سوکھے لیکن یاد امر لتا ہے

(نوید احمد، کراچی کا جواب)

نجم الدین نجم .... سلطان پور

یوں تو بھول جاتا ہوں خراشیں تلخ باتوں کی
مگر جو زخم گہرے دیں رویے یاد رکھتا ہوں

عاصی اختر .... ٹھٹھہ

میرے چاہنے والے مجھ کو بھول گئے تو کیا
موسم ہو تبدیل تو پتے جھڑنے لگتے ہیں

نزہت زاہد .... ٹوبہ ٹیک سنگھ

مجھے اکثر ستاروں سے یہی آواز آتی ہے
کسی کے ہجر میں نیندیں گنوا کر کچھ نہیں ملتا

نذر الاسلام.........حیدر آباد

میں ترے دست سخاوت کو بھلا کیا کرتا
میرے آگے تو کبھی میری ہتھیلی نہ ہوئی

اشرف ممتاز ... کراچی

موت سے خوف زدہ جینے سے بے زار ہیں لوگ
اس المیے پہ ہنسا جائے کہ رویا جائے

عمر فیصل ...... کریم نگر (جی بی)
ماتھے جھکے ہزار خداؤں کے سامنے
تجھ دعا اور کوئی نشانی نہ پاسکے

سلطانہ فیض........ کراچی
منزل ہے نہ چارہ ہے نہ سایہ ہے نہ پانی
تنہائی کا احساس فقط راہ نما ہے
(شیخ محسن لاڑکانہ کا جواب)

سلیم کاریڈ...... کھاناں
نامکمل ہیں ابھی مظلوم کی رسوائیاں
پھر ذرا ترتیب دیجئے قلم کی روداد کو

رقیہ قیصر........ سرگودھا
نام خدا لے کر اٹھ جاتے ہیں جو لوگ
منزل کے پاس وہ نہیں منزل ان کے پاس آتی ہے
(سعید احمد چاند، کراچی کا جواب)

اقبال طاہر........ ڈی آئی خان
ان دیوں کو بجھانہ دے یہ ہوا
اک دریچے میں جو جلے ہیں ابھی

مظہر جبیں........ میرپور خاص
اجالوں کی کمندیں پھینکتا ہوں
اندھیری رات میں تنہا دیا ہوں

نوشادا سلم........ بہاولپور
آتا نہیں یقین مگر ہے واقعہ
شیشے کے گھر سے آئے ہیں پتھر کبھی کبھی

شائستہ زیب........ حاصل پور
اتنی جلدی تو بدلتے نہیں ہوں گے چہرے
گرد آلود ہے آئینے کو دھویا جائے

راجا ناصر........ اٹک سٹی
آگ کے شہر میں تنکے کی حقیقت کیا تھی
دشت پہ پھول کے سایہ تو محبت کیا تھی

مدثر افتخار ...... شکیاری مانسہرہ
آنکھوں کی یہ شمعیں اسی چوکھٹ پہ رہیں گی
تم جاؤ پردیس تو یہ دھیان میں رکھنا

نعیم بھٹی ...... راولپنڈی
اس لیے بھی تیری تصویر جلادی میں نے
اور کچھ تھا ہی نہیں دل کو جلانے کے لیے
(حبیب الرحمٰن، گوجرہ کا جواب)

ارشاد حسن ...... لاہور
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں
(سندس رفیق کراچی کا جواب)

تنویر رفیق...... کراچی
اپنی آبرو رکھنا بڑا نازک زمانہ ہے
دلوں میں بغض رکھتے ہیں بہ ظاہر دوستانہ ہے
(مرزا فرحان بیگ، حیدرآباد کا جواب)

نسرین اختر...... کراچی
یہ کار بے ثمر ہے اگر کرلیا تو کیا
ان دائرے میں ہم نے سفر کرلیا تو کیا

مریم........ خوشاب
یہ بات نہیں معلوم تجھے
وہ کون سوچوں میں ڈوبی ہے
(سعید قاسمی، ڈالوال کا جواب)

نوشین عارف........ چیچہ وطنی
اے جمال ان پہ بھی نظر رکھیے
سامنے وہ جو مرحلے ہیں ابھی

سخاوت کریم........ لاہور
اے ستم پرور اے میرے حاکم شہر ستم
خاک تربت ہی بھرے گی ایک دن معدہ ترا

احتشام حسین...... ملتان
اے دوست عرض حال کسی نے سنا کہاں
پوچھے مگر کوئی تو اب مدعا کہاں

مشکور حسین ...... چنیوٹ
اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب سے

زاہد وجدانی........ لاہور
آنسوؤں کی جھڑی ہے آنکھوں میں
ہم نے پایا نصیب بادل کا

☆☆☆

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کردیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش۔ 84

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا علمی و ادبی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کرکے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک علمی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کرکے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اکتوبر 2012ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

آفریدی النسل تھے۔ ایسٹ انڈین ریلوے میں ٹی ٹی آئی کی نوکری کی۔ 1932ء میں آل انڈیا ریڈیو اور 1942ء میں پنچولی اسٹوڈیو میں نوکری کی۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی آ گئے۔ 1952ء سے 1963ء تک ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے۔ نغمہ نور، کیف و سرور، چراغ طور، کفر و ایمان، بتکدہ، وجد و حال، نغمہ روح، کرم بالائے کرم، ثنائے حبیب اور حکیم بڈھن مشہور تصنیف۔ کراچی ہی میں انتقال کیا۔

علمی آزمائش 82 کا جواب

راجندر سنگھ بیدی کا جنم پہلی ستمبر 1915ء کی صبح 3 بج کر 47 منٹ پر لاہور میں ہوا۔ وہ لکھتے ہیں میرے باپ کی تمنا تھی کہ میرا بیٹا بڑا ہو کر کلکٹر بنے۔ میرے باپ کی بھی یہی تمنا تھی۔ ایسا انہیں کہاں معلوم تھا کہ ایک زمانہ وہ بھی آئے گا جب کلکٹر بھی میرے ادب میں کھڑے ہو جائیں گے۔ میری ماں برہمن تھی اور باپ چھتری۔ اسکول جانے کی عمر تک شرلاک ہومز کے کارنامے پڑھ ڈالے۔ میرے چچا نے ایک اسٹیم پریس خرید اجو جہیز میں پانچ چھ ہزار کتابیں لائی۔ پرائمری سے مڈل تک پہنچتے پہنچتے وہ میں نے ہضم کر لیں۔ اردو میں خوب شاعری کی، کہانیاں لکھیں اور قلم گری میں بھی وقت گزارا مگر وہی 12 بجے والی بات کہ 12 بجتے ہی سردار جی عقل کو جیب میں رکھ لیتے ہیں، میں بھی سب بھول بھال بیٹھا اور وہی قلم گھسیٹتا رہا۔

انعام یافتگان

1۔ ناصر حسین، فیصل آباد 2۔ شیریں بانو، کوئٹہ 3۔ نصرت جاوید، پشاور

4۔ نوید احمد، کراچی 5۔ سلطان فتح عالم، حب (بلوچستان)

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے نور احمد، عارفہ سلطان، مہوش اختر، فہیم احمد فہیم، نصرت فاروقی، جاوید علی، خلش مظفر، نگار ہمدانی، کہکشاں تسنیم، علی احمد، نجم الدین سید، ناصر محفوظ، وجیہہ الحسن، ماسٹر فیض الاسلام، بختاور شاہ، ابرار احمد، منور علی، نواز علی شاہ، سرفراز گوندل، نعیم الحسن، محمد سرفراز، احمد شیخ، عنایت مسیح، کاوش اختر، علی احمد، کلیم اللہ نعیمی، فخر الدین صدیقی، رجب علی بیگ، افتخار حسن، رجب علی مرزا، تنویر حسین زیدی۔ لاہور سے ناصر حسین، نازش خان، عفان صدیقی، تابش عطاری، نصیر بٹ، منیر، سید ممتاز احمد، مروج اختر، زبیر اسلم، ارشاد علی، نعمان بٹ، حمیرا خاتون، ہما جبیں، ابرار حیدر، احمد علی مشرقی، ملک جاوید، نازش خان، ابرار احمد، انعام الحق، نثار اختر، نعمان اشرف، نیاز احمد ملک۔ راولپنڈی سے تنویر الحسن، سید محمد تقی، بخت خان، زاہد عباسی، نسرین اشرف، نرجس علی، نعیم الاسلام خان، زویا بخاری، کائنات بانو، زبیر شاہ، پروین حیدر۔ اسلام آباد سے ثمین جاوید، محمد شہزاد، شہناز فیض، ردا ممتاز، سعید اختر، نصرت حیات، انور یوسف زئی، بشریٰ فاروقی، شاہین اشفاق، محمد متین، خضر حیات عباسی، انور یوسف زئی۔ ملتان سے مناف سید، جمیل ملک، فہیم اللہ فاروقی، توفیق سلطان، زبیر شاہ، نیاز احمد ملتانی، بیگم احمد دین، محمد یونس، عزادار حسین، مہوش زرولی خان، فضل الحق، بہادر خان، کوکب جہاں، خالد ڈار، جنید ارشد، اشرف علی شیروانی، نگار سلطانہ، ابریز بشیر۔ جہلم سے صدر الدین، سرفراز حسین زیدی، نذر کلیم ممتاز، شنا ور ترمذی، عثمان علی شاہ، ملک شفاعت، کمال احسن کمال، ارباز خان اچکزئی، اقبال حسن سید۔ چکوال سے عنایت علی سید، ناصر غنی، امتیاز احسن، نوشابہ صفدر ملک، اقبال حمیدی۔ کوئٹہ سے ممتاز احسن ملک، تقی چنگیزی، محمد احسان، راؤ رشید، ضمیرا اچکزئی، نگار بٹ، نصرت چنگیزی، خاقان اعوان، صالح بشیر، قتیل سید پوری، فیض اللہ خان، ارباز خان۔ سرگودھا سے حیات خان، خلیق الحق، عظمیٰ اکمل ٹوانہ، خضرت حیات، نادر شاہ۔ شجاع آباد سے زوار حسین زیدی، سید عباس علی، ارباز خان۔ حیدرآباد سے نواز عثمان آبادی، تہمینہ سلطان، عبدالقیوم، حسن خان، انوار علی زبیری، نظیر علی بھٹو، ممتاز خان، نصیر بھٹو، رام لال، چوکھا مل امرانی۔ ساہیوال سے ممتاز فخر، فدا حسین، امجد سروش، نوازش حسن۔ حاصل پور سے خالد بن ماجد، مہوش ملک۔ ڈی جی خان سے فرحت اللہ شیراز، گل شیر مٹھو۔ بہاولپور سے شمیم وٹو، نازش کریم، آمنہ ملک۔ میرپور خاص سے نواز علی نوازش، ابرار صدیقی، دھیر دل، ضوریز اختر۔ شادی خان سے عرفینہ اقبال خان۔ جہانیاں سے زبیر خان، خضر حیات، انیق احمد صالح، وزیر حسن، خوش خان۔ کوٹ ادو سے نعمت اللہ، اطہر حسین سید۔ رانی پور حسن ابدال سے سید محمد رضا، کرم الٰہی، نعمت خان۔ چونالہ سے ملک شاہ، ثنا احمد، ناہید فتح۔ پاک پتن سے سدرہ شفیق۔ جھنگ سے زدیار رفیق، امتیاز حسن، ملک سرفراز، مجیب گل، احباب زیدی، ناصر افروز، نیاز حسن۔ سکھر سے نعمان شیخ، کامل حسن۔ پشاور سے نوید نعیم، محمود اچکزئی، دردانہ شاہ، نسیم نیازی، جویریہ بشیر نواز، اطہر نواز، نسیم فردوس، ضیاء الحق، ندیم نیازی، جمال شاہ، شمیم فاروقی۔ اوکاڑہ سے ملک حیدر، راجا احسن، اظہر الدین، سعید احسن محمود۔ سیالکوٹ سے ام حبیبہ، ناصر خان، جاوید محمود ملک، فیض الحسن، نرجس زیدی، نوید شہزاد خواجہ، محمد مستقیم، احمد رضا، مہ جبیں فلک، اسلام الدین۔ اٹک سے زبیر اللہ، خان عرفان، رانا حبیب۔ حافظ آباد سے خالد جاوید، اسلم شیخ، منیر فیاض، نگار سلطان۔ نواب شاہ، عزیز حسن، نوید اسلم، ارحم شاہ، فلک ناز۔ شہر سلطان سے نوید انصاری۔ میرپور آزاد کشمیر سے کاشف حسین۔ بھکر سے غازی شاہ، نعمان نیازی، کاشف عباسی۔ ٹنڈو آدم سے فاطمہ عباسی۔ گولارچی سے خالد خان۔ نارووال سے شیبہ الحسن۔ تربیلا ڈیم سے ملک احمد ریاض۔ کمالیہ سے ناصر ملک۔ لیہ سے راجا ابرار۔ ایبٹ آباد سے میاں احسن۔ مردان سے تاثیر خان۔

ممالک غیر سے۔ نصیر خان ناصری (جدہ) ملک تنویر تنولی (کینیڈا) زاہد فاروق (ٹورنٹو) احسن فاروقی (العین یو اے ای) محمد طفیل نیازی (سلطنت اومان) ارباب زیدی، نسیم صدیقی (جرمنی)

***

جناب معراج رسول
السلام علیکم
میں عرصہ دراز سے سرگزشت کا مطالعہ کررہا ہوں۔ آج تک کئی ہزار آپ بیتیاں جگ بیتیاں پڑھ چکا ہوں۔ خود میری آپ بیتی بھی ان آپ بیتیوں سے کم دلچسپ نہیں۔ شاید آپ کو بھی پسند آجائے اور سرگزشت کا حصہ بن جائے اسی امید پر یہ آپ بیتی بھیج رہا ہوں۔

الف شین
(اسلام اباد)

مجھے تنہائی سے بہت ڈر لگتا ہے۔ شاید اس لیے کہ میں نے بچپن سے ہی ہنگامہ پرور زندگی گزاری، ہمیشہ اپنے ساتھ لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ مجھے اپنے بچپن کا زمانہ اچھی طرح یاد ہے۔ ہم ایک بڑی سی کوٹھی میں رہا کرتے تھے جو ابا نے کلیم میں حاصل کی تھی۔ ابا جان پاکستان بننے کے فوراً بعد یہاں آئے تھے۔ پہلے انہوں نے برنس روڈ پر ایک کرائے کا فلیٹ لیا اور جو جمع پونجی ساتھ لائے تھے۔ اس سے گوردھن داس مارکیٹ میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی دکان کھول لی۔ شروع میں تو اس دکان سے اتنی زیادہ آمدنی نہیں تھی لیکن اتنا ہو جاتا کہ دال روٹی چل جاتی۔ آہستہ آہستہ دکان کی آمدنی بڑھتی گئی اور تین ماہ بعد ہی ابا جان نے ہم لوگوں کو بھی اپنے پاس بلالیا۔ اس وقت ہمارا گھرانہ کل پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ یعنی میں، مجھ سے بڑی بہن صفیہ، دو چھوٹے بھائی اور امی۔ اس وقت میری عمر چھ سال تھی۔ ابا نے میرا داخلہ پاکستان چوک پر واقع ایک سرکاری اسکول میں کروا دیا۔ دونوں چھوٹے بہن بھائی بھی میرے ساتھ اسی اسکول میں جاتے تھے۔ البتہ صفیہ آپا کا اسکول ذرا دور تھا۔ ابا انہیں صبح دکان جاتے وقت اسکول چھوڑتے ہوئے جاتے اور دوپہر میں امی انہیں لے کر آتیں لیکن چند دنوں بعد جب صفیہ آپا یہاں کے راستوں اور ماحول سے واقف ہو گئیں تو خود ہی اپنی سہیلیوں کے ساتھ آنے لگیں۔

کچھ ہی عرصہ بعد زندگی معمول پر آگئی لیکن ابا کو اپنے بہن بھائیوں کی بڑی فکر تھی۔ ہندوستان میں ہمارے دادا کا بہت بڑا مکان تھا۔ جہاں وہ سب ساتھ رہا کرتے تھے۔ ابا کے سب بہن بھائی شادی شدہ اور اپنی اپنی زندگیوں میں مگن تھے لیکن ابا کو بڑا بھائی ہونے کے ناتے ان کا غم کھائے جا رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں بھی سب ساتھ ہی رہیں لیکن دو کمروں کے فلیٹ میں اس کی گنجائش نہ تھی۔ بلڈنگ کے مالک نواب میاں سے ابا جان کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی اور وہ دونوں رات کے کھانے کے بعد کچھ دیر بیٹھ کر حالات حاضرہ پر گفتگو کیا کرتے۔ جب ابا جان نے ان کے سامنے مسئلہ بیان کیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ ہندوؤں کی کئی کوٹھیاں خالی پڑی ہیں۔ کسی ایک پر قبضہ کر کے اسے اپنے نام الاٹ کروالو۔ ابا جان کو یہ مشورہ پسند آیا اور تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد وہ گرومندر کے علاقے میں ایک کوٹھی پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد کلیم داخل کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہندوستان میں ہمارے دادا کا بہت بڑا مکان تھا جس میں اس وقت تک چچاؤں اور پھوپھیوں کی رہائش تھی۔ ابا نے اسی مکان کے عوض کلیم داخل کردیا اور جب وہ کلیم منظور ہوا تو ابا جان نے اسی مکان کے عوض یہ کوٹھی اپنے نام کروالی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک ایک کر کے اپنے سب بہن بھائیوں کو پاکستان بلالیا اور دیکھتے ہی دیکھتے چند مہینوں میں یہ کوٹھی پوری طرح آباد ہو گئی۔

شروع شروع میں تو سب لوگ بڑے پیار محبت سے رہتے رہے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ رویوں میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ سب سے پہلے بڑے پھوپا نے علم بغاوت بلند کیا۔ وہ جب تک بے روزگار تھے۔ بڑے مزے سے ہمارے ساتھ رہتے رہے لیکن جیسے ہی انہیں ملازمت مل گئی۔ انہوں نے اپنے گھر میں شفٹ ہونے کا اعلان کردیا۔ ابا نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں مانے۔ بڑی پھوپی بھی ان کی ہم نوا تھیں اور شوہر سے زیادہ انہیں اپنے گھر میں شفٹ ہونے کی جلدی تھی۔ شاید ہر عورت کی طرح وہ بھی اپنا گھر سجانے اور سنوارنے کی آرزومند تھیں۔ چنانچہ امی اور ابا کے بے حد اصرار کے باوجود وہ اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ سرکاری مکان میں شفٹ ہو گئیں۔

ان کے جانے کے چند ماہ بعد چھوٹے پھوپا کی غیرت بھی جاگ اٹھی۔ جیسے ہی ان کے حالات کچھ بہتر ہوئے انہیں سسرال میں رہنا ناگوار گزرنے لگا۔ انہوں نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن اشاروں کنایوں سے ضرور ظاہر کردیا کہ انہیں پرائیویسی درکار ہے جو اس کوٹھی میں میسر نہیں آسکتی تھی۔ اس مرتبہ ابا نے روکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ ان کے جانے کے بعد بھی کوٹھی کی رونق میں کوئی کمی نہیں آئی۔ نسیم چچا کے چار اور قسیم چچا کے دو بچے تھے، دن بھر کوٹھی میں اودھم برپا رہتا۔ ہم سب مل کر خوب ہنگامہ کرتے۔ لڑنا جھگڑنا، کھیلنا، شرارتیں کرنا اور ڈھیر ساری باتیں کرنا بھی ہمارے مشاغل تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ جیسے جیسے بچے بڑے ہوتے گئے۔ یہ کوٹھی بھی چھوٹی پڑنے لگی۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے دونوں چچاؤں نے یکے بعد دیگرے اپنی ذاتی رہائش کا بندوبست کیا اور بڑے غیر محسوس طریقے سے الگ ہو گئے۔ اب اس کوٹھی میں صرف ہماری فیملی کے چھ افراد رہ گئے تھے۔ نسیم چچا اور قسیم چچا کے جانے کے بعد ہمیں تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ جس گھر میں ہر طرف لوگ ہی لوگ نظر آتے، وہاں اب سناٹے کا راج ہو گیا۔ ابا جان کاروباری مصروفیات کے سبب دیر سے گھر آتے، صفیہ باجی کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ وہ دن بھر امی کے ساتھ گھر کے کاموں میں لگی رہتیں۔ ہم تینوں بھائی اپنی مصروفیات میں گم تھے۔ پڑھائی، کھیل، دوستوں کے ساتھ گھومنا پھرنا، ہم سب رات کے کھانے پر ہی اکٹھے ہوتے یا صبح ناشتے کی میز پر ملاقات ہوتی۔

مجھے یہ تنہائی بہت بری لگتی تھی۔ کالج سے واپس آنے کے بعد پاگلوں کی طرح پوری کوٹھی میں پھرتا رہتا پھر شام کو دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے چلا جاتا اور رات کو کھانے
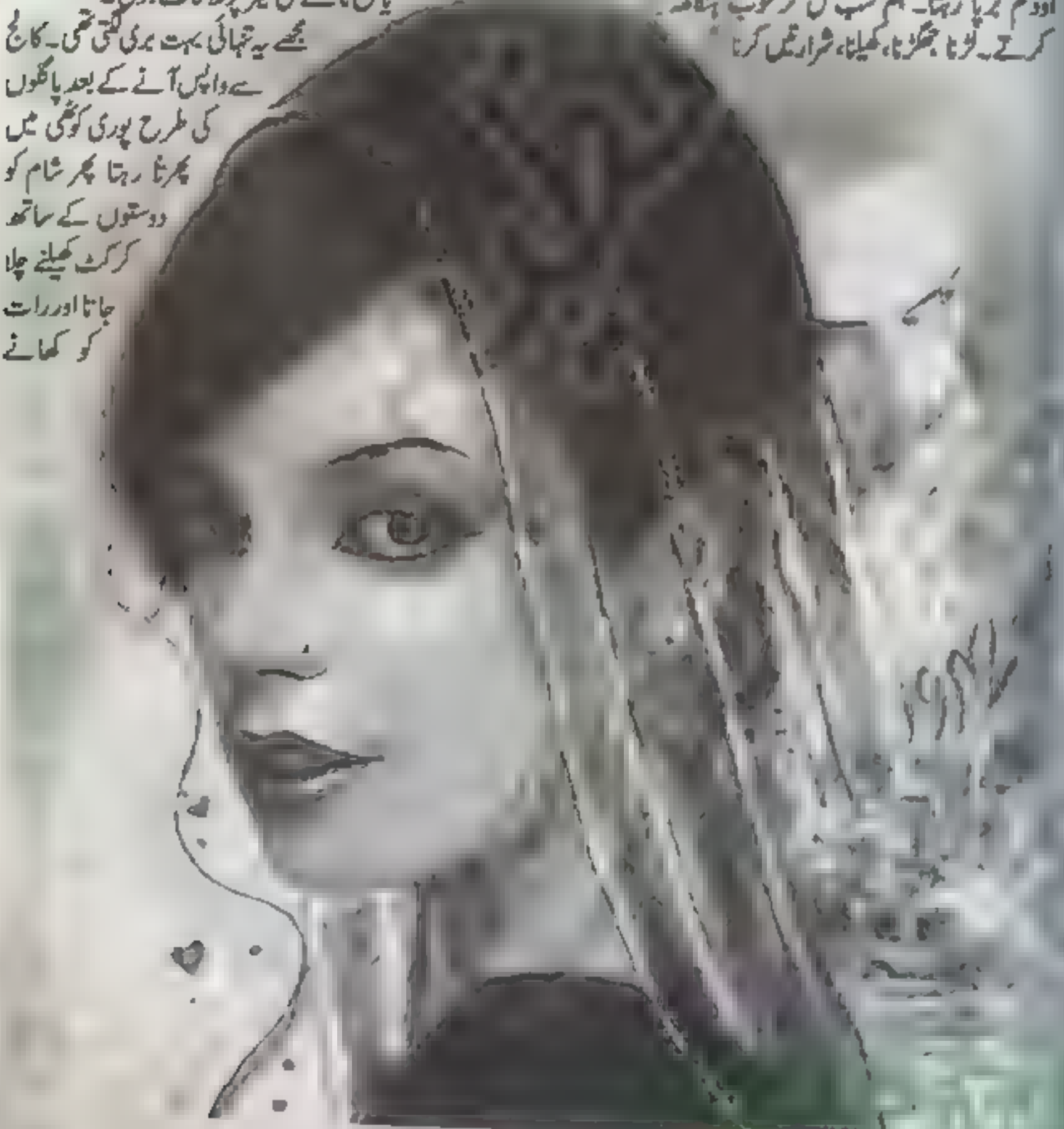
کے بعد پڑھنے بیٹھ جاتا۔ مجھے شدت سے چھٹی والے دن کا انتظار رہتا کیونکہ ابا نے اپنے بہن بھائیوں کو اس پر راضی کر لیا تھا کہ وہ چھٹی کا دن ہمارے یہاں گزاریں گے۔ چنانچہ کئی برس تک یہ معمول رہا کہ چھٹی والے دن دونوں چچاؤں اور دونوں پھوپھیوں کی فیملیز ہمارے گھر اکٹھی ہو جاتیں اور پھر سب مل کر خوب انجوائے کرتے۔ کیرم، لوڈو، مووی، گپ شپ، غرض دن بھر بہی ہلا گلا رہتا۔ رات کے کھانے کے بعد جب سب لوگ اپنے اپنے گھروں کا رخ کرتے تو میں ایک بار پھر اداس ہو جاتا۔

انہی دنوں صفیہ آپا کی شادی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے تو کبھی اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ ایک دن صفیہ آپا بھی چلی جائیں گی اور ہمارے گھر میں ایک فرد کی اور کمی ہو جائے گی۔ سب لوگ شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے اور میری وحشت بڑھتی جا رہی تھی، میں ہر وقت یہی سوچتا رہتا کہ کاش صفیہ آپا اس گھر سے نہ جائیں۔ کوئی ایسی سبیل بن جائے کہ وہ اپنے دولہا کے ساتھ ہمارے گھر میں ہی رہیں۔ جب میں نے یہی بات امی سے کہی تو وہ میرے سر پر چپت مارتے ہوئے بولیں۔

"پگلے، کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ لڑکی شادی کے بعد میکے میں رہے۔ اسے اپنے گھر جانا ہی ہوتا ہے۔ صدیوں سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ دنیا کے ہر خطے، ہر مذہب اور ہر معاشرے میں یہی رواج ہے کہ لڑکی بیاہ کر اپنے دولہا کے گھر جاتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے امی لیکن صفیہ آپا کے جانے کے بعد ہمارا گھر کتنا سُونا سُونا ہو جائے گا۔ ان کی کمی کس طرح پوری ہو گی؟"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔" امی میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ "یہ سُونا پن عارضی ہے۔ تم تینوں بھائی اپنی تعلیم مکمل کر لو تو تمہاری شادیاں ہو جائیں گی، اس گھر میں تین بہوئیں آ جائیں گی اور اس کے بعد ڈھیر سارے بچے۔ خوب رونق رہے گی۔"

امی کی بات سن کر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ مجھے بچہ سمجھ کر بہلا رہی تھیں حالانکہ اتنی عقل تو مجھ میں بھی تھی کہ ابھی میری تعلیم مکمل ہونے میں کافی وقت باقی ہے۔ اس کے بعد ملازمت کی تلاش پھر سیٹ ہونے میں بھی کچھ مدت درکار ہو گی۔ اس حساب سے میری شادی کم از کم سات آٹھ سال بعد ہی ہوتی۔ تب تک ہم پانچ افراد ہی ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ کر وقت گزارتے۔

صفیہ آپا کی شادی ہو گئی اور وہ اپنے ساتھ گھر کی ساری رونقیں بھی لے گئیں۔ کالج سے آنے کے بعد میں دیوانوں کی طرح پورے گھر میں ٹہلتا رہتا۔ دونوں چھوٹے بھائی اپنی اپنی دلچسپیوں میں مگن تھے۔ ویسے بھی ہماری عمروں کے درمیان کافی فرق تھا۔ میں امجد سے چار سال بڑا تھا جبکہ ارشد اس سے دو سال چھوٹا تھا۔ وہ دونوں آپس میں کافی کلوز تھے جبکہ میں بڑا ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ گھلنے ملنے سے قاصر تھا۔ اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے میں نے دوستوں کا سہارا لیا۔ کمبائنڈ اسٹڈی کے بہانے اپنے دوستوں کو گھر پر بلانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے باقاعدگی سے جم جانا بھی شروع کر دیا۔ امی کو میری تنہائی کا احساس تھا۔ انہوں نے ہی مجھے مشورہ دیا کہ کبھی کبھی اپنے چچاؤں اور پھوپھیوں کے یہاں بھی جاتا رہوں۔ میں نے ان کے اس مشورے پر بھی عمل کرنا شروع کر دیا اور ہفتے میں ایک دو مرتبہ ان میں سے کسی ایک کے یہاں چلا جاتا۔ اس طرح میرا وقت اچھا گزرنے لگا اور تنہائی کا احساس بھی کسی قدر کم ہو گیا۔

انہی دنوں میں نے محسوس کیا کہ شمیم چچا کی بیٹی عالیہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو رہی ہے۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ دوسرے گھروں کی نسبت اس گھر میں میری آمد و رفت زیادہ تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عالیہ اور اس کا بھائی نعیم تقریباً میرے ہم عمر تھے۔ عالیہ مجھ سے چھ مہینے اور نعیم دو سال چھوٹا تھا۔ اس لیے میرا وہاں دل لگتا تھا جبکہ نسیم چچا اور دونوں پھوپھیوں کی اولادیں مجھ سے بہت چھوٹی تھیں۔ عالیہ ان دنوں انٹر کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ میں جب بھی اس کے گھر جاتا وہ مجھے گھیر کر بیٹھ جاتی۔ اسے بولنے کا مرض تھا۔ نالج بھی اچھی تھی۔ خصوصاً کرکٹ کے کھلاڑیوں اور شوبزنس کے اسٹارز کے بارے میں اس کی معلومات بڑی اپ ٹو ڈیٹ تھیں۔ ہم گھنٹوں مختلف موضوعات پر باتیں کرتے۔ میں جب بھی اٹھنے کی کوشش کرتا وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیتی اور کہتی۔ "ارے بیٹھو، اتنی جلدی کیا ہے۔ ابھی تو مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنا ہیں۔"

اس کے پاس باتوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا ذخیرہ تھا جبکہ مجھے زیادہ بولنے کی عادت نہیں تھی۔ میں اس کی باتوں کے جواب میں ہوں ہاں کرتا رہتا۔ وہ دس جملے بولتی تو میری زبان سے بمشکل آدھا جملہ ادا ہوتا۔ اس پر وہ بگڑ جاتی اور کہتی۔

"تم کس مٹی کے بنے ہوئے ہو۔ میں اتنی دیر سے بک بک کیے جا رہی ہوں اور تم میری کسی بات کا جواب نہیں دے رہے۔"

وہ اسی طرح کی باتیں کیا کرتی تھی۔ بے ربط اور معصومانہ جن کا کوئی سر پیر نہ ہوتا۔ میں ایک اچھے سامع کی طرح اس کی ہر بات سنتا اور کبھی کبھی ایک آدھ جملہ بول کر اس کی تائید بھی کر دیتا۔ اسے خوش رکھنا بھی ضروری تھا ورنہ اختلاف کرنے کی صورت میں وہ ناراض ہو جاتی اور بحث و تکرار پر اتر آتی جبکہ میں اس کا عادی نہیں تھا اور نہ ہی اسے ناراض کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کے پاس بیٹھ کر، اس سے باتیں کر کے میری تنہائی دور ہو جاتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس کے پاس بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ وہ جب بولتی تو اس کی آنکھوں میں چمک آ جاتی اور ہونٹ مسکرانے لگتے۔ مجھے اس کا یہ انداز اچھا لگتا تھا۔ کبھی کبھار وہ مجھ سے پڑھائی میں بھی مدد لے لیا کرتی تھی۔ اس کی انگریزی کمزور تھی جبکہ میں انگلش میڈیم میں پڑھنے کی وجہ سے اس مضمون میں کافی ہوشیار تھا۔ وہ نثر کی نسبت نظم میں زیادہ دلچسپی لیتی تھی اور جب میں کسی رومانی نظم کی تشریح کر رہا ہوتا تو اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک ابھرنے لگتی۔ پہلے پہل تو میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن آہستہ آہستہ مجھے اس کے رویے میں ایک خاص تبدیلی محسوس ہونے لگی۔ یوں لگا جیسے وہ باتیں کرتے کرتے اچانک ہی چپ ہو جاتی ہے جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہو۔ کبھی آپ ہی آپ مسکرانے لگتی۔ پہلے وہ مجھ سے بڑے نارمل انداز میں ملا کرتی تھی لیکن اب اس کی نظروں کا زاویہ ہی بدل گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر گلاب کھل اٹھتے، روشن آنکھوں کی چمک اور بڑھ جاتی اور لبوں پر دلکش مسکراہٹ بکھر جاتی۔ یوں لگتا تھا کہ اسے میری آمد کا شدت سے انتظار ہو۔ جب میں واپسی کا ارادہ کرتا تو وہ مختلف حیلے بہانوں سے مجھے روکنے کی کوشش کرتی۔

عالیہ نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن اس کی آنکھیں بہت کچھ بتا رہی تھیں۔ ان میں ایک واضح پیغام تھا جسے میں بآسانی سمجھ سکتا تھا۔ میرے لیے یہ بہت کٹھن صورت حال تھی۔ وہ جو کچھ چاہتی تھی، اس کا جواب دینا فی الوقت میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ ابھی میری پڑھائی چل رہی تھی اور اگر میں عشق کا روگ لگا لیتا تو اس سے میری تعلیم متاثر ہو سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ میری چچازاد تھی۔ میرا حد سے زیادہ آنا جانا اور وہاں دیر تک بیٹھے رہنا، شکوک و شبہات کو جنم دے سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کا حل یہ نکالا کہ پڑھائی کا بہانہ بنا کر شمیم چچا کے یہاں اپنی آمد و رفت محدود کر دی۔ عالیہ کو یہ حرکت پسند نہیں آئی اور ایک دن اس نے مجھے آڑے ہاتھوں لے ہی لیا۔

"تمہیں اپنی پڑھائی کی بہت فکر ہے اور میرا کچھ خیال نہیں۔ اگر انگریزی میں اچھے نمبر نہیں آئے تو میرا گریڈ خراب ہو جائے گا۔"

"تم پڑھنے سے زیادہ باتوں میں دلچسپی لیتی ہو ورنہ اب تک تمہاری تیاری مکمل ہو چکی ہوتی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔ جب تک میرے امتحان نہیں ہو جاتے، تم مجھے روزانہ پڑھانے آؤ گے۔"

"روزانہ تو نہیں البتہ ہفتے میں ایک دو دفعہ آ سکتا ہوں۔ وہ بھی اس شرط پر کہ تم باتوں سے زیادہ پڑھائی پر توجہ دو گی۔"

"مجھے منظور ہے۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

میں نے زندگی میں کبھی کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کیا اور ہمیشہ دل کی بجائے دماغ سے سوچا ہے۔ یہ اندازہ تو مجھے ہو ہی گیا تھا کہ عالیہ مجھے پسند کرنے لگی ہے۔ اب مجھے اپنے دل کو ٹٹولنا تھا کہ میں اسے پسند کرتا ہوں یا نہیں؟ شاید میری یہ سوچ قبل از وقت تھی لیکن عالیہ جس تیزی سے میری طرف بڑھ رہی تھی، اسے دیکھتے ہوئے مجھے بھی اپنے ردعمل کے بارے میں سوچنا تھا۔ اگر میرے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی تو مناسب یہی تھا کہ میں عالیہ کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے مکمل طور پر سرد مہری اختیار کر لوں۔

میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ کیا میں بھی عالیہ کو پسند کرنے لگا ہوں۔ میرے پاس اسے ناپسند کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ خاندان کی لڑکی، خوش شکل، خوش مزاج، خوش لباس، ہنس مکھ، مہذب، سلیقہ شعار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ مجھے پسند کرنے لگی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر وہ مجھے پسند کرتی ہے تو مجھے بھی اسے ناپسند کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ کیا میں اس سے محبت کرتا ہوں تو اس بارے میں میرا فلسفہ بہت مختلف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے اور اس وقت تک میرے دل میں اس کے لیے ایسا کوئی جذبہ نہیں بیدار ہوا تھا لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرا دل اس کی جانب کھنچا چلا جا رہا ہے۔

وقت اپنے حساب سے آگے بڑھتا رہا۔ میں نے سوچ لیا کہ اگر امی نے کبھی اس موضوع پر بات کی تو میں بلا جھجک عالیہ کا نام لے دوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کبھی بھی

میری خواہش کے خلاف فیصلہ نہیں کریں گی کیونکہ ابھی تک میری اور عالیہ کی زبان پر ایک لفظ بھی ایسا نہیں آیا تھا جس سے ہمارے درمیان کسی تعلق کا اظہار ہوتا۔ ہم خاموشی کی زبان میں گفتگو کرتے۔ ہونٹ بند ہوتے لیکن آنکھیں بولتی رہتیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ہم دونوں کے درمیان جو خاموش تعلق پروان چڑھ رہا ہے، اس کی کسی کو خبر ہی نہیں لیکن یہی میری بے خبری تھی۔ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ زبان سے تو کسی نے کچھ نہیں کہا لیکن دبی دبی سرگوشیاں میرے کانوں تک ضرور پہنچ گئیں جن کے مطابق پورے خاندان کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ عالیہ اور میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔

صفیہ آپا کی شادی میں عالیہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کی وجہ سے امی کا بہت سا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ وہ اس کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی تھیں پھر نہ جانے کب اور کیسے انہوں نے اسے اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ مجھ سے پوچھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ میں نے بھی دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہنا پڑا۔ ان کا بس چلتا تو وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے بہو بنا کر اپنے گھر لے آتیں لیکن مجبور تھیں۔ انہیں اس وقت تک انتظار کرنا تھا جب تک میں تعلیم مکمل کرکے اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو جاتا۔

میں نے ماسٹرز کرنے کے بعد سی ایس ایس کی تیاری شروع کردی۔ انہی دنوں امی کے کانوں میں کہیں سے بھنک پڑ گئی کہ عالیہ کے لیے ایک دو رشتے آئے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں لیکن امی کچھ زیادہ ہی گھبرا گئیں اور اس سے پہلے کہ چچا اور چچی، عالیہ کے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے، وہ میرا رشتہ لے کر پہنچ گئیں۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ چچا اور چچی کے لیے مجھ سے بہتر اور کون ہوسکتا تھا، ویسے بھی انہیں اپنی بیٹی کی پسند کے بارے میں کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اس لیے انہوں نے بخوشی یہ رشتہ قبول کرلیا اور ہم دونوں کی منگنی کردی گئی۔ عالیہ کا میڈیکل میں داخلہ نہیں ہوسکا تھا چنانچہ اس نے وقت گزاری کے لیے یونیورسٹی جوائن کرلی تھی۔

میں نے مقابلے کا امتحان پاس کرلیا اور میری پوسٹنگ ایک سرکاری محکمے میں ہوگئی۔ میری نوکری کو چھ مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ امی کو میری شادی کی دھن سوار ہوگئی جبکہ مجھے مالی طور پر مستحکم ہونے کے لیے کچھ وقت درکار تھا لیکن میری ایک نہ سنی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے شادی کی تاریخ بھی طے پا گئی۔ عالیہ کی آمد ہمارے لیے بہار کا جھونکا ثابت ہوئی۔ جس گھر میں تنہائی اور اداسی نے ڈیرا ڈال رکھا تھا وہاں قہقہے گونجنے لگے۔ عالیہ میں ویسے تو بہت سی خوبیاں تھیں لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ زندگی کو ہر رنگ میں انجوائے کرنا جانتی تھی۔ اس نے ہمارے پورے گھر کو ہنستا بولنا اور زندگی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونا سکھا دیا۔ وہ کھانا پکانے کی ماہر تھی۔ اس کے علاوہ اسے نئی نئی ڈشز بنانے کا شوق تھا۔ وہ مختلف رسالوں اور کتابوں سے یہ ڈشز بنانے کی ترکیبیں سیکھتی اور روزانہ ہی کوئی نہ کوئی ڈش بنانے کی کوشش کرتی۔ اس نے اپنے آپ کو کچن تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے دوسرے شوق بھی پورے کرتی رہی۔ مثلاً اخبار پڑھنا، ٹی وی دیکھنا، شاپنگ کرنا، فیشن کے مطابق ڈریسز بنوانا، گھر کی صفائی ستھرائی اور سجاوٹ، مہمانوں کی خاطر مدارات اور سیر و تفریح۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ان سب کاموں کے لیے وقت کیسے نکال لیتی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ وہ ہر کام بڑے سلیقے، ترتیب اور ڈسپلن سے کرتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ہم سب کو بھی ڈسپلن کا پابند بنا دیا۔ پہلے ہم لوگ اپنی چیزوں کو ڈھونڈتے پھرتے تھے، عالیہ نے کچھ ایسا سسٹم بنا دیا کہ ہر چیز اپنی مقررہ جگہ پر ملنے لگی۔

ایک سال بعد میرے یہاں پہلے بیٹے کی ولادت ہوئی۔ اس کی آمد کے بعد گھر کی رونق میں اور اضافہ ہو گیا۔ یوں لگتا تھا کہ گھر کے سب لوگوں کو ایک کھلونا مل گیا ہے اور وہ باری باری اس سے کھیلتے رہتے۔ ابا جان نے اس کا نام نوید رکھا۔ امی تو اسے ایک پل کے لیے بھی اپنے سے جدا نہ کرتیں اور ابا جان بھی گھر آنے کے بعد بقیہ سارا وقت اسی کے ساتھ گزارتے۔ صفیہ آپا بھی ہفتے میں ایک دو مرتبہ ہمارے گھر کا چکر لگا لیتی تھیں۔ اتوار والی گیدرنگ حسب معمول جاری تھی۔ اس روز تو ہمارے گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہوتا تھا۔ میں اس ہنگامہ آرائی سے خوب لطف اندوز ہوتا۔ لوگ سکون کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن مجھے یہ بھیڑ بھاڑ اور شور شرابا اچھا لگتا تھا۔

اسی طرح ہنستے کھیلتے دو سال گزر گئے۔ عالیہ ایک بار پھر امید سے تھی کہ اچانک ہی ہمارے خوشگوار ازدواجی سفر میں پہلا اسپیڈ بریکر آیا۔ ایک روز میں دفتر پہنچا تو تبادلے کے احکامات میرے منتظر تھے۔ مجھے تو یہ یاد ہی نہ رہا تھا کہ سرکاری ملازمت میں تبادلہ بھی ہوتا رہتا ہے۔

میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ عالیہ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اسے اپنے ساتھ لے جاسکتا اور نہ ہی اسے چھوڑ کر جاسکتا تھا۔

میں نے اپنے طور پر تبادلہ رکوانے کی پوری کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ امی، ابا جان اور عالیہ میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ میں اپنا شہر چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلا جاؤں۔ ابا جان کا خیال تھا کہ میں ملازمت سے استعفا دے کر ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹاؤں لیکن میں ایسی کوئی حماقت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے گریڈ سترہ سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا اور میرے سامنے ایک شاندار مستقبل تھا۔ ابا جان کوئی بہت بڑے سرمایہ دار نہیں بلکہ کپڑے کے ایک معمولی تاجر تھے۔ میں ان کے کاروبار کے سائز سے اچھی طرح واقف تھا اور میرے لیے وہاں کوئی گنجائش نہیں بن سکتی تھی۔

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں اپنے شہر کی رونقیں اور بہاروں سے جدائی کا داغ لیے اسلام آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان دنوں یہ شہر نیا نیا آباد ہوا تھا۔ اس لیے کراچی کے مقابلے میں یہاں کی رونق بہت کم تھی۔ میں نے اپنے طور پر عالیہ کو تسلی دی تھی کہ وہ جونہی زچگی سے فارغ ہوگی تو میں اسے اپنے پاس بلالوں گا۔ وہ جانتی تھی کہ میں اسے طفل تسلیاں دے کر بہلا رہا ہوں۔ ایک چھوٹے سے اجنبی شہر میں اتنی جلدی رہائش کا بندوبست نہیں ہوسکتا تھا۔ اس میں سال چھ مہینے بھی لگ سکتے تھے۔ اس کے باوجود اس نے میری باتوں پر یقین کرلیا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس چارہ بھی کیا تھا۔ وہ میری مجبوریوں کو سمجھتی تھی لہٰذا اس نے ایک مرتبہ بھی یہ نہیں کہا کہ تمہارے بغیر میں کس طرح رہوں گی۔

ان دنوں اسلام آباد میں مکانوں ہی کی نہیں بلکہ ہوٹلوں کی بھی شدید قلت تھی چنانچہ میں نے راولپنڈی اسٹیشن پر اتر کر ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کمرا کرائے پر لے لیا۔ میرا خیال تھا کہ دو چار دن بعد اسلام آباد کے کسی ہوٹل میں شفٹ ہو جاؤں گا۔ مجھے جلد از جلد مکان کا بندوبست بھی کرنا تھا تاکہ عالیہ جیسے ہی ڈلیوری سے فارغ ہو تو اسے اپنے پاس بلالوں۔

چند روز بعد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرے لیے فوری طور پر اسلام آباد شفٹ ہونا ممکن نہیں۔ وہاں گنتی کے چند ہوٹل تھے جو میرے حساب سے انتہائی غیر معیاری اور مہنگے تھے جبکہ راولپنڈی اسٹیشن سے اسلام آباد سیکریٹریٹ کا طویل فاصلہ طے کرنے میں مجھے کافی دقت پیش آرہی تھی چنانچہ وقتی طور پر فیض آباد کے ایک ہوٹل میں شفٹ ہوگیا جو راولپنڈی اور اسلام آباد کے سنگم پر واقع ہے۔ اس طرح وقت کی کچھ بچت ہوگئی لیکن ہوٹل میں زیادہ عرصہ رہنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں نے زور و شور سے مکان کی تلاش شروع کردی۔ جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں کہ ان دنوں اسلام آباد بہت چھوٹا ہوا کرتا تھا۔ شہر میں ذاتی مکانات کی تعمیر شروع نہیں ہوئی تھی اور کل رہائشی علاقہ سرکاری مکانوں پر مشتمل تھا۔ میرے سامنے دو ہی راستے تھے، راولپنڈی میں کرائے کا مکان ڈھونڈتا یا پھر سرکاری کوارٹر کی الاٹمنٹ کا انتظار کرتا۔ میں نے دوسرے آپشن کو ترجیح دی۔ ابھی میرے پاس چھ مہینے کا وقت تھا۔ اس وقت تک سرکاری مکان ملنے کی امید تھی کیونکہ راولپنڈی میں بھاری کرایہ پر مکان لینا اور ویگن میں مرغا بن کر اسلام آباد آنا جانا میرے بس سے باہر تھا۔

دفتر میں ایک ساتھی راجا نواز سے میری اچھی خاصی بے تکلفی ہوگئی۔ وہ میرے مسئلے سے واقف تھا اور اس کے حل کے لیے اپنے طور پر کوشش بھی کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے عارضی طور پر راولپنڈی میں ہی کرائے کا مکان لے لینا چاہیے کیونکہ ہوٹل کا کھانا کھا کر میری صحت خراب ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر میں مکان لے لوں تو وہ میرے لیے ایک ملازم کا بندوبست کردے گا جسے کھانا پکانا بھی آتا ہو لیکن میں اس تجویز کے حق میں نہیں تھا اور میری کوشش تھی کہ مجھے اسلام آباد میں مکان مل جائے تاکہ میں آنے جانے کی مصیبت سے بچ سکوں۔

ہمارے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ انصاری صاحب بڑے مخلص اور مہربان افسر تھے۔ ایک دن میں کسی کام کے سلسلے میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور بولے۔

”مجھے تمہارا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگتا ہے۔ شاید میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔“

”یہ کیسے ہوسکتا ہے سر!“ میں نے تعجب سے کہا۔ ”مجھے اسلام آباد آئے ہوئے چند روز ہی گزرے ہیں اور اس سے پہلے ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔“

”میں نے یہ کب کہا کہ ہم اس سے پہلے بھی مل چکے ہیں۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ تمہارا چہرہ کچھ شناسا سا لگ رہا ہے۔ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ والد صاحب کیا کرتے ہیں؟ انڈیا میں کس جگہ سے تعلق ہے؟ وہاں ان کا کیا مشغلہ تھا، وغیرہ وغیرہ۔“

میں نے انہیں ابا جان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ ناگپور کا ذکر آتے ہی وہ چونک پڑے۔ ان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ کچھ دیر تک مجھے دیکھتے رہے پھر بولے ”تم فرید احمد کے بیٹے ہو۔ میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ تمہاری شکل بالکل اپنے باپ پر گئی ہے۔ ہم دونوں نے تقسیم سے قبل بہت سا وقت ناگپور میں ایک ساتھ گزارا تھا پھر ہجرت کے ہنگاموں نے ہمیں ایک دوسرے جدا کردیا۔ تمہیں دیکھ کر یوں لگا جیسے میرا دوست میرے سامنے آ گیا۔“

اس کے بعد انہوں نے میری ایک نہ سنی اور چھٹی کے بعد زبردستی مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ اپنی فیملی سے ملوایا۔ ان کی بیگم بھی ناگپور کے دنوں کو یاد کرکے آبدیدہ ہوگئیں۔ انصاری صاحب کا ایک ہی بیٹا ہمایوں تھا جسے انجینئرنگ کی ڈگری ہونے کے باوجود ابھی تک ملازمت نہیں ملی تھی اور اسی لیے وہ کچھ زود رنج اور چڑچڑا ہوگیا تھا۔ مجھ سے مل کر بھی اس نے کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ انصاری صاحب کی دو بیٹیاں زرینہ اور علینہ بھی تھیں۔ زرینہ گریجویشن کررہی تھی جبکہ علینہ انٹر کے امتحان کی تیاری کررہی تھی۔ دونوں بہنوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ زرینہ بہت کم گو اور سنجیدہ مزاج کی حامل تھی جبکہ اس کے برعکس علینہ کافی شوخ اور چنچل واقع ہوئی تھی۔ اس کے پاس کبھی نہ ختم ہونے والی باتوں کا ذخیرہ تھا اور وہ اپنے دلچسپ اندازِ گفتگو سے دوسروں کو متاثر کرنے کا فن جانتی تھی جبکہ زرینہ میں ایسی کوئی خوبی نہ تھی لیکن اس کا ملکوتی حسن دیکھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کرلیتا تھا۔ وہ بے حد پُرکشش تھی۔ گورا رنگ، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں، تراشیدہ ہونٹ اور سیاہ لمبے گھنے بال۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اتنی حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مرد کتنا بے ایمان ہوتا ہے، جہاں کوئی اچھی شکل دیکھی، فوراً پٹری سے اتر گیا۔ زرینہ کو دیکھنے کے بعد میرے ذہن میں بھی پہلا خیال یہی آیا کہ اگر میں کنوارا ہوتا تو ہر قیمت پر اس سے شادی کرلیتا۔

انصاری صاحب اور ان کی بیگم نے میری بہت خاطر مدارات کی اور اصرار کرکے رات کے کھانے پر روک لیا۔ میں ان لوگوں کے خلوص اور محبت سے بہت متاثر ہوا اور وعدہ کرلیا کہ گاہے بہ گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہوں گا۔ اس کے بعد میں نے باقاعدگی سے ان کے یہاں جانا شروع کردیا۔ انصاری صاحب کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اس لیے وہ بہت کم وقت گھر پر گزارتے تھے، ہمایوں بھی اکثر گھر سے غائب رہتا۔ چند ہی دنوں میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ انصاری صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ اور لعن طعن سے بچنے کے لیے راہِ فرار اختیار کرتا ہے۔ انصاری صاحب کی بیگم گھر کے کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔ اس لیے زرینہ اور علینہ ہی مجھے کمپنی دیتیں بلکہ زرینہ کا بھی صرف نام ہی تھا۔ وہ زیادہ تر خاموش رہتی اور اس کے حصے کی باتیں بھی علینہ ہی کیا کرتی۔ پھر آہستہ آہستہ زرینہ بھی مجھ سے بے تکلف ہوتی گئی۔ کبھی کبھار علینہ کسی کام سے اٹھ کر جاتی تو زرینہ کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی۔ ہونٹ مسکرانے لگتے اور یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے لیکن دل کی بات زبان پر لانے سے قاصر ہے۔

انہی دنوں امی کا خط آیا کہ عالیہ کی زچگی کے دن قریب آرہے ہیں لہٰذا مجھے چھٹی لے کر گھر آجانا چاہیے۔
...خط پڑھتے ہی میں بے چین ہوگیا اور دوسرے ہی دن ایک مہینے کی چھٹی کی درخواست دے دی۔ جب میں نے انصاری صاحب کے گھر والوں کو اپنے جانے کے بارے میں بتایا تو زرینہ کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اسے میرا کراچی جانا ناگوار گزرا ہے۔ وہ کسی کام کا بہانہ بنا کر اٹھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد علینہ نے کہا ”آپ کی وجہ سے ہمارے گھر میں بڑی رونق رہتی تھی، اب آپ نہیں ہوں گے تو یہ پورا مہینا بڑی بوریت میں گزرے گا۔“

انصاری صاحب کی بیگم بھی میرے کراچی جانے کی خبر سن کر اداس ہوگئی تھیں لیکن وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولیں ”اس میں بوریت کی کیا بات ہے، یہ چھٹی پر اپنے گھر جارہے ہیں۔ بس دعا کرو کہ ساتھ خیریت کے واپس آجائیں۔ پھر تم جی بھر کر موج میلا کرلینا۔“

زرینہ کا رویہ میرے لیے الجھن اور حیرت کا باعث تھا۔ وہ بے وقوف لڑکی اپنی آنکھوں میں نہ جانے کون سے خواب سجائے بیٹھی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ ہوں، وہ فریب کھانے پر آمادہ ہوگئی تھی لیکن میں اسے کسی دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جس طرح ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں، اسی طرح ایک دل میں بھی دو عورتیں ڈیرا نہیں جما سکتیں۔ عالیہ میری بیوی تھی اور اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت کے بارے میں سوچنا بھی میرے لیے گناہِ عظیم سے کم نہ تھا۔

لہٰذا میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ زرینہ کے بڑھتے ہوئے قدموں کو یہیں روک دوں گا اور اس کا واحد حل یہی تھا کہ میں انصاری صاحب کے گھر آنا جانا کم کردوں۔

کراچی آنے کے بعد میں بہت مصروف ہوگیا۔ عالیہ بہت کمزور ہوگئی تھی۔ شاید اس نے میری جدائی کا کچھ زیادہ ہی اثر لے لیا تھا۔ اس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن آنکھوں میں شکوے مچل رہے تھے۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ جتنے دن کراچی میں ہوں، زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزاروں گا تاکہ اس کی خفگی دور ہوجائے۔ وہ بڑے ظرف والی عورت تھی۔ اس نے مجھ سے کوئی شکوہ نہیں کیا اور نہ ہی رہائش کے بارے میں کچھ پوچھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ رہائش کا بندوبست ہوجانے کے باوجود وہ... فی الوقت میرے ساتھ اسلام آباد نہیں جاسکتی۔

میری آمد کے تیسرے یا چوتھے روز عالیہ کو اسپتال جانا پڑ گیا جہاں اس نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا۔ پورے گھر کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس زبان سے رب کا شکر ادا کروں جس نے مجھے اتنی نعمتوں سے نوازا تھا، بس ہر نماز کے بعد یہی دعا کرتا کہ ہمارے گھر کو کسی کی نظر نہ لگے۔

ایک مہینا پلک جھپکتے ہی گزر گیا۔ مجھے ایک بار پھر اپنے پیاروں سے بچھڑنے کا عذاب سہنا تھا۔ اس بار نہ جانے کیوں میرا دل اسلام آباد جانے پر آمادہ نہیں ہورہا تھا۔ شاید ماں باپ، بہن بھائی اور بیوی بچوں کی محبت نے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ بار بار یہی خیال آتا کہ نوکری چھوڑ کر اپنے گھر والوں کے ساتھ زندگی کے مزے لوٹوں لیکن عقل نے مجھے ایسا فیصلہ کرنے سے باز رکھا۔ دماغ سے یہی آواز آئی کہ یہ جدائی عارضی ہے۔ جیسے ہی مکان مل جائے، تم بیوی بچوں کو اپنے پاس بلاسکتے ہو لیکن جذبات میں آکر کوئی ایسا فیصلہ مت کرنا جس پر ساری عمر پچھتانا پڑے؟

میں دل پر پتھر رکھ کر اسلام آباد آگیا۔ اس بار عالیہ بہت دل گرفتہ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا ضبط جواب دے رہا ہو۔ اس نے براہِ راست تو مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی لیکن اس کے چہرے پر لکھی تحریر بتا رہی تھی کہ اسے میری جدائی شاق گزر رہی ہے۔ وقتِ رخصت وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور اس نے میرے کوٹ کا کالر پکڑتے ہوئے کہا۔

”اب میں زیادہ برداشت نہیں کرسکتی۔ جتنی جلد ممکن ہو مجھے اپنے پاس بلالو۔“

میں نے اسے تسلی دی لیکن مجھے خود اپنے لفظوں کے کھوکھلے پن پر اعتبار نہ تھا۔ اگر اسے بلانا میرے بس میں ہوتا تو اتنی دیر ہی کیوں لگتی۔ میں نے اپنے ذہن میں چھ ماہ کا ٹارگٹ فکس کیا اور طے کرلیا کہ اس دوران مجھے مکان نہ ملا تو میں واقعی نوکری چھوڑ کر کراچی واپس آجاؤں گا۔

اسلام آباد آنے کے بعد ایک بار پھر زندگی اپنی ڈگر پر آگئی۔ عالیہ کی قربت کے نشے نے مجھے ہر احساس سے بیگانہ کردیا تھا لیکن اس کی بانہوں کے حصار سے نکلتے ہی میرے قدم ڈگمگانے لگے۔ میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ انصاری صاحب کے گھر والوں سے برائے نام تعلق رکھوں گا تاکہ زرینہ سے کم سے کم سامنا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھ میں اس کی جارحیت کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ جس تیزی سے میری جانب بڑھ رہی تھی، اس کا انجام ہماری تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ ہوتا اس لیے زرینہ سے دور رہنا ہی میرے مفاد میں تھا لیکن اسلام آباد پہنچتے ہی میرا ارادہ ڈانواں ڈول ہوگیا اور مجھے پہلی شام ہی زرینہ کے نام کرنی پڑ گئی۔

میں مٹھائی لے کر ان کے یہاں گیا تھا۔ دوسرے بیٹے کی پیدائش کی خبر سن کر سب نے ہی خوشی کا اظہار کیا لیکن زرینہ ہمیشہ کی طرح گم صم بیٹھی رہی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ ہوگئی ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھ سے شدید خفا ہے۔ اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کی آنکھوں میں بہت سے شکوے مچل رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھ سے ایسی توقعات کیوں وابستہ کررہی تھی جو کبھی پوری نہیں ہوسکتی تھیں۔ حالانکہ میرے دل میں کوئی بے ایمانی نہیں تھی۔ میری جگہ کوئی دوسرا مرد ہوتا تو زرینہ کا التفات دیکھ کر اسے بہ آسانی اپنی جھوٹی محبت کے جال میں پھنسا سکتا تھا۔

میں نے مکان کی الاٹمنٹ کے لیے کوششیں تیز کردیں۔ انصاری صاحب نے بھی متعلقہ افسران سے بات کی اور چند ہفتوں کے انتظار کے بعد مجھے سرکاری مکان مل ہی گیا۔ اب میں تقریباً انصاری صاحب کا پڑوسی بن گیا تھا۔ درمیان میں صرف دو بنگلے تھے۔ وہ اتنا بڑا مکان تھا کہ اس میں میری ساری فیملی بڑے آرام سے رہ سکتی تھی۔ عالیہ کے آنے کے بعد بھی وہ گھر خالی خالی لگتا۔ ظاہر ہے کہ میرے سب گھر والے تو یہاں نہیں آسکتے تھے۔ اب مجھے گھر کو سیٹ کرنے کی فکر لاحق ہوئی کیونکہ میرے پاس تو ایک سوٹ کیس کے سوا کچھ سامان نہیں تھا۔ میں نے راجا کے

لفظ "نسل" کے استعمال ہیں کہ یہ اب بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا ہلکا سا تاثر ہمیں ماہرین کے اس مقولے میں ملتا ہے کہ علم الانسان کے ماہرین کے نزدیک صرف Genetics کے ماہرین جانتے ہیں کہ نسل کیا ہے اور Genetics کے ماہرین کہتے ہیں کہ صرف علم الانسان کے ماہرین ہی جانتے ہیں کہ نسل کے معنی کیا ہیں؟ اس طرح "لفظ نسل" فکری انتشار کا بہت بڑا سبب ہے اور موجودہ دور میں UNESCO کے اس موضوع پر کام کے بعد علمی مباحث میں اس کا استعمال بہت احتیاط سے کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کے غلط مفاہیم کے چند نمونے درج ذیل ہیں۔

1۔ مشترکہ جسمانی خصوصیت کی بنا پر ہم ایک گروہ کو نسل کہہ سکتے ہیں جیسے سفید فام نسل لیکن اس میں ہمیں کم از کم تین مختلف رنگوں کی آمیزش نظر آتی ہے۔

2۔ ایک زمانے سے آبا و اجداد کے کئی پیڑھیوں تک انحصار رہنے والوں کو بھی نسل ہی کہا جاتا ہے مثلاً انگریز، فرانسیسی، جاپانی وغیرہ۔

3۔ اس لفظ کا اطلاق پوری نوع انسانی پر بھی ہوتا ہے۔

4۔ لفظ نسل مختلف ثقافتی گروہوں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً مسلمان، بدھ، ہندو۔

5۔ یہ لفظ ان انسانی گروہوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جن کی اکثریت کسی مشترکہ خصوصیت کی حامل ہو مثلاً مارشل آرٹ ریس، خواہ اس کے کئی افراد اس خصوصیت سے عاری ہی کیوں نہ ہوں۔

6۔ اس لفظ کا ایک اور گمراہ کن استعمال اس وقت عمل میں آتا ہے جب ہم مسلمان نسل، اینگلو سیکسن نسل، چینی یا جاپانی نسل کہتے ہیں۔

7۔ کئی دفعہ اس کا استعمال اس طرح کیا جاتا ہے کہ نسل اور قوم میں التباس پیدا ہو جاتا ہے۔

8۔ زبان اور ثقافت کے اظہار کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے مشہور ماہر حیاتیات ٹی ایچ ہکسلے نے کہا تھا کہ "انسانی گروہوں پر اطلاق کے وقت یہ لفظ حیاتیاتی مفہوم سے بالکل مبرا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق "اگرچہ کچھ عرصہ کے لیے پودوں، حیوانات اور انسانوں کے بارے میں ماہرین حیاتیات میں نسل کے تصور پر اتفاق تھا لیکن عام فہم زبان میں لفظ نسل کے کوئی واضح اور صحیح معنی نہیں ہیں اور کثرت استعمال سے اس میں ناخوشگوار اور تکلیف دہ مفاہیم پیدا ہو چکے ہیں۔"

تلاش: اے جے صدیقی، کراچی

سامنے یہ مسئلہ رکھا تو وہ بولا۔

"فی الحال زیادہ تام جھام کرنے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی یہ سرکاری مکان ہے۔ کل کو تمہارا ٹرانسفر ہو گیا تو اتنا سامان لے کر کہاں جاؤ گے۔ فی الحال تم اپنے گزارے کے لیے ایک پلنگ، چند کرسیاں اور تھوڑے سے برتن خرید لو۔ جب بھابی آئیں گی تو وہ خود ہی اپنی ضرورت کے مطابق سیٹنگ کر لیں گی۔"

میں نے اپنے گھر میں کبھی کوئی کام نہیں کیا تھا۔ مجھے تو چائے بنانا بھی نہیں آتی تھی۔ اس لیے مکان مل جانے کے باوجود کھانے کا مسئلہ اپنی جگہ رہا۔ اس کے علاوہ گھر کی صفائی ستھرائی کے لیے بھی ملازم کی ضرورت تھی۔ یہ مسئلہ راجا نے حل کر دیا۔ وہ ویک اینڈ پر اپنے گاؤں گیا تو واپسی میں ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکے کو بھی ساتھ لے آیا۔ اس کا نام فضل دین تھا لیکن سب اسے فضلو کہہ کر بلاتے تھے۔ اس کا باپ مر چکا تھا اور ماں گاؤں کے زمیندار کے گھر کام کر کے دو وقت کی روٹی کما لیتی تھی۔ فضلو نے پانچ جماعتیں پڑھ کر اسکول چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ اب وہ سارا دن گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا یا کھیل کود میں وقت گزار دیتا۔ راجا نے اسے میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"یہ گیلی لکڑی کی طرح ہے، جس طرف چاہو موڑ سکتے ہو۔ فی الحال یہ تمہارے کسی کام کا نہیں لیکن آگے چل کر بہت کارآمد ہو سکتا ہے۔ اب یہ تمہارے اوپر منحصر ہے کہ کتنے دنوں میں اسے ٹرینڈ کرتے ہو۔"

مجھے کسی ماہر خانساماں یا تربیت یافتہ ملازم کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی بہت تھا کہ گھر کے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے ایک بندہ مل گیا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر بازار گیا۔ اس کے لیے شلوار قمیص کے دو سوٹ اور ضرورت کی دیگر چیزیں خریدیں اور اسے چھوٹے موٹے کاموں پر لگا دیا۔ وہ دیکھنے میں بدھو لیکن حقیقت میں بہت ذہین تھا۔ چند ہی دنوں میں اس نے بہت سے کام سیکھ لیے۔ وہ پورے گھر کی صفائی کرتا۔ لان میں پودوں کو پانی دیتا۔ اسے چائے بنانا آتی تھی اور ناشتے میں انڈا بھی تل لیتا تھا۔ پہلے میں ہوٹل میں کھانا کھاتا تھا۔ اس کے آنے کے بعد میں نے گھر پر کھانا منگوانا شروع کر دیا۔ فضلو کو یہ اچھا نہیں لگا۔ ایک دن کہنے لگا "صاحب جی! بازار کا کھانا ٹھیک نہیں ہوتا اور اس میں پیسے بھی بہت خرچ ہوتے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں کھانا بنانا سیکھ لوں؟"

مجھے اس کی بات سن کر ہنسی آ گئی اور میں نے کہا۔ "یہاں کون تمہیں کھانا بنانا سکھائے گا؟ اس کے لیے تو تمہیں کسی ہوٹل کے شیف یا خانساماں کی شاگردی اختیار کرنی پڑے گی۔"

"آپ انصاری صاحب کی بیگم سے بات کر لیں۔ وہ مجھے سکھا سکتی ہیں۔"

اس کی تجویز معقول تھی۔ میں نے انصاری صاحب کی بیگم سے بات کی تو وہ بہ خوشی راضی ہو گئیں اور اس طرح فضلو دوپہر میں ان کے گھر جانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کئی قسم کے کھانے بنانے سیکھ لیے۔ اس طرح ہوٹل کی

تنہائی دور ہو گئی۔ میرا دوسرا بیٹا بھی چھ ماہ کا ہو چکا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ عالیہ کو جا کر لے آؤں۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ عالیہ اور بچوں کے آ جانے سے گھر کی رونق بالکل ہی ختم ہو جائے۔ امی، ابا جان اور دونوں چھوٹے بھائی ان کے بغیر اداس ہو جائیں گے۔ امی نے تو پوری گھر داری عالیہ کے حوالے کر دی تھی۔ اب ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ دوبارہ گھر کی ذمے داریاں سنبھال سکیں۔

میں اپنے انداز میں سوچ رہا تھا اور امی نے کچھ اور ہی پلاننگ کر رکھی تھی۔ عالیہ کے خط سے معلوم ہوا کہ ان دنوں وہ بڑے زور و شور سے چھوٹے بھائیوں کے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہی تھیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ دونوں کی شادی ایک ساتھ کر دی جائے۔ انہوں نے عالیہ سے کہہ دیا تھا کہ نئی بہوؤں کے آتے ہی وہ اسے میرے پاس بھیج دیں گی تاکہ میری تنہائی دور ہو سکے اور میں سکون سے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ زندگی گزار سکوں۔ مجھے امی کی دور اندیشی پر پیار آنے لگا۔ واقعی ماں کی نظر ہر پہلو پر ہوتی ہے۔ انہیں شدت سے میری تنہائی کا احساس تھا اور جانتی تھیں کہ عالیہ کے بغیر مجھے کتنی مشکل ہو رہی ہوگی اسی لیے انہوں نے چھوٹے بھائیوں کی شادی کا فیصلہ کیا تاکہ دونوں گھروں کی تنہائی دور ہو سکے۔

اس کے بعد مجھے امی کا خط ملا جس میں انہوں نے تفصیل سے ساری باتیں لکھ دی تھیں۔ دونوں بھائیوں کے لیے لڑکیاں پسند کر لی گئی تھیں اور شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی تھی۔ امی نے تاکید کی تھی کہ اس دوران میں اپنا گھر سیٹ کر لوں کیونکہ اب عالیہ کو میرے ساتھ ہی رہنا تھا۔ انہوں نے انصاری صاحب اور ان کی فیملی کو بھی شادی میں بلایا تھا۔ اس زمانے میں ٹیلی فون کی سہولت عام نہیں تھی اس لیے امی نے یہ ذمے داری مجھے سونپی کہ میں ان کی طرف سے انصاری صاحب کو شادی کا دعوت نامہ دے دوں۔

جب میں نے انصاری صاحب کے گھر والوں کو یہ خبر سنائی اور بتایا کہ بھائیوں کی شادی کے بعد عالیہ مستقل طور پر میرے ساتھ ہی رہے گی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ علینہ بچوں کی طرح تالیاں بجاتے ہوئے بولی "آہا... خوب مزہ آئے گا۔ عالیہ بھابی اور بچوں کے آ جانے سے بڑی رونق رہے گی۔ میں تو عالیہ بھابی سے پکی دوستی کر لوں گی اور ان سے وہ سب کچھ سیکھ لوں گی جو مجھے نہیں آتا۔"

"تمہیں آتا ہی کیا ہے سوائے فضول بکواس کرنے کے۔" زرینہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ عالیہ کے آنے کی خبر سن کر خوش نہیں ہوئی بلکہ اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ شاید وہ نہیں چاہتی تھی کہ عالیہ میرے پاس آ کر رہے لیکن کیوں؟ اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ کیا وہ عالیہ سے حسد کرنے لگی تھی، کیا وہ میرے دل میں اس کی جگہ لینے کا منصوبہ بنا رہی تھی؟ اس کے انداز اور رویے کو دیکھتے ہوئے دونوں ہی باتیں ممکن تھیں لیکن وہ ایسا کیوں سوچ رہی تھی جبکہ میں نے کبھی اسے اس نظر سے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اس وقت مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس

ہوا۔ مجھے اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے انصاری صاحب کے گھر نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ انصاری صاحب کی بیگم مجھے کھانے کے لیے روکتی رہ گئیں لیکن میں ایک ضروری کام کا بہانہ کرکے وہاں سے چلا آیا۔

دوپہر کا کھانا میں دفتر کی کینٹین میں کھالیا کرتا تھا جبکہ انصاری صاحب اپنا لنچ گھر سے لے کر آتے تھے۔ اگلے روز جب میں وقتِ مقررہ پر کھانے کے لیے کینٹین جانے لگا تو انصاری صاحب نے چپراسی کے ذریعے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور بولے "آج تم لنچ میرے ساتھ کروگے۔ زرینہ نے نہاری بنائی ہے اور اسے معلوم ہے کہ یہ تمہاری مرغوب ڈش ہے۔ اسی لیے اس نے تاکید کردی تھی کہ آج میں تمہیں اپنے ساتھ لنچ میں شریک کرلوں۔"

زرینہ نے میرے دل میں جگہ بنانے کے لیے یہ راستہ اختیار کیا تھا۔ شاید اس نے کہیں پڑھ لیا ہوگا کہ مرد کے دل تک پہنچنے کا راستہ معدے سے گزرتا ہے۔ اب وہ اس طرح میرے پسندیدہ کھانے بنا کر مجھے اپنا گرویدہ کرنا چاہتی تھی لیکن میں اس جھانسے میں آنے والا نہیں تھا۔ سوچا کہ کوئی خوبصورت سا بہانہ بنا کر انصاری صاحب سے معذرت کرلوں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، چپراسی نے کھانا لگادیا۔ انصاری صاحب بولے "بس جلدی سے ہاتھ دھوکر آجاؤ ورنہ سالن ٹھنڈا ہوجائے گا۔"

اس کے بعد میری کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی اور میں خاموشی سے کھانے میں شریک ہوگیا۔ زرینہ نے واقعی بہت لذیذ نہاری بنائی تھی۔ میں دل ہی دل میں اس کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ اسی دوران انصاری صاحب نے مطلب کی بات چھیڑ دی اور بولے "دل تو بہت چاہ رہا ہے کہ تمہارے بھائیوں کی شادی میں شرکت کروں لیکن ان دنوں میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔ بلڈ پریشر رہنے لگا ہے اس لیے شاید میرا جانا ممکن نہ ہو البتہ تمہاری چچی اور میری دونوں بیٹیاں ضرور شرکت کریں گی۔ ہمایوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔"

"آپ کو اپنی صحت کا خیال رکھنا چاہیے۔" میں نے ازراہِ ہمدردی کہا۔

میری آواز سن کر انہوں نے سر جھکالیا اور آہستہ سے بولے "کیا کروں، تفکرات نے گھیر رکھا ہے۔ ہمایوں کچھ کرتا کراتا نہیں ہے۔ اسے دیکھ کر میری جان جلتی ہے۔ اگر وہ مان جائے تو اپنے ہی محکمے میں اس کی ملازمت کا بندوبست ہوسکتا ہے لیکن وہ تو ہواؤں میں اڑ رہا ہے، کہتا ہے کہ مزید تعلیم کے لیے امریکا جائے گا۔ تم ہی بتاؤ یہ کیسے ممکن ہے؟ مجھ جیسا مڈل کلاس آدمی وہاں کے اخراجات کس طرح برداشت کرسکتا ہے۔ اگر دو چار ہزار کی بات ہوتی تو میں اس کی یہ خواہش بھی پوری کردیتا۔"

یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکے اور پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے رازداری سے بولے "جوان اولاد باپ کے بڑھاپے کا سہارا ہوتی ہے لیکن اس نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔ اس کی طرف سے مطمئن ہوجاؤں تو لڑکیوں کی شادی کے بارے میں سوچوں۔ تم مجھے بیٹوں کی طرح عزیز ہو، اس لیے تم سے دل کی بات کہہ سکتا ہوں۔ تمہاری نظر میں کوئی لڑکا ہو، اپنی امی سے بھی کہنا، شاید وہ اس سلسلے میں کوئی مدد کرسکیں۔"

میں نے انہیں تسلی دی اور وعدہ کیا کہ مجھ سے جو ہوسکا، وہ ضرور کروں گا۔ گھر آنے کے بعد میں انہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ واقعی اولاد کا دکھ انسان کو مار ڈالتا ہے۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ وہ اندر سے کتنے دکھی تھے۔ کاش وہ پہلے ہی اپنا مسئلہ بیان کردیتے تو میں امی کو ان کے گھر رشتہ ڈالنے پر تیار کرلیتا۔ مجھے خود بھی یہ بات سوچنا چاہیے تھی۔ جب امی چھوٹے بھائیوں کے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہی تھیں تو مجھے ان کے کان میں یہ بات ڈال دینی چاہیے تھی کہ وہ انصاری صاحب کی کسی ایک لڑکی کو اپنی بہو بنالیں۔

دوسرے دن ایک اور انہونی ہوئی۔ میں شام کو کلب جانے کی تیاری کررہا تھا کہ بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر زرینہ آگئی۔ فضلو اس وقت کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ زرینہ کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران رہ گیا کیونکہ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ مجھے اس کا آنا اچھا نہیں لگا اور میں نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

اس نے میری ناراضی کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ "بس میرا دل چاہا اس لیے چلی آئی لیکن آپ اتنا کیوں بگڑ رہے ہیں؟ کیا میں یہاں نہیں آسکتی؟"

"ہاں، یہی سمجھ لو۔"

"لیکن مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

"اس وقت میں تمہاری کوئی بات نہیں سن سکتا۔ میں کلب جارہا ہوں۔ واپسی پر تمہارے گھر آؤں گا پھر جتنی چاہے باتیں کرلینا۔"

"آپ سمجھتے کیوں نہیں، اگر یہ بات گھر پر ہوسکتی تو مجھے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی، کیا آپ مجھے چند منٹ بھی نہیں دے سکتے؟"

"بالکل نہیں۔" میں نے بے رخی سے کہا "تمہیں

یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ سب جانتے ہیں کہ میں اکیلا رہتا ہوں۔ اگر کسی نے تمہیں آتے جاتے دیکھ لیا تو کتنی بدنامی ہوگی۔ اگر تمہیں میری عزت کا ذرا بھی خیال ہے تو براہِ کرم آئندہ ایسی جسارت نہ کرنا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں جارہی ہوں لیکن وعدہ کریں کہ کلب سے واپسی پر آپ ہمارے گھر ضرور آئیں گے؟"

"ہاں ہاں، وعدہ۔" میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

کلب سے واپسی پر خاصی دیر ہوچکی تھی۔ اس وقت میرا انصاری صاحب کے گھر جانا ٹھیک نہیں تھا لیکن زرینہ سے وعدہ کرچکا تھا اس لیے بہ حالتِ مجبوری چلا گیا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ کچھ دیر پہلے انصاری صاحب کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ وہ اسپتال جانے پر تیار نہ ہوئے تو ڈاکٹر کو گھر پر بلایا گیا۔ اس نے انہیں ایک انجکشن لگایا اور کچھ دوائیں لکھیں جس کے بعد ان کی طبیعت سنبھل گئی اور وہ آرام کررہے تھے۔ یہ سن کر مجھے ان کے ساتھ ہونے والی گفتگو یاد آگئی اور میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "لگتا ہے کہ انہیں کسی بات کی ٹینشن ہے۔ آپ لوگ انہیں خوش رکھنے کی کوشش کریں اور ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ کریں۔"

"جس گھر میں لڑکیاں جوان ہورہی ہوں، وہاں کوئی چین کی نیند کیسے سوسکتا ہے؟" انصاری صاحب کی بیگم ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولیں "وہ زرینہ کی طرف سے بہت پریشان رہتے ہیں۔ اس لڑکی کے دماغ ہی نہیں ملتے۔ نہ جانے کتنے رشتے آچکے ہیں لیکن یہ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی عیب نکال کر انکار کردیتی ہے۔ اب اس کے لیے کوئی شہزادہ تو آنے سے رہا۔ لڑکیوں کی شادی کی یہی عمر ہوتی ہے۔ اس کے بعد رشتے آنا بند ہوجاتے ہیں۔"

میں ان کی پریشانی جان گیا تھا اور زرینہ کے انکار کی وجہ بھی میری سمجھ میں آچکی تھی۔ اس وقت میں اپنے آپ کو ہی ان واقعات کا ذمے دار سمجھ رہا تھا۔ کاش میں اسلام آباد نہ آتا۔ انصاری صاحب سے راہ و رسم نہ بڑھائی ہوتی۔ زرینہ سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو وہ پاگل لڑکی بھی اپنے آپ کو روگ نہ لگاتی۔ اب اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا تھا کہ زرینہ کو حقیقت کی دنیا میں واپس لاکر اسے شادی کے لیے آمادہ کیا جائے۔ میں نے بیگم انصاری کو تسلی دی اور وعدہ کیا کہ میں بھی اپنے طور پر زرینہ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

کچھ دیر ان کے پاس بیٹھنے کے بعد میں اپنے گھر جانے کے لیے نکلا تو زرینہ بھی میرے پیچھے پیچھے دروازے تک چلی آئی۔ میں نے پوچھا "زرینہ! وہ کیا بات تھی جو تم مجھ سے کرنا چاہ رہی تھیں؟"

اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "میں نے امی کی باتیں سن لی ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ ابو نے بھی آپ سے اس سلسلے میں کچھ کہا تھا۔ نہ جانے یہ لوگ کیوں آپ کو اپنی پریشانیوں میں شریک کرنا چاہ رہے ہیں۔ آپ بھلا اس سلسلے میں کیا کرسکتے ہیں؟"

میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے کہا "دیکھو زرینہ! تمہارے ابا تم دونوں بہنوں کی شادیاں کرنا چاہتے ہیں لیکن تم ہر آنے والے رشتے کو انکار کردیتی ہو۔ آخر کیوں؟ اگر تم کسی کو پسند کرتی ہو تو بتادو۔ میں اس سلسلے میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔"

وہ طنزیہ انداز میں بولی "یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے اور آپ اس سے دور ہی رہیں تو بہتر ہوگا ورنہ ہم سب اس آگ میں جل کر تباہ ہوجائیں گے۔ لہٰذا آپ اپنے گھر

ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر (اکتوبر 1775ء تا نومبر 1862ء) ہندوستان کے آخری مغل بادشاہ تھے۔ بہادر شاہ ظفر جس دربار میں بیٹھا کرتے تھے وہاں ان کی حیثیت نمائشی تھی۔ بعدازاں برطانوی فوج کے میجر ولیم ہڈسن نے 20 ستمبر 1857ء کو انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیا۔ انگریز نے بہادر شاہ ظفر اور ان کے زندہ بچ جانے والے رشتے داروں کو گرفتار کرکے برما کے علاقے رنگون بھیج دیا۔

7 نومبر 1862ء کو بہادر شاہ ظفر کی وفات ہوئی اور انہیں خفیہ طریقے سے ایک درخت کے نیچے دفن کردیا گیا۔ برطانوی حکومت کو خدشہ تھا کہ آزادی کے پروانے دوبارہ یہاں سے ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 1942ء میں نیتاجی سبھاش چندرا بوس نے اسی تاریخی مقام سے برطانوی حکومت کے خلاف "دلی چلو" تحریک کا آغاز کیا تھا۔

زمانے کی گرد نے اس مقبرے کو چھپادیا تھا جسے 1991ء میں دوبارہ دریافت کیا گیا۔ بہادر شاہ ظفر کا مقبرہ تمام مغل شہنشاہوں کے مقابر میں سب سے زیادہ سادہ اور عام سا ہے مگر میانمر میں اس مقبرے کو مزار کا درجہ حاصل ہے۔

اقتباس: مغل ادوار

مرسلہ: روشین خان، ایبٹ آباد

خوش رہیں اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اس موضوع پر تم سے بعد میں بات کروں گا لیکن تمہیں جلد از جلد اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمہیں پچھتانے کا موقع بھی نہ مل سکے۔"

"آپ میری فکر نہ کریں۔ میں اپنے مستقبل کے بارے میں زیادہ بہتر انداز میں سوچ سکتی ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہی تھی۔ یقیناً وہ کسی لڑکے کو چاہتی ہے لیکن اس کے راستے میں کوئی ایسی رکاوٹ ضرور ہے جس کی وجہ سے وہ دل کی بات زبان پر لانے سے قاصر ہے۔ مجھے ہر حال میں اس کی چاہت کے بارے میں معلوم کرنا تھا تاکہ اس رکاوٹ کو دور کرکے ان دونوں کی شادی کی راہ ہموار کی جاسکے۔

انصاری صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے ان کی فیملی کا کوئی بھی فرد ہمارے یہاں شادی میں شریک نہ ہوسکا۔ میں اس بار ایک مہینے کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ گھر میں خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ میں اپنی بیوی بچوں اور شادی کے ہنگاموں میں سب کچھ بھول گیا البتہ ولیمہ کی تقریب میں مجھے زرینہ اور علینہ کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوئی۔ اگر وہ شادی میں آجاتیں تو بہت سی نگاہوں کا مرکز بن سکتی تھیں۔ میں اس تقریب میں شریک ایسی کئی خواتین کو جانتا تھا جو اپنے لڑکوں کی شادی کے لیے فکرمند تھیں۔ واقعی انصاری صاحب کی قسمت خراب تھی ورنہ اتنا اچھا موقع ہاتھ سے نہ نکلتا۔

میں واپسی میں عالیہ کو اپنے ساتھ ہی لیتا آیا۔ اب اسے کراچی میں چھوڑنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ شروع کے چند روز تو وہ خاصی پریشان رہی لیکن رفتہ رفتہ سب کچھ ٹھیک ہوگیا۔ میری زندگی میں بھی ٹھہراؤ آگیا تھا۔ تنہائی کا عذاب ختم ہوا تو اپنا گھر مجھے جنت لگنے لگا۔ میں دفتر سے سیدھا گھر آتا اور بقیہ وقت عالیہ کے ساتھ ہی گزارتا۔ اب مجھے اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔

کبھی کبھی ہم لوگ انصاری صاحب کے گھر چلے جاتے۔ وہ لوگ عالیہ کے ساتھ بڑی اچھی طرح پیش آتے تھے۔ خاص طور پر علینہ تو عالیہ سے بہت گھل مل گئی تھی جبکہ زرینہ کے رویے میں سرد مہری پائی جاتی تھی۔ میں محسوس کررہا تھا کہ اسے عالیہ کا آنا اچھا نہیں لگا اسی لیے وہ اس سے بے رخی سے پیش آتی تھی۔

ہمایوں کو ملازمت مل گئی تھی اور وہ لاہور چلا گیا۔ اس طرح انصاری صاحب کا ایک مسئلہ تو حل ہوگیا اور ہمایوں کے جانے کے بعد وہ خاصے مطمئن نظر آنے لگے۔ البتہ لڑکیوں کی شادی کی فکر انہیں ستائے جارہی تھی۔ انہی دنوں زرینہ کے لیے ایک بہت اچھا رشتہ آگیا۔ لڑکا سی ڈی اے میں انجینئر تھا۔ بہن بھائی شادی شدہ تھے اور وہ اپنی ماں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ انصاری صاحب اور ان کی بیگم کو یہ رشتہ بہت پسند آیا اور وہ چاہتے تھے کہ زرینہ کی شادی اس سے ہوجائے لیکن اس بار بھی زرینہ نے انکار کردیا گوکہ اس کے پاس اس رشتے کو مسترد کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی لیکن اس نے بہانہ یہ بنایا کہ وہ ماسٹرز کرنا چاہتی ہے اور اس سے پہلے شادی نہیں کرے گی۔

انصاری صاحب اور ان کی بیگم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ دونوں کسی قیمت پر بھی اس رشتے کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے یہ ذمے داری مجھے سونپی کہ زرینہ کو سمجھاؤں۔ میں جانتا تھا کہ یہ کوشش بے سود ہوگی لیکن انصاری صاحب کے کہنے پر میں نے زرینہ سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ جیسے ہی میں نے اس کے سامنے یہ ذکر چھیڑا، وہ مجھ سے اکھڑی اکھڑی اور ناگواری سے بولی۔

"میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ اس معاملے سے دور رہیں لیکن شاید آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔"

"میں بھی اس معاملے میں دخل نہ دیتا لیکن یہ بہت اچھا رشتہ ہے اور اس خاندان کا بہی خواہ ہونے کی حیثیت سے یہ میرا فرض بنتا ہے کہ تمہیں کسی صحیح فیصلے تک پہنچنے میں مدد دوں۔"

"میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ اس کے لیے مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں۔"

"آخر تم چاہتی کیا ہو؟" میں نے جھنجلاتے ہوئے کہا "میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ اگر کسی اور کو چاہتی ہو تو بتادو۔ میں تمہارے والدین کو اس رشتے کے لیے قائل کرلوں گا۔"

"آپ کچھ بھی نہیں کرسکتے۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی "اگر میری زبان پر اس کا نام آگیا تو ایک بھونچال آجائے گا۔ آپ مجھے اپنی آگ میں جلنے دیں اور دعا کریں کہ دوسروں کا دامن اس آگ سے محفوظ رہے۔"

وہ بڑے معنی خیز انداز میں گفتگو کررہی تھی۔ میں کچھ نہ جانتے ہوئے بھی بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ میرے خدشات صحیح ثابت ہورہے تھے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے اپنے دل کے خانے میں کس کی تصویر سجا رکھی ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو

ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس تصویر کو نوچ کر پھینک دیتا لیکن کسی کے دل پر میرا اختیار نہیں تھا جب اس نے خود ہی اس آگ میں جلنے کا فیصلہ کرلیا تو میں اپنا دامن بچانے کے سوا اور کیا کرسکتا تھا۔ یہ جانتے کے باوجود کہ جس چاند کو چھونے کی تمنا کررہی ہے وہ کسی دوسرے کے آنگن میں اپنی کرنیں بکھیر رہا ہے، اس نے اپنے دل کو یہ روگ لگایا تھا۔ مجھے ہر قیمت پر اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنا تھا اور اس کا واحد حل یہی تھا کہ میں اس کی نظروں سے دور ہوجاؤں۔

میں نے اپنے تبادلے کے لیے کوشش شروع کردی کیونکہ میرے یہاں رہنے سے معاملات سنگین صورت اختیار کرسکتے تھے۔ میں اچھی طرح جان گیا تھا کہ زرینہ میرے عشق میں پاگل ہوچکی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہوں وہ مجھے پانے کا خواب دیکھ رہی تھی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ اگر میری شادی نہ ہوئی ہوتی تو میں زرینہ کی محبت پاکر اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ کوئی بھی مرد اسے دیکھ کر پاگل ہوسکتا تھا جبکہ شکل و صورت کے معاملے میں عالیہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی لیکن اب وقت گزر چکا تھا، عالیہ میری بیوی تھی اور میں اسے تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ قبول کرچکا تھا۔ اب میرے راستے میں زرینہ تو کیا حسینۂ عالم بھی آجاتی تو میں اسے ٹھوکر مار کر آگے بڑھ جاتا۔

مجھے لگا کہ میں اوپری دل سے یہ سب باتیں سوچ رہا ہوں۔ عالیہ میری بیوی تھی اور میں اس سے محبت کرتا تھا بلکہ یوں کہہ لیں کہ اس سے محبت کرنے پر مجبور تھا جبکہ زرینہ بڑے غیر محسوس طریقے سے میرے دل میں جگہ بنا چکی تھی۔ شاید میرے اور اس کے بیچ ایک تعلق قائم ہوچکا تھا ورنہ میں اس کے بارے میں کیوں سوچتا۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو پتا چلا کہ وہ روزِ اول سے ہی میرے دل میں جگہ بنا چکی ہے۔ میں نے تو اس کی پہلی دستک پر ہی اپنے دل کا دروازہ کھول دیا تھا پھر اسے ہی دوش کیوں دوں؟ میں بھی تو اس جرم میں برابر کا شریک تھا۔ میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ کیا واقعی مجھے زرینہ سے محبت ہوگئی ہے تو جواب ہاں میں آیا اور یہ ایسی خوفناک حقیقت تھی جس سے منہ چھپانے میں ہی میری عافیت تھی ورنہ سب کچھ تباہ و برباد ہوجاتا۔ میں نے محبت ہونے پر لعنت بھیجی اور محبت کرنے کو ترجیح دیتے ہوئے پہلے سے زیادہ عالیہ کی نازبرداری کرنے لگا۔ شاید خودغرضی اسی کو کہتے ہیں۔

انہی دنوں عالیہ نے ایک عجیب سی خواہش کا اظہار کیا۔ اس کا بھائی عادل تعلیم مکمل کرکے برسرِ روزگار ہوچکا تھا اور اس کے لیے لڑکیاں دیکھی جارہی تھیں۔ عالیہ کو علینہ بہت پسند تھی اور وہ چاہ رہی تھی کہ عادل کا رشتہ اس سے طے ہوجائے۔ عالیہ کی خواہش جان کر میں جیسے خوابِ غفلت سے بیدار ہوگیا۔ مجھے بالکل بھی یاد نہ رہا تھا کہ انصاری صاحب نے مجھ سے ایک مرتبہ اپنی لڑکیوں کے رشتے کے سلسلے میں بات کی تھی۔ یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا کہ عادل کا رشتہ انصاری صاحب کی کسی ایک لڑکی سے ہوسکتا ہے۔ اصولاً تو زرینہ کی شادی پہلے ہونی چاہیے تھی لیکن عالیہ کو علینہ پسند تھی تو یونہی سہی۔ کم از کم اسی طرح انصاری صاحب کا کچھ بوجھ ہلکا ہوجائے گا۔

میں نے مناسب سمجھا کہ براہِ راست پیغام دینے سے پہلے انصاری صاحب کے کان میں یہ بات ڈال دی جائے تاکہ وہ اپنی بیگم سے ابتدائی طور پر مشورہ کرسکیں، اگر ان کی طرف سے گرین سگنل مل گیا تو عالیہ کے والدین اور عادل کو بلاکر باقاعدہ پیغام دے دیا جائے گا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، میں نے جب انصاری صاحب کے سامنے یہ ذکر چھیڑا تو ان کی آنکھیں حیرت اور خوشی سے پھیل گئیں۔ لڑکی کا باپ ہونے کے ناتے انہیں فوری طور پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن انہوں نے جذبات میں آکر میرا ہاتھ پکڑلیا اور بولے۔

"اگر ایسا ہوجائے تو اس سے اچھی کیا بات ہوسکتی ہے۔"

اس کے بعد تمام معاملات بڑی تیزی سے طے پاگئے۔ انصاری صاحب کی بیگم تو خوشی سے پھولی نہیں سمارہی تھیں۔ علینہ کو بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ البتہ زرینہ کا رویہ خاصا حیران کن تھا۔ جیسے اسے اس سارے معاملے سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔ گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہوچکی تھیں لیکن وہ ان سے بالکل لاتعلق تھی۔ انصاری صاحب کی بیگم کو ہی سارے کام کرنا پڑرہے تھے۔ شادی کے موقعے پر عادل کی برات میں ہمارے گھر کے بھی لوگ آئے تھے۔ میری خواہش تھی کہ امی اور ابا جان کچھ روز میرے ساتھ رہیں۔ ابا جان نے تو کاروباری مصروفیت کے سبب معذرت کرلی البتہ امی میرے بے حد اصرار پر کچھ دنوں کے لیے رک گئیں۔

ان دنوں میں نے ایک خاص بات یہ نوٹ کی کہ

زرینہ کی میرے گھر آمدورفت بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ امی سے ملنے کے بہانے آتی اور کئی کئی گھنٹے بیٹھی رہتی۔ صبح اور شام میں اس کے دو چکر لازمی تھے۔ وہ امی کے بہت سے کام بغیر کہے کردیتی تھی جبکہ عالیہ بچوں اور گھر کے کام کاج کی وجہ سے امی کو زیادہ وقت نہیں دے سکتی تھی۔ چند ہی دنوں میں زرینہ نے امی کو اپنا گرویدہ بنایا اور وہ اٹھتے بیٹھتے اس کی تعریفیں کرنے لگیں۔ عالیہ ویسے تو بڑی سادہ مزاج اور صاف دل کی عورت تھی لیکن امی کی زبانی اس کی اتنی زیادہ تعریف اسے بھی اچھی نہ لگی۔ وہ زبان سے تو کچھ نہ بولی لیکن اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اسے زرینہ کا آنا ناگوار گزرتا ہے۔

امی کچھ دن رہ کر واپس کراچی چلی گئیں۔ جاتے وقت انہوں نے بیگم انصاری سے وعدہ کیا کہ وہ زرینہ کے لیے جلد ہی کوئی مناسب رشتہ تلاش کرلیں گی۔ مجھے امی کی سادگی پر ہنسی آگئی۔ زرینہ کے لیے رشتوں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن وہ خود ہی شادی کے لیے آمادہ نہیں ہورہی تھی اور کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے ہر رشتے سے انکار کردیتی تھی۔ امی کے جانے کے کچھ ہی دنوں بعد اس کے لیے ایک بہت اچھا رشتہ آیا۔ لڑکا ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور ہمایوں کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔ زرینہ نے ہمیشہ کی طرح اس رشتے کو بھی رد کرنا چاہا لیکن اس بار انصاری صاحب اور ہمایوں کا ردِعمل بہت مختلف تھا۔ وہ کسی قیمت پر بھی اس رشتے کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔ انصاری صاحب نے تو اپنی بیگم سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر زرینہ نے اس رشتے سے انکار کردیا تو وہ ساری عمر اس سے بات نہیں کریں گے اور نہ ہی اس سے کوئی تعلق رکھیں گے۔ ہمایوں نے بھی اس سے ملتی جلتی دھمکی دی تو زرینہ پریشان ہوگئی۔ وہ دوڑی دوڑی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ اس معاملے میں اس کی مدد کروں۔ مجھے اس کی بات سن کر بہت غصہ آیا اور میں نے بے رخی سے کہا۔

"اگر تمہارے پاس انکار کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ ہے تو مجھے بتاؤ۔ اس کے بعد ہی میں تمہاری مدد کرنے کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔" وہ اپنا منہ دوسری جانب کرتے ہوئے بولی "میں کسی دوسرے مرد کو بھرپور توجہ اور محبت نہیں دے سکتی کیونکہ میں کسی اور کو چاہتی ہوں۔"

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے اس کا نام بتادو۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہاری شادی اس سے ہوجائے۔"

"کاش یہ سب اتنا ہی آسان ہوتا جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔" وہ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے بولی "وہ مجھے نہیں مل سکتا کیونکہ وہ پہلے ہی کسی اور کا ہوچکا ہے۔"

زرینہ نے کسی کا نام نہیں لیا لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ اس کا اشارہ کس کی جانب ہے۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور کہا "اس حقیقت کو جان لینے کے باوجود کہ وہ تمہیں نہیں مل سکتا، تم کیوں اپنا وقت ضائع کررہی ہو۔ کیا تمہیں کسی معجزے کا انتظار ہے۔ یاد رکھو کہ اس معاشرے میں کوئی لڑکی تنہا نہیں رہ سکتی۔ تمہیں ایک پناہ گاہ کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کہ وقت تمہارے ہاتھ سے نکل جائے تمہیں اپنے لیے ایک گھر تلاش کرلینا چاہیے۔"

"یہ تو منافقت ہوگی کہ پیار کسی اور سے کروں اور شادی کسی اور سے، میں یہ ناٹک نہیں رچاسکتی۔"

"پھر اپنے محبوب سے کہو کہ وہ بیوی کو طلاق دے کر تم سے شادی کرلے۔"

"میں اتنی خود غرض نہیں کہ اپنی خوشیوں کی خاطر کسی کا ہنستا بستا گھر اجاڑ دوں۔" وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔ "اسے تو شاید میری چاہت کا بھی علم نہیں۔"

"تم ایک سائے کا تعاقب کررہی ہو، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تمہیں نہیں مل سکتا۔ بہتر ہوگا کہ تم اس یکطرفہ محبت کی قربانی دے دو۔ ہوسکتا ہے کہ شادی کے بعد تم اپنے محبوب کو بھول جاؤ اور شوہر سے محبت کرنے لگو۔"

اس نے زخمی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک التجا تھی۔ جیسے وہ کسی معجزے کا انتظار کررہی ہو۔ جیسے اسے یقین ہو کہ میں آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لوں گا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں پتھر کے بت کی طرح اپنی جگہ کھڑا رہا۔ زرینہ کے آنسو میرے دل کو موم کررہے تھے۔ ممکن تھا کہ مجھ سے کوئی لغزش سرزد ہوجاتی اور میں کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آجاتا لیکن میں نے اپنے اعصاب پر قابو پالیا۔ زرینہ کی آنکھوں میں امید کے دیے بجھ گئے اور وہ لڑکھڑاتے قدموں سے میرے گھر کی دہلیز پار کرگئی۔

اس کے جانے کے بعد میرے دل کی کسک بڑھتی گئی۔ یوں لگا جیسے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے چاہنے لگا ہوں۔ شاید زرینہ نے اعترافِ محبت کے بعد میرے دل میں جگہ بنالی تھی۔ عالیہ میری بیوی تھی اور میں اس سے

وفاداری نبھانے پر مجبور تھا جبکہ زرینہ سے مجھے محبت ہوگئی تھی۔ اس باریکی کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو محبت کرنے اور محبت ہوجانے کے فرق سے واقف ہیں۔

مجھ سے مایوس ہونے کے بعد وہ شادی کے لیے تیار ہوگئی۔ انصاری صاحب اور ان کی بیگم کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا وہ بڑے زور و شور سے اس کی شادی کی تیاریوں میں لگ گئے۔ علینہ اور ہمایوں بھی آگئے تھے اور انصاری صاحب کے گھر میں خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ میں اور عالیہ روزانہ شام کو ان کے گھر جاتے اور شادی کی تیاری میں ان کا ہاتھ بٹاتے۔ اس روز کے بعد زرینہ نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ اتفاقاً ہمارے پاس آکر بیٹھ جاتی اور زیادہ تر خاموش ہی رہتی۔ میں اس کی ناراضی کی وجہ جانتا تھا لیکن مجھے اس بارے میں زیادہ پریشانی نہیں تھی اور یہی سوچ کر دل کو تسلی دے لیتا کہ چند روز ہی کی تو بات ہے۔ شوہر کا ساتھ پاکر وہ سب کچھ بھول جائے گی اور اسے یاد بھی نہیں رہے گا کہ زندگی کے کسی موڑ پر اس کا مجھ سے سامنا ہوا تھا۔

زرینہ کی شادی کے دو ماہ بعد میرا تبادلہ پشاور ہوگیا۔ اس زمانے میں ٹیلی فون کی سہولت عام نہیں تھی اور خط لکھنے کے معاملے میں، میں ہمیشہ سے ہی کاہل واقع ہوا ہوں اس لیے انصاری صاحب کے گھر والوں سے میرا رابطہ تقریباً ختم ہوگیا تھا۔ علینہ اور عادل بھی کینیڈا چلے گئے تھے ورنہ انہی کے ذریعے انصاری صاحب کی خیر خیریت معلوم ہوجاتی۔ ایک کام کے سلسلے میں میرا لاہور جانا ہوا تو اتفاقاً میری ملاقات ہمایوں سے ہوگئی۔ وہ مجھے کچھ پریشان سا لگ رہا تھا لیکن اس نے مجھے اپنی پریشانی کی وجہ نہیں بتائی۔ بس دو چار رسمی باتیں کرکے رخصت ہوگیا۔ البتہ میں نے اس سے اس کا فون نمبر لے لیا تاکہ بوقتِ ضرورت اس سے رابطہ کرسکوں۔

زندگی کا سفر تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ میں ترقی کرتے کرتے گریڈ بائیس کا افسر بن چکا تھا۔ اس دوران بہت سے واقعات رونما ہوئے۔ والد دنیا سے رخصت ہوگئے، بھائیوں نے بھی اپنے اپنے الگ ٹھکانے بنالیے۔ ابا جان کے انتقال کے بعد امی اکیلی رہ گئی تھیں اس لیے میں نے ان کی تنہائی دور کرنے کی غرض سے عالیہ کو ان کے پاس کراچی بھیج دیا۔ ویسے بھی بچے اب بڑی کلاسوں میں آچکے تھے اور میرا بار بار تبادلہ ہونے سے ان کی پڑھائی متاثر ہورہی تھی۔ اس لیے یہی مناسب سمجھا کہ انہیں کراچی میں ہی رہ کر اپنی تعلیم مکمل کرنی چاہیے۔

صحت مند گھرانے میں

بچے کا ذہن تیزی سے نشوونما پاتا ہے

ماہرینِ نفسیات کے مطابق ایسے بچے جو صحت مند گھرانے میں پرورش پارہے ہیں ان کا ذہن زیادہ تیزی کے ساتھ نشوونما پاتا ہے۔ یہاں صحت سے مراد صرف جسمانی صحت نہیں ہے بلکہ ذہنی و نفسیاتی صحت مراد ہے۔ دانشوروں نے تحقیقات کے بعد نتیجہ نکالا ہے کہ جو بچے اپنے مذہب، تہذیب اور کلچر سے دور زندگی گزارتے ہیں وہ ذہنی دباؤ کا شکار ہوجاتے ہیں جس سے ان کی ذہنی نشوونما متاثر ہوتی ہے۔

پیدائش کے پہلے سال میں بچے کا ذہن تیزی سے بڑھتا ہے۔ چنانچہ تین سے چار سال کی عمر میں بچے کے دماغ کا ایک اہم سسٹم جو بچے کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور جسمانی سرگرمیوں کو منظم کرنے کی صلاحیت دیتا ہے، مکمل ہوجاتا ہے۔ اس عمر میں بچے کے دماغ میں معلومات کا انبار موجود ہوتا ہے اور کسی زبان کے تمام الفاظ کا ذخیرہ اس کے پاس ہوتا ہے۔ اب وہ اپنی ضروریات کو آسانی بیان کرسکتا ہے۔

بعض والدین اپنے بچوں کو گود میں نہیں لیتے اور ان سے باتیں نہیں کرتے ہیں۔ یہ چیز بچوں میں ذہنی خلل کا باعث بنتی ہے۔ جن بچوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کیا جائے وہ ہر وقت غصے میں رہتے ہیں اور چیخ و پکار کرتے رہتے ہیں۔ ایسے بچے ذہنی کمزوری کے ساتھ نفسیاتی مسائل میں بھی مبتلا رہتے ہیں۔

بعض بچے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی آواز تو بہت سنتے ہیں، والدین کی چپقلش یا بھائی بہن کے درمیان ہونے والی لڑائی کی آواز تو ان کے کانوں میں جاتی ہے لیکن اپنے والدین اور بہن بھائیوں اور دوسرے ساتھیوں کی پیار بھری آوازوں سے محروم رہتے ہیں۔ ان میں سے کوئی آواز ایسی نہیں ہوتی جو بچے کے لیے ہو یا اسے مخاطب کرے۔

مرسلہ: ندا زیبا، جیوٹ

میری ریٹائرمنٹ میں تین سال رہ گئے تھے اور قاعدے کی رُو سے مجھے یہ مدت اپنے اسٹیشن پر ہی گزارنا تھی لہٰذا چند ماہ بعد میرا ٹرانسفر بھی کراچی ہوگیا۔ دونوں بیٹے اپنی تعلیم مکمل کرچکے تھے اور انہیں ملک سے باہر جانے کی دُھن سوار تھی۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ یہاں رہ کر بھی کوئی اچھی ملازمت تلاش کرسکتے ہیں لیکن وہ نہیں مانے۔ ان کا خیال تھا کہ فارن ڈگری کے بغیر کوئی اچھی ملازمت نہیں مل سکتی لہٰذا وہ یہاں رہ کر اپنے مستقبل کو داؤ پر نہیں لگا سکتے۔

ان کے جانے کے چند ماہ بعد امی کا بھی انتقال ہوگیا۔ کراچی آنے سے پہلے میں سوچا کرتا تھا کہ بس چند دنوں کی بات ہے۔ اپنے شہر میں اپنے پیاروں کے ساتھ رہ کر کتنا مزہ آئے گا۔ خوب رونق لگے گی۔ بچوں کی شادیاں ہوجائیں گی، ان کے بچے ہوں گے۔ پھر تو یہ کوٹھی بھی چھوٹی پڑ جائے گی لیکن انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ اور ہے۔ امی ابا چلے گئے۔ بیٹوں نے پردیس کی راہ لی۔ اب اتنی بڑی کوٹھی میں ہم تین افراد رہ گئے۔ یعنی میں، عالیہ اور میری بیٹی، پھر اس کی بھی شادی ہوگئی۔

بچوں کے بغیر گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ میں اور عالیہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے تھک جاتے لیکن طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ میری خواہش تھی کہ دونوں بیٹے گھر واپس آجائیں لیکن وہ ہمیشہ ہنس کر میری بات ٹال دیتے بلکہ جواب میں یہی کہتے کہ آپ دونوں وہاں بیٹھے کیا کررہے ہیں؟ ہمارے پاس آجائیں۔ میں تو شاید ان کی بات مان لیتا لیکن عالیہ کسی طرح بھی اپنا گھر اور ملک چھوڑنے پر تیار نہ تھی۔ ایک بار پھر مجھے کسی کام کے سلسلے میں لاہور جانا پڑا تو مجھے ہمایوں سے ملنے کا خیال آیا۔ میں نے اسے فون کیا تو وہ خود ہی مجھے لینے آگیا۔ اس کی رہائش اقبال ٹاؤن میں تھی اور وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بہ ظاہر خوش وخرم زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی زبانی معلوم ہوا کہ انصاری صاحب اور ان کی بیگم کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہوچکا تھا۔ زرینہ کو شادی کے کچھ دنوں بعد ہی طلاق ہوگئی تھی۔ پھر اس نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ وہ گورنمنٹ کالج میں لیکچرار ہوگئی تھی۔ ہمایوں کو اس کے موجودہ ٹھکانے کا کوئی علم نہیں تھا۔ آخری بار جب اس سے رابطہ ہوا تو ان دنوں وہ کراچی میں تھی۔ اس نے ہمایوں سے اپنا تعلق ختم کرلیا تھا کیونکہ وہ اسے اپنی بربادی کا ذمے دار سمجھتی تھی۔ البتہ علینہ سے اس کی کبھی کبھار فون پر بات ہوجاتی ہے اور اسے بھی علینہ سے ہی اس کی خیریت کا پتا چلتا رہتا ہے۔

مجھے ہمایوں کی زبانی زرینہ کے حالات جان کر بہت افسوس ہوا۔ میرا خیال تھا کہ اس معاملے میں اس سے بھی تھوڑی بہت کوتاہی ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ زرینہ کی ناراضی اپنی جگہ لیکن بھائی ہونے کی حیثیت سے اس کا فرض تھا کہ وہ اس کی خبر گیری کرتا۔ ہمایوں کا کہنا تھا کہ اس نے اپنی طرف سے پوری کوشش کرلی کہ وہ اس کے ساتھ رہے لیکن زرینہ اس پر تیار نہ ہوئی۔ بعض اوقات تو وہ اس کا فون بھی ریسیو نہیں کرتی تھی اور اس نے ایک سے زائد مرتبہ کہا کہ وہ اسے فون نہ کیا کرے کیونکہ وہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔

میں نے ہمایوں سے زرینہ کا فون نمبر مانگا تو اس نے معذرت کرلی اور کہا کہ اس کے پاس زرینہ کا موجودہ فون نمبر نہیں ہے۔ البتہ وہ مجھے علینہ کا فون نمبر اور ای میل ایڈریس دے سکتا ہے۔ میں اگر چاہوں تو اس سے رابطہ کرکے زرینہ کے بارے میں معلومات حاصل کرسکتا ہوں۔ اس نے مجھے اپنے وزیٹنگ کارڈ کی پشت پر علینہ کا ای میل ایڈریس اور فون نمبر لکھ کر دے دیا۔ میں نے کارڈ بہ غور پڑھا تو اس کے لاہور اور نیویارک کے ایڈریس لکھے ہوئے تھے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ انصاری صاحب کے انتقال کے بعد وہ بھی امریکا چلا گیا تھا اور وہیں اس نے مستقل رہائش اختیار کرلی تھی۔ ان دنوں وہ بیوی بچوں کے ساتھ چھٹیاں گزارنے پاکستان آیا ہوا ہے۔

میں نے اسے سمجھایا کہ زرینہ کی ناراضی اپنی جگہ لیکن اسے بہن کی طرف سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ یہ اس کا دینی اور دنیاوی فریضہ ہے کہ بہن کی خبر گیری کرتا رہے۔ اگر وہ اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تب بھی اس پر لازم ہے کہ فون کے ذریعے اس سے رابطہ رکھے، میرے سمجھانے کا یہ اثر ہوا کہ اس نے سنجیدگی سے ایک بار پھر رابطہ کرنے کا فیصلہ کرلیا اور بولا ”میں ابھی ایک مہینا اور لاہور میں ہوں۔ اس دوران اس کا ٹھکانا معلوم کرکے اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ اگر کامیابی ہوگئی تو اس کی اطلاع آپ کو بھی دے دوں گا۔“

ہمایوں کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے ٹالنے کی کوشش کررہا تھا۔ مجھے اس سے کسی مدد کی امید نہیں تھی لہٰذا میں نے علینہ کو ای میل کیا۔ اس نے جو پتا مجھے بتایا، زرینہ وہاں نہیں ملی۔ پڑوسیوں سے بہ مشکل اتنا معلوم ہوسکا کہ وہ چند روز پہلے وہ جگہ چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میں نے اس کے کالج کا نام معلوم کرنا چاہا لیکن وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے

تھے۔ ان لوگوں کی باتوں سے اتنا اندازہ ضرور ہوگیا کہ وہ تنہا اور لاتعلق زندگی گزار رہی تھی اور محلے کے کسی گھر میں اس کا آنا جانا نہیں تھا۔

میں نے اپنے طور پر زرینہ کا پتا چلانے کی پوری کوشش کی مگر ناکام رہا۔ شہر کے تمام کالجز چھان مارے لیکن وہ مجھے نہیں مل سکی۔ تنگ آکر میں نے ایک بار پھر علینہ سے رابطہ کیا اور اس سے کہا کہ جیسے ہی اسے زرینہ کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو مجھے ضرور اطلاع دے۔ علینہ نے وعدہ تو کرلیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس کے پاس زرینہ کا موجودہ پتا نہیں ہے، وہ خود ہی کبھی کبھار فون کرلیتی ہے۔

تھک ہار کر میں نے زرینہ کی تلاش ترک کردی۔ میں خود یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ میں اس کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہوں۔ اسے اتنی شدت سے کیوں تلاش کررہا ہوں؟ اگر وہ مجھے مل بھی گئی تو کیا ہوگا؟ میرا اس سے کیا رشتہ ہے؟ میں اس سے کس تعلق کی بنیاد پر ملوں گا۔ میرے پاس کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا بس ایک خلش تھی جو مجھے بے چین کیے جارہی تھی۔ وہ تو میرے لیے ایک بھولا ہوا خواب تھی۔ لیکن ہمایوں سے ملنے اور اس کے حالات جاننے کے بعد وہ پوری طرح میرے دل ودماغ پر قابض ہوگئی تھی۔ کبھی کبھی یوں لگتا کہ اس کی موجودہ حالت کا میں ہی ذمے دار ہوں لیکن کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ میں بے بس اور مجبور ہوں۔ وہ چاند کو چھونے کی تمنا کررہی تھی جو اس کی پہنچ سے باہر تھا۔ اگر اس نے اپنی آنکھوں میں کچھ خواب سجالیے تھے تو اس میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ ہاں اگر میں نے اسے کوئی امید دلائی ہوتی، کوئی وعدہ کیا ہوتا تو میں خطاوار ٹھہرایا جاتا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس کے برعکس میں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی جو بے سود رہی۔

ریٹائرمنٹ کے بعد میرے لیے وقت گزارنا مشکل ہوگیا۔ عالیہ نے اپنے آپ کو گھر کے کاموں میں مصروف کر رکھا تھا۔ میں نے اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے کتابوں کا سہارا لیا۔ اب میرا زیادہ وقت کتابیں پڑھنے اور عالیہ سے باتیں کرنے میں گزر جاتا۔ کبھی کبھی بیٹوں سے نیٹ پر باتیں ہو جاتیں۔ ان کی بس ایک ہی رٹ تھی کہ ہم دونوں سب کچھ چھوڑ کر ان کے پاس چلے جائیں لیکن عالیہ اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے زبان سے کبھی کچھ نہیں کہا لیکن وہ اپنا دکھ چھپانے کا ہنر جانتی تھی۔ اندر چاہے کتنے ہی طوفان مچل رہے ہوں لیکن اس کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ نظر آتی۔

بیٹوں کے جانے کا دکھ اس نے برداشت تو کرلیا لیکن وہ دل میں ان سے ناراض تھی اور اسی لیے ان کے پاس جانے سے انکار کررہی تھی۔

بیٹی کی شادی کے بعد وہ بالکل تنہا ہوگئی تھی۔ وہ دن بھر پوری کوٹھی میں بولائی بولائی پھرتی۔ بار بار دروازے پر جاتی جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ شاید نہیں جانتی تھی کہ جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ آخر وہ یہ صدمہ برداشت نہ کرسکی اور ایک دن خاموشی سے اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اب میں ہی تنہائی کا عذاب سہنے کے لیے زندہ رہ گیا تھا۔

یہاں پہنچ کر اس کہانی کو ختم ہوجانا چاہیے لیکن جب تک اس میں کوئی دلچسپ موڑ نہ آئے یا وہ کسی غیر متوقع انجام پر پہنچ کر ختم نہ ہو تب تک وہ کہانی نہیں کہلاتی بلکہ ایک سپاٹ سا قصہ بن کر رہ جاتی ہے۔ میری کہانی میں بھی ایسا ہی ایک موڑ آیا۔ عالیہ کے انتقال کے بعد میں نے سوچ لیا تھا کہ اب میرے لیے اتنی بڑی کوٹھی میں تنہا رہنا ممکن نہیں اس لیے مجھے بیٹوں کی بات مان لینی چاہیے۔ اس روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا کسی کتاب کا مطالعہ کررہا تھا کہ ملازم نے مجھے کسی خاتون کی آمد کی اطلاع دی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھ سے ملنے کون سی عورت آسکتی ہے؟ میں ملازم سے کہنے ہی والا تھا کہ وہ اس عورت کو ڈرائنگ روم میں بٹھائے لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ خود ہی ملازم کے پیچھے پیچھے میرے کمرے تک چلی آئی۔ اس نے چادر سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ میں اسے اپنے سامنے دیکھ کر گڑبڑا گیا اور جھجکتے ہوئے بولا۔

”معاف کیجیے خاتون...... ! میں نے آپ کو پہچانا نہیں؟“

میں نے ملازم کو اشارہ کیا کہ وہ مہمان کی خاطر مدارات کا کچھ بندوبست کرے۔ اس کے جانے کے بعد عورت نے اپنے چہرے سے چادر ہٹادی۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ چہرہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا، میں اسے ہزاروں کے مجمع میں بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ زرینہ تھی، پچیس سال بعد بھی اس کے چہرے کی شادابی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا۔

”تم ... تم ... یہاں کیسے؟“

”آپ کو یقیناً مجھے یہاں دیکھ کر حیرت ہورہی ہوگی۔ پچیس سال بعد آخر کوئی اس طرح سامنے آجائے تو حیرت ہونی ہی چاہیے۔ آپ تو شاید مجھے بھول گئے ہوں لیکن میں آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی نہ بھلا سکی۔“

"تم کیسے کہہ سکتی ہو۔ میں نے تو تمہیں تلاش کرنے کی بہت کوشش کی۔"

"جانتی ہوں لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ علینہ نے مجھے سب بتا دیا تھا کہ کس طرح آپ کی ہمایوں سے ملاقات ہوئی اور میرے حالات معلوم ہو جانے کے بعد آپ کے دل میں دبی ہوئی کوئی چنگاری سلگ اٹھی۔ علینہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ مجھے بڑے زور و شور سے تلاش کرتے رہے۔ اس لیے میں نے اپنا ٹرانسفر دوسرے شہر کروا لیا تاکہ آپ سے سامنا نہ ہو سکے۔"

"یقین جانو زرینہ، مجھے تمہارے حالات جان کر بہت افسوس ہوا۔"

"لیکن مجھے کوئی افسوس یا پچھتاوا نہیں ہے۔ یاد ہے کہ آپ نے آخری ملاقات میں کیا کہا تھا کہ محبت قربانی مانگتی ہے۔ سو میں نے اسے آپ کا حکم سمجھ کر تعمیل کی اور شادی کے لیے ہاں کر دی۔ پھر آپ کا تبادلہ دوسرے شہر ہو گیا اور میں بھی کچھ دنوں بعد اپنے گھر واپس آ گئی۔ شوہر سے میرا نباہ نہ ہو سکا۔ میرا دل تو کسی اور کی محبت میں تڑپ رہا تھا پھر میں اس سے وفا کس طرح کر سکتی تھی، چنانچہ اس نے مجھے آزاد کر دیا۔ ابو یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے اور کچھ دنوں بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میں نے ایک کالج میں لیکچررشپ اختیار کر لی اور کوشش کر کے اپنا تبادلہ اسی شہر میں کروا لیا جہاں آپ رہائش پذیر تھے۔ آپ کو پتا بھی نہ چلا کہ میں آپ کے کتنے قریب آ چکی ہوں۔ جانتی تھی کہ ایک سائے کا تعاقب کر رہی ہوں لیکن میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں آپ کا سامنا کرنے سے ڈرتی تھی کہ کہیں میری وجہ سے آپ کی ازدواجی زندگی متاثر نہ ہو اسی لیے دور دور سے دیکھ کر اپنی نظروں کی پیاس بجھا لیتی تھی۔

ہمایوں اور علینہ نے بڑی کوشش کی کہ میری دوسری شادی کروا دیں لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ جب ان کا اصرار حد سے بڑھ گیا تو میں نے ان سے بھی لاتعلقی اختیار کر لی۔ ہمایوں تو امریکا جا کر اپنی دلچسپیوں میں مگن ہو گیا اور اس نے کبھی یہ جاننے کی زحمت بھی نہیں کی کہ میں کس حال میں ہوں۔ علینہ سے میرا رابطہ رہا اور میں فون پر اس سے بھی بات کر لیا کرتی۔ اس نے بتایا کہ آپ مجھے تلاش کر رہے ہیں تو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی اور یوں لگا جیسے میری عمر بھر کی ریاضت رائگاں نہیں گئی۔ آپ کے دل میں میری محبت تھی، اس سے زیادہ میرے لیے خوشی کی کیا بات ہو سکتی تھی۔ اب میں یہیں کراچی میں ہوں۔ عالیہ کی موت کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ میں آپ کو صبر کی تلقین بھی نہیں کر سکتی کیونکہ جانتی ہوں کہ تنہائی کا دکھ کیا ہوتا ہے۔"

اس کی باتیں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ میں کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ بہ مشکل تمام اتنا ہی کہہ سکا "اب کیا رہ گیا ہے ہمارے پاس، سب کچھ ختم ہو گیا۔"

"شاید!" وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولی "لیکن میں اپنے آپ کو خالی ہاتھ نہیں سمجھتی کیونکہ میرے پاس محبت کی دولت ہے۔ میں نے اس خزانے کی پوری طرح حفاظت کی ہے۔ کم از کم مجھے یہ پچھتاوا تو نہیں کہ میں محبت کی آزمائش میں پوری نہیں اتری۔"

"زرینہ، مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تمہارے جذبات کی قدر نہیں کی۔ شاید تم بھی یہ بات جانتی ہو کہ ایسا ممکن نہ تھا۔ آج بھی میں پہلے کی طرح مجبور اور بے بس ہوں۔ عالیہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی لیکن اس کی روح سے میرا تعلق ختم نہیں ہوا۔ وہ آج بھی میرے وجود کا حصہ ہے اور میں اسے اپنے سے الگ نہیں کر سکتا۔"

"میں نے تم سے ایسی کوئی امید نہیں باندھی۔" وہ اچانک ہی آپ سے تم پر آ گئی "جس طرح پچیس سال سے تمہیں دیکھ دیکھ کر جی رہی ہوں، ویسے ہی بقیہ زندگی گزار لوں گی۔ البتہ تمہاری تنہائی مجھے بہت گراں گزر رہی ہے۔ میں پورے خلوص کے ساتھ تمہارا دکھ بانٹنے کے لیے تیار ہوں۔ اب تک میں عالیہ کی وجہ سے تمہارے سامنے نہیں آئی تھی لیکن اب مجھے تم سے چھپنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں تمہاری زندگی میں نہیں آ سکی تو کیا ہوا، ایک اچھے دوست کی طرح تمہارے دکھ کا مداوا تو کر سکتی ہوں۔"

مجھے اس کے خلوص اور محبت پر کوئی شک نہ تھا۔ اس کے باوجود میں اس کی پیش کش قبول نہ کر سکا۔ جانتا تھا کہ اس معاشرے میں مرد اور عورت کی دوستی کو کس نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی، میں نے اس کی پیشکش کا کوئی جواب نہیں دیا اور وہ ایک بار پھر میرے دروازے سے خالی ہاتھ لوٹ گئی، جس طرح پچیس سال پہلے مایوس ہو کر گئی تھی۔ میں آج یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ مجھے پہلی نظر میں ہی اس سے محبت ہو گئی تھی لیکن اپنی مجبوریوں کے سبب اس سے محبت نہ کر سکا۔ میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ محبت ہونے اور محبت کرنے میں اتنا فرق کیوں ہوتا ہے؟

راوی: شاہد

تحریر شہاب شیخ

محترم مدیر اعلیٰ

سلام مسنون

میں اپنی آپ بیتی بھیج رہا ہوں۔ لکھنے پڑھنے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے پھر بھی اپنے حالاتِ زندگی کاغذ پر منتقل کر ہی لیے۔ اگر اندازِ تحریر کہانی جیسا نہ لگے تو کسی اچھے رائٹر سے اسے دوبارہ لکھوالیں۔

شاہد

(کراچی)

میری اور میرے چھوٹے بھائی راشد کی شادی ایک ساتھ ہوئی تھی۔ یہ امی کا فیصلہ تھا۔ ان کا فیصلہ آخری ہوتا تھا اور ان کے سامنے کوئی چوں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ابا بھی خاموشی اختیار کر لیتے تھے۔

مجھ سے دو بڑے بھائی تھے، عابد اور واحد۔ ایک چھوٹی بہن تھی جمیلہ۔ ہمارا اپنا گارمنٹس کا کاروبار تھا۔ کارخانہ ہم بھائی مل کر چلاتے تھے۔ گھر میں ابا، امی کے سامنے بھیگی بلی بنے رہتے تھے گویا گھر پر اماں کا راج تھا۔ ایک چھوٹا بھائی ماجد تھا۔

ہمارا گھر بہت بڑا تھا۔ چار کمرے ہم چار شادی شدہ بھائیوں کو دے دیے گئے تھے۔ چار کمرے مزید تھے جو امی، ابو، چھوٹے بھائی ماجد اور چھوٹی بہن جمیلہ کے استعمال میں تھے۔

میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہا تھا کہ عظمٰی میری بیوی بن گئی تھی۔ تعلق ہمارے ہی محلے سے تھا اور وہ محلے کی حسین لڑکیوں میں شمار ہوتی تھی۔ اس کے لیے بہت رشتے آئے تھے لیکن قرعہ میرے نام کھلا تھا۔ ہماری شادی کو بیس دن گزر چکے تھے۔ اس دوران یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ عظمٰی نہایت سمجھ دار، سگھڑ اور بڑوں کا احترام کرنے والی لڑکی ہے مگر راشد کی بیوی زاہدہ بڑی غصے والی اور تیز طرار تھی۔ وہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔ ایسی لڑکیوں کے بارے میں میرا مشاہدہ تھا کہ وہ ہٹ دھرم، ضدی اور کافی حد تک بدتمیز ہوتی ہیں۔

میں کارخانے سے فارغ ہو کر گھر پہنچا تو ماحول میں کھنچاؤ سا تھا۔ سب ہی خاموش اور بجھے بجھے سے تھے۔ میں عظمٰی کو اپنے کمرے میں لے آیا اور بولا "کیا بات ہے، سب لوگ خاموش خاموش کیوں ہیں؟"

"زاہدہ اور نسرین بھابی کی لڑائی ہوئی ہے۔" اس نے بتایا۔ نسرین عابد بھائی کی بیوی تھیں۔

"اوہ...... یہ تو بہت افسوسناک بات ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"ہمارے گھر میں لڑائی جھگڑے کا کوئی رواج نہیں ہے لیکن اب یہ کیا ہونے لگا ہے۔" میں نے کہا۔

"زاہدہ کو سنبھالنا ہوگا کسی طرح۔" وہ بولی۔

"غلطی کس کی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"زاہدہ کی۔" اس نے جواب دیا "نسرین بھابی سے تھوڑی سی چائے گر گئی اس پر، بس وہ پھٹ پڑی، سنبھالنا مشکل ہو گیا اسے۔ کہہ رہی تھی انہوں نے چائے جان بوجھ کر گرائی ہے۔"

"اچھا ہو سکے تو تم اسے سمجھانا۔ شاید تمہاری بات سمجھ جائے وہ۔ تم بھی نئی ہو اور وہ بھی نئی ہے۔ پرانی والیوں کو ہو سکتا ہے وہ اپنی دشمن سمجھ رہی ہو۔" میں نے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں، میں اسے سمجھاؤں گی۔" اس نے تسلی دی۔ "کھانا لے آؤں آپ کے لیے؟" اس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"ہاں لے آؤ۔" میں نے جواب دیا۔

وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے زاہدہ کے رویے کا بڑا افسوس تھا۔ ہمارے گھر میں کبھی اس طرح نہیں ہوا تھا۔ میں راشد کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ شادی کے بعد سے وہ الجھا الجھا اور پریشان دکھائی دیتا تھا۔ منہ سے کچھ نہیں کہتا تھا لیکن اس کا چہرہ بولتا تھا۔ ہم دونوں اوپر تلے کے تھے اس لیے کافی بے تکلف تھے۔ ایک دوسرے سے دل کی بات بھی کہہ لیتے تھے لیکن راشد اپنی ازدواجی زندگی کے بارے میں کچھ بتانے سے نہ جانے کیوں گریزاں تھا۔ شاید سوچ رہا ہو کہ زاہدہ سدھر جائے گی۔ میں نے زاہدہ کے حوالے سے کئی بار اسے ٹٹولا بھی تھا لیکن وہ ہنس کر ٹال گیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھر کے ماحول میں کشیدگی بڑھنے لگی۔ زاہدہ نے سب ہی کو پریشان کر رکھا تھا۔ ایک روز عابد بھائی نے اعلان کر دیا کہ اب وہ اس گھر میں نہیں رہیں گے۔ ان کی اس بات کا امی نے بڑا اثر لیا اور بیمار پڑ گئیں۔ میں نے عابد بھائی سے کہا "عابد بھائی! آخر آپ نے کیوں الگ ہونے کا فیصلہ کیا ہے؟"

"تم جانتے ہی ہو۔" انہوں نے قدرے تلخی سے کہا۔

"آپ کا مطلب ہے زاہدہ؟" میں نے ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"ہاں۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ اس گھر کے بڑے ہیں۔ امی ابو کے بعد آپ ہی ہیں۔ آپ اگر ایسا کریں گے تو ہم چھوٹے کیا کریں گے؟" میں نے کہا۔

"میں اپنے بچوں کو سکون دینا چاہتا ہوں۔ وہ اس کی وجہ سے سہمے رہتے ہیں۔ نسرین مجھ سے لڑتی ہے۔ میں امی سے کہتا ہوں، وہ کچھ کر نہیں سکتیں۔ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟" وہ شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھے۔

"آپ زاہدہ کو سمجھائیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے اپنی عزت بڑی پیاری ہے بھائی! اس سے تو وہی بات کرے جس نے اپنی عزت کا ستیاناس کروانا ہو۔" وہ بولے۔

"اچھا آپ فکر نہ کریں، میں بات کروں گا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم کوشش کرکے دیکھ لو لیکن سب فضول ہوگا۔" انہوں نے سگریٹ سلگا لیا۔

"آپ ایک ہفتہ دیں مجھے، میں سب سنبھال لوں گا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بولے "اگر ایک ہفتے میں بات نہ بنی تو میں چلا جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے، مجھے یقین ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

میں نے عظمٰی کے ذریعے زاہدہ کو اپنے کمرے میں بلوایا اور اس سے نرم لہجے میں کہا "دیکھو زاہدہ! میں تم سے ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں۔ آخر کیا مسئلہ ہے، تم ہر وقت غصے میں کیوں رہتی ہو۔ کیا تمہیں ہمارے گھر میں کسی قسم کی پریشانی ہے؟"

"آپ کو مجھ سے کیا پریشانی ہے؟" اس نے میری بات کاٹ کر جواب دینے کے بجائے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"مجھے تو کوئی پریشانی نہیں ہے۔" میں نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔

"تو پھر آپ کیوں سوال جواب کر رہے ہیں، جس کو پریشانی ہے وہ مجھ سے بات کرے۔" وہ بولی۔

"دراصل ہمارے گھر میں ہم سب مل جل کر اور محبت سے رہتے ہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اسی طرح رہو۔" میں نے سمجھایا۔

"آپ کو تو کوئی پریشانی نہیں ہے ناں مجھ سے؟" وہ آنکھیں نکال کر بولی۔ میرا جی چاہا کہ اتنی زور کا تھپڑ اس کے گال پر رسید کروں کہ انگلیوں کے نشان بن جائیں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ بات بہت بگڑ جاتی۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر عظمٰی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تم ذرا سمجھاؤ اسے۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں کمرے سے باہر آ گیا۔ پھر امی کے کمرے میں پہنچ کر انہیں تسلیاں دینے لگا۔ میں واپس اپنے کمرے میں آیا تو عظمٰی بولی "وہ تو مجھ سے اکھڑی جا رہی ہے۔"

"کیوں، کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"کہتی ہے سارے گھر کو برباد کر دوں گی۔" اس نے جواب دیا۔

"آخر کیوں؟" میں نے زور دے کر پوچھا۔

"کہتی ہے کہ مجھے یہ گھر پسند ہی نہیں ہے۔" وہ بولی۔

"پسند نہیں ہے؟" میں نے تعجب سے کہا "پسند نہیں ہے سے کیا مراد ہے اس کی؟ اب تو یہی اس کا گھر ہے، اب تو اسے پسند کرنا ہی پڑے گا۔"

"بہت سمجھایا ہے میں نے اسے، بڑی غصے والی ہے بھئی وہ، وقت لگے گا اسے قابو کرنے میں۔" وہ بولی۔

"تم کسی طرح سنبھالو یار اس کو۔" میں نے بیزاری سے کہا "پتا نہیں کس سوچ کی عورت ہے یہ، شادی ہو چکی ہے، اب پسند ناپسند کی بات کر رہی ہے۔ راشد کو بھی مصیبت میں ڈالا ہوا ہوگا اس نے، وہ بھی پریشان نظر آتا ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں، میں سنبھال لوں گی اسے۔" اس نے مجھے تسلی دی۔ میں بے بسی سے گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اگلے روز جب میں گھر آیا تو یہ بری خبر ملی کہ عابد بھائی جا چکے ہیں۔ وہ بیوی بچوں کو لے گئے تھے۔ امی رو رہی تھیں۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ وہ میرے سینے سے لگ گئیں۔ میرے بھی آنسو نکل آئے۔ ماں کو پہلی بار بے بس دیکھا تھا۔ میں انہیں ان کی روایتی شان کے ساتھ دیکھنا چاہتا تھا، حکمرانی کرتے ہوئے۔ ان کی بے بسی پر دل رونے لگا۔ عظمٰی نے بتایا

مجھے بیس سال کی عمر سے خواجگانِ چشت سے عقیدت اور ارادت ہے اور خواجہ معین الدین کا حلقۂ ارادت میرے گوشِ جان میں ہے۔ چند سال پیشتر میں آپ کے روضۂ پاک کی زیارت سے مشرف ہو چکی ہوں۔ میرے بھائیؒ (دارا شکوہ) کی صحبت سے جو عارف کامل ہے، یہ شوق بہت تیز ہوا۔ 1049ھ میں جب میں اپنے والد خلد اللہ ملکہ وسلطانہ کی ہمراہی میں لاہور پہنچی تو میرا بھائی بھی ساتھ تھا۔ اسی سال میرے بھائی کو والد نے کابل کی طرف روانہ کیا۔ اس وقت میرے بھائی نے مجھے نفحات الانس کے مطالعے کی تاکید کی۔ میں نے ہمیشہ اس کتاب کو اپنے مطالعے میں رکھا اور اس سے روحانی فیض حاصل کیا۔ میرے بھائی نے مجھے دو بزرگوں کے بارے میں اطلاع دی۔ ان میں سے ایک شیخ شاہ دولہ دریائی تھے جو گجرات خورد میں سکونت رکھتے اور دوسرے حاجی عبداللہ تھے جنہوں نے ٹال جلال گکھڑ کے حوالی میں گوشہ نشینی اختیار کر رکھی تھی۔ جب ہماری سواری گجرات پہنچی تو میں نے اپنے ایک خواجہ سرا کے ذریعے شاہ دولہ کے پاس نیاز بھیجی اور فیض کی درخواست کی پھر جب ہم ٹال جلال گکھڑ کے قریب پہنچے تو حاجی صاحب کو نذر بھیجی جو انہوں نے واپس کر دی اور اپنی طرف سے ایک تسبیح و جائے نماز اور روٹی بھیجی۔ میں نے ان میں سے ایک ٹکڑا کھایا تو میرا دل روشن ہو گیا اور مجھے روحانی تسکین اور جمعیت خاطر حاصل ہوئی۔

اقتباس: جہاں آرا بیگم بنت شاہ جہاں کی سرگزشت

مرسلہ: ندیم مصطفیٰ، گجرات

کہ نسرین بھابی اور زاہدہ میں شدید جھڑپ ہوئی تھی اور دونوں نے آپس میں مار پیٹ بھی کی تھی۔ مجھے زاہدہ پر شدید غصہ آرہا تھا لیکن میں اس سے بات کر کے معاملات کو بگاڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے خاموش رہنے پر اکتفا کیا۔

عابد بھائی کے جانے سے گھر کے ماحول میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ اب آئے روز مجھے زاہدہ اور واحد بھائی کی بیوی زبیدہ کی لڑائیوں کے قصے سننے کو ملنے لگے۔ ایک روز تنگ آکر واحد بھائی بھی اپنے بیوی بچوں کو لے کر ہم سے الگ ہوگئے۔ ابو خاموشی سے سب کچھ دیکھتے رہتے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اندر ہی اندر سلگ رہے ہیں۔ امی کے لیے واحد بھائی کا بچھڑنا دوسرا بڑا صدمہ تھا۔ وہ چارپائی سے لگ گئیں۔ ان کا علاج معالجہ شروع ہوگیا لیکن طبیعت میں کوئی خاص بہتری نہ آئی اور پھر ایک روز وہ اتنی خاموشی سے مر گئیں کہ جیسے کہہ گئی ہوں کہ تم لوگ جانو اور تمہارے مسئلے، مجھ میں صدمے اٹھانے کی ہمت نہیں ہے۔

زاہدہ اب مزید شیر ہوکر رہنے لگی۔ ایک روز میں نے راشد سے کہا "یار، میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں بھائی بولو؟" اس نے کہا۔

"کیسی گزر رہی ہے تمہاری زندگی؟" میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کے چہرے پر زخمی مسکراہٹ آگئی، وہ بولا۔

"ٹھیک ہی گزر رہی ہے۔"

"کیا زاہدہ تمہاری کچھ بات مانتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی .. کیا مطلب؟" اس نے الجھی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"میرا مطلب ہے اگر کچھ بات مانتی ہے تو اسے سمجھاؤ، آج کل وہ ماجد سے لڑائی جھگڑے کر رہی ہے۔ پہلے ہی بڑا نقصان ہو چکا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ماجد بھی گھر چھوڑ کر چلا جائے۔" میں نے نرمی سے کہا۔

وہ الجھ گیا۔ پھر میری تسلی کی خاطر بولا "میں اسے سمجھاؤں گا۔"

"کوشش کر کے دیکھو، شاید وہ سدھر جائے۔" میں نے کہا۔

"جی بہتر ہے۔" اس نے سر جھکا لیا۔

اگلے ہی روز زاہدہ اور ماجد میں گرما گرم جھڑپ ہوگئی۔ میں اس وقت گھر میں ہی تھا "اگر دوسروں کی بیٹیوں کو رکھ نہیں سکتے تو کیوں بیاہ کر لے آتے ہو تم لوگ؟" زاہدہ نے غصے بھرے انداز میں ماجد سے کہا۔

"اصل میں تم جیسی غریب لڑکیوں کو اچھی سسرال مل جائے تو وہ اپنی اوقات بھول جاتی ہیں، بات صرف اتنی سی ہے۔" ماجد بھی غصے میں تھا۔

"غریب ہوگا تمہارا باپ!" زاہدہ پھنکاری۔

"زبان سنبھال کر بات کرو ورنہ ..." ماجد نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ راشد اپنے کمرے سے نکلا۔ اس نے ایک زوردار لات زاہدہ کی کمر پر رسید کی۔ وہ جا کر دیوار سے ٹکرائی اور وہیں گر کر کراہنے لگی لیکن چند لمحوں بعد ہی سنبھل کر اس نے راشد کو ماں کی گالی دی۔

"میں تجھے طلاق دیتا ہوں .. میں ..." اس سے پہلے کہ راشد مزید الفاظ ادا کرتا، میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور غصے سے بولا۔

"یہ کیا بے وقوفی کر رہے ہو؟ یہ نہیں ہوگا۔ اس گھر میں طلاق نہیں ہوگی۔ ایسا ہمارے خاندان میں کبھی نہیں ہوا ہے۔"

میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا پھر تیز تیز قدم اٹھاتا، گھر سے باہر چلا گیا۔

"طلاق کیوں نہیں دی کمینے نے مجھے۔ باہر کیوں چلا گیا؟" زاہدہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

میں نے اپنے ساتھ کھڑی عظمیٰ سے کہا "اسے تم کسی طرح سنبھالو، میں کمرے میں جا رہا ہوں۔"

"آپ جائیں، میں سنبھالتی ہوں۔" وہ بولی۔

میں کمرے میں آگیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ زاہدہ بڑی ڈھیٹ عورت ہے۔ اس ایک گندی مچھلی نے سارے جل کو گندا کر دیا تھا۔

کچھ دیر بعد عظمیٰ آگئی "وہ اب بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے بتایا۔

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا جس میں اطمینان کے ساتھ ساتھ بے بسی بھی شامل تھی۔

وقت گزرتا رہا لیکن گھر کے کشیدہ اور کھنچاؤ والے ماحول میں بہتری نہ آئی، زاہدہ اب بھی اپنی روش پر چل رہی تھی۔

ایک روز یہ روح فرسا خبر ملی کہ جمیلہ محلے کے ایک اوباش لڑکے جنید کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

میں بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ جبھی میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون نکال کر اس کے اسکرین پر نظر ڈالی۔ نمبر جانا پہچانا نہیں تھا۔ میں نے بٹن دبا کر فون کان سے لگا لیا اور بولا "ہیلو!"

"میں ماجد بول رہا ہوں، پی سی او سے۔" ماجد کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ہاں بولو۔" میں نے کہا۔

"آپ کو جمیلہ کا پتا چل گیا ناں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"اب تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔"

"ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو لیکن..."

"میں اب کبھی اس گھر میں نہیں آؤں گا۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا "میں یہ شہر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

"لیکن کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"دنیا بہت بڑی ہے۔" اس نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے فون کان سے ہٹا کر اسے بے بسی سے دیکھا اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"کیا ہوا؟" عظمیٰ نے پوچھا۔ وہ میرے قریب ہی بیٹھی تھی۔

"ماجد کا فون تھا۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

"کیا کہہ رہا تھا؟"

"اب وہ اس گھر میں نہیں آئے گا۔"

"اوہ...... لیکن کیوں؟"

"جمیلہ کی حرکت کی وجہ سے؟"

"اوہ......" وہ بے بسی سے ایک گہری سانس لے کر رہ گئی "یہ تو بہت برا ہوا۔"

"جب سے وہ منحوس زاہدہ اس گھر میں آئی ہے، برا ہی ہو رہا ہے۔ نہ جانے کس بات کا انتقام لے رہی ہے وہ ہم سے؟" میں پھٹ پڑا۔

"آپ حوصلہ کریں۔" وہ میرے قریب آکر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"کیا حوصلہ کروں۔" میں نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔

"دونوں بڑے بھائیوں کے جانے کے بعد اب آپ پر ہی گھر کی ساری ذمے داری ہے۔ آپ حوصلہ ہار بیٹھے تو ہم سب کا کیا ہوگا؟" وہ بولی۔

میں بے بسی سے ایک گہری سانس لے کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے پانی پلایا۔ پھر پیار سے مجھے لٹا دیا اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "آپ فکر نہ کریں، ہم دونوں مل کر گھر کے حالات ٹھیک کرلیں گے۔"

اس کی بات سے مجھے حوصلہ مل گیا۔

اس دن کے بعد سے عظمیٰ اور میں نے گھر کے حالات کو سنبھالنے کی مشترکہ کوششیں شروع کر دیں جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے۔ زاہدہ ہماری تمام کاوشوں پر پانی پھیر دیتی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" ایک روز عظمیٰ کو گہری سوچ میں دیکھ کر میں نے اس سے پوچھا۔

"سوچ رہی ہوں کہ گھر کا ماحول آخر کس طرح سدھرے گا؟" وہ افسردگی سے بولی۔

"حوصلہ کرو، ہم کوشش تو کر رہے ہیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ عورت کون سی زبان سمجھتی ہے۔" اس کے لہجے میں تلخی گھل گئی۔ اس کا اشارہ زاہدہ کی طرف تھا۔

"تم نے اب تک کچھ اندازہ لگایا کہ آخر اس کا مسئلہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میری تو اب تک سمجھ میں نہیں آیا۔"

"پھر بھی کچھ تو اندازہ کیا ہوگا؟ کھانے پینے، کپڑے لتے میں کمی ہے؟ راشد کا رویّہ ٹھیک نہیں ہے، کسی اور سے شکایت ہے؟"

"مسئلہ کچھ بھی نہیں ہے، میرا تو خیال ہے کہ وہ نفسیاتی کیس ہے۔"

"ہوں" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کسی کی کوئی بات اس کی عقل میں ہی نہیں آتی ہے۔ میں نے ہر طرح سے اسے سمجھایا لیکن اس کا غصہ تو ناک پر رکھا رہتا ہے۔" وہ بولی۔

"میں تو بہت پریشان ہوں۔ ابو کی طرف سے الگ پریشانی ہے۔ وہ مستقل بیمار رہنے لگے ہیں۔"

"انہوں نے سارے دکھوں کا اثر دل پر لیا ہے۔ اندر ہی اندر گھل رہے ہیں وہ۔"

"ہاں، روز بہ روز کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔"

"خیر، آپ پریشان نہ ہوں۔" اس نے تسلی آمیز انداز میں کہا "میں اسے سنبھالنے اور سمجھانے کی پوری کوشش کروں گی۔"

"اگر تم اس گھر کو سنبھال لو، جو کچھ رہ گیا ہے اسے بچا لو تو میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا۔" میں نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟" اس نے شکایتی انداز میں میری طرف دیکھا "میں آپ کی بیوی ہوں۔ آپ مجھ سے اس انداز میں بات نہ کیا کریں۔"

"نہیں، میں اُن مردوں میں سے نہیں ہوں جو بیوی پر حکم چلاتے ہیں، میں تو پیار و محبت کا قائل ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ بولی "آپ کی محبت کا ہی تو

سہارا ہے کہ میں اتنے ذہنی دباؤ والے ماحول میں یہاں رہ رہی ہوں اور حالات کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہوں ورنہ میں بھی دونوں بڑی بھابیوں کی طرح آپ سے کہہ سکتی ہوں کہ الگ ہو جائیں اس گھر سے۔"

"مجھے تم پر فخر ہے کہ تم ان حالات میں میرا ساتھ دے رہی ہو۔" میں نے تشکر آمیز انداز میں کہا۔

ابو روز بہ روز کمزور ہوتے چلے گئے۔ ڈاکٹرز نے انہیں آرام کا مشورہ دیا۔ وہ زیادہ تر گھر پر رہنے لگے۔ کارخانے کی ذمے داریاں میرے اور راشد کے کاندھوں پر آ گئی تھیں۔ وہ اکثر کھویا کھویا اور پریشان رہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ زاہدہ نے اس کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ ان دونوں کی اکثر لڑائی ہوتی رہتی تھی۔

ایک روز ابو بھی اس دنیا کو چھوڑ گئے۔ انہوں نے کسی سے کوئی شکایت نہیں کی تھی، بس امی کی طرح خاموشی سے کنارہ کر لیا تھا۔

اب گھر میں سناٹا سا چھایا رہتا تھا۔ امی، ابو، بہن، بھائیوں، بھابیوں اور ان کے بچوں کی آوازیں، ہنسی مذاق، قہقہے سب کچھ ماضی میں دفن ہو چکا تھا۔

ایک روز میں نے راشد سے کہا "تم جانتے ہو کہ ملائیشیا سے ہمارا اچھا کاروبار ہوتا ہے اور میں وہاں کی پارٹی کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا۔ وہاں سے فیکس آیا ہے، وہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی وہاں جائے۔ کیا تم وہاں جانا پسند کرو گے یا میں جاؤں؟"

"آپ چلے جائیں۔" اس نے جواب دیا "میں یہاں کے معاملات دیکھ لوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "اور دیکھو، زاہدہ اگر لڑے جھگڑے تو کوشش کرنا معاملہ رفع دفع ہو جائے۔ معاملات کو طول نہ دینا۔ اپنے آپ کو ریلیکس رکھنا۔"

"جی بہتر ہے۔" اس نے سر جھکا لیا۔

میں ملائیشیا آ کر اپنے کاروباری معاملات میں الجھ گیا۔ پارٹی سے یہ طے پایا کہ میں تین ماہ یہیں ان کے ساتھ رہوں گا۔ پھر عظمٰی کے فون آنے لگے کہ اس کی طبیعت خراب ہے۔ کچھ دن بعد اس کے گھر والے دیکھ بھال کے لیے اسے اپنے ساتھ لے گئے، میں مطمئن ہو گیا۔

عظمٰی سے میرا مسلسل رابطہ تھا۔ وہ بتاتی رہی کہ اس کی طبیعت کافی بہتر ہے۔ بالآخر میں واپس وطن پہنچ گیا۔ یہاں پتا چلا کہ عظمٰی مجھ سے جھوٹ بولتی رہی تھی۔ اسے کینسر ڈائیگنوز ہوا ہے۔ میں نے اس سے شکایت کی کہ اس نے مجھے اصل صورتِ حال سے آگاہ نہیں کیا ورنہ میں جلد لوٹ آتا۔"

"اس کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے پتا چل گیا تھا کہ میں بچوں گی نہیں۔ آپ کے جلدی آنے سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ آپ کے کاروبار کا حرج ہوتا۔" وہ بولی۔

"کچھ بھی تھا، تمہیں مجھے اصل صورتِ حال تو بتانی چاہیے تھی۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ نہ بولی۔ دس دن بعد وہ مر گئی۔ تب اس کی ماں نے مجھے ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا "بیٹا! عظمٰی نے یہ لفافہ دیا تھا کہ اگر وہ مر جائے تو میں یہ تمہیں دے دوں۔"

"کیا ہے اس میں؟" میں نے لفافے کو الٹ پلٹ کر اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں۔" وہ بولیں "اسے کھولنے سے اس نے منع کیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں لفافہ کھولنے لگا۔ وہ وہاں سے چلی گئیں۔ لفافے میں سے ایک رقعہ نکلا، جس پر لکھا تھا۔

"شاہد!

میں نے تم سے کبھی محبت نہیں کی اور نہ ہی تمہارے گھر والوں سے۔ نفرت کے بیج بو کر محبت کی فصل نہیں کاٹی جا سکتی۔ تم لوگ امیر تھے اور ہم غریب۔ غریبوں کو بھی محبت کا حق ہوتا ہے۔ میں نے بھی ایک لڑکے سہیل سے محبت کی تھی۔ وہ بھی مجھے چاہتا تھا۔ ہم شادی کر لیتے لیکن تم درمیان میں آ گئے۔ میں نے اپنی امی سے کہا بھی کہ میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی لیکن وہ نہ مانیں۔ کہتی تھیں ایسے امیر گھرانے کسی کسی کے نصیب میں آتے ہیں۔ میں بہت روئی، گڑگڑائی لیکن میری ایک نہ سنی گئی۔ میرے محبوب سے یہ صدمہ برداشت نہ ہو سکا، اس نے خودکشی کر لی۔ میں نے سب سے انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ اپنے انتقام کے لیے میں نے زاہدہ کو استعمال کیا۔ جو کچھ اس نے کیا اس کے پسِ پردہ میں ہی تھی۔ تمہاری بہن کو بھی میں نے ہی بھگایا۔ میرا یہ انتقام جاری رہتا اور میں سب کچھ تباہ کر دیتی لیکن قدرت نے میرے لیے موت کا پروانہ جاری کر دیا۔ مجھے موت سے خوف نہیں آتا تھا۔ میں سب کچھ کرنے کے بعد مرنے کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن خودکشی کرنے سے پہلے ہی مجھے موت نے آ دبوچا۔

میری بددعا ہے کہ تم لوگوں کا جو کچھ بچا ہے، وہ بھی تباہ، برباد ہو جائے۔

فقط
سہیل کی عظمٰی۔"

تجربہ

مکرمی مدیر اعلیٰ
سلام مسنون

ایک دن سرِراہ وقاص خان سے ملاقات ہوگئی تھی۔ ایک پڑھے لکھے بندے کو بھیک مانگتے دیکھ کر میں حیرت میں پڑ گیا تھا مگر اس نے تجربے کے لیے جو کام شروع کیا تھا، وہ آج بھی میرے لیے حیرت کا باعث ہے۔ آپ خود بھی حیرت میں آجائیں گے مگر کیا کیا جاسکتا ہے۔

اخلاق احمد
(میرپورخاص)

وہ اچھا خاصا تندرست سا نوجوان تھا۔ جو ہاتھ پھیلائے میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ میں اپنے لیے بنیان اور موزے خریدنے گیا تھا کہ وہ میرے سامنے آ گیا۔ وہ کسی طرح بھی فقیر نہیں معلوم ہوتا تھا۔

"تمہیں شرم نہیں آتی بھیک مانگتے ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت آتی ہے۔ اس لیے تو تمہاری طرف دیکھ نہیں

رہا ہوں۔ اپنا چہرہ دوسری طرف کیا ہوا ہے۔ اب لاؤ دس کا نوٹ ہاتھ پر رکھ دو۔"

"عجیب ڈھیٹ قسم کے آدمی ہو۔" میں نے کہا۔ "تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟"

"دیکھیں جناب! یہ وہ واحد اور کامن مشورہ ہے جو ہر آدمی دے دیتا ہے۔ کام کیوں نہیں کرتے؟ آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ کام نہیں ہے۔ آپ ذرا یہ کام تو کر کے دکھا دیں۔ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ پتا چل جائے گا کہ محنت کیا ہوتی ہے۔ آپ جیسے لوگ ہمارے لیے طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں لیکن ہم پروا نہیں کرتے۔" آواز شاسگاں کہ نہ کند رزق گدارا۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے فارسی کا ایک مصرعہ بڑا برمحل پڑھ دیا تھا۔ "بھائی! تم تو صاحب ذوق اور پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔" میں نے کہا۔

"آپ نے کیا ہمیں جاہل سمجھ رکھا ہے۔" وہ ناراض ہونے لگا تھا۔ "ہماری برادری میں ایک سے ایک لوگ ہوتے ہیں۔ شاعر، ادیب، مفکر۔"

"اس کے باوجود بھی بھیک مانگتے ہیں؟"

"ہاں، کیوں بھیک مانگنا بھی ایک طرح کی دانش وری ہے۔" اس نے کہا۔ "خیر، یہ وقت ایسی تفصیلی باتوں کا نہیں ہے، کیونکہ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ مجھے دوسروں کو بھی دیکھنا ہے۔ آپ کو کچھ دینا ہو تو دے دیں۔ ورنہ میں جا رہا ہوں۔"

میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسا قیمتی اور انوکھا فقیر ہاتھ سے چلا جائے۔ اس لیے میں نے اس کے ہاتھ پر بیس کا ایک نوٹ رکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو بھائی فقیر! کل پھر ملنا، تم سے بہت باتیں کرنی ہیں۔"

"کیوں نہیں۔" وہ مسکرا دیا۔ "لیکن دس بجے کے بعد، دس بجے میں آف کرتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "پھر چاہے کوئی پچاس ہزار بھی بھیک میں دے، میں نہیں لیتا۔ یہ میرا اصول ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ دس بجے میں آجاؤں گا۔" میں نے کہا۔

اس نے باقاعدہ مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ گرچہ عجب لگ رہا تھا کہ میں ایک سفید پوش نظر آنے والا شخص کسی بھکاری سے باتیں کر رہا ہوں۔ اس سے ہاتھ ملا رہا ہوں لیکن میں اس فقیر کی ورتھ سے واقف تھا۔

دوسری رات دس بجے میں اسی جگہ پہنچ گیا جہاں کل رات میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس بار وہ، کیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوب صورت، اسمارٹ سی لڑکی بھی تھی۔

"یہ میری دوست ہے۔" اس نے بتایا۔ "سونیا نام ہے اس کا۔"

"تمہاری دوست؟" میں نے حیرت سے دُہرایا۔

"کیوں، اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" اس نے کہا۔ "کیا کوئی بھکاری اپنی گرل فرینڈ نہیں رکھ سکتا؟ کیا اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے؟"

"کیوں نہیں۔" میں نے اپنی گردن ہلائی۔ پھر اس لڑکی سے مخاطب ہوا۔ "سونیا تم کیا کرتی ہو؟"

"میں انگلش میں ماسٹر کر رہی ہوں۔" اس نے بتایا۔ "یہ میرا آخری سال ہے۔"

"کمال ہے۔" میں حیرت سے بے ہوش ہوا جا رہا تھا۔ "انگلش میں ماسٹر کرنے والی لڑکی اور ایک بھکاری کے ساتھ۔"

"تو کیا ہوا؟" وہ بے پروائی سے بولی۔ "ہر ایک کی اپنی اپنی فیلڈ ہوتی ہے۔ وکی کی یہی فیلڈ ہے تو اس میں کیا بُرائی ہے؟"

"کون وکی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کمال ہے۔ آپ کو ان کا نام نہیں معلوم۔" سونیا نے کہا۔ "ان کا نام وکی ہے۔ اور یہ خود بھی ماس کمیونی کیشن میں ماسٹر کر چکے ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے بے ہوش ہو جانا چاہیے۔" میرا واقعی یہی حال ہو رہا تھا۔

"بے ہوش نہ ہوں۔ آپ یہ بتائیں۔ آپ کو مجھ سے کیا باتیں کرنی تھیں؟" وکی نے پوچھا۔

"اب کیا بتاؤں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "میں نے یہ سوچا تھا کہ تمہارے حال پر رحم کھا کر تمہیں کہیں کوئی جاب لگوا دوں گا لیکن اب تو خود میں اپنے آپ پر ترس کھا رہا ہوں۔"

"جاب کیسی ہے؟" سونیا نے پوچھا۔

"اب رہنے ہی دو۔ خوامخواہ میں شرمندہ ہوتا رہوں گا۔" میں نے کہا۔ "بس پندرہ ہزار کی جاب ہے۔ اس میں تمہارا کیا ہوگا؟"

"واقعی کچھ بھی نہیں ہوگا۔" سونیا نے کہا۔ "پندرہ ہزار کی تو یہ مجھے شاپنگ کروا دیتے ہیں۔"

"چلیں، کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" وکی میری طرف دیکھ کر بولا۔ "دس بج گئے ہیں۔ میں آف ہو چکا ہوں۔ ظاہر ہے۔ میں آپ کے ساتھ اس حلیے میں تو ہوٹل نہیں جا سکتا۔ اس لیے میرا انتظار کریں۔ میں زیادہ سے زیادہ آدھ گھنٹے میں چینج کر کے آتا ہوں۔" پھر اس نے سونیا کی طرف دیکھا۔ "اور تمہارا کیا پروگرام ہے۔ تم میرے ساتھ چل رہی ہو یا گھر جاؤ گی؟"

"نہیں میں گھر جا رہی ہوں۔" سونیا نے کہا۔ "آج بعض کے ساتھ فوڈ کورٹ جا رہی ہوں۔"

"وکی! میں بھی آدھ گھنٹے میں آجاؤں گا۔" میں کچھ نروس ہو کر بولا۔ "ویسے اب تم سے کیا بات کروں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔"

"ارے صاحب، کم از کم اس ملاقات ہی کو سیلیبریٹ کر لیں گے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

آدھ گھنٹے بعد میں پھر اسی مارکیٹ میں تھا۔ چونکہ میرا گھر وہاں سے قریب تھا اسی لیے آنے جانے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ آدھ گھنٹے بعد ایک خوب صورت سا نوجوان بہت ہی ماڈرن قسم کے لباس میں ملبوس میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"ہیلو!" اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "پہچانا نہیں، میں ہی ہوں وکی۔"

"اوہ، تم تو مجھے حیران کیے چلے جا رہے ہو۔" میں نے تحسین آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"چلیں، اب کہیں چلتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "مجھے بھی آپ سے کچھ انسیت سی ہونے لگی ہے۔"

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس کا رُخ پارکنگ کی طرف تھا۔ "اس طرف کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "رکشا تو سامنے سے ملے گا۔"

"میری گاڑی کھڑی ہے۔" اس نے ایک اور شگوفہ چھوڑ دیا۔

اور جب میں نے اس کی گاڑی کو دیکھا تو میرے اور بھی ہوش اُڑ گئے۔ وہ نئے ماڈل کی ٹویوٹا کرولا تھی۔

"تشریف رکھیں۔" اس نے میرے لیے کار کا اگلا دروازہ کھول دیا تھا۔

میں اس کے ساتھ بیٹھ کر خود کو چغد اور نروس محسوس

انتظار کی تعریف

انتظار ایسی کیفیت کا نام ہے جس میں انسان اپنی موجودہ حالت سے نکل کر دوسری نئی حالت میں جانے کی امید رکھے۔

پس انتظار دو عناصر کی ترکیب کا نام ہے۔

1۔ منفی عنصر یعنی موجودہ صورتحال سے بیزاری اور مثبت عنصر یعنی دوسری نئی حالت میں جانے کی امید۔

انسانی زندگی میں انتظار کی اہمیت

انسانی زندگی میں "انتظار" کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ترقی اور کمال پر پہنچنے کا انتظار اور امید ہی انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ آگے قدم بڑھائے۔ اسی لیے انتظار اور حرکت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

انتظار لوگوں کی شخصیت کو پہچاننے کا معیار بھی ہے۔ چنانچہ انتظار کی جانے والی چیز جتنی مقدس اور عظیم ہوگی اس کا انتظار بھی اتنی ہی اہمیت اور عظمت کا حامل ہوگا۔

مثلاً کوئی اپنی ترقی کا منتظر ہے، کوئی اپنے افسر کی خوشنودی چاہتا ہے، کسی کے لیے قرب خدا کی اہمیت ہے، کسی کا مقصد انفرادی زندگی ہے تو کوئی معاشرے کی ترقی کا منتظر ہے۔

پس انتظار انسانی زندگی میں دو اہم کردار ادا کرتا ہے۔

الف:۔ اس کو اس کے مقاصد کی جانب حرکت دیتا ہے۔

ب:۔ انسانی شخصیت کی شناخت کا معیار ہے۔

مرسلہ کلثوم عباس، کورنگی، کراچی

کررہا تھا۔ میں نے اس شخص پر اپنا احسان جتانے کی کوشش کی تھی لیکن یہ تو خود مجھ جیسوں پر احسان کرنے کے قابل تھا۔

"قبلہ! آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟" اس نے راستے میں پوچھا۔

"میرا نام اخلاق احمد ہے۔" میں نے بتایا۔ "ایک عام سا صحافی ہوں۔ قلم کی روزی کماتا ہوں۔ خدا نے معاشرے میں بس عزت دے رکھی ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔"

"ارے صاحب، عزت بھی بہت بڑی بات ہے۔" اس نے کہا۔ "چلیں، ہم شیرٹن پہنچ گئے۔"

"شیرٹن!" میں اب شاید بے ہوشی کی حد سے بھی گزر چکا تھا۔ "ہم شیرٹن میں بیٹھیں گے؟"

"اور کیا؟" وہ بے پروائی سے بولا۔ "میں عام طور پر شیرٹن ہی میں ڈنر کرتا ہوں۔"

اب تو میں اس کے سامنے بالکل ہی ڈھیر ہوگیا۔ اس ہوٹل کے سارے ویٹر اس کو بہت ادب سے سلام کررہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ جبکہ میں صرف ایک یا دو بار ہی آیا ہوں گا۔ وہ بھی کسی اور کے ساتھ۔

اس نے کھانے کا آرڈر کر مجھ سے باتیں شروع... کردیں۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا۔ "جناب! میں ایک عرصے تک دھکے کھاتا رہا ہوں۔ اس کے بعد اس طرف توجہ دی ہے۔ اب یہ ایک لمبی کہانی ہے کہ میں کس طرح بھکاری بنا ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ اب میرے پاس جو کچھ ہے وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔"

"وکی بھائی! اب ایک بات بتاؤ۔ کیا تمہیں کبھی شرم نہیں محسوس ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"شروع شروع میں شرم آتی تھی۔" اس نے بتایا۔ "لیکن اب عادت ہوگئی ہے اور بات یہ ہے کہ اصل چیز ہے پیسا۔ اگر وہ کسی طرح آرہا ہو تو پھر کون پوچھتا ہے کہ کہاں سے اور کیوں آرہا ہے؟"

"تمہارے گھر والوں کا کیا رویہ ہے؟"

"وہ سب بہت خوش ہیں۔" اس نے بتایا۔ "کیونکہ ان کی ہر خواہش پوری ہوتی رہتی ہے۔ ایک شاندار گھر، کپڑے، بینک بیلنس، سواری کے لیے گاڑی اور کیا چاہیے۔"

"شادی تو نہیں ہوئی ہوگی تمہاری؟"

"میری شادی اسی لڑکی کے ساتھ ہونے والی ہے۔ جس کو آپ میرے ساتھ دیکھ چکے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"اور اس کے گھر والے۔" میں نے پوچھا۔ اس وقت مجھے اپنی آواز حلق میں اٹکی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ "کیا انہیں یہ سب معلوم ہے؟"

"کیوں نہیں، اور وہ بھی بہت خوش ہیں۔" اس نے بتایا۔ "جناب! انہیں بھی ایسا داماد کہاں ملے گا۔"

اب اس سے کچھ اور پوچھنا ہی فضول تھا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک مطمئن اور خوش باش آدمی تھا۔ اس نے اپنے لیے جینے کی جو راہ پسند کی تھی وہ راہ اس کو راس آگئی تھی۔

"جناب! میں آپ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "کیوں نہ آپ بھی مجھے جوائن کرلیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ بھی شروع ہوجائیں۔ آپ کے سارے دلدر دور ہوجائیں گے۔"

"نہیں، میں یہ نہیں کرسکوں گا۔" میں نے کہا۔ "یہ میرے بس سے باہر کی بات ہے۔"

"آپ کی مرضی۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "ویسے جب بھی آپ کو کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو۔ بلا جھجک میرے پاس آجائیے گا۔ میں آپ کو اسی مارکیٹ میں ملوں گا۔"

شیرٹن سے واپسی کے بعد اس نے مجھے میرے فلیٹ کی بلڈنگ کے سامنے اُتار دیا تھا۔ اس وقت بھی وہ باز نہیں آیا۔ اس نے چلتے چلتے بھی مجھے اپنے ساتھ کام کی آفر کردی۔

میں رات بھر اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیا ہوتا جارہا تھا ہمارے معاشرے کو۔ ہم کس طرف جارہے تھے؟ اگر ایسے پڑھے لکھے نوجوانوں نے بھیک مانگنا شروع کردیا تھا تو پھر اس معاشرے کا خدا ہی حافظ تھا۔

اس کے بعد بھی وہ مجھے مارکیٹ میں دکھائی دیتا رہا۔ وہ مجھے پہچان کر میرے پاس آتا اور سلام دعا کرکے اپنے دھندے پر چلا جاتا۔ اس نے کبھی مجھ سے بھیک نہیں مانگی۔ بلکہ میرے پاس آکر اس کے ہونٹوں پر ایک شرمندہ سی مسکراہٹ ہوا کرتی۔

میں نے کئی بار سوچا بھی کہ اسے پھر کوئی نصیحت کروں لیکن میرے خیال میں یہ اس کے لیے فضول تھا۔ وہ ایک ٹھاٹ کی زندگی گزار رہا تھا جو میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ

رہا تھا۔ وہ میری بات کیوں مانتا؟

پھر یہ ہوا کہ وہ کئی دنوں تک دکھائی نہیں دیا۔ بلکہ بہت دنوں تک دکھائی نہیں دیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کہیں چلا گیا تھا یا اس کے ساتھ کچھ اور ہوگیا تھا۔ یہ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔

اس کا جواب کچھ دنوں کے بعد مل گیا تھا۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ اس نے ایک بار اپنی گاڑی میں مجھے میرے فلیٹ کے سامنے ڈراپ کیا تھا۔ اسی لیے وہ میرا پتا پوچھتا ہوا میرے فلیٹ تک آگیا۔ اس وقت وہ بھکاری نہیں بلکہ ایک معقول نوجوان تھا۔

میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ "ارے وکی! تم... تم کیسے؟"

"میں آپ کو ایک خبر سنانے آیا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "میں نے بھیک مانگنا چھوڑ دی ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہوئی۔ پھر اب کیا کررہے ہو؟"

"مجھے ایک اچھی جاب مل گئی ہے۔" اس نے کہا۔ "میں نے بتایا تھا کہ میں ماس کمیونیکیشن میں ماسٹر کرچکا ہوں۔ بس اسی مناسبت سے جب ایک جاب ملی تو میں نے جوائن کرلی۔ اس میں ظاہر ہے کہ اتنے پیسے نہیں ہیں جتنے بھیک سے ملا کرتے تھے لیکن اتنا ضرور ہے کہ اچھی خاصی عزت ہے میری۔"

"چلو مبارک ہو۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "اور تمہاری گرل فرینڈ کا کیا حال ہے؟"

"اگلے مہینے میری اس سے شادی ہونے والی ہے۔" اس نے بتایا۔

"یہ تو اور بھی خوشی کی بات ہے۔"

"میرے لیے دعائیں کرتے رہیے گا۔" اس نے کہا۔ "کیونکہ میری منزل صرف یہی نہیں ہے۔ میں تجربے کرتے رہنے کا قائل ہوں۔ میں آگے بڑھنا چاہتا ہوں اور اسی لیے۔ اور ابھی تو میں نے ترقی کی طرف اپنا سفر شروع کیا ہے۔"

"چلو، خدا تمہیں تمہارے ارادوں میں کامیاب کرے۔"

اس کے بعد وہ پھر غائب ہوگیا۔ ایک طویل عرصے کے لیے۔ اس کے بارے میں پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے اور اس نے کہاں تک ترقی کی ہے؟

اس دوران میرے ساتھ بہت کچھ ہوا۔ میں ویسے تو اپنی صحافتی زندگی میں بہت محتاط رہنے والا شخص ہوں لیکن مجھ سے کبھی کوئی ناانصافی برداشت ہی نہیں ہوتی۔

ایسی ہی ایک ناانصافی پر میں نے کچھ ایسا کالم لکھ دیا تھا کہ جس کی وجہ سے بہت دنوں تک زیرِ عتاب رہا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ معاملہ ٹھنڈا پڑتا گیا۔

اس زمانے میں ملکی سیاست میں بہت تبدیلیاں ہوگئی تھیں۔ سیاسی ہنگامے، لسانی فسادات اور نہ جانے کیا کیا؟ ان ہی چکروں میں میری جاب بھی چلی گئی۔ میں بے روزگار ہوگیا تھا۔

ان ہی دنوں حکومت کے شعبہ اطلاعات میں ایک جگہ خالی ہوئی۔ ان کی ڈیمانڈ ایسی تھی جن پر میں پورا اترتا تھا۔ یعنی میری تعلیم اور میرا تجربہ دونوں اس پوسٹ کے لیے بالکل مناسب تھے۔

لیکن کوشش اور خواہش کے باوجود مجھے جاب نہیں مل سکی۔ نہ جانے وہ کون ہوتے ہوں گے جن کو فوراً ہی جاب مل جاتی ہے۔

ایک دن مارکیٹ میں مجھے وہی لڑکی دکھائی دے گئی۔ وہی وکی کی گرل فرینڈ۔ وہ اکیلی ہی تھی اور شاید شاپنگ کے لیے آئی تھی۔ مجھے اس کا نام تک یاد تھا، سونیا۔

میں سونیا سے وکی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا۔ "سونیا!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "کیا تم نے مجھے پہچانا؟"

"نہیں تو۔" اس نے انکار میں گردن ہلا دی۔ "سوری، میں نہیں پہچان سکی۔"

پھر جب میں نے یاد دلایا کہ میں کون ہوں اور کس

طرح اسی مارکیٹ میں اس سے ملاقات ہوئی تھی تو اس نے پہچان لیا۔ ”ہاں، ہاں کچھ کچھ یاد تو آرہا ہے۔“

”میں وکی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ وہ خیریت سے تو ہے نا؟“

”کیا اس کے بعد بھی اس سے ملاقات رہی تھی؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں، دو تین بار۔ ایک بار وہ میرے فلیٹ بھی آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس نے ایک اچھی جاب کرلی ہے اور وہ تم سے شادی کرنے والا ہے۔“

”لیکن اس نے مجھ سے شادی نہیں کی۔“ سونیا تلخ ہوکر بولی۔ ”آپ اسی سے اندازہ لگالیں کہ میں نے اس کا بھکاری ہونا تک قبول کرلیا۔ ورنہ ایسی کون سی لڑکی ہے جو اس قسم کی ذلت برداشت کرے۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے بے وفائی کرگیا۔ کیونکہ وہ ترقی کرتا جارہا ہے۔ اب اس کی نگاہیں کہیں اور ہیں۔ اس کا ٹارگٹ بہت آگے جاتا ہے۔ اور میں اس کے خانے میں فٹ نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لیے اس نے مجھے چھوڑ دیا۔“

”کمال ہے۔ اب ایسی بھی کیا ترقی، وہ کون سا گورنر جنرل بن گیا ہے۔“

”یہ آپ کو خود ہی معلوم ہوجائے گا کہ وہ کیا بن گیا ہے۔“ سونیا نے کہا۔ ”مجھے اجازت دیں، خدا حافظ۔“

سونیا مجھے ذہنی خلفشار میں مبتلا کرگئی تھی۔

وکی آخر کیا ہوگیا تھا؟ اس نے سونیا جیسی لڑکی کو اپنی زندگی سے کیوں نکال دیا تھا؟ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ وہ کس محکمے میں ہے تو میں وہاں جاکر اس سے ملنے کی کوشش کرتا۔

مجھے تو اس کا اصل نام بھی نہیں معلوم تھا۔ اس کا نام وکی تو نہیں ہوگا۔ کچھ اور ہی ہوگا۔

اس کے بعد مجھے بھی ایک اخبار میں ملازمت مل گئی۔ یہ ملازمت میرے سابقہ تجربہ کی بنیاد پر ملی تھی۔ لیکن اس بار نوعیت مختلف تھی۔

میں پہلے ڈیسک پر تھا۔ اب مجھے فیلڈ رپورٹنگ کرنا تھی۔

اسی دوران ملک کے کئی صوبے شدید سیلاب کی لپیٹ میں آگئے اور مجھ سے کہا گیا کہ میں سیلاب کی رپورٹنگ کروں۔ میں ایک چھوٹی سی ٹیم لے کر سیلاب زدہ علاقوں کی طرف روانہ ہوگیا۔

خدا کی پناہ۔

کیا تباہی تھی۔ ہر طرف پانی ہی پانی۔ اور اس پانی میں بہتے ہوئے کچے مکانات۔ مردہ مویشی۔ سیلاب زدگان کے لیے کئی کیمپ لگادیے گئے تھے۔

ہم نے ان کیمپوں کا بھی دورہ کیا۔ بہت کسمپرسی تھی۔ پریشان حال لوگ۔ روتے اور بلبلاتے ہوئے مرد اور عورتیں۔ لیکن ایک اچھی بات یہ تھی کہ دو چار کیمپس ایسے تھے جن میں پناہ لینے والوں کو بہت مناسب خوراک فراہم کی جارہی تھی۔ ہم سب ان کیمپوں میں صاف ستھرے کھانوں کا معیار دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔

پتا چلا کہ یہ کیمپس کسی وقاص خان کی طرف سے لگائے گئے ہیں اور خود وقاص خان بھی امدادی کاموں کا جائزہ لینے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔

اب ہمارے لیے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ ہم ان صاحب کا انٹرویو لیتے جو اتنا نیک کام کررہے تھے۔

وقاص خان نے کچھ فاصلے پر اپنا ایک تمبو لگا رکھا تھا جس کے اردگرد کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہماری ٹیم اس بندے کے پاس پہنچ گئی۔

اور وقاص خان کو دیکھ کر میرے ہوش اُڑ گئے۔ یہ وہی وکی تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر فوراً ہی کرسی سے کھڑا ہوگیا۔ ”ارے، آپ یہاں؟“

”میں یہاں اپنے اخبار کی طرف سے کوریج کے لیے آیا تھا۔“ میں نے بتایا۔ ”پھر کسی وقاص خان کے بارے میں سنا کہ وہ بہت دریادل قسم کا انسان ہے تو اس کا انٹرویو لینے آگیا۔ اب پتا چلا کہ وہ تم ہو۔“

”ارے صاحب، کیا دریادلی۔“ اس نے کہا۔ ”یہ سارے پیسے تو میں نے بڑے بڑے سیٹھوں کی جیبوں سے نکلوائے ہیں۔“

”کمال ہے، ورنہ یہ لوگ مدد کہاں کرتے ہیں۔“

”ہاں عام طور پر تو نہیں کرتے۔ لیکن مجھے مانگنے کا تجربہ تو ہے نا۔“ وہ ایک آنکھ دبا کر بولا۔ ”آپ خود اس فیلڈ میں میری کامیابی دیکھ چکے ہیں۔ تو وہی تجربہ یہاں بھی کام آرہا ہے۔“

میں اس کی بات سن کر ہنس پڑا۔ وہ واقعی کمال کا آدمی تھا۔

شریف غنڈا

محترم ایڈیٹر

آداب ونیاز

ناکام محبت پر آپ نے جو خاص نمبر نکالا تھا۔ اس میں ایک کہانی پڑھی جو مجھے ”محبت بیتی“ لگی۔ جی ہاں ایسا ہی ایک واقعہ میرے ساتھ بھی پیش آیا ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو اسے بھی شائع کردیں مہربانی ہوگی۔

عارف ذیشان
(ملتان)

جس زمانے کی میں بات کررہا ہوں، اس زمانے میں یہ نہایت غیر معمولی بات تھی کہ کوئی لڑکا کسی لڑکی کو ٹیوشن پڑھائے لیکن جب میں فاخرہ کو پڑھانے اس کے گھر جانے لگا تو محلے میں کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ محلے والوں کا یہ رویہ شاید اس لیے تھا کہ محلے میں میری شرافت کی دھوم تھی۔ ہمیشہ آنکھیں جھکا کر چلتا تھا۔ کسی بھی لڑکے سے اگر دوستی نہیں تھی تو دشمنی بھی نہیں تھی۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ صبح کالج جاتا، دوپہر کو گھر آتا تو پھر مسجد کے سوا کہیں اور جانے کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ میری امی میری اس عادت سے تنگ تھیں۔ وہ کہتی تھیں، میں لڑکا ہوں، مجھے کچھ دیر گھر سے نکل کر لڑکوں کے ساتھ بھی وقت گزارنا چاہیے۔ لڑکیوں کی طرح کیوں گھر میں پڑا رہتا ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ محلے کے بزرگ تک میرا احترام کیا کرتے تھے۔

ایک دن میں حسب معمول گھر پر ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں دروازے پر گیا۔ باہر ایک صاحب کھڑے تھے۔ انہیں میں شکل سے تو پہچانتا تھا لیکن نام سے واقف نہیں تھا۔ وہ میرے گھر سے دو گلیاں چھوڑ کر رہا کرتے تھے۔ آتے جاتے ایک آدھ بار میں نے انہیں دیکھا تھا۔

"عارف میاں، مجھے پہچانتے ہو؟"

"جی ہاں، میں نے آپ کو دیکھا تو ہے لیکن اس وقت نام ذہن میں نہیں ہے۔"

"میرا نام امتیاز ہے اور اسی محلے میں رہتا ہوں۔"

"فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"میاں خدمت کیسی، بس ایک درخواست ہے اگر آپ قبول کر لیں۔"

"کیوں شرمندہ کرتے ہیں، آپ میرے بڑے ہیں حکم کیجیے۔"

"میاں، بات یہ ہے میری بیٹی ہے فاخرہ۔ سیکنڈ ایئر کا امتحان دے گی۔ آپ سے درخواست ہے کہ اسے انگریزی اور اردو پڑھا دیا کریں۔ قریب ہی میں تو گھر ہے، آپ کو کوئی زحمت نہیں ہوگی۔"

"آپ سے یہ کس نے کہا کہ میں ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔"

"کسی نے بھی نہیں کہا۔ میں تو بس فاخرہ کے لیے آپ سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"چچا، میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کسی لیڈی ٹیچر کا بندوبست کر لیں۔ میں آپ کی صاحب زادی کو پڑھاتا کیا اچھا لگوں گا۔ میرا مطلب ہے وہ ایک لڑکی ہے اور میں......"

"صاحب زادے، میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں اور آپ کی گلی کے بزرگوں سے مشورے کے بعد ہی آیا ہوں۔ ہر شخص آپ کی تعریف ہی کر رہا ہے۔"

"یہ ان سب کی محبت ہے لیکن مجھے یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ میں کسی لڑکی کو ٹیوشن پڑھاؤں۔"

"اس میں حرج کیا ہے، وہ آپ کی بہن کی طرح ہے اور جب میں خود اجازت دے رہا ہوں تو آپ کو تکلف نہیں ہونا چاہیے۔"

"مجھے پھر بھی تکلف ہے۔ میری طرف سے انکار سمجھیے۔"

انہوں نے پھر بھی اصرار کیا لیکن میرے مسلسل انکار پر مایوس ہو کر چل دیے۔

میں گھر پر آیا تو اماں نے مجھ سے پوچھا کہ کون آیا تھا۔ میں نے ساری بات بتا دی۔ میں سمجھ رہا تھا وہ میری تعریف کریں گی مگر انہوں نے الٹا مجھے سمجھانا شروع کر دیا کہ دن بھر گھر میں پڑا رہتا ہوں، ٹیوشن پڑھا کر چار پیسے مل جاتے تو کیا برائی تھی۔ میری بہن سعیدہ بھی آ کر بیٹھ گئی۔ وہ مجھے اپنے انداز سے سمجھانے لگی۔

"بھائی، تم تو ایسے شرما رہے ہو جیسے تم لڑکی ہو اور لڑکے کو پڑھانا ہے۔ جب اس کے باپ کو اعتراض نہیں تو تم کیوں ہچکچا رہے ہو؟"

"بہرحال اب تو میں منع کر چکا۔" میں نے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

میں سمجھ رہا تھا بات آئی گئی ہو گئی لیکن اگلے دن شام کے وقت وہ پھر آ گئے۔ اس مرتبہ ان کی بیگم بھی ساتھ تھیں۔ مجھے مجبوراً انہیں گھر میں بلانا پڑا۔ ان صاحب نے ٹیوشن پڑھانے پر پھر اصرار کرنا شروع کر دیا۔ میری والدہ نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دی۔ ان کی بیگم نے تو عجیب ہی بات کہہ دی۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اگر میں نے ان کی بیٹی کو ٹیوشن نہیں پڑھائی اور وہ فیل ہو گئی تو اس کا گناہ مجھ پر ہوگا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ ساری دنیا کے ٹیوٹر کیا ختم ہو گئے ہیں کہ یہ ٹیوشن مجھ ہی کو پڑھانی ہے۔ میں انکار کرتا رہا لیکن پھر مجھے ہار ماننی پڑی کیونکہ وہ سب ایک ہو گئے تھے۔

"تو پھر چلیے، میرا گھر بھی دیکھ لیجیے اور اپنی شاگرد سے بھی مل لیجیے۔ پڑھانا چاہے کل سے شروع کیجیے گا۔"

فیس بھی انہوں نے اتنی طے کی تھی کہ اس زمانے میں ایک بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔ میں ان کے ساتھ ان کے گھر چلا گیا۔ گھر کے رنگ ڈھنگ سے ظاہر ہوتا تھا کہ اچھے پیسے والے لوگ ہیں۔ فاخرہ سے ملاقات ہوئی۔ دبلی پتلی قبول صورت لڑکی تھی۔ کوئی ایسی خوبصورت نہیں تھی لیکن بدشکل بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں لڑکیوں کے معاملے میں یوں بھی اناڑی تھا۔ اس سے زیادہ توجہ ہی نہیں دی۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا حسن اس کی شوخی میں پنہاں ہے۔ باتیں کرنے کا انداز ایسا ہے کہ گھنٹوں سنیے اور دل نہ بھرے۔ میں نے اس سے دو چار سوالات کیے تاکہ اس کی قابلیت جانچ سکوں اور دوسرے دن کا کہہ کر اٹھ آیا۔

دوسرے دن وعدے کے مطابق میں فاخرہ کو پڑھانے

کے لیے اس کے گھر پہنچ گیا۔ گھر سے باہر امتیاز صاحب آ گئے تھے۔ انہوں نے بڑے احترام سے مجھے مخاطب کیا اور مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر چلے گئے اور پھر حسب توقع فاخرہ اندر آ گئی۔ ایک دن پہلے ہی میں اسے دیکھ چکا تھا لیکن آج وہ قدرے مختلف یعنی زیادہ پرکشش نظر آ رہی تھی۔ اس کی وجہ بھی جلد ہی میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس نے ہلکا سا میک اپ کیا ہوا تھا۔ کپڑے بھی نہایت سلیقے کے پہنے ہوئے تھے۔ اپنی دانست میں خوب تیار ہو کر آئی تھی۔ میں نے کسی قسم کی کوئی توجہ ظاہر نہیں کی۔ اس نے بھی آتے ہی کتابیں میرے سامنے رکھ دیں اور میں نے کسی تمہید کے بغیر پڑھانا شروع کر دیا۔

پہلے دن ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ذہین بھی ہے اور پڑھنے کی شوقین بھی۔ میں خوش تھا کہ اس پر زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی بلکہ میں تو یہ حیران ہو رہا تھا کہ وہ پڑھائی میں اتنی کمزور تو نہیں ہے پھر اس کے گھر والوں نے اس کے لیے ٹیوشن کیوں لگائی ہے؟

میں اپنی عادت کے مطابق اپنے کام سے کام رکھے ہوئے تھا۔ کوئی بات کیے بغیر جاتے ہی اسے پڑھانا شروع کر دیتا اور جب پڑھا چکتا تو خاموشی سے اٹھ کر چلا آتا۔

اس انداز مدرسی کو ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ فاخرہ کی رگِ شرارت پھڑکنے لگی۔

"سر، ایک بات پوچھنے کی جسارت کر سکتی ہوں؟"

"کتابوں سے ہٹ کر کوئی بات ہے تو ہرگز نہیں۔"

"کتابوں سے الگ ہے لیکن تعلیم سے الگ ہرگز نہیں۔"

"جلدی پوچھو۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"استاد اور شاگرد میں کتنا فاصلہ ہونا چاہیے؟"

"جتنا فاصلہ والدین اور بچوں کے درمیان ہوتا ہے۔"

"بچوں کی ضدیں کون پوری کرتا ہے؟"

"اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔" میں نے کہا اور پڑھانے میں مشغول ہو گیا۔ وہ پڑھ رہی تھی لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ آج اس کا پڑھنے میں دل نہیں لگ رہا ہے۔

اس دن کے بعد سے وہ بہت شوخ ہو گئی تھی لیکن اس شوخی میں کوئی بے ہودگی نہیں تھی اور نہ ہی وہ پڑھنے سے جی چرا رہی تھی اس لیے مجھے اس کی یہ شوخیاں برداشت ہو رہی تھیں۔

ایک دن میں اس کے گھر پڑھانے گیا تو میں نے وہ دیکھا جو میری آنکھیں یقین کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ محلے کا مشہور غنڈا ارسلان اس کے گھر سے نکل رہا تھا۔ مجھ پر اس کی نظر بھی پڑی تھی لیکن وہ آنکھیں چرا کر ایک طرف نکل گیا تھا۔

وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اسی محلے میں اپنی ایک بہن اور ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ گھر میں تو بہت کم رہتا تھا البتہ جہاں گھر ختم ہوتے تھے وہاں میدان میں نیم کا ایک بڑا درخت تھا، وہاں چارپائی ڈالے بیٹھا رہتا تھا۔ وہیں اس کے جوان دوست جمع ہوتے تھے اور وہیں پولیس والے دکھائی دیتے تھے۔ کوئی شریف آدمی وہاں جانا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔

ارسلان چھبیس ستائیس سال کا نوجوان تھا۔ شکل سے غنڈا نہیں کسی فلم کا ہیرو لگتا تھا۔ ان غنڈوں میں سے تھا جو محلے کے محافظ سمجھے جاتے ہیں۔ اس کی دادا گیری محلے میں نہیں محلے سے باہر تھی لیکن پھر بھی تھا تو غنڈا۔ محلے میں سب ہی اس سے بچ کر گزرتے تھے اور میں نے اسے امتیاز صاحب کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔

میں نے پہلی مرتبہ اپنے دل میں وہ جذبہ محسوس کیا جسے رقابت کا جذبہ کہتے ہیں۔ رقابت کا جذبہ وہیں ابھرتا ہے جہاں محبت ہوتی ہے۔ تو کیا مجھے فاخرہ سے محبت ہے؟ ایک خیال سا ابھرا اور پھر میں نے اپنے ذہن کو جھٹک دیا۔

میں فاخرہ کو پڑھانے بیٹھا تو آج میری طبیعت بدلی ہوئی تھی۔ غالباً فاخرہ نے بھی محسوس کیا تھا۔ وہ بھی سمجھی کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

"سر، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"کیوں، میری طبیعت کو کیا ہوا ہے؟"

"آج آپ کچھ بدلے بدلے سے لگ رہے ہیں۔"

"تمہیں مجھ سے زیادہ اپنی فکر کرنی چاہیے۔"

"کیا مطلب سر؟"

"کچھ نہیں، اپنی پڑھائی پر دھیان دو۔"

میرے لہجے میں کچھ ایسی تلخی تھی کہ وہ سہم کر رہ گئی۔

میں اسے پڑھا ضرور رہا تھا لیکن میرا ذہن ابھی تک ارسلان میں الجھا ہوا تھا۔ ایسے چھٹے ہوئے بدمعاش کا اس کے گھر میں کیا کام۔ میں یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔

میں نے باہر نکلنے سے پہلے امتیاز صاحب سے پوچھ لیا "ارسلان آپ کے گھر کیوں آیا تھا، وہ ایسا تو نہیں کہ اسے گھر میں بلایا جائے۔"

"وہ ایسا بھی نہیں ہے جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔ وہ

بدمعاش ضرور ہے لیکن شریف لوگوں کا بہت احترام کرتا ہے۔ پھر ہماری محلہ داری بھی ہے۔ کسی کام سے آیا تھا۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھالیا۔ ایسے لوگوں سے بگاڑ بھی تو نہیں کر سکتے۔"

ان کی بات میں خاصا وزن تھا۔ میں نے سوچا، اگر وہ میرے دروازے پر آجائے تو ڈر کے مارے ڈرائنگ روم میں بٹھانا ہی پڑے گا۔

ان کی وضاحت کے بعد میرا دل صاف ہو گیا تھا ورنہ میں تو خدانخواستہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کا فاخرہ سے کچھ تعلق ہے۔

یہ تمام باتیں ایک مہینے میں ہو گئی تھیں اور ایک مہینے بعد امتیاز صاحب نے مجھے پہلی ٹیوشن فیس دی تھی۔ پیسے مجھے ملے تھے اور فاخرہ ایسے خوش ہو رہی تھی جیسے اسے تنخواہ ملی ہو۔

"سر، ایک بات کہوں؟"

"کہو۔ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"آپ ہر بات کا تو برا مان جاتے ہیں۔ کہنے کی ہمت کہاں ہوتی ہے میری۔"

"معقول بات ہوگی تو میں ہرگز برا نہیں مانوں گا۔"

"آپ کو پہلی تنخواہ ملی ہے۔ اس پر کچھ حق میرا بھی تو ہے۔"

"کل مٹھائی لیتا آؤں گا۔"

"مٹھائی سے کام نہیں چلے گا۔"

"پھر کس سے کام چلے گا؟"

"آپ مجھے اپنے ساتھ لے کر جائیں گے اور سوٹ پیس دلوائیں گے۔"

"تم میرے ساتھ کیسے جا سکتی ہو؟"

"کیوں نہیں جا سکتی۔ آپ میرے استاد ہیں اور بقول آپ کے استاد شاگرد کا رشتہ والدین اور اولاد کا رشتہ ہوتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"استاد صرف پڑھائی کے وقت استاد ہوتا ہے۔"

"میں نے تو آپ کو ہر جگہ اپنا استاد تسلیم کر لیا ہے۔ آپ کو گھبرانے کی ضرورت یوں بھی نہیں ہے کہ میں آپ کے ساتھ چوری چھپے نہیں جاؤں گی بلکہ گھر والوں کی اجازت سے جاؤں گی۔ کسی نے دیکھ بھی لیا تو الزام آپ پر نہیں آئے گا۔"

"ٹھیک ہے، اگر تم اپنے گھر والوں سے اجازت لے کر چلتی ہو تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گا۔"

مجھے معلوم تھا کہ اس کے گھر والے اسے یہ اجازت دے ہی نہیں سکتے۔ اس کی بات رہ جائے گی اور میں اس کے ساتھ جانے سے بچ جاؤں گا۔

میں دوسرے دن اس اعتماد کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا لیکن اس وقت مجھے سخت حیرت ہوئی جب اس کی ماں نے خود آکر مجھ سے کہا۔

"فاخرہ کہہ رہی تھی کہ وہ تمہارے ساتھ بازار تک جانا چاہتی ہے۔ تمہیں فرصت ہو تو لے جاؤ۔ میں اسے اکیلے بازار نہیں جانے دیتی ہوں۔"

میں ان سے نہ جانے کیوں نہ تو انکار کر سکا، نہ یہ پوچھ سکا کہ اکیلی نہ بھیجیں، وہ خود اس کے ساتھ چلی جائیں۔ کچھ کہنے کا موقع یوں بھی نہ مل سکا کہ اسی وقت فاخرہ تیار ہو کر آگئی۔

"چلیے سر، واپس بھی آنا ہے۔"

میں اسے لے کر گھر سے باہر نکل تو آیا تھا لیکن سوچ رہا تھا، اب کیا کروں۔ اگر گھروں کی طرف سے جاتا تو لوگوں کا ڈر تھا۔ کوئی دیکھ لیتا تو گھر تک بات پہنچ جاتی۔ میدان کی طرف سے جاتا تو وہاں ارسلان بدمعاش پلنگ ڈالے بیٹھا تھا۔ پھر میں نے میدان کی طرف سے جانا ہی ٹھیک سمجھا۔ ارسلان کو میں فاخرہ کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ میں نے سوچا اگر کوئی بات ہوئی تو فاخرہ خود بتا دے گی کہ وہ اپنی ماں کی اجازت سے میرے ساتھ جا رہی ہے۔ ہم جیسے ہی اس پلنگ کے سامنے سے گزرے جہاں ارسلان بیٹھا تھا، وہ ہم دونوں کو ساتھ دیکھ کر چونک گیا اور پلنگ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

فاخرہ نے اس کی طرف نہیں دیکھا لیکن میں نے دیکھ لیا تھا کہ ارسلان کی آنکھوں سے چنگاریاں برس رہی ہیں۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے ابھی جھپٹ کر حملہ کر دے گا لیکن پھر اچانک اس کی بند مٹھیاں کھل گئیں اور وہ دوبارہ پلنگ پر بیٹھ گیا۔ میں نے کچھ دور جا کر پلٹ کر دیکھا۔ وہ شراب کی بوتل منہ سے لگائے لمبے لمبے گھونٹ لے رہا تھا۔

"تم نے ارسلان بدمعاش کو دیکھا؟"

"وہ کوئی دیکھنے کی چیز ہے جو دیکھتی۔"

"تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر اس کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔ لگتا تھا ابھی حملہ کر دے گا۔"

"ایسے ہی کر دے گا حملہ۔ اس کے باپ کا میدان ہے نا۔"

"آدمی خطرناک ہے، ایسے لوگوں سے ڈرنا چاہیے۔"

ہم یہ باتیں کرتے کرتے سڑک تک آگئے تھے۔ میں نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا۔ میں آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ رہا تھا لیکن اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر پچھلی سیٹ پر اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔

"کم از کم ٹیکسی والے کو تو یہ مت بتاؤ کہ ہم غیر ہیں۔"

میں چپ ہو گیا جیسے اس کے حکم پر چلنے پر مجبور ہوں لیکن دل میں سوچ ضرور رہا تھا کہ فاخرہ ضرورت سے زیادہ بھولی ہے یا اس کے کردار میں کوئی خرابی ہے۔

ہم مارکیٹ پہنچے تو اس نے ایک ایک دکان گھومنا شروع کر دیا۔ ایک سوٹ پیس خریدنا تھا، وہ کہیں سے بھی خریدا جا سکتا تھا لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ گھومنا چاہتی ہے لہٰذا وقت گزاری کر رہی ہے۔ ہم تقریباً پوری مارکیٹ گھوم چکے تھے۔ چلتے چلتے میرے تو پاؤں دکھ گئے تھے لیکن وہ تروتازہ تھی بلکہ اس کے چہرے پر شادابی اور خوشی کے ایسے رنگ تھے جنہیں کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

"تمہاری امی کہیں گی، ایک سوٹ خریدنے میں اتنی دیر لگا دی۔ جو خریدنا ہے جلدی خرید لو۔"

"اب تک تو وہ سمجھ بھی چکی ہوں گی کہ میں آپ کے ساتھ بھاگ گئی۔"

"فاخرہ، ایسی باتیں کرتے ہوئے تمہیں ذرا بھی حجاب نہیں آتا۔"

"آپ سے کیسی شرم! آپ تو میرے استاد ہیں۔"

"میں تھک بھی گیا ہوں۔ اب جو خریدنا ہے خرید لو۔"

"یہ کہیے نا۔ آپ پہلے کہہ دیتے۔" وہ ایک دکان میں گھس گئی۔ میں کسی نامراد شوہر کی طرح اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

اس نے کپڑا پسند کیا اور ایک سوٹ پیس خرید لیا۔ میں پیسے نکالتا رہ گیا اور اس نے دکاندار کے ہاتھ پر قیمت رکھ بھی دی۔ میں اصرار کرنے کے سوا اس وقت کیا کر سکتا تھا۔ باہر نکل کر میں نے اس سے کہا۔ "جب تمہیں ہی پیسے دینے تھے تو مجھے کیوں لائی تھیں؟"

"آئندہ آؤں گی تو آپ کے پیسے خرچ کراؤں گی۔"

"آئندہ بھی آؤ گی؟"

"اور نہیں تو کیا۔ اب تو ہر پندرہ دن بعد آیا کروں گی۔ مجھے بڑا مزہ آیا آپ کے ساتھ آ کر۔ آئیے اسی بات پر کہیں سے کولڈ ڈرنک پیتے ہیں۔"

کولڈ ڈرنک کے پیسے بھی اسی نے دیے تھے۔ اب یہ سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں رہی تھی کہ اس کا مقصد صرف مجھے ساتھ لانا تھا۔ مگر کیوں؟ میں ان چکروں سے دور اور اتنا سیدھا تھا کہ اس سوال کا جواب میں خود نہیں دے سکا تھا۔

کولڈ ڈرنک پینے کے بعد ہم پھر ٹیکسی کی تلاش میں نکلے۔ اس دوران وہ مجھ سے وعدہ لے چکی تھی کہ ہم مہینے میں دو ایک بار تفریح کے لیے گھر سے باہر نکلا کریں گے۔

ہم واپس آئے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں نے ٹیکسی اس کے گھر کے سامنے رکوائی۔ مجھے شک ہوا کہ کوئی آدمی ہمارے انتظار میں کھڑا تھا اور ٹیکسی رکتے ہی آگے بڑھ گیا۔ میں اسے دیکھ نہیں سکا لیکن مجھے شک ہوا تھا کہ وہ ارسلان ہے۔

میں نے فاخرہ کو اس کے گھر میں چھوڑا اور پیدل اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ گھر دور ہی کتنا تھا، دو گلیاں ہی تو پار کرنی تھیں لیکن گھر کے قریب پہنچتے ہی میری جان نکل گئی۔ میرے دروازے کے پاس ارسلان کھڑا تھا۔ میں اس سے بچ کر بھی نہیں نکل سکتا تھا کیونکہ مجھے گھر میں داخل ہونا تھا۔ جتنی دیر میں مجھے کوئی ترکیب سوجھتی، وہ میرے قریب آگیا۔

"مجھے جانتے ہو؟" وہ غرایا۔

"آپ کو یہاں کون نہیں جانتا۔"

"تو پھر یہ بھی جانتے ہو گے کہ میرا چاقو پلک جھپکتے میں پیٹ کے دو ٹکڑے کر دیتا ہے۔"

"میں تو آپ کے ہاتھوں کی صفائی کا بڑے عرصے سے قائل ہوں لیکن آپ یہ سب کچھ مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ اگر کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے تو فوراً مجھے خبر کرنا۔ آنکھیں نکال کر سالے کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔"

"آپ کی مہربانی لیکن یہاں میری کسی سے دشمنی نہیں، نہ میں اس قسم کا آدمی ہوں۔"

"اب جس راستے پر تم چل نکلے ہو، تمہارے بہت سے دشمن ہو سکتے ہیں، سمجھے تم!" اس نے ہتھوڑے جیسا ہاتھ میرے شانے پر رکھتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

میں اس سے یہ بھی نہیں پوچھ سکا کہ راستے پر چلنے سے اس کا کیا مطلب ہے؟ ویسے میں سمجھ گیا تھا کہ اس کا اشارہ فاخرہ کی طرف ہے۔

میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ ارسلان نے مجھے کوئی دھمکی نہیں دی تھی، اس لیے اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا تھا البتہ یہ ضرور سوچنے لگا تھا کہ وہ لوگ کون ہو سکتے ہیں جن سے مجھے خطرہ ہے۔ یہ سوچنا بھی بالکل جائز تھا کہ ارسلان کو مجھ سے اتنی دلچسپی کیوں ہو گئی ہے۔

میں ارسلان کی طرف سے بے فکر ہو کر فاخرہ کو پڑھانے کے لیے جاتا رہا۔ اس کے امتحان نزدیک آگئے تھے اس لیے میں اسے وقت بھی زیادہ دے رہا تھا بلکہ اب تو یہ ہو گیا تھا کہ

پڑھائی کے بعد گپ شپ کے لیے بھی رک جاتا تھا۔ اس کے والدین بھی مجھ پر اتنا بھروسا کرتے تھے اس لیے انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔

ایک دن وہ پھر کہنے لگی ”سر! کہیں گھومنے چلتے ہیں۔“

”امتحان سر پر ہیں اور تمہیں گھومنے کی پڑی ہوئی ہے۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ ذہن فریش ہو جائے گا تو اچھا پڑھا جائے گا۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”آپ اپنی شاگرد کا اتنا خیال بھی نہیں رکھ سکتے؟“

اس نے کچھ اس انداز سے ضد کی کہ میں تیار ہو گیا۔ اس کے گھر والوں کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ فوراً اجازت مل گئی۔ باہر نکلتے ہی فاخرہ ضد کرنے لگی کہ فلم دیکھی جائے۔ اس کی ضد میں ایسا بچپنا تھا کہ مجھے ماننا پڑا۔ اس موقع پر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ میں اس کی ہر بات کیوں مان لیتا تھا تو اس کی وجہ کچھ اور نہیں تھی۔ وہ ضد کرتے وقت بالکل بچی معلوم ہوتی تھی۔ میں اس کا دل رکھ لیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس سے مجھے کوئی اور غرض نہیں تھی۔ اس نے بھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔

اس کے بعد اتنا ضرور ہوا تھا کہ ہم اکثر تفریح کے لیے ساتھ جانے لگے تھے۔ امتحانات ختم ہو گئے تو تقریباً ہر دوسرے دن کا جانا ہو گیا تھا۔ زیادہ تر وہی پیسے خرچ کیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی میری جیب سے بھی نکل آتے تھے۔

وہ بی اے میں آ گئی تھی اور مجھے ایک بینک میں نوکری مل گئی تھی۔ اب میرے پاس وقت کم تھا لیکن جیب میں پیسے بہت تھے..... ٹیوشن کا سلسلہ پھر بھی چل رہا تھا۔ اماں کہتی بھی تھیں کہ اب تجھے ٹیوشن کی کیا ضرورت ہے لیکن میں انہیں کیا بتاتا کہ ٹیوشن میں فیس کے لیے نہیں پڑھا رہا ہوں بلکہ فاخرہ کی باتیں مجھے اچھی لگتی ہیں اس لیے ٹیوشن کے بہانے اس کے گھر چلا جاتا ہوں۔

اب اس کے ساتھ گھومنے کا پروگرام چھٹی والے دن طے ہوتا تھا۔ میں پابندی سے اس کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے جا رہا تھا لیکن ایک بات مجھے بہت پریشان کر رہی تھی۔ ہم جہاں بھی جاتے تھے، مجھے محسوس ہوتا تھا ارسلان ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ ہمارے سامنے نہیں آتا تھا لیکن کہیں نہ کہیں اس کی ایک جھلک میں دیکھ ہی لیتا تھا۔ میں نے اپنے اس وہم کو فاخرہ پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا مگر ایک روز میرا یہ وہم حقیقت میں بدل گیا۔ اس روز ہم فلم دیکھنے گئے تھے۔

سینما ہاؤس سے باہر آئے تو معلوم ہوا بسوں کی ہڑتال ہو گئی ہے۔ رکشا، ٹیکسی بھی کوئی نہیں مل رہا تھا۔ ہم دونوں پریشان کھڑے تھے۔ پھر یہی سوچا کہ پیدل ہی گھر کی طرف چلا جائے۔ دوسرا شو دیکھنے گئے تھے اور اب رات کے دس بج رہے تھے۔ ہم راستہ مختصر کرنے کے لیے آبادی سے ویرانے کی طرف مڑ گئے تھے۔ یہ ایک میدان تھا۔ پھر ایک سڑک آتی تھی اور اس کے بعد وہ میدان شروع ہو جاتا تھا جہاں ارسلان اپنی چارپائی ڈال کر بیٹھا کرتا تھا۔

ابھی ہم اس ویرانے میں داخل ہوئے تھے کہ ہم نے چار آدمیوں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ میں نے سوچا تھا، یہ لوگ بھی ہماری طرح پیدل اپنے گھروں کو جا رہے ہوں گے لیکن میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا جب انہوں نے ہمارے گرد گھیرا سا ڈال لیا۔

”اس بلبل کو کہاں لے جا رہا ہے؟“

”بکواس بند کرو، یہ میری بیوی ہے۔“

”آج یہ ہم سب کی بیوی ہوگی۔ کل آ کے یہاں سے لے جانا۔“

”بھائی، تم چاہتے کیا ہو؟“

”بڑا بھولا ہے۔ اب بھی نہیں سمجھا۔ ہم یہ چاہتے ہیں۔“ ان میں سے ایک نے کہا اور فاخرہ کی کلائی پکڑ لی۔

”خیریت چاہتا ہے تو یہاں سے بھاگ جا۔“

”بھاگے گا تمہارا باپ۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تم لوگوں سے ڈر جاؤں گا۔“

میری آواز کانپ رہی تھی۔ ہمت کر کے میں نے انہیں دھمکی دی تھی۔ اس دھمکی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے چاقو نکال لیے۔ میں ان غنڈوں سے ہاتھ پاؤں کی لڑائی نہیں لڑ سکتا تھا۔ اب تو انہوں نے چاقو بھی نکال لیے تھے۔ بس اس وقت ایسا معلوم ہوا جیسے گیدڑوں کے درمیان کوئی شیر کود پڑا ہو۔ میں اندھیرے میں دیکھ بھی نہیں سکا کہ وہ کون ہے لیکن وہ جو کوئی بھی تھا، بلا کا بہادر انسان تھا۔ اس نے آتے ہی چاروں کو اپنے گھونسوں پر رکھ لیا۔ کچھ دیر وہ گھونسے برساتا رہا اور پھر وہ چاروں بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کے بھاگتے ہی مجھے اپنے محسن کو پہچاننے میں وقت نہیں ہوئی۔ وہ ارسلان تھا۔

”ارسلان بھائی، میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟“

”شکریہ ادا کرو لیکن آئندہ رات کے وقت اس طرف سے مت گزرنا۔ رات کے وقت یہ علاقہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔“

”ارسلان بھائی، آپ اس طرف کیسے نکل آئے

تھے؟“

”اس سے تمہیں کیا۔ تم کیا میرے باپ ہو جو پوچھ رہے ہو۔ سیدھے نکل کے سڑک پار کر لو۔ میں دیکھتا رہتا ہوں پھر کوئی حرامی تمہیں پریشان نہ کرے۔“

اس کے بعد کسے پریشان کرنا تھا۔ پریشان تو فاخرہ کر رہی تھی جو اس واقعے سے اتنا ڈر گئی تھی کہ اس کے لیے چلنا مشکل ہو گیا تھا۔ جیسے تیسے میں نے اسے اس کے گھر تک پہنچایا اور یہ ہدایت کر کے اپنے گھر چلا آیا کہ وہ اس بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائے۔

اپنے گھر آ کر میں بڑی دیر تک ارسلان کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ اتفاقاً وہاں آ گیا تھا یا پھر میرا اندیشہ درست تھا کہ وہ ہمارا پیچھا کرتا رہتا ہے۔ اگر پیچھا کرتا ہے تو کیوں؟ اسے ہماری نقل و حرکت میں کیوں اتنی دلچسپی ہے؟ میں ان سوالات پر صرف سوچ سکتا تھا۔ کوئی واضح جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں سوچتے سوچتے تھک گیا تو سو گیا۔

دوسرے دن میں بینک گیا تو اس وقت بھی ارسلان میرے ذہن پر سوار تھا۔ مجھے اپنے اردگرد خطرہ منڈلاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مجھے کئی فلمیں یاد آ گئیں جن میں ہیرو اپنی ہیروئن کو متاثر کرنے کے لیے خود غنڈے بھیجتا ہے اور پھر ان سے فرضی مقابلہ کر کے انہیں بھگا دیتا ہے۔ ارسلان بھی ایسا ہی کچھ تو نہیں کر رہا ہے۔ اسے مجھ میں دلچسپی ہے یا فاخرہ میں؟ اگر وہ فاخرہ میں دلچسپی لے رہا ہے تو مجھے کسی بھی وقت راستے سے ہٹا سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ میں کئی دن تک اسے پڑھانے نہیں گیا۔ پھر امتیاز صاحب میری خیریت دریافت کرنے آ گئے۔ میں نے ان سے اپنی مصروفیت کا بہانہ کر کے فاخرہ کو پڑھانے سے معذرت کر لی۔ وہ بھی میری مصروفیت کو سمجھ رہے تھے لہٰذا انہوں نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔

کچھ دن اور گزر گئے۔ پھر ایک دن وہ میرے پاس آئے۔ اس وقت وہ میرے پاس ٹیوشن کے لیے اصرار کرنے نہیں آئے تھے بلکہ اپنے ایک ذاتی کام سے آئے تھے لہٰذا مجھے ان کے ساتھ ان کے گھر جانا پڑا۔ انہوں نے مجھے اسی کمرے میں بٹھایا جہاں کچھ دنوں پہلے تک میں فاخرہ کو پڑھایا کرتا تھا۔

”عارف میاں، میں نے تمہیں اس لیے زحمت دی ہے کہ...“ یہ کہتے کہتے انہوں نے فاخرہ کو اندر بھیج دیا۔ صرف ان کی بیگم تھیں جو ان کے پاس بیٹھی تھیں۔ ”بات یہ ہے کہ فاخرہ کا رشتہ آیا ہے۔ میں چاہتا ہوں، تم اس سے مل لو۔ تم نئے زمانے کے ہو۔ اسی نظر سے لڑکے کو دیکھو گے۔ مجھے تم پر اتنا بھروسا بھی ہے کہ میں تمہاری رائے کو اہمیت دوں گا۔“

”بہت بہتر۔“ میں صرف اتنا کہہ سکا ”آپ مجھے لڑکے کا پتا بتا دیجیے گا، میں جا کر مل لوں گا۔“

میں نے ان سے کہنے کو تو کہہ دیا تھا لیکن اس دن پہلی مرتبہ میرے دل نے کہا تھا کہ عارف ذیشان، تمہیں فاخرہ سے محبت ہے۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ امتیاز صاحب، فاخرہ کے لیے مجھے بھی تو پسند کر سکتے تھے۔ کاش! انہوں نے مجھے یہ کہنے کے لیے بلایا ہوتا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خود کیسے کہہ سکتے تھے۔ شاید میں نے ہی دیر کر دی۔ مجھے خود ان سے کہنا چاہیے تھا۔ میں اب بھی کہہ سکتا ہوں لیکن اب نہیں۔ وہ لڑکا کسٹم میں ملازمت کرتا ہے۔ اس کے سامنے میری کیا حیثیت۔ انکار سننے سے بہتر ہے میں خاموش رہوں۔ میں نے اگر اپنا ذکر کیا تو وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔ پھر میں یہ بھی سوچنے لگا تھا کہ فاخرہ نے کبھی اظہار نہیں کیا۔ وہ میرے ساتھ گھومتی پھرتی ضرور تھی لیکن محبت کا ایک لفظ بھی کبھی اس کی زبان پر نہیں آیا۔ کیا خبر وہ میرے لیے کیا جذبات رکھتی ہے؟ مجھے تو خود ابھی معلوم ہوا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔

میں نے دل پر پتھر رکھ لیا اور امتیاز صاحب کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ کر اس لڑکے سے ملاقات کی۔ لڑکا مجھے اچھا لگا۔ وہ لوگ تھے بھی دولت مند۔ فاخرہ کے لیے یہ رشتہ بہت مناسب تھا۔ مالی اعتبار سے بھی وہ لڑکا نہایت مستحکم تھا۔ فاخرہ دولت میں کھیلے گی۔ اس وقت میں نے یہی سوچا تھا۔

اس سے ملاقات کر کے آیا تو سیدھا فاخرہ کے گھر پہنچا اور اس لڑکے کے بارے میں امتیاز صاحب کو نہایت اچھی رپورٹ دے دی اور ہارے ہوئے جواری کی طرح گھر واپس آ گیا۔ ابھی آ کر بیٹھا ہی تھا کہ محلے کا ایک بچہ آیا اور اس نے بتایا کہ فاخرہ باجی آپ کو بلا رہی ہیں۔ میں سمجھا وہ اپنے گھر میں ہوگی۔ میں اس کے گھر جانے کے لیے گھر سے نکل آیا۔ گھر سے نکلتے ہی میں نے دیکھا کہ وہ برقع پہنے گھر کے سامنے کھڑی ہے۔

”میرے پیچھے پیچھے چلے آئیے۔“

اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ میں آ رہا ہوں یا نہیں۔ مجھے مجبوراً اس کے پیچھے جانا پڑا۔ اس نے آگے چل کر ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ وہ بھی بیٹھ گئی۔

”مجھے کسی ریسٹورنٹ میں لے چلیے۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔

ہزاروں سال پہلے 262 قبل از میلاد مسیح علیہ السلام

بہت ہی خوفناک اور بھیانک منظر تھا۔ ہزاروں لاکھوں انسان آپس میں گتھم گتھا اور گھمسان کا رن پڑا تھا۔ دونوں لشکر پورے جوش و خروش سے برسرپیکار تھے۔ جے جے کار کے فلک شگاف نعروں سے دھرتی کا سینہ کانپ رہا تھا، تیروں کی سنسناہٹ ڈھالوں کے ٹکرانے اور کھانڈوں کے بجنے سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ برعظیم ہندوستان کا پہلا اور آخری ہندو شہنشاہ مہاراجا اشوک بہ نفس نفیس میدان کارزار میں موجود اپنے لشکر کی قیادت کر رہا تھا اس کی موجودگی سے اس کے سپاہیوں کے حوصلے بہت بڑھے ہوئے تھے۔ اشوک اپنے باپ راجا بندوسار کے عہد میں ٹیکسلا (ٹیکسلا، پاکستان) پر کامیاب ماتحت وزیر کی حیثیت سے حکومت کر چکا تھا، اس کی انتظامی صلاحیتیں وہاں تجربے سے مزین ہو کر جلا پا چکی تھیں اور اب باپ کے انتقال کے بعد ہرات (افغانستان) سے سیام (تھائی لینڈ) اور کشمیر سے مدراس تک وسیع و عریض مملکت کا بلاشرکت غیرے حکمران تھا اور سابقہ تجربے کی بنیاد پر فرائض حکومت بڑی خوش اسلوبی سے نبھا رہا تھا درمیان میں کلنگ (اڑیسہ، بھارت) کا خطہ غیر مفتوح تھا جسے وہ اس وقت فتح کرنے اور اپنی سلطنت کی تکمیل میں مصروف تھا۔ راجا چندرگپت موریا کا یہ عظیم الشان پوتا اشوک مہاراجا سے شہنشاہ بننے کا آخری مرحلہ طے کرنے ہی والا تھا۔ دشمن اپنی ہاری ہوئی جنگ زیادہ دیر تک جاری نہ رکھ سکا اور بالآخر کلنگ کا رن مہاراجا اشوک کے ہاتھ رہا۔ فتح و نصرت اس کی بلائیں لیتی ہے۔ دشمن کے ایک لاکھ سپاہی رزم گاہ میں کھیت رہتے ہیں اور ڈیڑھ لاکھ جنگجو قید ہوتے ہیں۔ کثیر تعداد میں قیدی اور مال غنیمت سمیٹ کر مہاراجا اور اب شہنشاہ اشوک جب اپنی راجدھانی پاٹلی پتر (پٹنہ، بہار) میں داخل ہوتا ہے تو اسی شہنشاہ کے طفیل برعظیم ہندوستان کو پہلی بار اک وحدت بننا نصیب ہوتا ہے۔ چھوٹی بڑی ریاستوں میں بٹا ہوا برعظیم ہندوستان یکجا اور یک جان ہو کر اک پرچم تلے اور مملکت بنتا ہے، اس پرچم کو اشوک چکر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ (جو آج بھی بھارت کا قومی پرچم ہے) کلنگ کی شاندار فتح اپنی جگہ پر مگر یہ خوں ریز لڑائی فطری طور پر نیک دل شہنشاہ کی کایا پلٹ دیتی ہے۔ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا بہیمانہ قتل اسے پشیمانی، تاسف اور افسردگی میں مبتلا کر دیتا ہے، وہ سچے دل سے تائب ہو کر آہنسا (عدم تشدد) کا پیروکار بن جاتا ہے کسی بھی جان دار کو مطلق تکلیف نہ دینا اور مخلوق ارضی کو زیادہ سے زیادہ سکھ پہنچانا اس کا مسلک بن جاتا ہے۔ رہنما بدھ مت اختیار کرنے والا شہنشاہ اشوک پھر ساری عمر بنیادی نیکیوں اور سچائیوں کی عملی تبلیغ کرتا ہے، اپنے ایک سنگی کتبے پر کندہ کرایا ہوا اس کا یہ قول آیندہ عمل کی بنیاد بنتا ہے کہ تمام انسان میرے بچے ہیں اور اپنے صلبی بچوں کی طرح میں تمام انسانوں کے لیے دنیا و آخرت کی بھلائی چاہتا ہوں۔ شہنشاہ اشوک کا عہد اس لحاظ سے بھی تاریخ میں یادگار رہتا ہے کہ وہ پتھر سے عمارتیں بنانے کا آغاز کرتا ہے، اس سے پہلے ہندوستان میں لکڑی کی عمارتیں بنتی تھیں، باپ دادا کا محل بھی لکڑی کا تھا۔

مرسلہ: محمد ایاز راہی، مانسہرہ

میں نے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے ٹیکسی رکوالی۔

”آپ ابا کے کہنے پر کہاں گئے تھے؟“

”کس دل سے کہوں کہ اس لڑکے کو دیکھنے گیا تھا جس کا رشتہ تمہارے لیے آیا ہے۔“

”مبارک ہو، آپ نے یہ فرض ادا کر دیا۔“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو، میں نے کیا غلط کیا؟“

”آپ کو ذرا بھی اندازہ نہیں؟ آپ کو یہ یاد نہیں آیا کہ میں آپ کے ساتھ کیوں جاتی رہی ہوں۔ گھنٹوں آپ سے کیوں باتیں کرتی رہی ہوں۔ میں اس انتظار میں دن گزارتی رہی کہ کسی دن آپ کی طرف سے اظہار ہوگا لیکن اظہار یہ ہوا کہ آپ میرے لیے رشتہ دیکھنے چلے گئے۔“

”مجھے بھی اب احساس ہوا ہے کہ میرا وجود تمہارے بغیر کچھ نہیں۔ کاش! تم نے پہلے اظہار کیا ہوتا۔ میں خود کو تمہارے لائق نہیں سمجھتا تھا اس لیے کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا کہ تم مجھے پسند کرتی ہوگی۔“

”آپ اب بھی یہ رشتہ ختم کرا کے میرا ہاتھ تھام سکتے ہیں۔“

”اب بہت دیر ہو چکی ہے فاخرہ! محبت اس لیے نہیں ہوتی کہ بڑوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی جائے۔ تمہارے والد نے مجھ پر بھروسا کیا ہے۔ میں اُس لڑکے کی تعریف کر چکا۔ اب میں یہ کہہ دوں، کیا سوچیں گے وہ؟“

”آپ کو سب کی پروا ہے، میری پروا نہیں؟“

”مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تمہیں سمجھنے میں بہت دیر لگا دی۔“

”عارف، قسمت پر شاکر ہو کر نہ بیٹھ جاؤ۔ اگر میں کسی اور کی ہو گئی تو کبھی خوش نہیں رہوں گی۔ مجھے بچا لو، میری خوشیاں لوٹا دو۔ مجھے اپنا لو۔“

مجھ پر اپنی شرافت کا نشہ ایسا طاری تھا کہ اس کے آنسو پانی بن کر بہہ گئے اور میں اس سے یہ وعدہ نہ کر سکا کہ میں اسے اپنانے کے لیے اس کے والد سے بات کروں گا۔

اس نے مایوس قدموں سے چلتے ہوئے واپسی کا راستہ طے کیا اور میں اس ارادے سے اس سے جدا ہو گیا کہ اب اس کی دنیا میں قدم نہیں رکھوں گا۔

میں اس کی طرف جا نہیں رہا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح اس گھر کی خبریں مجھ تک پہنچ ضرور رہی تھیں۔ فاخرہ کے گھر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مجھے خوشی نہیں ہونا چاہیے تھی مگر میں پھر بھی خوش تھا کہ فاخرہ اچھے گھر میں بیاہ کر جا رہی ہے۔ کچھ دنوں میں وہ مجھے بھول جائے گی۔ اس کی زندگی سکون سے گزرے گی۔

ایک دن اس کے والد میرے گھر آئے۔ سخت پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ میرا دل زور سے دھڑکا تھا کہ خوشی کے گھر میں ایسی کیا پریشانی ہو گئی۔ میرا دھیان فاخرہ کی طرف گیا تھا۔ اس نے تو کوئی ایسا ویسا قدم نہیں اٹھا لیا؟ جب امتیاز صاحب سے بات ہوئی تو ان کی زبان پر کوئی اور ہی کہانی تھی۔

”فاخرہ کا رشتہ ختم ہو گیا۔“

”رشتہ ختم ہو گیا مگر کیوں؟“

”لڑکے والوں کی طرف سے انکار ہو گیا۔“

”یہ تو بہت برا ہوا لیکن ان لوگوں نے کوئی وجہ تو بتائی ہوگی؟“

”وہ غنڈا ارسلان ان لوگوں کے گھر جا پہنچا تھا اور دھمکیاں دے کر آ گیا کہ اگر زبیر نے فاخرہ سے شادی کی تو وہ اسے جان سے مار دے گا۔ وہ لوگ میرے گھر آئے اور میری ناک کاٹ کر چلے گئے۔ جاتے جاتے کہہ گئے کہ جب اس غنڈے سے تمہاری بیٹی کے تعلقات تھے تو ہمارے گھر رشتہ لے کر کیوں آئے تھے۔“ انہوں نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

میں نے بڑی مشکل سے انہیں چپ کرایا تاکہ وہ کچھ اور کہیں۔ ان کا کچھ دل تو ہلکا ہو۔

”انکل، بات دکھ کی ضرور ہے لیکن دنیا اتنی چھوٹی نہیں۔ فاخرہ کے لیے بہت رشتے۔ اللہ کہیں اور انتظام کر دے گا۔“

”میں تو کچھ اور سوچ رہا ہوں عارف میاں!“ انہوں نے حالت سنبھلنے کے بعد کہنا شروع کیا ”اس غنڈے نے اگر زبیر سے اس کی شادی نہیں ہونے دی تو کسی سے بھی نہیں ہونے دے گا۔ جو رشتہ آئے گا اسے اسی طرح بھگا دے گا۔“

”مگر کیوں؟“

”کس منہ سے کہوں۔ مجھے تو یہ لگتا ہے کہ فاخرہ سے وہ خود شادی کرنا چاہتا ہے۔ کسی دن رشتہ لے کر بھی آ جائے گا ورنہ تم خود سوچو، زبیر سے اس کی کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ کیوں اس نے رشتہ ختم کرایا۔ اس غنڈے سے ہم کیسے لڑ سکیں گے۔ اس سے تو محلے والے بھی ڈرتے ہیں۔ کوئی بھی ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔“

ان کی بات میرے دل کو بھی لگ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے پچھلی باتیں بھی یاد آ رہی تھیں۔ اس کا چھپ چھپ کر ہمارا تعاقب کرنا۔ ایک دفعہ ہمیں غنڈوں سے بچانا۔ ایک مرتبہ فاخرہ کے گھر سے بھی نکل رہا تھا۔ یہ سب باتیں کیا یہ سمجھانے کو کافی نہیں تھیں کہ وہ فاخرہ کو پسند کرتا ہے۔ اسی لیے وہ اسے کسی اور کی ہونے دینا نہیں چاہتا۔

میں نے سمجھا بجھا کر امتیاز صاحب کو تو رخصت کر دیا تھا لیکن خود پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے جب زبیر کو بھگا دیا تو میری کیا حیثیت ہے۔ زبیر کا رشتہ ختم ہونے کے بعد فاخرہ ضرور مجھ سے شادی کرنا چاہے گی لیکن کیا ارسلان یہ شادی ہونے دے گا؟

میں فاخرہ سے محبت ضرور کرتا تھا لیکن اس غنڈے سے اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کسی دن میرے دروازے پر بھی آ سکتا ہے۔ زبیر کو جو دھمکی دی ہے وہ مجھے بھی دے سکتا ہے۔

ان حالات میں مجھے یہی سوجھی کہ میں فاخرہ کے گھر جانا بالکل ہی چھوڑ دوں۔ ارسلان مطمئن ہو جائے گا اس کے بعد دیکھا جائے گا۔

میں واضح اعلان کرتا ہوں کہ یہ میری بزدلی تھی جسے میں نے مصلحت کا نام دے لیا تھا۔

ہر طرف خاموشی تھی، نہ امتیاز صاحب آئے تھے، نہ میں گیا تھا اور نہ فاخرہ نے کوئی رابطہ کیا تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے، وہی میرے ساتھ ہوا۔ ایک دن امتیاز صاحب آ گئے۔ پہلے سے بھی زیادہ گھبرائے ہوئے تھے۔

حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت تاریخ کے آئینے میں

تاریخ	مہینا	سال	تقویم
12-9	ربیع الاول	1	عام الفیل
18	دے	40	نوشیروانی
25	برموده	287	قبطی جدید
22	اپریل	571	عیسوی
01	جیٹھ	628	بکرمی
20	نیساں	882	سکندری (مقدونی)
18	توت	1319	بخت نصری
20	07	2585	ابراہیمی
01	جیٹھ	3672	کل جگ
11	ہتشس	3675	طوفان نوح
10	ایار	4331	رومی۔ یہودی۔ عبرانی
19	اپریل	5284	جولین پیریڈ

مرسلہ: محمد ایاز راہی، مانسہرہ

"وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔" انہوں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔

"اب کیا ہو گیا انکل! کیا پھر ارسلان نے کوئی ہنگامہ کھڑا کیا ہے؟"

"آخر اس کے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔ اس نے مجھے راستے میں روک کر کہا ہے کہ میں اس کی یعنی اس غنڈے کی مرضی کے بغیر فاخرہ کا رشتہ کہیں طے نہ کروں ورنہ وہ اس رشتے کا بھی وہی حشر کرے گا جو زبیر کا کیا ہے۔"

"آپ نے اس سے پوچھا تو ہوتا کہ اس کی مرضی کیا ہے؟"

"میرے سامنے کوئی اور ہوتا تو اس سے پوچھ بھی لیتا۔ اس غنڈے کے منہ کیا لگتا۔"

امتیاز صاحب کے چلے جانے کے بعد میں اتنا پریشان ہو گیا کہ زندگی میں شاید کبھی نہ رہا ہوں گا۔ مجھے اپنی موت نہیں تو رسوائی ضرور سامنے نظر آ رہی تھی۔ جو شخص زبیر کو آنتیں نکالنے کی دھمکی دے سکتا ہے وہ میرا کیا حشر کرے گا۔ وہ غنڈا ہے، اتنا باظرف نہیں کہ اپنی محبت پر سمجھوتا کر لے۔ میں اگر فاخرہ کی طرف بڑھا بھی تو وہ میری ٹانگیں کاٹ کر رکھ دے گا۔ وہ اب تک مجھے اس لیے برداشت کرتا رہا ہے کہ مجھے فاخرہ کا ماسٹر سمجھتا رہا ہے۔ جس دن وہ دیکھے گا کہ میں کچھ اور بننے کی کوشش کر رہا ہوں بس اسی دن اس کے تیور بدل جائیں گے۔ میرے ساتھ میری والدہ کا دم لگا ہوا ہے۔ بہن ہے جس کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔ مجھے کچھ ہو گیا تو میری ماں بہن کا کیا ہوگا۔ میں اپنی غرض کے لیے ان سب کو داؤ پر کیوں لگاؤں؟

فاخرہ کی محبت اب بھی میرے دل میں کروٹیں لے رہی تھی لیکن میں نے اس سے ملنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ بچے کو بھیج کر مجھے بلوایا لیکن میں نے جانا مناسب نہیں سمجھا۔ امتیاز صاحب بھی نہیں آئے، اس کا مطلب تھا کوئی نیا واقعہ ظہور میں نہیں آیا۔

ایک دن میں بینک میں بیٹھا تھا کہ امتیاز صاحب آ گئے۔ وہ بہت کمزور دکھائی دے رہے تھے یا پھر مجھے لگ رہے تھے کہ تقریباً ایک سال بعد میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ سلام دعا کے بعد میں نے رسماً پوچھ لیا کہ فاخرہ کا کہیں رشتہ ہوا؟

وہ پھٹ پڑے "وہ غنڈا کہیں رشتہ ہونے دے گا تو ہوگا نا۔ ایک رشتہ اور آیا تھا، اسے بھی اس نے بھگا دیا۔ کہتا ہے جہاں وہ چاہے گا وہاں رشتہ ہوگا۔"

"آپ نے پوچھا تو ہوتا کہ وہ کہاں چاہتا ہے؟"

"پوچھا تھا، یہ بھی پوچھا تھا۔ اس نے کہا ہے وہ جلد ہی یہ بھی بتا دے گا۔ اسی لیے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ اگر اس نے اپنا نام پیش کیا تو مجھے کیا کرنا ہوگا۔ آپ کچھ مشورہ دیں۔"

میں انہیں کیا مشورہ دیتا۔ پھر بھی تسلی دینے کے لیے کہہ دیا "جب وہ اپنا نام پیش کرے تو آپ اس سے سوچنے کے لیے دو دن لے لیجیے گا اور پھر مجھے بتا دیجیے گا۔"

"تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں اس کے بعد آپ کو بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔"

وہ بے چارے جس الجھن میں تھے اس کے بعد مطمئن تو کیا ہوتے، میری بات پر یقین ہی کر سکتے تھے۔ وہ بے دلی سے مسکرائے اور اٹھ کر چلے گئے۔

اتنی بڑی خبر سننے کے بعد میرے لیے بینک میں کام کرنا مشکل تھا۔ میں نے منیجر سے ضروری کام کا بہانہ کر کے چھٹی لی اور گھر چلا آیا۔ گھر پہنچ کر میں سوچنا چاہتا تھا کہ اگر ارسلان نے فاخرہ کے لیے اپنا نام پیش کیا تو مجھے کیا کرنا ہوگا۔

گھر پہنچ کر تھکن کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا اور سوچنے لگا۔ ارسلان سے لڑنا میری قوت سے باہر تھا۔ بس

یہ دعا ہی کرسکتا تھا کہ کوئی معجزہ ہوجائے اور فاخرہ مجھے مل جائے۔ میں نے معاملات خدا پر چھوڑے تو کچھ ڈھارس بندھی۔ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔

نہ جانے کتنی دیر گزری تھی کہ میری بہن میرے کمرے میں آئی۔

"بھائی، کوئی دروازے پر آیا ہے۔ عجیب سا آدمی ہے، تمہیں بلارہا ہے۔"

"اس کا نام تو پوچھ لیا ہوتا۔"

"پوچھا تھا کہنے لگا نام سے کیا مطلب، عارف کو بھیج دو۔"

"عجیب بدتمیز آدمی ہے۔ اچھا میں دیکھتا ہوں۔"

میں باہر نکلا تو میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ اس آدمی کو میں کئی مرتبہ ارسلان کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔

"چلو، استاد بلا رہے ہیں۔"

"کون استاد؟"

"ارسلان دادا۔ بلانے کا مطلب بلا رہے ہیں۔ میدان میں بیٹھے تمہارا انتظار کررہے ہیں۔ فوراً آجاؤ۔ فوراً کا مطلب فوراً۔"

یہ کہہ کر وہ چلتا بنا۔ میری کیا مجال تھی کہ میں انکار کرتا۔ آنے والے لمحوں کے لیے میں نے خود کو تیار کیا اور گھر میں چلا آیا۔ ایک مرتبہ یہ خیال بھی آیا تھا کہ اس کے پاس جانے کے بجائے کہیں بھاگ جاؤں لیکن یہ کوئی حل نہیں تھا۔ ارسلان مجھے پاتال سے بھی نکال کر لاسکتا تھا۔ میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ میرے حق میں یہی بہتر ہے کہ میں اس سے جاکر ملوں۔ دیکھوں تو کیا کہتا ہے۔ میں اس سے کہہ دوں گا کہ فاخرہ سے اب میرا کوئی تعلق نہیں۔

میں گھر سے نکلا اور اس میدان میں پہنچ گیا جہاں وہ نیم کے پیڑ کے نیچے چارپائی ڈالے بیٹھا رہا کرتا تھا۔ اس وقت بھی بیٹھا ہوا تھا جو آدمی مجھے بلانے آیا تھا وہ بھی اس کے پاس بیٹھا تھا لیکن مجھے آتے ہوئے دیکھ کر ایک طرف کو چل دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ارسلان مجھ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے میرے لیے چارپائی پر جگہ بنادی۔

"بیٹھو۔" اس نے جیسے حکم دیا اور میں بیٹھ گیا۔

اس نے کہنا شروع کیا "میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ اپنی زندگی کا ایک اہم راز تمہیں بتاؤں۔ وہ جو تمہاری شاگرد ہے فاخرہ، بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ فاخرہ کو تو شاید اس کا علم بھی نہ ہو۔ آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا بھی نہ ہو لیکن میں اس سے محبت کرتا تھا۔ چاہتا تھا کہ وہ پھولوں پر چلے ہونے کے بستر پر سوئے۔ دنیا کی ہر خوشی اسے مل جائے۔ میں اگر چاہوں تو اس کے گھر سے اس کا ہاتھ پکڑ کر لے آؤں لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ میرے ساتھ خوش نہیں رہے گی۔ محبت کرنے والا تو یہ چاہتا ہے کہ اس کی معشوقہ ہمیشہ خوش رہے۔ چاہے اس کے ساتھ نہ رہے لیکن خوش رہے۔ یہی تو محبت ہوتی ہے۔ میں نے بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ خوش رہے گی۔"

"میرے ساتھ؟" میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"میں ایک غنڈا ہوں۔ میرا اس معاشرے میں مقام ہی کیا ہے۔ اس کے لیے تو پڑھا لکھا شخص ہونا چاہیے، جیسے تم ہو۔۔۔ میری درخواست ہے کہ تم اس سے شادی کرلو۔ جب وہ تمہارے ساتھ جارہی ہوتی تھی تو بڑی خوش دکھائی دیتی تھی۔ میں چھپ چھپ کر دیکھتا تھا کہ وہ کتنی خوش ہے۔ اس کا جوڑ تو وہی ہوسکتا ہے جس کے ساتھ وہ خوش ہو۔ میرا کیا ہے، میں تو پھر بھی اس سے محبت کرتا رہوں گا۔ محبت تو جذبے کا نام ہے۔۔۔ تعلق ہو نہ ہو۔ تم اسے اپنالو، اسے خوشیاں خرید کردے دو، اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو میں تمہارا بھی وہی حشر کروں گا جو اپنے دشمنوں کا کرتا ہوں۔"

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ غنڈا تھا لیکن کتنی سمجھ داری کی باتیں کررہا تھا۔ اس کی محبت کتنی عظیم تھی۔۔۔ بے غرض اور شدید۔

یوں لگتا تھا وہ بہت دور چلا گیا ہے اور اپنے آپ سے باتیں کررہا ہے۔ "میں نے فاخرہ کی دو جگہ سے بات ختم کرائی۔ فاخرہ کے باپ کو بھی دھمکیاں دیں کہ فاخرہ کی شادی میری مرضی کے بغیر نہ کریں اور میری مرضی یہ ہے کہ تم اس سے شادی کرلو۔"

"ارسلان بھائی! میں تو فاخرہ سے بہت پہلے شادی کرلیتا، آپ کے ڈر سے رکا ہوا تھا۔"

"یہی تو المیہ ہے کہ لوگ ہمیں غنڈا سمجھتے ہیں، انسان سمجھتے ہی نہیں۔" میں نے اس بہادر آدمی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔

یہ اسی غنڈے کی عطا ہے کہ فاخرہ آج میری بیوی اور میرے بچوں کی ماں ہے۔ کئی برس گزر چکے، وہ غنڈا مجھے اب بھی یاد ہے جو ہماری شادی کے کچھ ہی دن بعد ایک لڑائی کے دوران قتل کردیا گیا تھا۔

نادیدہ عشق

جناب ایڈیٹر سرگزشت
آداب عرض
یہ ایک ایسی کہانی ہے جس کی توجیہہ عقل نہ دے سکے مگر میں خود اس کہانی کا ایک کردار ہوں، پوری کہانی کا شاہد ہوں اس لیے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ اس میں رتی بھر بھی مبالغہ نہیں، جو کچھ دیکھا ہے وہی لکھ رہا ہوں۔ امید ہے آپ کو بھی یہ آپ بیتی پسند آئے گی جو میرے دوست سلمان کی ہے۔

سعید احمد خان
(فیصل آباد)

میرا تعلق اس کہانی سے ان معنوں میں گہرا ہے کہ میں نے وہ جنون دیکھا ہے۔ وہ کردار میرے ساتھ رہا ہے جس کی یہ کہانی ہے۔ اب نہیں معلوم کہ وہ شخص کہاں ہے؟

اس نے کہا تھا کہ میں اس کی کہانی اسی وقت بیان کروں جب وہ یا تو مرچکا ہو یا کہیں غائب ہوچکا ہو۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ وہ مرچکا ہے لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ کہیں غائب ہوچکا ہے۔

اسی لیے میں اس کی کہانی بیان کررہا ہوں۔

بہت دنوں پہلے کی بات ہے کہ سلمان میرے محلّے ہی میں رہا کرتا تھا۔ وہ ایک ایسا نوجوان تھا جس کو دیکھتے ہی اس کی طرف دل کھنچنے لگتا تھا۔

اس میں کچھ ایسی کشش تھی کہ لوگ اس سے دوستی کرنے یا کم از کم اس سے باتیں کرنے کے لیے بے تاب ہی رہا کرتے تھے لیکن وہ اس سلسلے میں حد سے زیادہ محتاط تھا۔

شاید گنتی کے کچھ ہی لوگوں سے اس کی دعا سلام رہی ہوگی جبکہ شاید اس محلّے میں صرف میں ہی اس کا دوست تھا۔ وہ عام طور پر شام کا وقت میرے ساتھ ہی گزارا کرتا۔

اس زمانے میں زندگی اتنی دشوار اور اتنی خطرناک نہیں تھی جتنی آج ہے۔ ہم رات گئے تک گھومتے پھرتے تھے کیونکہ ان دنوں کوئی پریشان کرنے والا یا لوٹ مار کرنے والا

نہیں ہوتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ جب سے پاکستان میں موبائل آنا شروع ہوئے ہیں، تب ہی سے لوٹ مار بھی زیادہ ہوگئی ہے ورنہ پہلے کبھی کبھی سنا کرتے تھے کہ فلاں کے یہاں چوری ہوئی ہے، ڈاکے بھی اُس زمانے میں بہت کم پڑا کرتے تھے اور اگر پڑ جاتا تو مہینوں حیرت سے تبصرے کیے جاتے۔

جبکہ آج کل تو بے چارے چور عنقا ہی ہو چکے ہیں، ان کی تو نسل ہی گویا ختم ہوگئی ہے، ان کی جگہ ڈاکوؤں نے لے لی ہے۔

بہرحال تو میں یہ بتا رہا تھا کہ میں اور سلمان ایک دوسرے کے دوست تھے۔ اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی۔ ہمارے محلّے میں ایک بہت بڑا میدان تھا۔ اس میدان کے درمیان سیمنٹ کی ایک پچ بنائی گئی تھی، محلّے کے کرکٹ کھیلنے والے اسی پچ پر کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔

میں اور سلمان رات کو عام طور پر وہیں جا کر بیٹھ جایا کرتے۔ سلمان فلمی گانے سنایا کرتا۔ ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہتیں اور ہم پر ایک بے خودی سی طاری ہو جاتی۔

میں نے ایک بات نوٹ کی تھی کہ رات کے وقت جب ہم وہاں آ کر بیٹھتے اور سلمان گانا سناتا تو اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک دکھائی دیتی۔

بہت ہی خوبصورت چہرہ ہو جاتا اس کا۔ خوبصورت تو وہ ویسے بھی تھا لیکن اس وقت وہ اور زیادہ حسین معلوم ہوتا۔

سلمان اپنے گھر کا ایک ہی بیٹا تھا جبکہ اس کی دو بہنیں بھی تھیں۔

میں نے ان دونوں بہنوں کو بھی دیکھا ہوا تھا۔

وہ دونوں بھی خوبصورت تھیں لیکن سلمان والی بات نہیں تھی۔ اس میں تو اور ہی طرح کی کشش تھی جو شاید لاکھوں میں کسی ایک کو نصیب ہوتی ہوگی۔

اس کے گھر کے یا خود اس کے معاشی حالات چاہے جیسے بھی ہوں، میں نے اس کو ہمیشہ خوش ہی دیکھا تھا۔ ایسا اطمینان بھی بہت کم کے چہروں پر ہوتا ہوگا۔

یہ کہا جائے کہ وہ ہر لحاظ سے ایسا نوجوان تھا جس پر کوئی توجہ دیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

مجھے معلوم ہے کہ محلّے کی کئی لڑکیاں اس پر دل و جان سے عاشق تھیں لیکن وہ ان چکروں میں نہیں پڑتا تھا۔ وہ کہا کرتا "بھائی، مجھے ان لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ خواہ مخواہ اپنا وقت برباد کرتی رہتی ہیں۔"

"یار، پھر بھی کبھی نہ کبھی، کسی سے اُلفت تو ہو ہی جائے گی۔"

"ہو سکتا ہے۔" وہ بے پروائی سے کہتا "بھائی جان! اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو سب سے پہلے میں آپ ہی کو بتاؤں گا۔"

کچھ دن ہی گزرے تھے کہ اس نے ایک عجیب انکشاف کیا "بھائی جان، ایک لڑکی سے مجھے عشق ہو گیا ہے۔"

"کیا...!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "مبارک ہو۔ کون ہے وہ؟ کیا نام ہے اس کا؟ کہاں رہتی ہے وہ؟"

"میں یہ سب نہیں جانتا۔" اس نے بتایا۔

"کیا مطلب؟ کیا تم اسے جانتے ہی نہیں ہو؟"

"نہیں، یہ سب معلوم کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی کیونکہ وہ بہت خوبصورت ہے، بہت دلکش ہے۔"

"خدا کے بندے! یہ تو معلوم ہوگا کہ وہ رہتی کہاں ہے، اور تمہاری اس سے ملاقات کہاں ہوئی؟"

"میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ وہ رہتی کہاں ہے لیکن یہ ضرور بتا سکتا ہوں کہ اس سے ملاقات کہاں ہوئی؟ کیا تم یقین کرو گے کہ میں تین راتیں اس کے ساتھ بیٹھ کر گزار چکا ہوں۔"

میں نے اس طرح اس کی طرف دیکھا جیسے اس کا ذہنی توازن خراب ہو چکا ہو۔ وہ میرے دیکھنے کے انداز سے سمجھ گیا تھا کہ میں اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہوں۔

"نہیں بھائی جان! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ ہنس کر بولا "میں پاگل نہیں ہوا ہوں۔"

"پھر جو تم بول رہے ہو، وہ کیا ہے؟"

"اب میں بتاتا ہوں کہ وہ کیا ہے؟" اس نے کہا "ایک ہفتہ پہلے اسی طرح میں رات کو گھر واپس جا رہا تھا کہ کسی نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔ وہ مجھے میرے نام سے بلا رہا تھا۔ میں رک گیا، وہ ایک لمبا چوڑا انسان تھا جس نے ادب سے سلام کرتے ہوئے کہا "سلمان صاحب، آپ کو بی بی بلا رہی ہیں۔"

"کون بی بی؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ سامنے گاڑی میں ہیں۔" اس نے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی ایک کار کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے پہلے اس گاڑی پر دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ چھوٹی سی گاڑی تھی۔ رات کے وقت بھی اس پر پردے کھنچے ہوئے تھے اسی لیے اندر بیٹھنے والے کی شکل دکھائی نہیں دے رہی تھی (اس وقت تک بلائنڈ ونڈو عام نہیں ہوا تھا، ورنہ کالے شیشے)

"دیکھو، شاید تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے کہا "تمہیں کسی اور کو بلانا ہوگا۔"

"نہیں، آپ ہی کو بلا رہی ہیں۔" اس نے اصرار کیا "آئیں، میرے ساتھ۔"

میں اس کے ساتھ اس بند گاڑی تک آیا۔ اسی وقت گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا اور ایک انتہائی خوبصورت اور دلکش آواز آئی "گھبرائیں نہیں، بیٹھ جائیں۔"

سچ تو یہ ہے کہ اس آواز نے مجھے مدہوش کر دیا تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ شخص اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ بھائی صاحب! میں نہیں بتا سکتا ... اس وقت میری کیا حالت ہو رہی تھی۔ کار میں اندھیرا تھا اس لیے اس کی صورت دکھائی نہیں دی تھی لیکن اس کے جسم اور اس کے لباس سے اُٹھنے والی خوشبو نے مجھے پاگل کر کے رکھ دیا تھا۔ اک ایسی بے خودی کی کیفیت تھی کہ میں اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتا۔"

میں سلمان کے بارے میں جانتا تھا کہ وہ ایک سیدھا سادا نوجوان ہے اور جھوٹ نہیں بولا کرتا یا کم از کم ایسی داستان گڑھنے کی صلاحیت اس میں نہیں تھی۔

وہ بے خودی کے عالم میں بولے جا رہا تھا "بھائی صاحب، میں نہیں جانتا کہ کار کن کن راستوں سے جا رہی ہے۔ اتنا ہوش ہی نہیں تھا۔ میرے ذہن پر تو بے پناہ مدہوشی طاری تھی۔ ایسا سرور مل رہا تھا کہ بس کچھ نہ پوچھیں۔ جبکہ میں اس کی صورت بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔"

"اس نے تم سے کوئی بات تو کی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، راستے بھر اس نے کوئی بات نہیں کی۔" اس نے بتایا "اور مجھے بھی اتنا ہوش کہاں تھا کہ میں اس پر دھیان دیتا کہ وہ مجھ سے بات کرتی ہے یا نہیں۔"

"بہت حیرت انگیز کہانی ہے۔" میں نے تبصرہ کیا۔

"حیرت تو اب شروع ہوئی بھائی صاحب!" اس نے کہا "وہ مجھے اپنے ساتھ ایک بڑے سے مکان میں لے آئی۔ میں نہیں جانتا کہ وہ مکان کہاں ہے، اس کو باہر سے بھی دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ گاڑی گیٹ کے اندر ہی پارک ہوئی تھی۔ پھر مجھ سے کہا گیا کہ میں اتر جاؤں۔"

میں اتر گیا، میرے ساتھ بیٹھنے والی بھی اُتر گئی تھی اور اس وقت بھی میں اسے دیکھ نہیں سکا تھا کیونکہ اس نے خود کو ایک شال میں اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ اس کا چہرہ بھی چھپ گیا تھا۔

سنہرے اصول

آپ غالباً 38ء میں پیدا ہوئے۔ اگر 37ء یا 39ء یا 40ء میں پیدا ہوتے تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔

سنا ہے کہ بچپن میں ہر بات میں بلا کی تندی و تیزی دکھاتے تھے۔ بزرگ سر ہلا ہلا کر کہتے یہ لڑکا بڑا ہو کر ضرور کچھ کرے گا' جوان ہو کر موٹر ڈرائیور بنے۔

ان دنوں بس ڈرائیور ہیں۔

آپ نے برسوں کے تجربے سے موٹر چلانے کے چند سنہرے اصول وضع کیے ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں۔

1) موٹر ہمیشہ سڑک کے بیچ میں چلاؤ کیونکہ سائیکل والے اور پیدل حضرات جان بوجھ کر سڑک کا درمیانی حصہ استعمال کرتے ہیں۔

2) کسی موٹر کو آگے مت نکلنے دو۔ اگر کوئی ہارن بجا بجا کر تنگ کرنے لگے تو ذرا دائیں طرف ہو کے کچے راستے کی دھول اس پر ڈالو خود ہی پیچھے ہو جائے گا۔

3) اگر کوئی موٹر آگے جا رہی ہو تو اسے اپنی ذاتی توہین سمجھو اور فوراً آگے نکل جاؤ خواہ راستہ ہو یا نہ ہو۔

4) موڑتے وقت گاڑی کی رفتار کم از کم پچاس میل فی گھنٹہ ہونی چاہیے' ورنہ موشن ٹوٹ جائے گا اور ناحق گیئر بدلنا پڑے گا۔

5) گیئر بدلنے اور بریک لگانے سے ہمیشہ احتراز کرو۔ اس طرح مشینری گھسنے سے بچ جائے گی۔

6) رات کو سامنے سے گاڑی آ رہی ہو تو اللہ کا نام لے کر اس پر پوری روشنی چھوڑ دو۔ یہ دوسرے ڈرائیور کا فرض ہے کہ اپنی موٹر کس طرح بچائے۔

7) یاد رکھو ہر حادثے میں بس ڈرائیور دیسی فلموں کے ہیرو کی طرح صاف بچ جاتا ہے۔ چنانچہ حادثے سے پہلے دروازے سے کود جانے کے لیے تیار رہو۔ (ہر ہفتے اس کی ریہرسل کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں)

8) رات کو حادثہ کرتے ہی موٹر کی بتیاں بجھا کر پوری رفتار سے بھاگ نکلو تا کہ کسی کو گاڑی کا نمبر معلوم نہ ہو سکے۔

(مستری رحمت بخش از شفیق الرحمٰن)

مجھے ایک بڑے کمرے میں پہنچادیا گیا۔ بھائی صاحب، میں کیا بتاؤں، اس کمرے کی سجاوٹ کیسی تھی...... اور اس کا ماحول کیسا تھا؟ آپ نے الف لیلہ والی ہالی ووڈ کی فلمیں تو دیکھی ہوں گی، سب کچھ ویسا ہی تھا۔ میں تو یہ سب دیکھ دیکھ کر دنگ ہوا جارہا تھا۔"

"اس لڑکی کا کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بھی میرے ساتھ ہی اس کمرے میں آئی تھی اور بھائی صاحب، اس نے جب اپنی شال اُتاری تو ایسا لگا جیسے اس کمرے میں بجلیاں کوند گئی ہوں۔ ایسا بے مثال حسن...... جو میرے تصور میں بھی نہیں ہوگا۔ میرے ہوش تو پہلے ہی اُڑے ہوئے تھے، اس کو دیکھ کر تو میں کسی کام کا نہیں رہا۔"

"یار، تم تو بالکل الف لیلہ ہی جیسی کوئی کہانی سنا رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"بھائی صاحب، آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں جھوٹ نہیں بولتا...... اور نہ ہی مجھے اس قسم کی کہانیاں گڑھنے کا کوئی شوق ہے۔ میرے ساتھ جو گزری ہے، وہ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔"

"چلو...... پھر کیا ہوا؟"

"ہونا کیا ہے، مجھ کو اتنا ہوش ہی نہیں تھا کہ میں اس لڑکی سے اس کا نام پوچھتا۔" سلمان نے کہا "بس ایک انجانی سی سرخوشی کا عالم تھا اور یہ کیفیت اس وقت دُگنی ہوگئی جب اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔"

سلمان پر شاید ابھی تک سرشاری کی کیفیت تھی۔ اسی لیے وہ بولتے بولتے خاموش ہوجاتا۔ میرے اُکسانے پر اس نے بتایا "وہ رات اسی طرح گزر گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے رہے پھر اس نے پینے کے لیے کوئی مشروب دیا۔ اس کی لذت بھی ابھی تک ہونٹوں پر ہے اور جب رات گزرنے لگی تو اس کے آدمی مجھے دوبارہ میرے گھر کے پاس اسی گاڑی میں اُتار گئے۔"

"یار، عجیب کہانی ہے تمہاری۔" میں نے کہا۔

"ہاں بھائی صاحب، میں اب تک تین بار اس کے پاس جاچکا ہوں۔" اس نے بتایا پھر ایک گہری سانس لی "بلکہ وہی مجھے بلاتی رہی ہے۔"

میں اس کی بات کو مان بھی رہا تھا اور کچھ یقین آ بھی نہیں رہا تھا۔ ایسی کون سی پُراسرار لڑکی ہوسکتی ہے جو اس طرح سے کسی نوجوان کے پیچھے پڑجائے اور اس کو اپنے گھر بلالیا کرے۔

بہرحال! اس دن کے بعد کئی دنوں تک سلمان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک دن ملا تو میں نے اس میں ایک عجیب سی تبدیلی دیکھی۔ وہ کچھ کمزور دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا بات ہے یار، خیریت تو ہے؟" میں نے پوچھا "تم کچھ بیمار سے لگ رہے ہو؟"

"بھائی صاحب! میں خود آپ سے مل کر آپ کو سب کچھ بتانا چاہتا تھا۔" اس نے کہا "اس لڑکی سے مجھے اب ڈر لگنے لگا ہے۔"

"کس بات کا ڈر؟"

"پتا نہیں کیوں؟" اس نے ایک جھرجھری لی "وہ ہر دوسری رات مجھے اپنے پاس بلالیتی ہے اور میں اس کے ساتھ ساری رات گزارنے کے لیے مجبور ہوجاتا ہوں۔"

"ایک بات بتاؤ، کیا اس کے ساتھ تمہارا کوئی جسمانی تعلق بھی ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں، یہی تو بات ہے۔" اس نے کہا "اسی لیے تو مجھے خوف محسوس ہوتا ہے کہ میں یہ کیسا گناہ کرنے لگا ہوں لیکن کیا کروں؟ اس کے سامنے جاتے ہی مجبور ہوجاتا ہوں۔"

"تم اس کے پاس جاتے ہی کیوں ہو؟"

"یہ بھی ایک مجبوری ہے۔" اس نے بتایا "جب وہ لوگ مجھے بلانے آتے ہیں تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ چل پڑتا ہوں، جیسے کوئی طاقت مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہو۔ اب تو مجھے لینے کے لیے وہ لڑکی نہیں آتی، صرف وہ دونوں آتے ہیں۔"

"کون دونوں؟"

"وہی، ایک اس کا ملازم اور دوسرا ڈرائیور۔ وہ ملازم آتے ہی مجھ سے کہتا ہے 'چلیں' اور میں اس کے ساتھ چل پڑتا ہوں۔ حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ میں چاہے جہاں بھی رہوں اور لاکھ کوشش کروں، اس وقت وہیں پہنچ جاتا ہوں، جو وقت اس گاڑی کے آنے کا ہے، یعنی رات ساڑھے گیارہ بجے۔"

"حیرت کی بات ہے۔ اب کب جاؤ گے؟"

"آج رات!" اس نے بتایا "پلیز بھائی صاحب! مجھے اس لڑکی سے بچائیں۔ آپ میری حالت دیکھ رہے ہیں، میں روز بہ روز کمزور ہوتا جارہا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ لڑکی مجھے چوس رہی ہو۔"

"سلمان! تم خود بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کروں؟" میں نے پوچھا۔

"آپ میرے ساتھ رہیں۔" اس نے کہا "اس آدمی کو سمجھائیں کہ وہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔ بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ میرے ساتھ چل کر اس لڑکی سے بات کرلیں۔"

"ہاں، یہ ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا "کیا وہ لڑکی مجھے برداشت کرلے گی؟"

"کیوں نہیں، میں اس سے کہوں گا کہ آپ میرے بھائی ہیں اور میری حالت دیکھ کر اس سے بات کرنے آئے ہیں۔"

"کیا...... وہ دونوں مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار ہوجائیں گے؟"

"کیوں نہیں؟ میں ان سے کہوں گا کہ ان کی مالکہ نے آج میرے ساتھ ساتھ میرے بھائی کو بھی بلایا تھا اس لیے آپ میرے ساتھ چل رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے دوست!" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا "یہ معاملہ ایسا ہے کہ مجھے تمہارا ساتھ دے کر خوشی ہوگی۔"

"آپ رات ساڑھے گیارہ بجے میدان والے برگد کے پاس پہنچ جایئے گا۔" اس نے کہا "وہ گاڑی وہیں پر آتی ہے۔"

میں گھر سے کھانا کھا کر ساڑھے گیارہ بجے برگد کے پاس پہنچ گیا۔ سلمان وہاں پہلے سے موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ خوش ہوگیا تھا "بھائی صاحب، آپ آگئے تو میری پریشانی کم ہوگئی۔"

کچھ دیر بعد اس نے کہا "وہ لیں بھائی صاحب، وہ گاڑی آگئی۔"

میں نے حیران ہوکر چاروں طرف دیکھا۔ کہیں بھی کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اس رات چاند بھی پوری طرح روشن تھا۔ دور دور تک دکھائی دے رہا تھا۔ سب کچھ دکھائی دے رہا تھا سوائے اس گاڑی کے، جو اس کی نظر کا دھوکا بھی ہوسکتا تھا۔

"سلمان۔ مجھے تو کوئی گاڑی دکھائی نہیں دے رہی۔" میں نے پریشان ہوکر کہا۔

"بھائی صاحب، وہ دیکھیں۔" اس کی آواز واضح طور پر کانپ رہی تھی "وہ آدمی بھی میری طرف آرہا ہے۔"

اور واقعی اس طرح سامنے آگیا جیسے ہوا میں اچانک نمودار ہوگیا ہو۔ سلمان کے بیان کے مطابق وہ واقعی ایک لمبا چوڑا انسان تھا۔ اس کو اس طرح نمودار ہوتے دیکھ کر خود میری حالت خراب ہوگئی تھی۔

اس آدمی نے میری طرف کوئی توجہ نہیں دی، اس نے سلمان سے کہا "آئیں چلتے ہیں۔"

اور سلمان اس کے ساتھ چل پڑا۔ صرف چند قدم۔ میرے اندازے کے مطابق زیادہ سے زیادہ پچیس تیس قدم کا فاصلہ رہا ہوگا اور وہ دونوں فضا میں تحلیل ہوگئے۔

جی ہاں، بالکل غائب ہوگئے۔

اس وقت میری کیفیت عجیب ہوگئی تھی جیسے سکتہ ہوگیا ہو۔ بے پناہ خوف نے میرے اعصاب کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

خود اندازہ کرلیں، ایک تو ویران میدان، دور دور تک پھیلی ہوئی پُراسرار چاندنی۔ سلمان کا کسی لڑکی سے ملنے کے لیے جانا۔ ایک آدمی کا اچانک نمودار ہونا، سلمان کا اصرار کہ سامنے ایک گاڑی کھڑی ہوئی ہے جبکہ وہاں کوئی گاڑی نہیں تھی اور سلمان کا اچانک اس آدمی کے ساتھ غائب ہوجانا، آخر یہ سب کیا تھا؟

میں نہ جانے کب تک کھڑا رہا تھا۔ پھر جب میرے ہوش بحال ہوئے تو میں نے اپنے گھر کی طرف دوڑ لگادی۔ میں نے اپنے گھر والوں کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

کون میرا یقین کرتا؟ لوگ نہ جانے کیا کیا تبصرے کرتے؟ اسی لیے میں خاموش رہا۔ ویسے میں نے اپنے طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ اب سلمان سے ملنا ناممکن ہے۔ نادیدہ طاقتیں اسے اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔

لیکن دوسری صبح وہ میرے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا اور پہلے سے کہیں زیادہ کمزور دکھائی دے رہا تھا۔

میں اسے دیکھ کر حیران ہوکر اس سے لپٹ گیا تھا۔

"سلمان، کیا ہوا تھا تمہارے ساتھ؟ کون لے گیا تھا تمہیں؟ تم غائب کیسے ہوگئے تھے، واپس کیسے آگئے؟"

میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات کر ڈالے تھے۔

"بھائی صاحب، پہلے یہ بتائیں، آپ نے ابھی کسی کو بتایا تو نہیں کہ میرے ساتھ کیا ہورہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، میں نے کسی کو نہیں بتایا ہے۔"

"آئیں، کسی ہوٹل میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" اس نے کہا "یہاں بات نہیں ہوسکے گی۔"

قریب ہی بنے بھائی کا ہوٹل تھا جہاں ہم روزانہ شام کے وقت بیٹھا کرتے۔ صبح کو وہ ہوٹل عام طور پر خالی ہی رہتا تھا۔ ہم دونوں ایک کونے میں جاکر بیٹھ گئے۔ میں اس کی داستان سننے کے لیے بے چین ہورہا تھا۔

"بھائی صاحب، میری زندگی خطرے میں ہے۔" اس نے کہا "میں کسی وقت بھی مار دیا جاؤں گا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں بھائی صاحب، وہ لڑکی کل بہت ناراض ہورہی تھی۔ وہ یہ کہہ رہی تھی کہ میں نے کسی اور کو کیوں بتایا؟ میں نے اس سے کہا کہ وہ میرے دوست بھی ہیں اور بھائی بھی

اسی لیے میں نے پریشان ہو کر ان سے ذکر کر دیا تھا۔"
"لیکن تمہارا اس طرح اچانک غائب ہو جانا جبکہ وہاں کوئی گاڑی نہیں تھی۔"
"پتا نہیں کیا چکر ہے بھائی صاحب!" اس نے کہا "آپ یقین کریں کہ میں اس گاڑی کو نہ صرف دیکھتا ہوں بلکہ اس میں بیٹھ کر جاتا بھی ہوں، آپ نے تو خود ہی دیکھا ہوگا۔"
"میں نے صرف اتنا دیکھا کہ تم اس آدمی کے ساتھ برگد کے درخت سے آگے گئے اور تم دونوں اچانک غائب ہو گئے۔ تمہارا کوئی پتا نہیں چلا۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے کہ میں کس طرح گھر واپس آیا ہوں۔"
"حیرت کی بات ہے۔" وہ بڑبڑایا "لگتا ہے، میں کسی اور ہی مخلوق کے چکر میں پھنس گیا ہوں۔"
"یہ احساس تمہیں اب ہو رہا ہے؟" میں نے کہا "میں تو اسی وقت سمجھ گیا تھا جب تم نے اپنی کہانی شروع کی تھی۔"
"بھائی صاحب، اب کیا ہوگا؟" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "مجھے بچائیں، میں اب اس لڑکی کے پاس جانا نہیں چاہتا۔"
"اب یہی ہو سکتا ہے کہ کسی عامل کے پاس چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔
"کیا آپ کی نظر میں کوئی ایسے عامل ہیں؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں، مولانا امین حسینی صاحب ہیں۔" میں نے بتایا "وہ کوئی جعلی پیر فقیر نہیں ہیں بلکہ ایک بہت بڑے اسکالر ہیں۔ ان کی ایک کتاب جادو اور مذہب اپنی نوعیت کی زبردست کتاب ہے۔"
"تو پھر خدا کے لیے چلیں ان کے پاس۔" اس نے کہا۔
مولانا حسینی میرے والد کے دوستوں میں سے تھے اور مجھے بھی اپنی اولاد ہی سمجھتے تھے۔ میں اسی شام کو سلمان کو لے کر ان کے پاس پہنچ گیا۔
حسینی صاحب' یہ ساری تفصیل سن کر بہت مضطرب ہو گئے تھے۔ وہ بہت دیر تک مراقبے کی کیفیت میں رہے پھر سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور بولنا شروع کیا "اس نوجوان پر ایک جنی کا سایہ ہے۔ وہ اس نوجوان کو اپنے چنگل میں پھانس چکی ہے۔ جس طرح یہ سنا ہوگا کہ جن عورتوں پر عاشق ہو جاتے ہیں اسی طرح جن عورتیں بھی مردوں پر عاشق ہو سکتی ہیں۔"
"حضرت!" میں نے سوال کیا "سنا یہ ہے کہ یہ مخلوق آگ سے پیدا کی گئی ہے اس لیے یہ انسانی شکل میں کیسے آ سکتی ہے؟"
"آ جاتی ہے۔" حسینی صاحب نے فرمایا "یہ مخلوق کسی بھی صورت میں سامنے آ سکتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نوجوان کی جان کیسے چھڑائی جائے؟ کیوں آئی، کیسے آئی؟ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ فوری مسئلہ تو یہ ہے۔"
"جی جناب، فوری مسئلہ یہی ہے۔" میں نے کہا۔
"جناب! جس وقت میرے جانے کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت میں اپنے کنٹرول میں نہیں رہتا۔" سلمان نے بتایا "کوئی طاقت مجھے کھینچتی ہوئی لے جاتی ہے۔"
"ہاں، ایسا ہی ہوتا ہوگا۔" حسینی صاحب نے گردن ہلا کر اس کی تائید کی "خدا نے اس مخلوق کو بہت طاقت ... دی ہے۔"
"تو پھر، کیا میں اس سے کبھی نجات نہیں پا سکوں گا؟" سلمان نے پوچھا۔
"مایوس مت ہو۔" حسینی صاحب نے کہا "میں تمہیں چند وظیفے بتاتا ہوں، وہ تمہیں خود پڑھنے ہوں گے۔"
"خدا جانے میں یہ سب کر بھی سکوں گا یا نہیں؟"
"کرنا تو تم ہی کو ہے۔" حسینی صاحب ذرا غصے سے بولے "ایک عجیب تصور ہے کہ فلاں صاحب میرے بجے وظیفے پڑھ دیں تو میں پریشانی سے باہر نکل آؤں گا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ بیمار آپ ہیں اور دوا کوئی اور کھا رہا ہے، نہیں آپ بیمار ہیں اس لیے دوا بھی آپ ہی کو کھانی ہے۔"
بہت معقول بات کی تھی مولانا صاحب نے۔ میں نے بھی ان کی تائید کی۔ حسینی صاحب نے ایک دو وظیفے بتا کر کہا "یہ خدا کا کلام ہے، یہ تمہارے گرد ایک حصار قائم کر دے گا۔ خدا نے چاہا تو وہ بلائیں اس حصار کے اندر نہیں آ سکیں گی اور نہ ہی کوئی ایسی طاقت ہوگی جو تمہیں زبردستی اپنے ساتھ اس لڑکی کے پاس لے جائے گی۔"
ہم مولانا حسینی سے اجازت لے کر واپس آ گئے۔
سلمان کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ وہ پُرامید بھی تھا اور مایوس بھی۔ کبھی کہتا کہ اسے یقین ہے کہ اس کی جان چھوٹ جائے گی اور کبھی کہتا نہیں، بہت مشکل ہے۔
"تم حسینی صاحب کی باتوں پر عمل کر کے تو دیکھو۔"
"ہاں، وہ تو کرنا ہی ہوگا۔"
اس کے بعد کئی دنوں تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یہ میں نے خود مشورہ دیا تھا کہ وہ مغرب کے بعد سے گھر سے باہر نہ نکلے۔ اپنے آپ کو گھر میں ہی پابند کر لے۔

اگر گھر والے پوچھیں بھی تو انہیں کچھ نہ بتائے اور مسلسل وظیفے پڑھتا رہے اسی لیے وہ ایک ہفتہ تک نظر نہیں آیا۔ ایک دن میں خود ہی اس کی خیریت معلوم کرنے اس کے گھر پہنچ گیا۔
وہ گھر پر ہی تھا اور بہت ہشاش بشاش۔ اس کا پُرانا حسن بھی آ گیا تھا۔ انتہائی کمزوری کے جو آثار اس میں نظر آنے لگے تھے، اب وہ بھی نہیں تھے۔
وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آیا تھا "بھائی صاحب، میں نے کہا تھا نا کہ آپ کی وجہ سے میری جان چھوٹ جائے گی، وہی ہوا۔ آپ نے مجھے مولانا حسینی سے ملوا دیا۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اب کوئی میرے قریب نہیں آتا۔ اب کوئی طاقت مجھے اپنی طرف نہیں کھینچتی۔ میرے لیے اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔"
"مبارک ہو ... لیکن اب تم غافل مت ہو جانا۔" میں نے کہا "پڑھائی کرتے رہنا اور رات کے وقت نکلنے سے احتیاط کرنا۔"
میں اس کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر واپس آ گیا تھا۔ اس میں تبدیلی دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔
دوسری رات کو میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آ گیا۔ میں اس رات اپنے معمول کے مطابق اس میدان سے گزرتا ہوا اپنے گھر کی طرف آ رہا تھا کہ اچانک وہی آدمی نمودار ہو گیا جو سلمان کو لے جایا کرتا تھا۔
میں نے ایک نظر میں اسے پہچان لیا تھا۔ میرا دل جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا ہو۔ میرے پاؤں جم کر رہ گئے تھے۔ وہ میرے پاس آ گیا "کہاں جا رہے ہو؟ میرے ساتھ چلو۔" اس نے کہا "ہماری ملکہ نے بلایا ہے تمہیں۔"
میں اس سے یہ بھی نہیں کہہ پایا کہ میں اس کے ساتھ کیوں جاؤں؟ ایک طاقت تھی جس نے مجھے بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔ اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "چلو، تمہارے لیے گاڑی کھڑی ہے۔"
اور اب مجھے وہ گاڑی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ سلمان نے جیسا بتایا تھا وہ ویسی ہی گاڑی تھی۔ پُرانے طرز کی۔ اس کی کھڑکیاں پردوں سے بند کر دی گئی تھیں اسی لیے یہ نہیں معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے اندر بھی کوئی ہے یا نہیں؟
میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس نے باقاعدہ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور مجھے اشارہ کیا کہ میں اندر جا کر بیٹھ جاؤں۔ میں کسی ٹرانس میں آئے ہوئے انسان کی طرح اس کی کار میں جا بیٹھ گیا۔
اس کار میں سوائے ڈرائیور کے اور کوئی نہیں تھا۔

میرے بیٹھتے ہی گاڑی چل پڑی۔ اور کم و بیش میری بھی وہی کیفیت ہو رہی تھی جو سلمان کی ہوگی۔
مجھ سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ ایک مدہوشی کی سی کیفیت تھی۔ حالانکہ سلمان کے پاس تو وہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جبکہ میرے پاس کوئی نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں سکتے کی کیفیت میں تھا۔
کچھ سفر کے بعد گاڑی کسی بڑے مکان کے گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔ بالکل وہی ماحول تھا جو سلمان نے بتایا تھا۔ مجھے ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا جس کی آرائش واقعی بہت انوکھی تھی۔
کچھ دیر بعد ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اور وہ ایسی تھی کہ اس کو دیکھ کر میں سانس لینا بھول گیا تھا۔ میں نے ایسا حسن پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا
"بیٹھ جاؤ۔" اس نے اشارہ کیا "گھبراؤ نہیں۔ تم بالکل آزاد ہو۔ تم کو ابھی واپس بھیج دیا جائے گا۔"
اس کے ساتھ ہی مجھے ایسا لگا جیسے جس بندھن نے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا، وہ بندھن ختم ہو گیا ہو یعنی میرا ذہن پوری طرح آزاد ہو گیا تھا۔
اس لڑکی کے حسن کا سحر تو مجھ پر قائم تھا لیکن ذہنی کیفیت وہ نہیں تھی جو کچھ دیر پہلے تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں بولنے کے بھی قابل ہوں اور سوچ بھی سکتا ہوں۔
"میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟" اس لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔
"نہیں تو ... آپ نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔"
"تو پھر ... تم نے میرے محبوب کو مجھ سے کیوں الگ کروا دیا؟" اس کی آواز میں غصہ تھا "میں نے اس سے محبت کی تھی۔ میری ذات سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا تھا۔ میں صرف اسے بلا کر اس سے باتیں کرتی رہتی تھی اور تمہیں یہ بھی گوارا نہیں ہوا۔ تم نے اس کو حصار میں رکھ لیا لیکن کب تک؟ ایک نہ ایک دن تو وہ حصار سے باہر آئے گا۔"
"آپ ... آپ کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"جو تم سمجھ رہے ہو، میں وہی ہوں۔" اس نے کہا "میں انسان نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ تم مجھے کچھ بھی سمجھ سکتے ہو۔"
نہ جانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی تھی، اسی لیے میں نے پوچھا "اگر آپ انسان نہیں ہیں تو پھر آپ سلمان سے کیسے محبت کر سکتی ہیں؟ محبت کے لیے تو دونوں کا ایک جنس سے ہونا ضروری ہوتا ہے۔ آپ دونوں کی محبت تو غیر فطری ہے۔"

"بے وقوف ہو تم۔ کیا تم انسان کسی جانور سے محبت نہیں کرتے؟ وہ بیمار پڑ جائے تو اس کے لیے بے چین ہو جاتے ہو۔ وہ مر جائے تو اس کی لاش پر آنسو بہاتے ہو، کیا یہ ہوتا ہے یا نہیں؟"

"ہاں، ہوتا تو ہے۔"

"تو کیا یہ محبت غیر فطری نہیں ہے۔ کہاں انسان اور کہاں جانور۔ مجھے بھی سلمان سے محبت ہو گئی تھی۔ میں صرف اسے دیکھنا اور اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن تم نے ہمیں ایک دوسرے سے الگ کروا دیا۔"

"میں نہیں جانتا تھا کہ آپ اس سے اتنی محبت کرتی ہیں۔"

"بہت زیادہ۔ وہ کھلونا ہے میرا۔ اور میں اپنے کھلونے کو پھر حاصل کرلوں گی۔ اس سے کہو کہ وہ حصار باندھنا ختم کردے اور میرے پاس آ تا رہے...... اور اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو میں تو کسی نہ کسی طرح اسے بلا ہی لوں گی۔ پھر اس کی واپسی نہیں ہوگی، سمجھ گئے۔"

"میں...... میں آپ کا پیغام اس تک پہنچا دوں گا۔"

"اب تم جاؤ، تم کیا سمجھتے ہو کہ تم نے اس کے لیے جو کچھ کیا ہے، وہ میری نگاہوں سے چھپا ہوا ہے۔ میں اس وقت بھی وہیں پر تھی جب تم اس کو اپنے ساتھ ایک عالم کے پاس لے کر گئے تھے۔ میں چاہتی تو سب کو نقصان پہنچا دیتی لیکن میں نے چھوڑ دیا، اب جاؤ۔"

وہی آدمی کمرے میں داخل ہوا اور مجھے اپنے ساتھ باہر لے آیا۔ واپسی کا سفر بھی اسی گاڑی میں ہوا تھا۔

میں جب اپنے گھر واپس آیا تو اس وقت صرف گیارہ بجے تھے۔ یعنی یہ ساری کہانی صرف دس پندرہ منٹ کی تھی۔ میں بے انتہا خوف زدہ بھی تھا اور اس لڑکی کا حسین ترین چہرہ بھی میری نگاہوں کے سامنے تھا۔

دوسری صبح میں سلمان کے پاس پہنچ گیا۔

میں نے اسے جب یہ کہانی سنائی تو بہت دیر تک خوف اور حیرت سے اس سے کچھ بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"بھائی صاحب، میری وجہ سے آپ بھی اس چکر میں پھنس گئے۔ نہ جانے وہ آپ کے ساتھ کیا سلوک کرے؟" اس نے کہا۔

"تم بس اپنے آپ کو مضبوط رکھو۔" میں اسے تسلی دیتے ہوئے بولا "وظیفہ پڑھتے رہو، آنے جانے میں احتیاط کرو، ورنہ ایک بار پھر تم اس کے چنگل میں پھنس جاؤ گے۔"

"اور آپ کا کیا ہوگا؟" اس نے کہا "وہ تو آپ کو اپنا دشمن سمجھنے لگی ہے۔"

"تم میری فکر مت کرو۔ میں مولانا حسینی صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ مجھے اس سے بچنے کا کوئی راستہ بتا دیں گے۔"

میں جب مولانا حسینی صاحب کے گھر (فیڈرل بی ایریا) پہنچا تو پتا چلا مولانا صاحب عمرے پر تشریف لے گئے ہیں۔ اس خبر نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔

میں ان کے علاوہ کسی اور کو نہیں جانتا تھا جو اس وقت اس صورت حال سے نکلنے میں میری مدد کرتا۔

بہرحال، اپنے طور پر جو کچھ مجھے یاد تھا، وہ میں پڑھا کرتا تھا۔ ایک بات طے تھی کہ اگر وہ لڑکی انسان بھی ہوتی تو اس کو حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائی جا سکتی تھی۔

عجیب حسن تھا اس کا، آسمانی حسن۔ جیسے ابھی ابھی آسمانوں سے اتر کر سامنے آ گئی ہو۔ کیا کشش تھی اس میں۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس پر سے نگاہیں نہیں ہٹتی تھیں۔

لیکن وہ انسان نہیں تھی، یہ اور بات ہے کہ اس کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل تھا۔ اس نے محبت کی تھی اور وہ ٹھیک ہی کہتی تھی کہ محبت تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔

انسان کو جانوروں سے ہو جاتی ہے۔ جانور انسان کے لیے اپنی جانیں دے دیتے ہیں۔ اگر اس کو بھی ایک انسان سے الفت ہو گئی تھی تو اس میں کیا خاص بات تھی۔

ایک دن جب میں سلمان سے ملنے اس کے گھر گیا تو وہ بہت اُداس ہو رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا "بھائی صاحب، میں نے ایک بات سوچ لی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں اس کے بغیر رہ نہیں پا رہا۔ وہ مجھے ہر وقت یاد آتی رہتی ہے۔ میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ میں وظیفے پڑھنا چھوڑ دوں۔"

"نہیں، یہ مت کرنا۔" میں گھبرا کر بولا۔

"نہیں بھائی صاحب! اب تو مجھے یہی کرنا ہے۔" اس نے کہا "مجھ سے اب اس کی دوری برداشت نہیں ہو رہی۔"

میں اسے سمجھاتا رہا لیکن اس نے پھر خاموشی اختیار کر لی تھی۔

اس کے بعد وہ غائب ہو گیا، اچانک۔۔۔ سب حیران تھے۔ صرف میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں اور کس کے پاس ہوگا؟

برسوں گزر گئے ہیں لیکن یہ واقعہ مجھے آج تک یاد ہے۔

ڈیئر ایڈیٹر

السلام علیکم

میں کوئی کہانی نویس نہیں اور نہ ایسا مصنف ہوں کہ لوگ میری تحریر کے منتظر بیٹھے ہوں میں ایک سرکس دکھانے والا ہوں۔ مگر میرے سینے میں بھی دل ہے جب وہ دل پاش پاش ہوا تبھی میں نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ اس بات کو برسوں بیت گئے ہیں مگر ضمیر پر بوجھ ہے اسے میں آج ہلکا کر رہا ہوں۔

سہن الف

(مقام نامعلوم)

سرکس کی اپنی الگ دنیا ہوا کرتی ہے۔

میں ایک سرکس کا مالک تھا اور آج برسوں کے بعد وہ کہانی سنا رہا ہوں جسے میں نے اپنے سینے میں چھپا رکھا تھا۔

یہ سرکس مجھے کس طرح ملا اور جو لوگ اس میں کام کرتے تھے۔ وہ کہاں سے آئے؟ یہ الگ داستان ہے۔ کہانی کی ابتدا میں اس واقعے سے کر رہا ہوں جس نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

میرے سرکس میں کئی قسم کے کھیل دکھائے جاتے

تھے۔ ہاں، یہ بتانا ضروری ہے کہ سرکس کے کھیل آسان نہیں ہوتے۔ زندگی اور موت کے مرحلے ہوتے ہیں۔ اس میں کام کرنے والے مسلسل تربیت حاصل کرتے رہتے ہیں۔ سخت محنت ہوتی ہے۔ تب جا کر ان کا فن اپنے عروج پر آتا ہے۔

سرکس میں دو شیر تھے۔

بہادر اور دلاور۔ یہ شیر یا تو مجھ سے مانوس تھے یا پھر ٹارزن سے۔ ٹارزن ایک مقامی تھا۔ جس کے کسرتی بدن کی وجہ سے ہم اسے ٹارزن کہا کرتے تھے اور دوسرا سبب یہ تھا کہ شیروں کا شو وہی دکھایا کرتا تھا۔

وہ بے خوفی سے ان کے اس بڑے سے پنجرے میں داخل ہو جاتا جس میں پہیے لگے ہوئے تھے اور جسے دھکیل کر رنگ میں لایا جاتا تھا۔ لوگ بے تحاشا تالیاں بجاتے۔

تالیوں کی گونج میں ٹارزن کی آمد کا اعلان کیا جاتا اور وہ اپنے ہاتھ میں ایک بید کی چھڑی لے کر رنگ میں آتا۔ لوگوں کو جھک کر سلام کرتا اور بے دھڑک پنجرے میں گھس جاتا تھا۔ وہ کچھ دیر تک شیروں کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا۔ لوگ اس کی بے خوفی پر اش اش کر اٹھتے تھے۔

ایک دن میں اپنے خیمے میں تھا کہ کسی نے بتایا کہ کوئی لڑکی مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کا تعلق سرکس سے نہیں ہے بلکہ وہ باہر کی لڑکی ہے۔

یہ ایک نئی بات تھی۔ تالیاں بجانے اور سراہنے والے تو بہت سے تھے لیکن ملاقات کے لئے کوئی نہیں آتا تھا۔ بہرحال میں نے اس لڑکی کو اندر بلا لیا۔ وہ انیس بیس برس کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے بال بے بی کٹ تھے۔ اس میں بے پناہ جاذبیت تھی۔

وہ سلام کرکے ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔

"ہاں کہو۔" میں نے پوچھا۔ "کون ہو تم؟ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہو؟"

"میرا نام نتاشا ہے۔" اس نے بتایا "اور میں سرکس میں کام کرنا چاہتی ہوں۔"

"سرکس میں کام۔" میں چونک گیا تھا۔

"جی ہاں۔" اس کے لہجے میں بہت اعتماد تھا۔ "یہ میری بچپن کی خواہش ہے۔"

"نہیں۔ ہم باہر کے آدمی کو قبول نہیں کرتے۔"

"ایسا نہ کہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میں بہت امید لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ سرکس کی دنیا میں کیا ہوتا ہے؟ یہ ایک الگ زندگی ہے۔" اس کو میں نے اور بھی بہت کچھ سمجھایا کہ سرکس والوں کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ ہم بنجاروں کی طرح رہتے ہیں۔ ہمارا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ کوئی خاندان نہیں ہوتا۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن وہ یہ سب سننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ "میں یہ سب جانتی ہوں جناب۔ سب معلوم ہے مجھے۔" اس نے کہا۔ "اس کے باوجود میں سرکس میں کام کرنا چاہتی ہوں۔"

"دیکھو نتاشا۔ تمہاری اپنی فیملی ہوگی۔ پورا بیک گراؤنڈ ہوگا۔ سب تمہیں جانتے ہوں گے۔ دوست ہوں گے۔ ان سبھوں کو چھوڑ کر تم یہاں کیسے آ سکتی ہو؟"

"جناب۔ میں ایک تنہا لڑکی ہوں۔" اس نے کہا۔ "بدقسمتی سے میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ اس لئے تو میں آپ کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کوئی نہ کوئی تو ہوگا؟"

اس پر اس نے ایک طویل کہانی سنا دی کہ اس کے والدین کا بہت پہلے انتقال ہو چکا ہے۔ اس کا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ اس نے دور کے ایک عزیز کے یہاں پرورش پائی ہے اور اگر اسے کچھ ہو بھی گیا تو نہ تو کسی کو اس کی تلاش ہوگی اور نہ ہی کسی کو پروا ہوگی۔

اس لڑکی نے مجھے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ میں اس طرح اسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔ نہ جانے کس قسم کے الزامات لگا دیئے جاتے۔ اس لئے میں نے اس سے کہا۔ "دیکھو نتاشا۔ تم یہ کہتی ہو کہ تم نے دور کے کسی عزیز کے یہاں پرورش پائی ہے۔"

"جی ہاں۔"

"تو چلو۔ ان ہی کو لے کر آ جاؤ۔ اگر وہ کہہ دیں کہ ہاں تم کو سرکس میں کام کرنے کی اجازت ہے تو پھر تمہارے لئے سوچنے کی کوشش کروں گا۔"

"کوشش سے کام نہیں چلے گا۔ آپ کو یہ کام کرنا ہے۔" اس نے کہا۔ "میں ان خاتون کو آپ کے پاس لے آؤں گی۔ وہ تو خود ہی جان چھڑانا چاہتی ہیں۔"

میں نے اسے آنے کے لئے کہہ دیا تھا۔ "ٹھیک ہے ان کو ساتھ لے کر آنا۔" وہ میرا شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔ میں یہ جانتا تھا کہ وہ کسی کو نہیں لا سکے گی۔ چاہے کوئی لاکھ جان چھڑانا چاہتا ہو۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ سرکس والوں کے حوالے کر دے۔

لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔

وہ لڑکی ایک معقول صورت خاتون کو اپنے ساتھ لے کر آ گئی تھی۔ "یہ میری خالہ ہیں۔" اس نے بتایا۔ "انہوں نے میری پرورش کی ہے اور انہیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ میں کہاں جاتی ہوں اور کس کے ساتھ رہتی ہوں۔"

"آپ کیا کہتی ہیں؟" میں نے اس عورت کی طرف دیکھا۔

"نتاشا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہمارا اب اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔" اس عورت نے کہا۔ "چاہے سرکس میں کام کرے۔ یا کہیں اور جائے۔"

وہ لڑکی یہ کیس جیتتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

لیکن ابھی بھی بہت سی باتیں میرے ذہن میں کھٹک رہی تھیں۔ اگر اس کی جگہ کوئی لڑکا یا کوئی مرد ہوتا تو پھر اس کے لئے سوچنے میں اتنی قباحت نہیں تھی لیکن یہ ایک لڑکی کا معاملہ تھا اور ظاہر ہے کہ اس کی زیادہ ذمے داری ہوا کرتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم دو چار دنوں کے بعد آؤ۔" میں نے کہا۔ "میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لوں۔"

"آپ کو مشورے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ تو مالک ہیں سرکس کے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہاں ہم سب ایک خاندان کی طرح رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک دوسرے کے مشورے سے کام چلتا ہے۔"

وہ دو چار دنوں کے بعد پھر آ دھمکی تھی۔ "جی جناب۔ اب بتائیں کیا فیصلہ کیا ہے آپ نے؟"

"تم یہ بتاؤ کہ تم کس ایکٹ میں حصہ لینا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"شیروں والے ایکٹ میں۔" اس نے بتایا۔

"کیا؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا پاگل ہو گئی ہو! تمہیں اندازہ ہے کہ یہ کتنا خطرناک کام ہے۔ ہمارے شیر سوائے ٹارزن کے اور کسی سے مانوس نہیں ہیں۔ ذرا سی دیر میں چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔"

"جب آپ کے شیر ٹارزن سے مانوس ہو گئے ہیں تو پھر مجھ سے بھی ہو سکتے ہیں۔"

"نہیں۔ میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔" میں نے کہا۔

"اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو پھر میں اپنی جان دے دوں گی۔" اس نے بتایا۔ "اور آپ کو یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میں دھن کی کتنی پکی ہوں۔"

اس کی باتوں نے ایک طرف جہاں پریشان کر کے رکھ دیا تھا وہیں دوسری طرف اس بات کی بھی خواہش تھی کہ کاش وہ کسی بہانے یہیں رہ جائے۔ یہ میرے اندر کی محرومی کی آواز تھی۔ اس کی خواہش تھی۔

میں نے اب تک زندگی میں محبت جیسی کوئی چیز حاصل نہیں کی تھی۔ سرکس کی دنیا میں ایسی باتوں کا موقع ہی کہاں ملتا ہے؟ یہاں تو ایک جیسی زندگی ہوتی ہے۔ لیکن اس خواہش کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ میں اس بے وقوف کی بات مان کر اس کے لئے موت کا سامان پیدا کر دوں۔

میں نے ایک بار پھر اپنے ساتھیوں سے اس کے لئے مشورہ کیا۔

وہ سب کے سب اس کے خلاف تھے کیونکہ یہ خاصی ذمے داری کا کام تھا لیکن دوسری طرف اس لڑکی کے بے پناہ شوق اور اس کی بے پناہ ضد نے ہمیں مجبور کر دیا تھا۔

"ہاں اگر وہ لڑکی ہمارے ساتھ شامل ہی ہونا چاہتی ہے تو اس سے کہو کہ وہ شیروں کے چکر میں نہ پڑے۔ کوئی اور کام سیکھ لے۔" ٹارزن نے کہا۔

"میں اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکا ہوں۔ لیکن وہ نہیں مانتی۔"

"تو پھر بھگا دو اسے۔ وہ اپنی زندگی کی دشمن معلوم ہوتی ہے۔"

لیکن میں اسے بھگا نہیں سکا ایک بار وہ آ کر رونے لگی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ پوری دنیا میں اس کے لئے کوئی سہارا نہیں ہے اور جب وہ اپنی مرضی سے یہ سب کرنے کو تیار ہے تو پھر اعتراض یا انکار کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟ وہ اس سلسلے میں لکھ کر بھی دینے کو تیار ہو گئی تھی۔ بہرحال، کئی دنوں کی بحث کے بعد اس لڑکی کو سرکس میں آنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

☆☆☆

ان دنوں چاند بہت روشن ہو گیا تھا اور ہواؤں میں سرشاری کی کیفیت تھی۔

نتاشا ہمارے ساتھ رہنے لگی تھی۔ اس نے لکھ کر دے دیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے سرکس میں شمولیت اختیار کر رہی

ہے۔ اسے کسی نے مجبور نہیں کیا ہے۔ اس کو سرکس کی ایک عورت ثریا کے ساتھ ایک خیمہ دے دیا گیا تھا۔ اب یہی اس کا گھر تھا۔

ویسے تو وہ سب کے ساتھ ہنستی بولتی تھی لیکن میرے لئے اس کی نگاہوں کے پیغامات بہت واضح تھے۔ وہ میرا بہت خیال رکھنے لگی تھی۔ ہم اکثر رات کے شو سے فارغ ہو کر میدان کی طرف نکل جاتے۔ جہاں دور دور تک چاندنی روپہلی حسن کی طرح اپنے جلوے دکھایا کرتی۔ ہم ایک بڑے سے پتھر پر جا کر بیٹھ جایا کرتے اور باتیں شروع ہو جاتیں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے ایسی باتیں کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ انسان یا تو آئینے کے سامنے بچہ ہو جاتا ہے۔ یا بچے کے سامنے یا پھر عورت کے سامنے۔

اور میں اس لڑکی کے سامنے بچہ ہو گیا تھا۔

اسے لطیفے سناتا۔ گانے سناتا۔ اپنی زندگی کے واقعات سناتا (میری زندگی میں سرکس کے تجربات کے سوا اور تھا ہی کیا) وہ بھی مجھے اپنے بارے میں بتایا کرتی۔

کتنی محرومیوں بھری زندگی گزاری تھی اس نے۔ کسی نہ کسی طرح انٹر تک تعلیم بھی حاصل کر لی تھی۔ اس کی زندگی میں محبت نام کی کسی چیز کا کوئی دخل نہیں تھا۔

محرومیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سناٹا تھا جو اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

ایک دن اس نے بتایا۔ ”زندگی میں پہلی بار مجھے ایسا لگا ہے جیسے میری بھی زندگی کا کوئی مقصد ہے اور میرے پاس بھی خوشیاں ہیں اور یہ احساس صرف آپ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔“

میرے لئے اس کا اعتراف بہت تھا۔ اس رات میں اسے شہر کے ایک خوبصورت سے ہوٹل میں کھانا کھلانے لے گیا تھا۔ کھانے کے دوران، میں نے اس سے پوچھا ”نتاشا اگلے ہفتے ہم اس شہر سے روانہ ہو رہے ہیں۔ اب تم کیا کرو گی؟“

”مجھے کیا کرنا ہے۔ میں تو اب زندگی بھر کے لئے آپ کے ساتھ ہوں۔“

”نتاشا کیا کبھی ایسا ہو سکے گا؟“ میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

اس نے شرما کر اپنی گردن جھکا لی تھی۔ بہت دیر کے بعد اس نے کہا۔ ”اب آپ میری ٹریننگ تو شروع کروا دیں۔“

”یار، تمہیں شیروں کے سامنے بھیجتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا ہے۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”زندگی میں پہلی بار تو مجھے۔ میرا مطلب ہے کہ محبت ملی ہے اور میں اسے بھی شیروں کے حوالے کر دوں۔“

”کچھ نہیں ہوتا۔“ اس نے کہا۔ ”میں بھی بے وقوف نہیں ہوں کہ فوراً شیروں کے سامنے چلی جاؤں۔ میں انہیں آہستہ آہستہ رام کروں گی۔ پیار ایسی چیز ہے جو کسی کو بھی رام کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔“

”ہاں۔ جس طرح تم نے مجھے رام کر لیا ہے۔“

اس نے ہنستے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

دوسری صبح میں نے ٹارزن کو بلا کر اس سے کہا۔ ”ٹارزن۔ میں ایک قیمتی امانت کی طرح نتاشا کو تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔ تم اسے تربیت دو۔ شیروں کو اس سے مانوس کرواؤ اور اس لڑکی کو بلاوجہ بہادر مت بننے دو۔ جلدی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تربیت آہستہ آہستہ بھی ہو سکتی ہے۔“

”میں سب سمجھتا ہوں باس۔“ ٹارزن نے اپنی گردن ہلا دی۔ ”تم فکر مت کرو۔ اگر شیروں کو حملہ کرنا ہی ہے تو پہلے مجھ پر کریں گے۔ پھر اس لڑکی کی باری آئے گی۔“

”مجھے تم سے یہی امید ہے ٹارزن۔“

☆☆☆

شیروں کے ساتھ اس کی ٹریننگ کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ یہ ایک انتہائی خطرناک قسم کی ٹریننگ تھی۔ یہ جہاں اس لڑکی کے لئے ایک چیلنج تھا۔ وہاں ٹارزن کے لئے بھی تھا۔ بہت پھونک پھونک کر نتاشا کو مانوس کروانا تھا۔

ٹارزن بہت اکھڑا اکھڑا رہتا تھا۔ اسے وہ لڑکی پسند ہی نہیں تھی۔ وہ بار بار مجھ سے کہا کرتا۔ ”باس یہ تم نے کیسا بکھیڑا پال لیا ہے۔ بھگاؤ اس لڑکی کو وہ ہم سبھوں کے لئے عذاب بن جائے گی۔“

”اب تو وہ آگئی ہے ٹارزن۔ اب اسے برداشت بھی کرو۔ اس کا ساتھ بھی دو۔“

وہ بک بک کرتا ہوا چلا جاتا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایک فرض شناس انسان ہے۔ نتاشا سے لاکھ ناراض اور خفا ہونے کے باوجود وہ اس کی ٹریننگ میں کوئی کوتاہی نہیں کرے گا۔

میں اور نتاشا بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آتے جا رہے تھے۔ ہم ایک بھی ہو سکتے تھے کیونکہ نتاشا کے لئے یہ کوئی پرابلم نہیں تھی۔ اس کے لئے ایسا کوئی بھی نہیں تھا

جس سے وہ اجازت وغیرہ حاصل کر سکتی۔

وہ اپنی مرضی کی مالک تھی۔ میرا خیال تھا کہ اگر میں نے یہ تجویز اس کے سامنے رکھی تو اسے انکار بھی نہیں ہوگا اور ویسے بھی ہم ایک دوسرے کے بہت قریب تو آ ہی چکے تھے۔

ایک رات سیر کرتے ہوئے میں نے اپنے دل کی بات اس سے کہہ دی۔ وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئی تھی۔ ”کیا بات ہے نتاشا۔ کیا میری یہ بات پسند نہیں آئی؟“

”میرے لئے اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟“ اس نے کہا۔ ”میری تو اب زندگی آپ ہی کے ساتھ ہے۔ میرے راستے آپ ہی کی طرف آتے ہیں۔ میں اب کہاں جا سکتی ہوں؟“

”نہیں نتاشا۔ تم پر کسی قسم کا جبر نہیں ہے۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”بلکہ تمہیں اپنی مرضی سے فیصلہ کرنا ہے۔“

”ہاں۔ میں جانتی ہوں کہ آپ اچھے سویٹ ہیں کہ آپ جبر کر بھی نہیں سکتے۔“ اس نے کہا۔

”تو پھر۔ کیا فیصلہ ہے تمہارا۔“

”ظاہر ہے کہ فیصلہ آپ کے حق میں ہے۔“ وہ مسکرا دی۔ ”لیکن ابھی نہیں۔ جب میں شیروں کے ساتھ اپنا پہلا شو کر لوں تو اس کے بعد۔ یہ میری خواہش ہے۔“

اس کی اس خواہش کا احترام کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

لیکن ہوا یہ کہ میں اس کی خواہش کا احترام نہیں کر سکا بلکہ معاملات کچھ اور ہو گئے تھے۔

☆☆☆

اس رات بھی چاند بہت روشن تھا۔

وہ اس شہر سے کسی اور شہر میں آ گئے تھے۔ یہاں بھی سرکس نے کامیابی حاصل کی تھی کیونکہ لوگوں کے لئے تفریح کے ذرائع کچھ اسی قسم کے ہوا کرتے ہیں۔

میں یہ سوچا کرتا تھا کہ آخر لوگ سرکس میں اتنی دلچسپی کیوں لیتے ہیں اور بہت کچھ سوچنے کے بعد یہ اندازہ ہوا تھا کہ شاید اس لئے کہ وہ خود کو ہیروں کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چشم تصور میں اپنے آپ کو خونخوار جانوروں سے اُلجھتے ہوئے دیکھا کرتے ہیں۔ تنے ہوئے رسّوں پر چلتے ہوئے دیکھتے ہیں اور انہیں ایک طرح کی خوشی اور طمانیت حاصل ہوا کرتی ہے۔

بہرحال، اس روز روشن چاندنی رات میں، وہ

تمہیں سلام

جل کر شہید ہو کے چلے تم، تمہیں سلام
کلمہ خدا کا پڑھ کے گئے تم، تمہیں سلام

دنیا کی آگ نیند کا باعث بنے جہاں
اس نارِ آخرت سے بچے تم، تمہیں سلام

اے جلنے والے پیارے شہیدوں کے وارثو!
صبرِ جمیل پی جو رہے تم، تمہیں سلام

یہ کیسے حکمران تھے مزے سے جو سو گئے
دو دن وہاں جھلستے رہے تم، تمہیں سلام

بھاری مشینیں بھیجا جن کو تھا ناپسند
ان ظالموں سے دور چلے تم، تمہیں سلام

ہم سب شریکِ جرم ہیں اقرار ہے سعید
اس فردِ جرم سے جو بچے تم، تمہیں سلام

احمد سعید قائم خانی

آوازیں میرے کانوں میں زہر انڈیل رہی تھیں۔ یہ آوازیں نتاشا اور نارزن کی تھیں۔ انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ میں بھی قریب کھڑا ہوا ان کی باتیں سن رہا ہوں۔

"تو وہ بوڑھا تم سے شادی کرنے کے چکر میں ہے۔"

یہ آواز نارزن کی تھی۔

"ہاں یار۔" نتاشا کہہ رہی تھی۔ "میں نے بڑی مشکلوں سے اسے ٹال رکھا ہے۔"

اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی بوڑھا ہو چکا ہوں اور مجھے نتاشا جیسی لڑکی کی خواہش کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ ان دونوں کی باتیں میرے پورے وجود میں آگ بھرتی جارہی تھیں۔

پتا چلا کہ ان دونوں کے درمیان یہ سلسلہ بہت دنوں سے چل رہا تھا اور وہ دونوں ہی مجھے بے وقوف بنا رہے تھے۔ ایک طرف نتاشا اپنی باتوں سے مجھے بہلا رہی تھی اور دوسری طرف نارزن مجھے احساس دلاتا رہا تھا کہ وہ نتاشا کو پسند نہیں کرتا تاکہ میں اس کی طرف سے غلط فہمی میں مبتلا رہوں۔

میں اس وقت کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا۔

میں جیسے زندگی اور موت کے درمیان معلق ہو کر رہ گیا تھا۔

یا خدا! میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کا قرب حاصل کیا تو اس نے ایسا دھوکا دیا۔

وہ دونوں ایک دوسرے میں گم ہو کر باتیں کیے جارہے تھے۔ "معلوم ہے نارزن۔ میں نے اس سے کیا کہا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ جب میں شیروں کے ساتھ اپنا پہلا شو کرلوں گی تو پھر اس سے شادی کرلوں گی۔"

دونوں ہنس پڑے۔ پھر نارزن کی آواز آئی۔

"نتاشا۔ تم شیروں کے ساتھ شو ضرور کروگی لیکن یہ تمہارا اور میرا آخری شو ہوگا۔"

"کیونکہ اس کے بعد ہم دونوں کو یہ سرکس چھوڑ کر کہیں اور چلے جانا ہے۔" نتاشا نے کہا۔ "ویسے میری بات جھوٹ بھی نہیں ہوگی کیونکہ میں نے اس سے کہا ہے کہ شو کے بعد میں شادی کرلوں گی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ شادی کس سے ہوتی ہے۔"

وہ دونوں ہنستے رہے۔ ہنستے رہے اور میرے وجود میں آگ شامل ہوتی چلی گئی۔

ان دونوں نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی اور مجھے یہ احساس دلا دیا تھا کہ میں ایک بوڑھا انسان ہوں اور مجھے اب مرجانا چاہیے۔ میرے لیے زندگی میں محبت نام کی کوئی چیز نہیں ہے صرف ایک موت ہے جو آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی چلی آرہی ہے۔

☆☆☆

لیکن میں نہیں مرا۔ وہ دونوں مرگئے۔

بالکل غیر متوقع طور پر۔ انتہائی بھیانک موت ہوئی تھی دونوں کی۔ نتاشا کا یہ شیروں کے ساتھ پہلا شو تھا اور وہ شیر جو نارزن کی انگلیوں کے اشارے پر رقص کیا کرتے تھے۔ ان ہی شیروں نے ان دونوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔

اور وہ بھی ہزاروں تماشائیوں کے سامنے۔

ہر طرف سے چیخیں گونجنے لگی تھیں۔ دونوں شیر خونخوار ہو چکے تھے۔ پولیس کے سامنے دونوں کو شوٹ کردیا گیا تھا۔ نتاشا اور نارزن کی موت بہت عبرتناک ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں کسی کو الزام بھی نہیں دیا جاسکتا تھا کیونکہ یہ جانوروں کا معاملہ تھا اور ان کی کسی حرکت کا ذمے دار کسی کو قرار نہیں دیا جاتا۔

وہ کسی بات پر بپھر گئے اور انہوں نے اپنے خون کی پیاس بجھالی تھی۔ نارزن نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہ شو نتاشا کا پہلا اور آخری شو ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس کے بعد نارزن کی نہیں بلکہ موت کی دلہن بن گئی تھی۔

میں نے اس کے بعد سرکس کی دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔

میں نے وہ سرکس فروخت کردیا تھا اور خود سکون کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر بھٹکتا پھرا۔ میں اب ایک مدت کے بعد یہ کہانی لکھ رہا ہوں اور اس بات کا اعتراف کررہا ہوں کہ ان دونوں کی موت اتفاقیہ نہیں ہوئی تھی۔

بلکہ وہ ایک خاص قسم کی دوائی جوان شیروں کی خوراک میں شامل کردی گئی تھی۔ اس دوا کا ری ایکشن یہ ہوا کرتا تھا کہ وحشی جانوروں کا وحشیانہ پن پوری شدت کے ساتھ سامنے آجاتا۔ ان کی سوئی ہوئی خونخواری جاگ اٹھتی تھی۔

اور جب ان کی خونخواری جاگ اٹھی تو انہوں نے نارزن اور نتاشا کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کو میرا یہ فعل انتہائی بزدلانہ اور ظالمانہ محسوس ہورہا ہو لیکن ان دونوں نے مجھ پر بھی تو ظلم کیا تھا۔

نتاشا کی محبت میرے لیے میری زندگی کا پہلا شو تھا اور یہ پہلا شو ہی میرے لیے موت کے پیغام کی طرح کردیا گیا تھا۔ تو میں کس طرح نتاشا کو اس کے پہلے شو میں کامیاب ہوتے دیکھ سکتا تھا۔

دونوں کے درمیان حرے کا جھگڑا ہورہا تھا۔ دونوں ہی بھکاری تھے۔ ان میں سوائے بوڑھے ہوجانے کے بظاہر اور کوئی خرابی یا معذوری نہیں تھی۔

یہ دونوں ہمارے محلے کی مارکیٹ کے ساتھ والے فٹ پاتھ پر ایک درخت کے نیچے بیٹھا کرتے تھے۔ ایک بوریا بچھا کر۔ دونوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ تین چار فٹ کا فاصلہ ہوتا ہوگا۔

میں چونکہ مارکیٹ سے قریب ہی رہتا تھا اس لیے آتے جاتے ان دونوں کو دیکھا کرتا۔ میں نے ان دونوں کے درمیان کبھی بات چیت ہوتے ہوئے نہیں دیکھی۔

وجودِ زن

محترم مدیر
السلام علیکم

وجودِ زن سے ہے کائنات میں رنگ یہ بات علامہ اقبال نے بہت پہلے کہی تھی مگر آج بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ عورت ہر فساد کی جڑ ہے مگر عورت کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ آپ خود بھی ملاحظہ کریں۔ واقعہ حاضر ہے۔

نسیم اختر
(کراچی)

دونوں ایک دوسرے سے ضد لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ لیکن اس دن دونوں میں جھگڑا ہو رہا تھا۔

صبح کا وقت تھا۔ مارکیٹ کھلی نہیں تھی۔ اس لئے شاید دونوں کو جھگڑا کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ یہ چونکہ ایک دلچسپ سچویشن تھی۔ اس لئے میں اپنے جوتوں پر پالش کرانے موچی کے پاس بیٹھ گیا۔

موچی کا اڈہ ان دونوں سے قریب ہی تھا۔ دونوں کے جھگڑنے کی آوازیں وہاں تک آ رہی تھیں۔

"خان صاحب۔ دونوں میں شاید جگہ کے معاملے پر جھگڑا ہو رہا ہے۔" میں نے موچی سے پوچھا۔

"ارے نہیں صاحب۔ یہ پھڈا کچھ اور ہے۔" موچی ہنس دیا۔ "ان دونوں میں ایک عورت کا جھگڑا چل رہا ہے۔"

"عورت کا جھگڑا۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں صاحب۔ بہی تو مزے کی کہانی ہے۔" موچی نے کہا۔ "یہ دونوں خانہ خراب اس عورت سے عشق مشق کرتا ہے۔"

"اور وہ عورت کون ہے؟"

"وہ بھی ایک بھکارن ہے صاحب۔ لیکن بہت جوان اور خوبصورت ہے۔"

"جھگڑا کس بات پر ہو رہا ہے۔"

"دونوں اس عورت کو اپنے پاس بٹھانا چاہتا ہے۔" موچی نے بتایا۔ "بس اسی بات کا جھگڑا ہے۔"

"یہ تو بہت مزے کی بات ہے۔ وہ بھکارن کہاں بیٹھتی ہے؟"

"اس کے پاس خالی جگہ نہیں ہے صاحب۔" موچی نے بتایا۔ "اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہے۔ ان لوگوں کو بھی ایک اڈے کا ضرورت ہوتا ہے۔ تو یہ دونوں اس کو جگہ دینے کے لئے بے چین ہو رہا ہے۔"

دونوں بوڑھے بھکاریوں کے درمیان جھگڑے کی شدت کچھ کم ہو گئی تھی۔ بس ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر بڑبڑائے جا رہے تھے۔ میرے جوتے بھی پالش ہو چکے تھے۔

میں نے پیسے دیئے اور اُٹھنے ہی والا تھا کہ موچی نے کہا۔ "صاحب۔ ابھی پانچ منٹ ٹھہرو۔ ایک تماشا دیکھتے جاؤ۔"

"کیسا تماشا؟"

"وہ بھکارن اب آنے والا ہے۔ وہ خانہ خراب اس وقت آتا ہے اور ان دونوں کو الو بنا کر چلا جاتا ہے۔ تم ذرا دیکھنا۔"

میں یہ تماشا دیکھنے کے شوق میں موچی کے پاس بیٹھا رہ گیا۔

تقریباً دس بارہ منٹ کے بعد وہ بھکارن نمودار ہوئی۔ موچی نے اسے جوان اور خوبصورت عورت کہا ہوگا۔ ممکن ہے کہ اس کے نقطۂ نظر سے وہ ایسی ہی ہو۔ بہر حال وہ ایک قبول صورت عورت ضرور تھی۔

وہ سیدھے ایک فقیر کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس فقیر نے اپنی جیب سے دس کا ایک نوٹ نکال کر اس عورت کو دے دیا۔ عورت نے اس سے دو چار باتیں کیں۔ پھر دوسرے بھکاری کے پاس چلی گئی۔ اس نے بھی دس کا ایک نوٹ دے دیا۔

"خان صاحب۔ یہ عورت تو جیسے دونوں سے محبت وصول کر رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ محبت کا بھتہ ہے صاحب۔" موچی ہنس دیا۔ "یہ دونوں صبح اسے ناشتے کا پیسا دیتا ہے۔ ابھی یہ ہوٹل میں جا کر ناشتا کرے گا۔"

"واہ۔" میں بھی ہنس پڑا۔ "گویا یہ دونوں کو بے وقوف بنا رہی ہے۔"

"ہاں صاحب۔ عورت کا چکر ہی بُرا ہوتا ہے۔" موچی نے کہا۔ "آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔"

"یہ لوگ رہتے کہاں ہیں؟"

"سنا ہے کچی آبادی میں رہتے ہیں۔" موچی نے بتایا۔ "لیکن ہم کو زیادہ نہیں معلوم۔"

وہ عورت جا چکی تھی۔ وہ دونوں بھکاری اب راہ گیروں سے بھیک مانگنے میں مشغول ہو چکے تھے۔ زندگی رواں دواں ہو گئی تھی۔ لیکن مجھے اس قصے میں بہت مزہ آیا تھا۔

یہ ایک دلچسپ صورت حال تھی۔ دو بوڑھے بھکاری ایک جوان بھکارن کے عاشق تھے اور وہ بہ یک وقت دونوں کو بے وقوف بنا رہی تھی۔

موچی اب ایک دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ میں بھی اُٹھ کر اپنے گھر چلا آیا۔ لیکن میں ان تینوں کے بارے میں مزید جاننا چاہتا تھا۔ یہ دیکھنا تھا کہ اس کشمکش کا انجام کیا ہوتا ہے۔ ان دونوں میں سے کس کی جیت ہوتی ہے۔ یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ بھکارن ان دونوں ہی کو چھوڑ جائے۔

شاید دس بارہ دنوں بعد کی بات ہے۔ میں نے ان تینوں کو ایک ساتھ دیکھ لیا۔ اپنے محلے میں نہیں بلکہ اپنے محلے سے دور۔ یہ ایک کچی آبادی تھی۔ وہاں گاڑیوں کا کام بہت بہتر ہوا کرتا تھا۔ ایک سے ایک میکینک وہاں ہوتے تھے۔ میں بھی اپنی گاڑی کی ایک خرابی دور کرنے چلا گیا۔

میکینک نے مجھے ایک گھنٹے کے بعد بلایا تھا۔ اب شہر جا کر پھر واپس آنا تو ایک فضول سی بات تھی۔ اس لئے میں اس کی دکان سے اُٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا اور کچھ دیر بعد ان تینوں کو دیکھ لیا۔

یہ بہت حیرت کی بات تھی۔ وہ تینوں ایک ساتھ دکھائی دے رہے تھے۔ تینوں ایک طرف جا رہے تھے۔ عورت کے ہاتھ میں دو شاپرز تھے۔ جن میں شاید سبزیاں بھری ہوئی تھیں۔

مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ میں بھی آہستہ آہستہ ان کے پیچھے چل پڑا۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے نہیں پہچانتے تھے۔ اسی لئے اگر دیکھا بھی ہوگا تو کوئی دھیان نہیں دیا ہوگا۔

وہ تینوں کچھ فاصلے پر ایک ہی مکان میں داخل ہو گئے۔

یہ ایک کچا مکان تھا جس کی حالت ہی بتا رہی تھی کہ برسوں سے اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ دروازے پر ٹاٹ کا ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں ان تینوں کو ایک ہی مکان میں داخل ہوتے دیکھ کر اور حیران رہ گیا۔

اب میرا تجسس اور بڑھ چکا تھا۔ میں ان تینوں کے بارے میں جاننے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ اس ڈرامے کا ایک نیا موڑ سامنے آیا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ پھر مجھے ایک دکان دکھائی دے گئی۔

چھوٹی سی دکان۔ جھونپڑی تھا۔ اس میں بھی ایک بوڑھا شخص بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے اس کی دکان سے جا کر یوں ہی دو تین بسکٹ خریدے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد پوچھا۔ "بابا۔ وہ جو سامنے گھر ہے۔ اس میں کون لوگ رہتے ہیں؟"

"کیوں؟" بابا نے شبے والی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"میں نے ان لوگوں کو اپنے علاقے میں بھیک مانگتے دیکھا ہے۔"

تیر بہ ہدف

ایک نوجوان، مولانا رشید احمد گنگوہی کے پاس پہنچا۔ اس نے ان سے کہا۔

"جناب! میں اپنی چچا زاد بہن سے محبت کرتا ہوں اور اس سے نکاح کا خواستگار ہوں مگر مشکل یہ ہے کہ میرے چچا مال دار آدمی ہیں اور میں غریب ہوں۔ آپ مجھے تعویذ لکھ کر دے دیجیے۔"

مولانا نے جواب دیا۔ "میاں! میں تعویذ وغیرہ نہیں لکھتا۔" نوجوان نہ مانا، اصرار کرتا رہا۔ مولانا بھی کسی طرح نہیں مانے۔ آخر نوجوان مایوس ہو کر صحن میں گیا۔ وہاں کنواں تھا۔ نوجوان کنویں میں پاؤں لٹکا کر بولا۔

"مولوی صاحب! میں بڑی امید لے کر آیا تھا، آپ نے میری امید توڑ دی، میں اب زندہ رہ کر کیا کروں گا۔" مولانا گھبرا کر چیخے۔

"ارے.... ٹھہرو.... ٹھہرو، یہاں آؤ، میں تعویذ لکھے دیتا ہوں۔" انہوں نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر نوجوان کو دیا۔ "جاؤ، سیدھے اپنے چچا کے پاس پہنچ جاؤ۔"

نوجوان نے مولانا کا کاغذ اپنے چچا کو دے دیا، اس کے چچا کاغذ پڑھتے ہی رام ہو گئے، کہنے لگے۔ "میاں! تم کہاں تھے؟ ہمیں تمہاری تلاش تھی۔" تھوڑی دیر بعد انہوں نے قاضی کو بلا کر بیٹی کا نکاح بھتیجے سے پڑھوا دیا۔

چند دن بعد نوجوان کو خیال آیا کہ مولانا نے بڑا تیر بہدف تعویذ دیا تھا۔ دیکھنا چاہیے کہ اس میں کیا لکھا تھا۔ اس نے تعویذ تلاش کیا اور اسے کھول کر پڑھا، لکھا تھا۔

یا اللہ مخلص کچھ جانتا نہیں
اور یہ مانتا نہیں
تو اس کا مولا، یہ تیرا غلام
اب تو جانے اور تیرا کام

مرسلہ: اطہر حسین..... کراچی

''بھیک مانگتے؟'' بابا حیران رہ گیا۔
''جی ہاں۔''
''ارے نہیں بھئی۔ تم نے کسی اور کو دیکھ لیا ہوگا۔''
اس نے کہا۔ ''یہ تینوں تو بہت دنوں سے یہاں رہتے ہیں۔ دو بھائی ہیں۔ بڑے بھائی کی بیوی ہے۔ بس یہ ہے خاندان۔''
یہ ایک اور نیا انکشاف تھا۔ وہ دونوں بھائی تھے اور وہ عورت ان میں سے ایک کی بیوی تھی۔ یہ بھی ایک حیرت کی بات تھی اور ان دونوں کے درمیان اس عورت کے لئے جھگڑا ہوتا رہتا تھا۔ یہ کیسا ڈراما تھا۔
''اور یہ تینوں کسی فیکٹری میں کام کرتے ہیں۔'' دکاندار نے بتایا۔ ''بے چارے صبح جاتے ہیں اور شام کو واپس آتے ہیں اور تم نے ان کو بھکاری بنا دیا۔''
''ہوسکتا ہے بابا کہ مجھ سے بھول چوک ہوئی ہو۔'' میں جلدی سے بولا۔
وہاں سے میں واپس تو آگیا لیکن اب یہ معاملہ زیادہ اُلجھ گیا تھا۔ یہ تو داستان در داستان تھی۔ اگر میرے مزاج میں اتنا تجسس کا مادہ نہیں ہوتا تو میں اس سچویشن پر لعنت بھیج دیتا۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ لٹھ لے کر ان کے پیچھے پڑ جاؤں۔ لیکن بُرا ہو اس طبیعت کا۔ مجھے چین نہیں مل رہا تھا۔
دوسری صبح میں اپنے علاقے کی مارکیٹ میں پہنچ گیا۔ وہ موچی اپنی جگہ موجود تھا اور وہ دونوں بھکاری بھی تھے۔ موچی نے مجھے پہچان کر سلام کیا۔ میں اس کے پاس رکھے ہوئے صندوق پر بیٹھ گیا۔ ''بابا۔'' میں نے موچی سے کہا۔ ''میں تمہیں ایک نئی بات بتانے آیا ہوں۔''
''ہاں صاحب بولو۔''
میں نے ساری صورتِ حال بتادی۔
''واللہ۔'' موچی بھی حیران رہ گیا تھا۔ ''یہ تو عجیب کہانی ہے صاحب۔ حیرت کی بات ہے۔''
''اب یہ بتاؤ۔ کیا تم کسی طرح ان کے بارے میں معلوم کرواسکتے ہو۔''
''جاسوسی؟'' موچی نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔
''ہاں۔ جاسوسی ہی سمجھ لو۔'' میں نے کہا۔
''مزہ آئے گا صاحب۔ ہمارا ایک آدمی ہے۔ بہت زبردست۔ وہ ان کی قبر میں بھی گھس جائے گا۔ پورا جاسوس ہے۔ اگر تم کہو تو ان کے پیچھے لگادے۔''

''ہاں لگادو اور میں اسے خرچا پانی بھی دے دوں گا۔''
''ایک بات پوچھوں صاحب۔ تم کو کیوں ان کا فکر ہوا ہے؟''
''بس یوں ہی۔'' میں نے کہا۔ ''میں اخبار کا آدمی ہوں۔ ان تینوں کی خبر چھاپوں گا۔''
''اس میں ہمارا نام بھی ہوگا صاحب۔''
''ہاں ضرور ہوگا۔''
''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ اب تم بے فکر ہوجاؤ۔ پانچ دن کے بعد تم کو سب معلوم ہوجائے گا۔''
پانچ چھ دنوں کے بعد جب میں اس طرف گیا تو وہ دونوں بھکاری غائب تھے۔ البتہ موچی ان کی پوری کہانی لئے بیٹھا تھا۔ ''صاحب۔ بڑا بے غیرت لوگ ہے۔'' اس نے بولنا شروع کیا۔ ''دونوں بھائی نہیں ہے بلکہ دوست ہے لیکن ایک گھر میں ایک ساتھ رہتا ہے۔''
''پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے آدمی کو کہاں سے یہ سب معلوم ہوا؟''
''اس عورت سے صاحب۔'' موچی نے بتایا۔ ''ہمارا آدمی بڑا زبردست ہے۔ ہم بتایا تھا۔ اس نے عورت سے دوستی کرلیا اور اس عورت نے اپنی کہانی بتایا ہے۔''
''چلو بتاؤ۔ دونوں دوست ہے۔ اور ایک گھر میں رہتے ہیں۔''
''ان میں سے ایک نے اس عورت سے شادی کیا تھا صاحب۔'' موچی نے بتایا۔ ''تین سال پہلے۔ پھر وہ خود گھر بیٹھ گیا اور عورت سے بولا کہ اب تم دوہرا محنت کرو۔''
''دوہرا محنت کیا مطلب؟''
''مطلب یہی کہ بھیک مانگے۔ اور شام کو اپنا جسم کا سودا کرو۔'' موچی نے کہا۔ ''اور وہ بولا کہ اب ہم سے محنت نہیں ہوتا۔ اس لئے تم کو یہ کام کرنا ہوگا۔ پھر یہ ہوا صاحب کہ اس عورت نے انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ وہ ایسا گندا کام نہیں کرتا۔''
''یہ کیسی بات ہوئی۔ جب وہ بھیک مانگ رہی ہے۔ جب اس نے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا ہے تو پھر کیسی عزت۔ کہاں کی عزت؟''
''ایسی بات نہیں ہے صاحب۔ ان بھکاریوں میں بھی اس قسم کا عورت لوگ ہوتا ہے۔ جو اپنے آپ کو بالکل سنبھال کر رکھتا ہے۔ ہم کسی کا بارے میں کچھ نہیں بول سکتا۔''
''چلو تو پھر کیا ہو؟''

"پھر یہ ہوا صاحب کہ اس بھکاری نے اس عورت کو مارنا شروع کردیا۔ اس پر تختی کیا۔ اس پر اس کا بھکاری دوست بہت ناراض ہونے لگا۔ اس بات پر دونوں میں جھگڑا ہوا اور اس کے خاوند نے اس کو طلاق دے دیا صاحب۔"

"اوہ۔ تو ان کے یہاں بھی یہ سب ہوتا ہے۔"

"کیوں نہیں صاحب۔ زندگانی کا پورا سسٹم ہے۔" موچی نے بتایا۔ "طلاق کے بعد صاحب رواج کے مطابق تین چار مہینے کا عدت ہوا اور اس عورت کا شادی دوسرے والے سے ہوگیا۔"

"بہت دلچسپ کہانی ہے۔"

"مزے کی بات یہ ہے صاحب کہ تینوں رہتا ایک ہی گھر میں تھا۔ جھگڑا ہو۔ شادی ہو۔ طلاق ہو۔ رہتا ایک ہی گھر میں ہے۔ پھر دوسرے والے نے شادی کرلیا۔ کچھ دن تو آرام سے گزرا۔ پھر دوسرے والے کو بھی مستی ہونے لگا۔ اس نے بھی وہی بات کیا جو پہلے والے نے کیا تھا۔"

"یہ تو بہت بُری بات ہوئی خان صاحب۔"

"بہت بُرا۔ وہ عورت دونوں بے غیرتوں کے درمیان فٹ بال جیسا ہوگیا۔ یہ دونوں اس کا خیال رکھتے ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ یہ بھی کرو۔ اور اس عورت کو یہ منظور نہیں ہے۔ اس نے پھر دوسرے والے سے طلاق مانگا ہے۔"

"طلاق کے بعد وہ پھر پہلے والے سے شادی کرے گی؟"

"نہیں صاحب۔ اب اس عورت نے کسی اور کو دیکھ لیا ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ وہ اچھا آدمی ہے۔ ان دونوں کی طرح بے غیرت نہیں ہے۔ وہ اس سے دوسرا کام نہیں کروائے گا۔"

"تو کیا اسے طلاق نہیں دے رہا۔"

"نہیں صاحب۔ اس کا خیال تو رکھتا ہے لیکن طلاق نہیں دیتا۔ لٹکا کے رکھتا ہے۔ اب دونوں اس سے گھر کا پورا کام بھی کرواتا ہے اور بھیک بھی منگواتا ہے۔"

"اس بے چاری کے ساتھ تو بڑا ظلم ہے خان صاحب۔"

"عورت ہے نا صاحب کمزور مخلوق۔ تو اس کا قسمت میں یہی لکھا ہے۔ ہر شخص اس پر ظلم کرتا ہے۔ اپنا اپنا طاقت اور اپنا اپنا حیثیت کے مطابق۔"

موچی نے بہت گہری بات کہہ دی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ واقعی عورت کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے۔ چاہے اس کا تعلق کسی بھی طبقے سے ہو۔

پھر بہت دنوں کے بعد اس موچی سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا۔ "صاحب۔ آپ کو معلوم ہے ان دونوں کا کیا ہوا؟"

"نہیں تو۔ کیونکہ وہ دونوں اب دکھائی بھی نہیں دیتے۔"

"وہ عورت ان دونوں کو چھوڑ کر چلا گیا ہے صاحب۔" موچی نے بتایا۔ "اور کوئی نہیں جانتا کدھر گیا ہے۔ اس شہر میں ہے یا خدا جانے کہیں اور ہے۔ کچھ پتا نہیں۔"

"اوہ۔ ان کے ساتھ یہ تو ہونا ہی تھا۔"

"جی صاحب۔"

"اور اب دونوں کہاں ہوتے ہیں؟ یہاں تو دکھائی نہیں دیتے۔"

"وہ دونوں کسی اور اڈے پر ہوتے ہیں صاحب۔ بنارس چوک پر بیٹھتے ہیں۔ ایک ساتھ۔" موچی نے بتایا۔ "اب دونوں میں بہت دوستی ہے صاحب۔ جھگڑے ختم ہوگئے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہتے ہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ جھگڑوں کی بنیاد ختم ہوگئی۔"

"ہاں صاحب۔ اب کوئی جھگڑا نہیں۔ عورت بیچ سے نکل جائے تو پھر سارا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔"

بات ختم ہوگئی۔ لیکن یہ کہانی شاید اپنے انجام کو نہیں پہنچی تھی۔ زندگی کو رواں دواں تو رہنا تھا۔ ایک بار میرا گزر بنارس چوک کی طرف سے ہوا۔

وہ دونوں بھکاری وہاں موجود تھے۔ ایک ٹوٹی ہوئی فٹ پاتھ پر اور حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کے ساتھ ایک عورت بھی موجود تھی۔ یہ وہ عورت تو نہیں تھی لیکن ایک عورت تھی۔ تینوں مل کر اس وقت کھانا کھا رہے تھے۔

موچی کی بات میرے کانوں میں گونج رہی تھی کہ عورت بیچ سے نکل جائے تو پھر سارا جھگڑا ختم ہو جاتا ہے لیکن موچی کو شاید یہ نہیں معلوم تھا کہ عورت کے بغیر رہا بھی نہیں جاسکتا۔

وہ بیچ سے نکل گئی تو پھر سب کچھ ویران ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی لئے ان دونوں بھکاریوں نے کسی اور کو ڈھونڈ لیا تھا۔

مکافاتِ عمل

محترمہ عذرا رسول
سلامِ عقیدت
یہ آپ بیتی میری نہیں میری ایک جاننے والی کی ہے' اس نے جس طرح سنایا اس کے اندازِ بیان میں ہلکی سی ترمیم کرکے اسے اپنے انداز میں تحریر کیا ہے لیکن کہانی میں کوئی ردوبدل نہیں کی ہے۔ امید ہے یہ روداد آپ کو بھی پسند آئے گی۔

ڈاکٹر نرگس وقار
(کراچی)

پچھلی رات بادل ٹوٹ کے برسے تھے۔ تاحال اس کا اثر باقی تھا۔ نیلے آسمان کو سیاہ بادلوں نے اپنی اوڑھنی میں چھپا رکھا تھا۔ وقفے وقفے سے بوندا باندی ہو رہی تھی..... پیڑ پودے اور پتے بارش سے دھل کر نکھرے نکھرے لگ رہے تھے۔ پھول اور پتوں پہ ٹھہرے ہوئے بارش کے قطرے نگینوں کی طرح چمک رہے تھے۔ پچھلے کئی دن کی شدید گرمی اور حبس سے اس بارش نے نجات دی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بچے بوڑھے سب کے چہرے خوشی

سے دمک رہے تھے۔ بچے پانی میں چھپ چھپ کرتے ادھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے۔ لیکن اس خوبصورت ماحول میں بھی میں اپنے گھر کی دہلیز پہ کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی اور اپنی آنکھوں کا پانی بار بار اپنے دوپٹے کے پلّو میں جذب کر رہی تھی۔ شاید میں آگے بڑھنا چاہ رہی تھی لیکن پاؤں کو اَن دیکھی زنجیروں نے جکڑ رکھا تھا۔ پھر کسی سوچ نے اُن اَن دیکھی زنجیروں کو کاٹ ڈالا۔

اب میرا رخ شمع کے گھر کی طرف تھا۔ میں اپنے آپ سے سوال کر رہی تھی کہ کیا یہ وہی شمع ہے جس کے سر کے بال بھی کسی اجنبی نے نہ دیکھے تھے اور جس نے اپنی زندگی کے بیس برس انتہائی عزت کے ساتھ اس محلے میں گزارے تھے۔ اوہ میرے خدا! کیا یہ وہی شمع ہے جس کی اونچی آواز کسی نے نہ سنی تھی لیکن آج وہ چیخ چیخ کر اپنے آپ سے کہہ رہی ہے۔ اے میرے رب اس زمین کا کلیجا پھٹ کیوں نہیں جاتا کہ میں اپنے ریزہ ریزہ وجود کو سمیٹ کر اس میں سما جاؤں۔

شمع اپنی ہی چوکھٹ پہ گھٹنوں میں سر دبائے بیٹھی تھی۔ اس کے گرد جم غفیر جمع ہونا شروع ہو چکا تھا۔ عورتیں بھی اپنے کام کاج چھوڑ کر گلی میں نکل آئیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ کوئی شمع سے ہمدردی کر رہا تھا اور کوئی جلتی پہ تیل ڈال رہا تھا۔

زہریلی سوچیں میری رگوں کو کاٹ رہی تھیں۔ محبت یوں بھی پاگل ہوتی ہے۔ رشتوں کی ڈور جسے مدتوں محبت کے تاروں سے بُنا جاتا ہے۔ کیا وہ یوں پل بھر میں کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتی ہے۔

''طلاق'' یہ چار حرفی لفظ کتنا چھوٹا سا ہے لیکن کسی بھی عورت کے لیے سب سے بڑی گالی ہے۔

افضل بھائی جنہوں نے زندگی کے بیس برس شمع کے سنگ گزارے تھے۔ لمحوں میں اس بے بس عورت کے گلے میں طلاق کا طوق ڈال کر اپنا رستہ جدا کر گئے۔

میں نے آگے بڑھ کر دوپٹا شمع کے سر پہ ڈالا، ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ تو صدمے سے بے ہوش ہو چکی تھی۔

افضل گھر کی چوکھٹ پہ پڑے شمع کے وجود کو ٹھوکر مار کر گھر کے اندر جا چکا تھا اور شمع کی نند بانو ناگن کی طرح کھڑی پھنکار رہی تھی۔ ''بھئی اچھا کیا تم نے اس گندگی کے ڈھیر سے چھٹکارا پا لیا''

بانو کی باتوں کا زہر شمع کی سانسوں میں گھل رہا تھا لیکن امید کا ٹمٹماتا ہوا دیا اور زمین بوس ہوتی آس سے وہ اپنے کرچی کرچی دل کو حوصلہ دے رہی تھی کہ شاید افضل کو غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ اس کے بکھرے وجود کو سمیٹ کر گھر کے اندر لے جائے۔ اس گھر میں جس کے ذرّے ذرّے میں اس کا خون پسینا شامل ہے۔

لیکن یہ صرف شمع کی سوچ تھی۔ اس کا شوہر اور نند اندر جا چکے تھے۔

میرے شوہر بھی گھر سے نکل کر گلی میں آ چکے تھے۔ میں نے انہیں ٹیکسی لینے کے لیے بھیج دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ٹیکسی آ گئی۔

میں نے چند عورتوں کی مدد سے شمع کے سرد وجود کو تھام کر ٹیکسی میں بٹھایا۔

کچھ ہی دیر میں ہم شمع کو لے کر قریبی ہاسپٹل کی ایمرجنسی میں پہنچ گئے۔ ڈیوٹی پہ موجود ڈاکٹر نے شمع کا معائنہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی اچانک صدمے سے یہ بے ہوش ہو گئی ہیں اور جلد ہی ہوش میں آ جائیں گی۔

رات کا شاید آخری پہر تھا جب نرس نے آ کر اطلاع دی ''آپ کی مریضہ ہوش میں آ چکی ہیں۔ اب آپ اُن سے مل سکتی ہیں۔''

میں وارڈ کی طرف بڑھ گئی۔ شمع بیڈ پہ سپاٹ چہرے کے ساتھ لیٹی ہوئی خالی خالی نگاہوں سے چھت کو تک رہی تھی۔

میں نے آہستہ سے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو چھوا تو وہ چونک گئی۔

''تم .....''

''ہاں شمع میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' میں نے جواباً کہا

شمع نے سسکتے ہوئے کہا۔ ''ہاجرہ یہ کیا ہوا افضل نے مجھے ط..... ط ..... طلاق کی گہری کھائی میں دھکیل دیا۔'' لفظ اس کے حلق میں اٹکنے لگے تھے اور آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی تھی۔

میں نے شمع کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''شمع حوصلہ رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

میں شمع کے دھواں دھواں چہرے کو تک رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ احساسِ تنہائی تڑپا رہا تھا۔ زہر تنہائی اس کے رگ و پے میں اتر رہا تھا۔ آنکھوں میں دکھوں کی دھند تھی اور دھند کے پیچھے نشیب و فراز سے گزرتا اس کا ماضی تھا۔

''شمع کیا سوچ رہی ہو؟''

میرے سوال پہ شمع اپنے بھیگے دوپٹے کے پلّو میں آنکھوں کا نمکین پانی جذب کرتے ہوئے بولی۔ ''آج طلاق کے دکھ نے ماضی کے کئی بند در کھول دیے ہیں۔ جانتی ہو میں بہت چھوٹی تھی۔ پاؤں پاؤں چلنا بھی نہ سیکھا تھا...... جب رب نے باپ کی شفقت سے محروم کر دیا۔ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں بابا مجھ سے بچھڑ کر آسمان کی وسعتوں میں کہیں کھو گئے۔ اور ماں کی ممتا کے ساتھ ساتھ باپ کی شفقت بھی اسی کی ذمّے داری بن گئی۔ آہ! معاشرے کی سرد و گرم ہواؤں سے بچتی بچاتی ماں کی انگلی تھامے میں زندگی کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

''میں تو ماں کی گود میں چھپ کر دھیرے دھیرے باپ کا دکھ بھولتی گئی لیکن ماں کے وجود کو بابا کا دکھ دیمک کی طرح چاٹنے لگا۔ بس، جاتے ہوئے ماہ و سال میں ماں محنت کی چکی میں پستی رہیں اور ان کے وجود میں زردیاں گھلتی گئیں۔ اماوس کی وہ رات میں کیسے بھول سکتی ہوں جب اچانک ماں کی حالت بگڑ گئی اور پھر ڈاکٹرز کے انکشاف پر میرے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔

ماں کے کمزور وجود میں کینسر اپنے پنجے گاڑھ چکا تھا۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ ماں کو اب دوا کی نہیں دعا کی ضرورت ہے۔ ماں مایوسیوں کی کھائی میں گرتی چلی گئیں۔

کینسر جیسے موذی مرض کے ساتھ ساتھ میری جوانی بھی ماں کے سکھ چاٹنے لگی۔ ماں کو ہر پل میری شادی کی فکر ستانے لگی۔ ماں میرے ہاتھوں میں مہندی اور سر پہ مضبوط سائبان کا خواب تکنے لگی اور پھر رب نے ماں کی دعا سن لی۔

پہلی ہی ملاقات میں افضل ماں کو بھا گیا اور میرے ساتھ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی کہانی ہو گئی۔

ماں نے مسکراتے لبوں کے ساتھ میرا ہاتھ افضل کے ہاتھ میں تھما کر سکھ سے موت کو گلے لگا لیا لیکن آج کتنی آسانی سے افضل نے مجھ سے وہ سب چھین لیا۔ میری عزت...... میرا گھر......''

شمع سسک رہی تھی۔ تب میں نے کہا، ''شمع چلو..... گھر چلنے کی تیاری کرو!''

''گھر کیسا گھر۔ کس کا گھر؟''

''تم میرے ساتھ میرے گھر چلو گی۔ میں جانتی ہوں تم بے قصور ہو۔ یہ سب تمہاری نند کا کیا دھرا ہے۔ میں ہمیشہ کہتی تھی کہ تمہاری نند بہت چرب زبان ہے۔ وہ

یادگار فوٹو

کلاس ٹیچر نے اپنی طالبات کے ساتھ گروپ فوٹو کھنچوایا اور کہنے لگیں: ''تم اس تصویر کو دس سال بعد بھی دیکھو گی تو ماضی یاد آ جائے گا۔ اپنے ملنے والوں کو بتاؤ گی کہ یہ صفیہ ہے جس کی شادی ہو چکی ہے۔ یہ رضیہ ہے جو اب لندن میں ہے اور یہ قمر ہے جو اب ٹیچر بن گئی ہے۔''

ایک لڑکی فوراً بولی: ''اور یہ ہماری کلاس ٹیچر ہیں جو وفات پا چکی ہیں۔''

(کراچی سے ...... دائمہ یونس کی برجستگی)

میٹھی چھری ہے لیکن تم نے میری باتوں پہ کان نہ دھرے اور اپنی سادگی میں ماری گئیں۔ خیر، تم میرے ساتھ چلو اللہ بہت بڑا ہے۔'' میں نے شمع کو لپٹاتے ہوئے کہا۔

شمع خاموشی سے اپنے کرچی کرچی وجود کو سمیٹتی میرے در پہ چلی آئی۔ کوئی اور رستہ بھی تو نہ تھا۔

میں اسے کمرے میں چھوڑ کر خود کچن کی طرف بڑھ گئی۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی۔

بوجھل دل اور جسم کو چھیدتی یادوں کے سنگ شمع یادوں کے دیپ جلا کر زندگی کے اندھیروں کو سمیٹنا چاہ رہی تھی کہ میں چائے کا کپ لیے چلی آئی۔ ''شمع چائے پی لو......''

''میرا دل نہیں چاہ رہا۔''

''شمع ہر بات من کی نہیں مانا کرتے۔ کبھی کبھی من کے فیصلے زندگی کا روگ بن جاتے ہیں۔ یوں سسک سسک کر اپنی جان کو روگ مت لگاؤ۔ جو بھی تمہارے من میں ہے کہہ ڈالو۔ دل کا بوجھ کم ہو جائے گا، حوصلہ رکھو۔ جانتی ہوں زندگی کا طویل سفر خوشیوں اور اپنوں کی محبتوں کے سنگ بڑی سبک رفتاری سے کٹتا ہے۔ لیکن اگر اپنے ہی بیگانے ہو جائیں اور ان کی نفرتوں میں بجھے تیر جسم و جاں کو چھلنی کر دیں تو پھر زندگی بوجھ بن جاتی ہے۔ اپنے ہی وجود کی کرچیاں سمیٹتے سمیٹتے انگلیوں کی پوریں لہولہو ہو جاتی ہیں۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ

خزاں رکھے گی درختوں کو بے ثمر کب تک
گزر ہی جائے گی یہ رُت بھی حوصلہ رکھنا!

میں تو خود سوچوں کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہوں کہ افضل بھائی جیسا شخص اتنا چاہنے والا، اتنی محبت کرنے والا لمحوں میں نفرت کی اس انتہا پہ پہنچ گیا اور وہ عمل کر گزرا جو بندوں کی نظر میں تو برا ہے لیکن اللہ کے نزدیک بھی سب سے زیادہ ناپسندیدہ عمل ہے۔"

"نہیں نہیں ...... افضل کا یہ فیصلہ لمحوں کا نہیں...... جانے کب سے اسے میرے خلاف نفرت کا زہر دیا جا رہا تھا۔"

"شمع پلیز تم ریلکس ہو کر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچ کر کڑی سے کڑی ملاؤ اور مجھے ساری باتیں سچ سچ بتاؤ۔ شاید میں اور شفیق دونوں مل کر تمہاری کچھ مدد کر سکیں اور تمہارا گھر ٹوٹنے سے بچ جائے۔ قرآن اور ہمارے مذہب نے ہر چیز بڑی واضح بیان کی ہے۔ قرآن پاک میں سورۂ طلاق میں طلاق کے بعد دوبارہ رجوع کرنے کی بڑی واضح دلیلیں ہیں۔ شیخ میں بھی قرآن کے حوالے سے ہی کہہ رہی ہوں کہ تین ماہ کا عرصہ کچھ کم نہیں ہے۔ جانتی ہو تین ماہ کے اندر میاں بیوی سے رجوع کر سکتا ہے اور طلاق واپس لے سکتا ہے۔ پھر تمہاری تو ابھی طلاق بھی نہیں ہوئی۔ طلاق کے لیے شرط ہے کہ تین طلاقیں ہوں۔ جبکہ افضل بھائی نے صرف ایک بار کہا ہے کہ میں نے تجھے طلاق دی۔"

"طلاق دی کہنے ہی سے طلاق ہو گئی، سب یہی کہہ رہے ہیں۔"

"یہ لوگ صرف گھر توڑنا جانتے ہیں۔ شرعی حکم شاید کسی کو بھی یاد نہیں۔ شفیق بتا رہے تھے کہ مسجد میں افضل سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بہت نادم اور خاموش تھا۔ شاید اپنے کیے پہ پچھتا رہا ہے۔"

"کیا افضل کے نادم ہونے سے میری تار تار عزت واپس آ سکتی ہے۔ میری پیشانی پہ لگا بدنامی کا کلنک افضل کی خاموشی سے مٹ سکتا ہے۔ ہاجرہ جس محلے میں، میں نے شرافت کے پچیس سال گزارے تھے وہاں اپنے ہی گھر کی دہلیز پہ مجھے رسوا کرتے ہوئے افضل نے پانچ سیکنڈ بھی نہیں لگائے۔ ہاجرہ یہ سچ ہے کہ عورت ہی ہمیشہ عورت کو ڈستی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ لب سی لوں گی اور اپنا معاملہ اللہ پہ چھوڑ دوں گی روزِ قیامت وہی میرا انصاف کرے گا۔ لیکن تم بھی ٹھیک ہی کہتی ہو۔ میری خاموشی مجھے ہی مجرم ثابت کر رہی ہے۔ میں تمہیں من وعن بتا رہی ہوں۔ تم تو جانتی ہو میری بہو افشاں، افضل کی بھانجی ہے۔ میں اس رشتے کے خلاف تھی۔ مجھے افشاں اور اس کی ماں بانو کے طور طریقے پسند نہ تھے لیکن افشاں اور بانو نے افضل کو جانے کیا گھول کر پلایا کہ وہ میری بات پہ کان ہی نہ دھرتا تھا اور سونے پہ سہاگا، میرے بیٹے نوید کا بھی اپنی پھوپی کے ہاں آنا جانا تھا۔ ماں بیٹی نے مل کر اسے بھی شیشے میں اتار لیا۔ وہ بھی ہر پل افشاں کے نام کی مالا جپنے لگا۔ یوں میں اس رشتے کی مخالفت میں اکیلی رہ گئی۔

بالآخر مجھے ہار ماننا پڑی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی افشاں کو بہو بنا کر گھر لے آئی۔ شادی کے کچھ دن بعد ہی افشاں اور بانو نے نوید پہ زور دینا شروع کر دیا کہ وہ عرب ممالک میں جاب کے لیے اپلائی کرے۔ کچھ ہی دنوں میں نوید کو دبئی میں ایک اچھی جاب مل گئی اور وہ دبئی چلا گیا۔ وقت سبک رفتاری سے کٹ رہا تھا، نوید چھٹی پہ پاکستان آیا تو میں نے کہا کہ بیٹا، افشاں کو بھی ساتھ لے جاؤ۔"

"اماں وہ میرے ساتھ جانا نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟" میں نے لہجے کی سختی کو دباتے ہوئے کہا۔

"دراصل اماں اس کا خیال بھی درست ہے۔ ابھی میں کچھ کمائی کر لوں، کچھ رقم جمع ہو جائے۔ دبئی میں فیملی کو رکھنا بہت مہنگا پڑتا ہے۔ اور پھر ابھی مجھے وہاں پر کمپنی کی طرف سے رہائش بھی نہیں ملی ہے۔ میں افشاں کو ساتھ لے جا کر کہاں رکھوں گا۔" خیر نوید واپس لوٹ گیا۔

افشاں کو گھر اور گھرداری سے کچھ خاص لگاؤ نہیں تھا۔ اس کا زیادہ وقت اپنی ماں کے ہاں گزرتا۔ شاید اس لیے کہ اسے وہاں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ وہ اپنی مرضی سے سوتی جاگتی تھی۔

پابندی تو اس پہ میرے گھر میں بھی نہ تھی لیکن بہرحال سسرال پھر سسرال ہوتی ہے۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی صبح سویرے اٹھنا پڑتا۔ ناشتا بنانا پڑتا اور پھر یہ بھی کہ افضل کو ٹی وی وغیرہ بھی پسند نہیں تھا۔ اکثر افضل عشا کی نماز سے فارغ ہو کر جب گھر لوٹتے تو افشاں سے کہتے کہ بیٹی اب ٹی وی آف کر کے سو جاؤ۔ دیر سے سوؤ گی تو فجر کے لیے آنکھ نہیں کھلے گی۔ ہاجرہ، اس لمحے میں محسوس کرتی تھی کہ افشاں کے چہرے پہ ایک بیزاری ہوتی اور وہ بادلِ ناخواستہ اپنے پسندیدہ انڈین چینل کو آف کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ جاتی۔ اکثر رات کو ٹی وی کے بے ہنگم شور پہ میری اور افضل کی آنکھ کھل جاتی۔ پتا چلتا کہ افشاں ٹی وی پہ کوئی

انڈین فلم یا گانوں کا کوئی پروگرام دیکھ رہی ہے۔ بس ہاجرہ ایسے موقعوں پر افضل خود تو جا کر اسے منع نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ نائٹ ڈریس میں ہوتی تھی۔ ایسے حالات میں مجھے ہی جا کر ٹی وی بند کروانا پڑتا۔ ایک دو بار میں نے افشاں سے ذرا سخت لہجے میں بھی کہا کہ اس شیطانی چرخے (ٹی وی) کو ہر وقت مت دیکھا کرو، گھر میں ہر وقت کے ناچ گانے سے رزق و روزی سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ بس ہاجرہ یوں اس کے ماموں تو پس پشت رہے۔ لیکن میں اس کی اور بانو کی نظروں میں کھٹکنے لگی۔ ایک دو بار میں نے بانو سے بھی افشاں کے طور طریقوں پر بات کی تو وہ میرے شکایتی لب و لہجے کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے بڑے میٹھے لہجے میں بولی۔

"بھابی ابھی بچی ہے۔ اکیلی پلی بڑھی ہے۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا تھا نہیں۔ اس لیے کچھ عادتیں اس کی پختہ ہو گئی ہیں لیکن بھابی آپ فکر نہ کریں، انشاء اللہ آہستہ آہستہ آپ کے گھر کے طور طریقے سمجھ جائے گی۔ آپ کی اپنی بچی ہے۔ آپ خود بھی اسے اچھا برا سمجھاتی رہا کریں۔ مجھے کبھی شکایت نہیں ہو گی۔"

بانو یہ سب اتنی محبت سے کہتی کہ میرے ہونٹ سل جاتے۔ مجھے تو لگتا کہ بانو کے پاس کوئی ایسی قوت ہے جو مجھے اس کے سامنے بالکل بے بس کر دیتی تھی۔ یعنی میں بانو سے دو چار منٹ بات کرنے کے بعد اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگتی تھی۔ ہاجرہ! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑ رہی تھی۔ بس یوں سمجھ لو کہ اس روز آسمان پر تیرتے سیاہ بادلوں کی سیاہی میرے مقدر سے بھی لپٹ گئی اور میرے نصیب کا چمکتا ہوا ستارہ بھی اس سیاہی میں کہیں کھو گیا۔ اس روز بانو افشاں سے ملنے آئی ہوئی تھی، موسم کی مناسبت سے میں، افشاں اور بانو چائے اور پکوڑوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ڈور بیل کی آواز پہ بانو جلدی سے اٹھ کر گیٹ پہ گئی۔ گیٹ سے واپس آ کر وہ اپنے مخصوص میٹھے لہجے میں بولی۔

بھابی شہریار صاحب آئے ہیں۔ میں انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کچھ بات کر لوں۔ میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ ان صاحب کو اندر بلاؤں یا نہیں۔ کیونکہ میں افضل کی شکی طبیعت کی وجہ سے خاصی محتاط رہتی تھی لیکن بانو نے تو مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ دیا اور خود ہی شہریار کو لے کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد بانو میرے پاس آئی اور بڑی محبت سے میرے ہاتھ تھام کر بولی۔

"شہریار بڑے نیک انسان ہیں۔ لاہور میرے لیے پردیس تھا۔ لیکن شہریار بھائی اور نجمہ بھابی نے مجھے اور افشاں کو کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ہم اپنوں سے دور ہیں۔

میں نے افشاں بیٹی کی شادی میں انہیں انوائیٹ کیا تھا لیکن یہ اپنی کچھ گھریلو مجبوریوں کی وجہ سے نہ آ سکے۔ آج یہ افشاں سے ملنے آئے ہیں تو میں چاہتی ہوں آپ بھی ان سے مل لیں۔ وہ بہت جلدی میں ہیں۔ اور بھابی شاید آپ کو ہمارے ساتھ طارق روڈ بھی چلنا پڑے۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے بھابی کہ شہریار بھائی خالی ہاتھ نہیں آئے۔ نجمہ بھابی نے آپ سمیت سب کے لیے کپڑے اور دیگر تحائف بھجوائے ہیں اور آپ کی بہو اور بیٹے یعنی افشاں اور نوید کے لیے تو بہت خوبصورت گولڈ پلیٹڈ رسٹ واچ لائے ہیں۔ دیکھیے نہ بھابی ہم اور آپ اتنا سب کچھ تو نہیں کر سکتے لیکن کم سے کم ایک ایک جوڑے اور کچھ تحائف ان کے بچوں کے لیے بھجوا سکتے ہیں ورنہ میرے سر پہ ایک بوجھ رہے گا۔ لین دین تو قرض کی طرح ہوتا ہے۔ اِدھر کسی نے دیا اُدھر اتارنے کی فکر شروع ہو جاتی ہے۔"

ابھی میں بانو کی چکنی چپڑی باتوں میں الجھی ہوئی تھی کہ افشاں نے آ کے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں اور معصومیت سے بولی۔ "مامی جان چلیے نا، میں آپ کو شہریار ماموں سے ملواؤں۔"

جانے وہ کون سا کمزور لمحہ تھا جب بدنصیبی دور کھڑی مسکرا رہی تھی اور میں سب کچھ نظرانداز کرتی دونوں ماں بیٹی کے ساتھ چلتی ہوئی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔

شہریار صاحب سے سلام دعا کے بعد میں چائے وغیرہ کے انتظام کے لیے اٹھنے لگی تو بانو نے میرا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ صوفے پر بٹھا دیا اور پھر افشاں کو تنبیہی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ جاؤ افشاں چائے وغیرہ کا انتظام کرو۔ بانو مجھے شہریار کے لائے ہوئے تحائف دکھانے لگی۔ انتہائی خوبصورت اور قیمتی تحائف دیکھنے کے بعد میں نے شہریار کا شکریہ ادا کیا تو وہ پُرخلوص لہجے میں بولے۔

"بانو میری منہ بولی بہن ہے اور اس ناتے سے افشاں میری بھانجی ہے۔ ایک بھانجی کے لیے یہ سب کچھ زیادہ تو نہیں ہے۔ بس آپ کی محبت اور خلوص ہے کہ آپ میرے لائے ہوئے تحائف کو سراہ رہی ہیں۔"

کچھ پل کی خاموشی کے بعد بانو بولی۔ ''شہریار بھائی، آپ کو میری بھابھی کیسی لگیں؟''

''بانو! شمع جی کی تعریف کرنا تو ایسا ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔''

بانو شہریار کے جواب پر مسکراتے ہوئے بولی ''تو پھر آپ اپنی ریت کے مطابق بھابی کے سر پر چنری ڈال کر انہیں بھی بہن کا درجہ دے دیں۔''

پھر وہ میری کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''شہریار بھائی! بھابی تو ویسے بھی اکلوتی ہیں۔ بھائی کے مان کو ترسی ہوئی ہیں۔'' یہ سب کہتے ہوئے بانو نے ایک خوبصورت چنری شہریار کے ہاتھ میں دی اور اس شخص نے انتہائی عقیدت سے وہ چنری میرے سر پہ ڈال دی۔ کچھ ہی دیر میں افشاں چائے اور لوازمات سے بھری ٹرالی لے آئی۔ پھر مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''واہ مامی جان آپ نے بڑی خوبصورت چنری اوڑھی ہوئی ہے۔'' تو بانو نے ہنستے ہوئے کہا تمہارے شہریار ماموں نے اوڑھائی ہے۔

افشاں ہنستے ہوئے بولی۔ ''تو لیجیے مامی جان آپ بھی اپنے ہاتھوں سے شہریار ماموں کو چائے بنا کر دیں تاکہ بہن کا کچھ تو حق ادا ہو جائے۔''

یوں ہنستے مسکراتے باتیں ہوتی رہیں۔ افشاں اور بانو نے موبائل سے تصویریں بھی لیں لیکن چونکہ میرے ذہن میں کوئی گندی سوچ نہیں تھی اس لیے میں نے ان دونوں ماں بیٹی کی حرکتوں کا... نوٹس بھی نہیں لیا۔

شومئی قسمت بانو نے مجھے طارق روڈ چلنے کے لیے کہا تو میں نے اسے منع بھی کیا کہ افضل کی اجازت کے بغیر میں کیسے جا سکتی ہوں۔ میرے جواب پہ بانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ارے بھابی چھوڑیں، آپ کوئی پندرہ برس کی لڑکی تو نہیں ہیں۔ ماشاءاللہ سے دادی بننے جا رہی ہیں۔ گھر میں اب آپ کی ایک مستحکم پوزیشن ہے اور جہاں تک افضل بھائی کا تعلق ہے ان کی واپسی رات نو بجے تک ہوگی اور ہم تو انشاءاللہ پانچ بجے تک لوٹ آئیں گے۔ لیکن اگر پھر بھی آپ کی تسلی نہیں ہو رہی تو میں خود فون کر کے افضل بھائی سے اجازت لے لیتی ہوں۔''

میرے کچھ کہنے سے قبل ہی بانو افضل کو فون ملا کر بات کرنے لگی۔ پھر مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ''بھابی افضل بھائی نے شاپنگ کی اجازت دے دی ہے۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ مغرب سے پہلے پہلے گھر واپس آجائیں کیونکہ بقول افضل بھائی مغرب کے بعد عورتوں کا گھر سے باہر رہنا کچھ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔''

''بس بہن! میں، بانو اور شہریار بھائی ٹیکسی میں سوار ہو کر طارق روڈ پہنچ گئے۔ بانو نے گفٹ خریدے۔ میں نے بھی شہریار بھائی کی بیگم کے لیے ساڑی اور ان کے لیے مردانہ سوٹ پیس لے لیا۔

مقدر کھوٹا تھا اور عقل پہ پتھر پڑ گئے تھے۔ مجھے تو اندازہ ہی نہ ہوا کہ یہ ماں بیٹی میرے ساتھ کیا چال چل رہی ہیں۔ میں تو یہی کہوں گی کہ میری مت ماری گئی تھی۔ جانے کیوں میں حکم کا غلام بنی بانو کی ہر بات مانتی چلی گئی۔

شاپنگ سے فارغ ہو کر بانو ایک کولڈ اسپاٹ پہ آئس کریم کے لیے رک گئی۔ میری آنکھیں تو تب کھلیں جب بانو نے میری اور شہریار کی مختلف تصاویر افضل کے سامنے اچھالتے ہوئے کہا! ''بھائی یہ لو دیکھو بھابی کے کرتوت۔''

ان تصاویر کو دیکھ کر تو میرا بھی دماغ گھوم گیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ تو بتاؤ ایسے میں افضل کیسے اپنے حواس ٹھکانے رکھتے۔ بتاؤ اس صورت حال میں، میں اپنی صفائی کیسے دیتی؟ کہتی بھی تو کیا کہتی۔ مجھے تو لگتا ہے بانو نے افضل کو فون بھی نہیں کیا تھا۔ اس عمر میں بدنامی کا جو داغ میری پیشانی پہ لگا ہے یہ کیسے مٹے گا، مجھے کہیں سے زہر لا دو تاکہ میں اس زندگی سے چھٹکارا پا لوں۔''

''شمع پاگل مت بنو۔ جانتی ہو، خودکشی حرام ہے اور پھر زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ تو دیوانی ہوگئی ہے کیا۔ خدا کا نظام اپنے ہاتھ میں لینے کا سوچ رہی ہے۔ رہ گئی بات طلاق کی تو وہ میں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ اللہ نے طلاق کے معاملے میں بھی خاصی گنجائش رکھی ہے۔ افضل بھائی نے ابھی صرف اتنا کہا ہے میں نے تجھے طلاق دی۔ ابھی دو طلاق باقی ہے، تم اطمینان رکھو۔ میں اور شفیق کوشش کر رہے ہیں کہ افضل بھائی کی آنکھوں پر بندھی شک کی پٹی اتار سکیں۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو لیکن اتنا سمجھ لو کہ شک انسان کی عقل کو گھن کی طرح چاٹ لیتا ہے۔ افضل کی عقل پہ تو بانو نے شک کی ایسی سل رکھی ہے کہ اسے سرکانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔''

''میں جانتی ہوں کہ افضل بھائی کی عقل پہ پتھر پڑ چکے ہیں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارا بیٹا بھی پاکستان سے جا چکا ہے اور تمہاری نند اور بہو کو آج کل کھلی چھٹی ملی

ہوئی ہے۔ دونوں ماں بیٹی اپنے کالے کرتوتوں سمیت بڑی ڈھٹائی سے تمہارے گھر میں براجمان ہیں اور سارے محلے کی نگاہیں ان پہ جمی ہیں۔ ایک بات یاد رکھنا کہ وہ دونوں افضل بھائی کی آنکھوں میں تو دھول جھونک سکتی ہیں لیکن پورے محلے کی آنکھوں میں نہیں۔ تم صبر کا دامن مت چھوڑو۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو، انشاءاللہ.... جلد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔''

''شاید وہ مجھے آواز دے رہے ہیں۔'' کہتے ہوئے میں اٹھ کر دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

میں نے شوہر کی بات سن کر کہا ''ہمیں افضل بھائی سے ملنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن تم انہیں جلدی لے آئے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ باہر کے لوگوں کی آمد و رفت مغرب کے بعد شروع ہوتی ہے۔''

''تمہاری بات صحیح ہے۔ لیکن میں نے بھی افضل کے شکی دماغ میں یہ اچھی طرح ڈال دیا ہے کہ اس نے شمع بھابی کے ساتھ جو کیا ہے وہ انتہائی غلط ہے اور ان پہ جو الزامات لگائے ہیں وہ سراسر جھوٹ پر مبنی ہیں۔ شمع بھابی کی جو تصاویر انہیں دکھائی گئی ہیں وہ آج کی جدید ٹیکنالوجی کمپیوٹر کی کرامات ہیں۔ میں نے افضل کو کہا تھا کہ وہ میرے گھر بیٹھ کر خود دیکھے کہ اس کے گھر پہ کون کس وقت آ رہا ہے اور جا رہا ہے۔ تاکہ اسے اندازہ ہو کہ ہماری بات میں کتنی سچائی ہے۔''

''مگر ابھی انہیں نہیں لانا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اس وقت افضل خود آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سامنے والے اسلم بھائی نے افضل کو مسجد میں روک کر کچھ ایسی باتیں بتائی ہیں کہ وہ بہت تپ گیا ہے۔ دراصل ماجرہ دو دن پہلے لاہور سے سراج نامی ایک شخص آیا ہے۔ کل شام اس کا بانو سے بہت جھگڑا ہوا ہے۔ وہ دھمکیاں بھی دے کر گیا ہے۔ بقول سراج، وہ بانو کا داماد ہے۔ اس کی بیٹی افشاں اس کے نکاح میں ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں، اس بدقماش عورت نے بیٹی کا نکاح پہ نکاح کیا ہے۔ سراج لاہور میں بادشاہی مسجد کے قریبی محلے کا باسی ہے۔''

ابھی میرے شوہر کی بات ادھوری تھی کہ گولیوں کی گونج سے زمین تھرا اٹھی۔ شمع بھی گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ میرے شوہر باہر جانے کے لیے مڑے لیکن میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''نہ جائیں، جانے کیا معاملہ ہے۔''

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

یہ شعر داغ دہلوی سے منسوب ہے مگر داغ کا نہیں ہے، آب حیات میں مولانا محمد حسین آزاد رقم طراز ہیں ایک دن مرزا رفیع سودا مشاعرے میں بیٹھے تھے لوگ اپنی اپنی غزلیں پڑھ رہے تھے، ایک شریف زادے نے جس کی عمر بارہ تیرہ برس تھی یہ مطلع پڑھا، گرمی کلام پر سودا چونک پڑے اور پوچھا یہ مطلع کس نے پڑھا ہے؟ لوگوں نے کہا حضور یہ صاحب زادے ہیں، سودا نے بہت تعریف کی اور کئی دفعہ یہ پڑھوایا پھر کہا ' میاں تم جوان ہوتے تو نظر نہیں آتے، خدا کی قدرت کہ چند ہی دنوں بعد وہ لڑکا جل کر مر گیا۔

کالی داس گپتا رضا اپنی کتاب سہو و سراغ: مرتبہ، صابر دت، ادارہ فن و شخصیت ممبئی، میں لکھتے ہیں: یہ قصہ محمد حسین آزاد نے شعر کو سامنے رکھ کر گھڑ لیا ہے کیونکہ یہ شعر اس لڑکے کا ہے ہی نہیں، بلکہ پنڈت مہتاب رائے تاباں دہلوی کے شعر کی قدرے ترقی یافتہ شکل ہے، اصل شعر یوں ہے:

شعلہ بھڑک اٹھا مرے اس دل کے داغ سے
آخر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

تاباں دہلوی، خواجہ میر درد کے ہم عصر تھے، دیکھیے آثار الشعرائے ہند 1886ء میں اب اور تاباں کو الگ الگ شاعر لکھا گیا ہے۔

تاباں جن سے یہ شعر منسوب ہے، لکھا ہے پنڈت مہتاب رائے تاباں جن کی عمر بارہ برس تھی، انہوں نے، خواجہ میر درد کے مشاعرے میں آکر یہ مطلع پڑھا، یہ مطلع صرف تاباں دہلوی کا ہی ہے، داغ دہلوی کا ہرگز نہیں۔

(ذرہ حیدرآبادی کے مضمون سے اقتباس)

"ارے میرا ہاتھ تو چھوڑو۔ میں افضل کو دیکھوں۔"
کہہ کر وہ ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔

افضل بھائی پھٹی پھٹی آنکھوں سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہے تھے۔ میں اور شفیق بھی ان کے قریب چلے آئے۔ شمع بھی کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔

ہمارے کمرے کی کھڑکی سے افضل بھائی کا گیٹ صاف نظر آرہا تھا جو اس وقت چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ گلی میں ہُو کا عالم تھا قبرستان کی سی خاموشی تھی۔

افضل بھائی اپنے گھر جانا چاہ رہے تھے لیکن میرے شوہر نے انہیں یہ کہہ کر روک لیا۔ "افضل ابھی باہر مت جاؤ۔ سوچ سمجھ کے قدم اٹھاؤ۔ کہیں یہ تمہیں پھانسنے کی کوئی چال نہ ہو۔"

ابھی ہم لوگ اسی تذبذب میں تھے کہ ایک بلیک کرولا افضل بھائی کے گیٹ سے چند قدم کے فاصلے پر آکر رکی۔

گاڑی چلانے والے کو باوجود کوشش کے ہم نہ دیکھ پارہے تھے۔ کیونکہ بلیک شیشوں کی وجہ سے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

چند لمحوں بعد ایک شخص ہاتھ میں پستول لہراتا افضل بھائی کے گھر سے نکلا اور بلیک کرولا میں بیٹھ گیا تو کار نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

افضل بھائی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند کے ساتھ تشویش کے سائے لہرا رہے تھے، شاید وہ معاملے کی تہ تک پہنچ گئے تھے۔

وہ دھیمے لہجے میں بولے۔ "گولیوں کی زد میں میرا ہی گھر تھا۔ شاید بانو اپنے انجام کو پہنچ گئی ہے۔" پھر انہوں نے تیزی سے کمرے کا دروازہ کھولا اور اپنے گھر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

میں شوہر کے ساتھ تھی۔ گھر کے اندر لہو رنگ مناظر تھے۔ صحن میں افشاں کی لاش پڑی ہوئی تھی اور اس سے چند قدم کے فاصلے پر بانو زخمی پڑی تھی۔

"بانو تم حوصلہ رکھو، میں تمہیں لے کر ڈاکٹر کے پاس چلتا ہوں۔"

"نہیں بھائی نہیں، میرے پاس وقت بہت کم ہے، اس وقت موت میرے وجود کو اپنے شکنجے میں جکڑ چکی ہے۔ میں تم سے صرف اتنا کہوں گی کہ شمع بھابی بالکل بے قصور ہیں میں نے اس نیک عورت پر تہمت لگا کر اس کا گھر برباد کیا ہے۔ شاید رب نے مجھے اسی کی سزا دی ہے۔ میں مرنے سے پہلے شمع بھابی سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ ان سے کہو مجھے معاف کردیں۔"

بانو کی اکھڑتی سانسوں اور زرد ہونٹوں پر صرف ایک نام تھا۔ شمع بھابی...

بانو کی آنکھوں میں رچی بے بسی دیکھ کر میرا بھی دل رو رہا تھا۔

"بھابی! بانو اس وقت زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے۔ زندگی ہار رہی ہے۔ بھابی پلیز شمع کو لے آئیں۔ تاکہ میری بہن زندگی کی آخری سانسوں میں پرسکون ہو جائے۔" افضل بھائی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں تیز قدموں سے چلتی شمع کے پاس آئی۔ "شمع بانو اس وقت تم سے معافی مانگنے کے لیے آخری سانس لے رہی ہے۔"

"جزا و سزا اور جزا کا اختیار تو رب کے پاس ہے۔"

"افضل بھائی نے تمہیں بلوایا ہے۔ شاید تمہارے لیے بھی بہتر ہے۔"

میں اور شمع کمرے میں داخل ہوئے تو بانو کی بے نور آنکھوں میں پل بھر کے لیے زندگی کی چمک لہرائی۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے کپکپا رہے تھے، لیکن شاید زبان ساتھ چھوڑ چکی تھی۔

افضل نے شمع کو قریب بلایا۔ اس نے بانو کے سرد ہاتھ کو تھاما تو... بانو نے اس کے ہاتھ کو سختی سے پکڑ لیا۔ بہت دھیمی آواز میں اس نے کہا "بھابی مجھے معاف کردینا۔"

"بانو! میرے ساتھ جو بھی ہوا وہ مقدر کا لکھا تھا۔ تمہاری کوئی خطا نہیں۔ بس میرے نصیب کی گردش تھی۔" شمع نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔

بانو کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو لرز رہے تھے۔ اچانک اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں، اس کی آنکھیں شمع کے چہرے پر جمی تھیں۔

"شمع مجھے اور بانو کو معاف کردو۔ مجھ سے بھی انجانے میں بہت بڑی خطا ہوئی۔"

افضل کی دکھ سے بوجھل آواز پہ شمع نے آنکھیں کھولیں تو بانو کی سانسیں ختم ہو چکی تھیں اور گردن ڈھلک چکی تھی۔ افضل نے آگے بڑھ کر شمع کو گلے لگا لیا اور شدت غم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس لمحے مجھے لگا جیسے قرآن پاک کی اس آیت نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا ہے۔

"لوگ چالیں چلتے ہیں لیکن اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔"

خواہشات ناآسودہ

محترم عذرا رسول
سلامِ تہنیت
شیطان اور انسان کا ازلی بیر ہے وہ ہر ہر قدم پر انسان کو ورغلانے کی کوشش کرتا ہے جیسے مجھے ورغلادیا تھا مگر میں نے رحمٰن کو یاد رکھا اور اپنے گناہوں سے توبہ کرتی رہی یہی وجہ ہے کہ آج میں پُرآسائش زندگی گزار رہی ہوں مگر ایک خلش ہے جو مجھے چین لینے نہیں دے رہی ہے، اسی بوجھ کو میں کاغذ پر اتار رہی ہوں۔

صائمہ
(کراچی)

میری آنکھ کھلی تو ابا بری طرح اماں پر چیخ رہے تھے۔ اماں آنسو بہا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ان کی زبان بھی چل رہی تھی۔ "روز روز کے مرنے سے تو اچھا ہے کہ تم ہمیں ایک ہی دفعہ قتل کردو۔"

"ایک دن یہی ہوگا زینت!" ابا نے چیخ کر کہا "اگر تیری زبان اسی طرح چلتی رہی تو میں تم تینوں کو مار کے خود کو بھی مار لوں گا۔"

"تو پھر مار کیوں نہیں دیتے؟ گھر کے خرچے کے لیے

تم سے پیسے نہیں مانگوں گی تو کیا باہر بھیک مانگوں گی؟'' اماں نے تڑخ کر کہا ''میری تو زندگی عذاب ہوگئی ہے۔ اماں باوا نے نہ جانے کیا سوچ کر میری شادی تمہارے ساتھ کی تھی؟''

''ہاں، تیرے لیے تو کوئی شہزادہ آنے والا تھا نا؟'' ابا نے طنزیہ لہجے میں کہا ''تجھے اپنے حسن پر بہت ناز تھا، سمجھتی تھی کہ میں کسی گھر کی رانی بنوں گی۔''

روز کا یہی معمول تھا۔ کبھی بات صرف تو تو، میں میں تک محدود رہتی، کبھی اس حد تک بڑھ جاتی کہ ابا بہت بری طرح چیخنے لگتے لیکن مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ابا نے کبھی اماں پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ ہم جس پس ماندہ آبادی میں رہتے تھے وہاں کی عورتیں تو آئے دن اپنے شوہروں کے ہاتھوں پٹتی تھیں لیکن صبح تک سب کچھ بھول بھال کر وہ پھر شوہر اور بچوں کی خدمت میں لگ جاتی تھیں۔

جب بات زیادہ بڑھ گئی تو میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور اماں سے کہا ''اماں! آپ ہی خاموش ہو جائیں۔''

''ہاں، تو بھی مجھے ہی چپ کرا۔ سب کا زور مجھی پر چلتا ہے۔'' اماں نے کہا۔

ابا نے جیب سے مڑا تڑا پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اماں کو دینے کی بجائے مجھے دیتے ہوئے بولے ''صائمہ بیٹی! یہ پیسے رکھ لے، ان سے دال، چاول اور گھی لے آنا۔''

''اگر یہ پیسے پہلے ہی دے دیتے تو......''

''بس خاموش ہو جا!'' ابا نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تو تو پیسے بھی ایسے مانگتی ہے جیسے قرضہ وصول کر رہی ہو۔ بس مجھے غصہ آ جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر ابا لپکتے جھپکتے گھر سے چلے گئے۔

اماں نے ایک مرتبہ پھر بڑبڑانا شروع کیا تھا کہ میں نے جلدی سے کہا ''اماں! دال چاول کے ساتھ تھوڑا سا اچار بھی لے آؤں؟''

''بیٹی! ان پانچ روپے میں کیا، کیا آ جائے گا؟ تو پہلے ضروری چیزیں لے لینا پھر جو پیسے بچیں، وہ مجھے دے دینا۔''

اب سے تیس سال پہلے پانچ روپے بھی بہت ہوتے تھے۔ دال، چاول اور گھی خریدنے کے بعد بھی کچھ پیسے بچ جاتے تھے۔

میں نے تو اماں کا دھیان بٹانے کو یہ تذکرہ کیا تھا ورنہ اچار سے مجھے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ابا راج مزدور کا کام کرتے تھے۔ کبھی تو وہ دو دو مہینے کام کرتے رہتے، کبھی پورا پورا مہینا بے کاری میں گزر جاتا۔ بہ قول ابا کے یہ تو ہوائی روزی ہے۔ ملی ملی، نہ ملی نہ ملی۔ اس لیے کہتا ہوں کہ ہاتھ روک کر خرچ کیا کرو؟

اماں بے چاری ہاتھ تو جب روکتیں جب ہاتھ کھلا ہونے کی نوبت آتی۔ اس کے باوجود وہ کچھ نہ کچھ بچا ہی لیتی تھیں جو بے کاری کے دنوں میں کام آتا تھا۔

اتنی غربت اور تنگ دستی کے باوجود ابا مجھے اور بلال کو پڑھا رہے تھے۔ میں ان دنوں تیسری جماعت میں پڑھتی تھی اور بلال پہلی میں تھا۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ابا کا تعلق ایک کھاتے پیتے خاندان سے تھا۔ انہوں نے آٹھویں تک تعلیم بھی حاصل کی تھی پھر ہمارے دادا کا انتقال ہوگیا تو بھائیوں اور بھابیوں نے ابا کو گھر سے نکال دیا۔

ابا چھوٹی عمر میں محنت مزدوری کرنے لگے۔ آٹھویں پاس لڑکے کو بھلا کہاں ملازمت ملتی۔

ابا بتاتے ہیں کہ جس راج مستری نے کبھی ان کا مکان بنایا تھا، وہ ایک دن ابا کو مل گیا۔ ابا کی حالت دیکھ کر اسے بہت افسوس ہوا۔ وہ ابا کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے ابا کو راج مستری کا کام سکھایا پھر بعد میں اپنی بیٹی سے شادی کردی۔

وہ راج مستری میرے نانا تھے۔ میں نے بہت بچپن میں انہیں دیکھا تھا، بہت محبت کرنے والے شفیق انسان تھے۔

ابا کی رگوں میں شریف اور اعلیٰ خاندان کا خون تھا اس لیے نہ تو میں نے کبھی ان کے منہ سے گالی سنی تھی، نہ کبھی انہوں نے اماں پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اب حالات پر تو کسی کا بھی بس نہیں چلتا۔ وہ بے چارے اپنی سی تو ہر ممکن کوشش کرتے تھے لیکن افلاس اور غربت تھی کہ ہمارا پیچھا ہی نہیں چھوڑتی تھی۔

مجھے اپنی بے بسی پر رونا آتا تھا۔ میں نے اماں کو ایک ایک پیسے کے لیے سسکتے اور ترستے دیکھا تھا اس لیے اب پیسا ہی میری پہلی ترجیح بن گیا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ میٹرک کرنے کے بعد میں ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھ کر کہیں ملازمت کرلوں گی اور اپنی تمام نہیں تو کم سے کم کچھ خواہشات تو پوری کر ہی لوں گی۔

ہمارے گھر میں ہر طرف غربت اور افلاس کے ڈیرے تھے، نہ کھانے کو اچھا ملتا تھا نہ پہننے کو، اس کے باوجود میں انتہائی پرکشش اور حسین تھی۔ اس کا احساس مجھے اکثر میرے

اسکول کی سہیلیاں اور محلے کے لڑکوں کی نظروں سے ہوتا تھا لیکن میرے نزدیک اس وقت اپنے حسن کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ پیسے کی طلب اور خواہش سب سے بڑھ کر تھی۔

میں ان دنوں آٹھویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ بہ قول خالہ سعیدہ کے ''صائمہ نے تو ایسا رنگ روپ نکالا ہے کہ بس دیکھو تو دیکھتے ہی رہ جاؤ۔''

خالہ سعیدہ ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں اور اماں کی بہترین سہیلی تھیں۔

وہ اکثر اماں سے کہتی تھیں ''زینت! اب تم صائمہ کی شادی میں دیر مت کرو۔ مجھے تو اس کے حسن اور خوبصورتی سے خوف آنے لگا ہے۔''

ان کا یہ جملہ سن کر مجھے بہت حیرانی ہوئی تھی۔ بھلا حسن اور خوبصورتی سے بھی کوئی خوف کھاتا ہے؟ میں نے تو کہانیوں میں بھی یہی پڑھا تھا کہ بدصورت اور خوفناک چہروں کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔ خالہ سعیدہ کو میری خوبصورتی سے خوف کیوں آتا ہے؟

ان کی اس بات کا مطلب تو بہت بعد میں میری سمجھ میں آیا۔

اس دن میرا رزلٹ نکلا تھا اور میں آٹھویں پاس ہوکر اب نویں کلاس میں آگئی تھی۔ بلال بھی ساتویں کلاس میں آگیا تھا۔

میں خوشی خوشی گھر آگئی اور ابا کا انتظار کرنے لگی۔ اماں کو تو ان خبروں سے کوئی خوشی نہیں ہوتی تھی البتہ ابا بہت خوش ہوتے تھے۔

ابا شام ڈھلے گھر لوٹ آتے تھے لیکن اس دن انہوں نے بہت دیر کردی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی تھی، میں بھاگ کر دروازے پر پہنچی کہ ابا آگئے۔

دروازے پر ایک اجنبی کو کھڑا دیکھ کر میں نے حیرت سے پوچھا ''جی فرمایئے؟''

''مستری عبدالرحمن کا گھر یہی ہے نا؟''

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔

''بیٹا! تمہارے گھر میں کوئی بڑا ہے تو اسے بھیجو۔''

''اماں ہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا اور اماں کو جا کر بتایا کہ باہر کوئی آدمی آپ کو بلا رہا ہے۔

اماں دروازے پر پہنچیں، میں بھی ان کے پیچھے پیچھے تھی۔

اس اجنبی نے اماں سے کہا ''میں ٹھیکے دار ہوں اور عبدالرحمن میرے ہی لیے کام کررہا تھا۔ وہ کام کرتے ہوئے بہت بلندی سے نیچے گر گیا ہے۔ وہ اسپتال میں ہے، تم چل کر دیکھ لو۔''

اماں کے تو ہاتھ پیر پھول گئے۔

وہ گھبرا کر خالہ سعیدہ کے گھر کی طرف جانے لگیں تو ٹھیکے دار نے کچھ نوٹ اماں کی طرف بڑھا دیے اور بولا ''ان پیسوں میں عبدالرحمن کی دیہاڑی کے علاوہ علاج کے لیے کچھ رقم بھی ہے۔''

میں بھاگ کر خالہ سعیدہ کو بلا لائی۔ ان کے ساتھ خالو ابراہیم بھی آگئے۔ وہ کسی سرکاری دفتر میں چپراسی تھے۔ انہوں نے ٹھیکے دار سے پوچھا ''عبدالرحمن کس اسپتال میں ہے؟''

''جناح اسپتال میں......؟'' ٹھیکے دار نے جواب دیا۔

''ٹھیکے دار صاحب، اصولی طور پر تو آپ کو عبدالرحمن کے علاج معالجے کا تمام خرچ اٹھانا چاہیے۔''

''ہاں تو میں نے کب انکار کیا ہے؟'' ٹھیکے دار نے جلدی سے کہا ''سارا خرچ میں ہی اٹھاؤں گا۔''

اماں اسی وقت خالہ سعیدہ اور خالو کے ساتھ اسپتال چلی گئیں۔

میں ان کے جانے کے بعد بلک بلک کر رونے لگی۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ مجھے ابا سے شدید محبت تھی۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ کل صبح میں بھی اماں کے ساتھ اسپتال جاؤں گی۔

صبح ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ایک گھنٹے بعد اماں، خالہ سعیدہ اور خالو لوٹ آئے۔ وہ لوگ اپنے ساتھ ابا کو بھی لائے تھے لیکن ابا اب کچھ کہنے سننے کے قابل نہیں رہے تھے۔ وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسے تھے۔

ذرا سی دیر میں ہمارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ میں دھاڑیں مار مار کے رونے لگی۔ اماں تو پہلے ہی پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ ہمیں روتے دیکھ کر بلال بھی رونے لگا۔

محلے کی عورتیں ہمارے گھر میں جمع ہوگئیں اور وہ مجھے اور اماں کو تسلی دینے لگیں۔

اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ اس ٹھیکے دار نے ابا کے علاج کی ہامی اتنی آسانی سے کیسے بھرلی؟ وہ جانتا تھا کہ ابا اتنے شدید زخمی ہیں کہ اب نہیں بچیں گے، پھر جب زخمی رہے گا ہی نہیں تو اس کا علاج معالجہ کیسا؟

ابا کی موت کے بعد تو غربت اور افلاس کے ساتھ ساتھ فاقے بھی ہمارے اس تنگ وتاریک گھر میں

اتر آئے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ابا ہمارے لیے کتنا بڑا سہارا تھے۔ ان کی موجودگی میں ہم نے کبھی فاقے نہیں کیے تھے۔ روکھی سوکھی ہی سہی، وہ کم سے کم پیٹ بھر کے کھلا تو دیتے تھے۔

اب اماں بے چاری ہی کو کچھ کرنا تھا۔

ہماری اس کچی آبادی سے کچھ فاصلے پر بڑے بڑے بنگلے تھے۔ اماں کام کی تلاش میں ان ہی بنگلوں کی طرف نکل گئیں۔

انہیں بنگلوں میں جھاڑو پونچھا اور کپڑے وغیرہ دھونے کا کام مل گیا۔

اماں نے مجھے اسکول سے اٹھالیا۔ وہ تو بلال کو بھی اٹھانا چاہتی تھیں لیکن میں نے ہی اس کی مخالفت کی۔ یوں بلال اسکول میں پڑھتا رہا۔

گھر کی دال روٹی پھر کسی نہ کسی طرح چلنے لگی بلکہ اب تو ہم کچھ اچھی غذا کھانے لگے۔ اماں بنگلوں میں کام کر کے لوٹنے لگی تھیں تو کسی نہ کسی بنگلے سے انہیں روٹی سالن، کبھی بریانی اور کبھی کبھی مرغی بھی مل جاتی تھی۔ وہ یہ بچا کھچا کھانا گھر لے آتی تھیں۔

اماں کے جانے کے بعد میں دن بھر گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ میں نے اماں سے کہا ”اماں! اس سے تو اچھا ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ کام کروں۔ اس سے آمدنی بڑھے گی تو میں بھی پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے تعلیم حاصل کرلوں گی۔“

اماں پہلے تو ہچکچائیں پھر مجھے اپنے ساتھ لے جانے پر راضی ہوگئیں۔

کام پر جاتے ہوئے راستے میں انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”صائمہ! تو کئی گھروں میں کام کرنے کی بجائے صرف ایک ہی گھر میں کام کرنا۔ وہ گھرانا بہت اچھا ہے جہاں میں تجھے لے کر جارہی ہوں۔ ایک بڑی بی ہیں اور ان کے دو بیٹے ہیں۔ بڑی بی کے شوہر کا دو سال پہلے انتقال ہوچکا ہے اور کاروبار اب بڑا بیٹا سنبھالتا ہے۔“

مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ کاروبار کون سنبھالتا ہے، مجھے تو اس بات کی خوشی تھی کہ اب میں بھی چار پیسے کمانے لگوں گی۔

بڑی بی کا گھر کیا تھا محل تھا۔ بڑے بڑے کشادہ کمرے، ان میں بچھے ہوئے دبیز اور خوبصورت قالین کہ پاؤں رکھو تو اندر دھنس جائیں۔ بہت بڑا لان، ہر کمرے میں ائرکنڈیشنر۔ غرض دنیا کی ہر نعمت ان کے پاس تھی۔

بڑی بی انتہائی نرم دل اور شفیق تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی تھی کہ کوئی اتنی امیر کبیر عورت اتنی نیک بھی ہوسکتی ہے؟

انہوں نے اماں سے کہا ”جوان اور اتنی خوبصورت بیٹی کو لے کر یوں گھر گھر مت گھوموزینت! آج کل ماحول بہت خراب ہے۔ ویسے تو تمہیں اسے گھر سے لے کر نکلنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں اسے پچاس روپے مہینا، کھانا اور کپڑے دوں گی۔“

اماں کی تو باچھیں کھل گئیں۔ انہوں نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا ”آپ کی بہت مہربانی بیگم صاحبہ! آپ نے مجھ غریب پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔“

یوں میں اس گھر میں کام کرنے لگی۔ وہاں کام زیادہ نہیں تھا۔ گھر میں کل تین ہی تو افراد تھے۔ مجھے صرف جھاڑو پونچھ کرنا پڑتی تھی۔ کھانا پکانے کے لیے الگ سے ایک خانساماں تھا۔ وہ ابا کی عمر کا ہوگا۔ وہ بھی میرا بہت خیال رکھتا تھا۔

میں صبح سویرے کام پر آجاتی۔ بیگم صاحبہ کے گھر ناشتا کرتی، پھر جھاڑو پونچھ میں مصروف ہوجاتی۔ صبح سے لے کر شام تک تو بڑی بی بالکل اکیلی ہوتی تھیں۔ ان کا بڑا بیٹا عامر تو ساڑھے نو بجے تک دفتر چلا جاتا تھا، چھوٹا بیٹا یاسر انجینئرنگ کالج میں پڑھ رہا تھا۔ وہ عامر سے بھی پہلے نکل جاتا تھا۔

دونوں لڑکے انتہائی نیک اور شریف تھے۔ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ میری طرف تو ان دونوں نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

مجھے کبھی کبھی اپنی توہین کا احساس ہوتا تھا کہ وہ دونوں کیسے مرد ہیں؟ گلی محلے میں تو لڑکے اور اچھے خاصے مرد بھی مجھے یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے تھے جیسے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائیں گے۔

لوگوں کے اس رویے سے مجھے بھی اپنے حُسن پر کچھ زیادہ ہی ناز ہوگیا تھا لیکن یہ عامر اور یاسر نہ جانے کس مٹی کے بنے ہوئے تھے کہ ان پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا تھا۔

بیگم صاحبہ کے گھر میں رہنے اور اچھا کھانے سے میرے حسن میں مزید نکھار پیدا ہوگیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے مجھے کئی اچھے اچھے جوڑے بھی بنوا دیے تھے۔

زندگی خاصی پُرسکون ہوگئی تھی۔ بلال اب بہت دل لگا کر پڑھ رہا تھا۔ گھر میں اب پہلے جیسی غربت اور تنگ دستی نہیں تھی۔ ہر طرح سے سکون تھا لیکن مجھے ابھی

تک سکون نہیں ملا تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ پیسا حاصل کرنا چاہتی تھی۔

میں نے ایک دن بیگم صاحبہ سے کہا ”بیگم صاحبہ! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اپنی کتابیں بھی یہاں لے آیا کروں؟“

انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولیں ”تم پڑھتی ہو؟“

”جی ہاں، میں نے آٹھویں کلاس پاس کی ہے۔ اب سوچ رہی ہوں کہ پرائیویٹ طور پر میٹرک کرلوں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ بیگم صاحبہ خوش ہوکر بولیں ”تم اپنی کتابیں شوق سے یہاں لاؤ بلکہ اگر کوئی کتاب نہ ہو تو مجھے بتانا، میں منگوا دوں گی۔“

میں نے آٹھویں کلاس کا رزلٹ آنے سے پہلے ہی اپنے اسکول کی ایک لڑکی سے پرانا کورس خرید لیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اب مجھے اسکول آنا نصیب نہیں ہوگا۔

اس میں ایک دو کتابیں کم تھیں۔ میں نے بیگم صاحبہ سے کہا تو وہ بولیں ”تم ایسا کرو علی شیر کے ساتھ چلی جاؤ اور تمہیں جو کچھ خریدنا ہے، خرید لو۔“ انہوں نے مجھے سو روپے کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

”لیکن یہ پیسے......“

”تمہاری تنخواہ میں سے نہیں کاٹوں گی۔ یہ تمہارا انعام ہے۔“ وہ مسکرا کر بولیں۔

علی شیر اُن کا ڈرائیور تھا۔ وہ نوشہرہ کا رہنے والا تھا۔ لمبا تڑنگا، سرخ سفید اور انتہائی وجیہہ جوان تھا۔ میں نے اکثر اسے گاڑی کے پاس دیکھا تھا۔ عامر نے اسے بیگم صاحبہ کے لیے رکھا تھا کہ اگر انہیں کہیں جانے کی ضرورت ہو تو کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔

میں نے علی شیر کو نزدیک سے دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس نے بھی مجھے گہری نظروں سے دیکھا پھر میرے لیے گاڑی کا عقبی دروازہ کھول دیا۔

”کہاں جائیں گی آپ؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے کچھ کتابیں اور کاپیاں لینا ہیں۔“ میں نے کہا۔

علی شیر نے گردن ہلائی اور گاڑی کا انجن اسٹارٹ کردیا۔

راستے بھر وہ مجھے عقبی آئینے میں دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا سحر تھا کہ میں ان میں ڈوبتی جارہی تھی۔ اس کی گردن پر بکھرے ہوئے بھورے بھورے بال انتہائی خوبصورت لگ رہے تھے۔

مارکیٹ پہنچ کر میں نے کتابیں اور کاپیاں خریدیں، ایک پین اور روشنائی بھی خریدی اور واپس گاڑی میں آبیٹھی۔

”گرمی بہت ہے۔“ علی شیر نے کہا ”کچھ پئیں گی آپ؟ شربت یا ٹھنڈی بوتل؟“

”ہاں پیاس تو مجھے بھی لگ رہی ہے لیکن......“

”چلیے، میں آپ کو ٹھنڈی بوتل پلاتا ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا اور گاڑی کولڈ ڈرنک کی ایک دکان کے سامنے روک دی۔ وہاں سے وہ بھاگ کر دو ٹھنڈی بوتلیں لے آیا۔ مجھے بوتل دیتے ہوئے اس نے میری آنکھوں میں جھانکا تو میں بالکل ہی پگھل گئی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ وہ آپ سے تم پر آگیا۔

”میرا نام صائمہ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”صائمہ......! بہت خوبصورت نام ہے، بالکل تمہاری طرح۔“

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کسی مرد نے پہلی دفعہ میرے حُسن کی تعریف کی تھی۔

میں نے جلدی جلدی بوتل ختم کی اور اس سے کہا ”اب واپس چلو، بیگم صاحبہ پریشان ہورہی ہوں گی۔ ہمیں کچھ زیادہ ہی دیر ہوگئی ہے۔“

میں واپس پہنچی تو بیگم صاحبہ واقعی پریشان تھیں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے سکون کا سانس لیا اور بولیں ”میری بھی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں کہ میں نے ڈرائیور کے ساتھ تمہیں اکیلا بھیج دیا۔ علی شیر قابلِ اعتبار لڑکا ہے لیکن برا وقت کہہ کر نہیں آتا بیٹی!“

”علی شیر تو بہت شریف آدمی ہے بیگم صاحبہ!“ میں نے کہا۔

”ہاں، میں نے تمہارے لیے لاؤنج کی ایک الماری خالی کردی ہے۔ تم اپنی کتابیں اور دوسرا سامان اس الماری میں رکھ لو۔“

اب میں کام کے بعد پڑھنے بھی لگی لیکن جب سے علی شیر سے ملاقات ہوئی تھی، میری راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ علی شیر کا کوارٹر وہیں تھا اور وہ زیادہ وقت اپنے کوارٹر ہی میں رہتا تھا۔ بس صبح یاسر کو کالج چھوڑ کر آتا، پھر چھٹی کے وقت اسے لینے چلا جاتا، یا پھر بیگم صاحبہ کو باہر کا کوئی کام ہوتا تو وہ خانساماں کو اس کے ساتھ بھیج دیتی تھیں۔

میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ علی شیر سے ملاقات کروں لیکن میری ہمت نہ پڑی۔

ایک دن میں کام پر آئی تو پیچھے سے کسی نے مجھے آواز دی "صائمہ!"

میں نے چونک کر دیکھا، وہ علی شیر تھا اور بہ ظاہر گاڑی کی صفائی میں مصروف تھا۔

میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہاں اس کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا، میں آہستگی سے اس کے پاس پہنچ گئی۔

"کیا بات ہے؟"

"تم تو پھر اس دن کے بعد ملیں ہی نہیں۔" اس نے کہا۔

"میں کیسے مل سکتی ہوں علی شیر!" میں نے کہا "مجھے بیگم صاحبہ سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"اچھا آج جب تم چھٹی کے بعد گھر جاؤ گی تو میں تمہیں بنگلے کے باہر ملوں گا۔" یہ کہہ کر وہ پھر گاڑی چمکانے میں مصروف ہو گیا۔ میں تیزی سے اندر چلی گئی۔

میں بار بار خود سے یہی سوال کرتی رہی کہ آخر اب علی شیر مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟ مجھے اس سے نہیں ملنا چاہیے لیکن پھر میں نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ ایک دفعہ ملنے میں کیا حرج ہے؟

میں چھٹی کے بعد باہر نکلی تو علی شیر بنگلے سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور بولا۔ "صائمہ، میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے، مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو علی شیر!" میں نے کہا "اگر بیگم صاحبہ کو معلوم ہو گیا تو......"

"تو کیا، وہ زیادہ سے زیادہ مجھے ملازمت سے نکال دیں گی نا؟" علی شیر نے کہا "تو نکال دیں۔"

"وہ مجھے بھی گھر سے نکال دیں گی علی شیر!" میں نے کہا "میں بہت غریب لڑکی ہوں اور......"

"صائمہ! بیگم صاحبہ کو کبھی معلوم نہیں ہو گا۔" علی شیر نے کہا "اور کبھی معلوم ہو بھی گیا تو میں سارا الزام اپنے سر لے لوں گا۔"

اس دوران میں ہم گھر تک پہنچ گئے تھے۔ میں نے علی شیر سے کہا "میرا گھر آ گیا ہے۔"

"تم کل مجھے ملو گی صائمہ؟" علی شیر نے پوچھا۔

"کل کی کل دیکھی جائے گی۔" میں نے شوخ لہجے میں کہا اور تیزی سے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

پھر تو میں روز ہی علی شیر سے ملنے لگی۔ روزانہ کی یہ ملاقاتیں رنگ لائیں اور ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔

پھر ہم نے ملاقات کا ایک اور ذریعہ تلاش کر لیا۔ میں چھٹی کے بعد بنگلے سے نکلتی اور گھر جانے کی بجائے بنگلے کے عقبی گیٹ پر پہنچ جاتی۔ وہ دروازہ ہمیشہ بند ہی رہتا تھا۔ علی شیر اندر سے دروازہ کھول دیتا اور میں خاموشی سے اس کے کوارٹر میں چلی جاتی۔ پھر ہم ڈھیروں باتیں کرتے۔

علی شیر اپنے گاؤں کی باتیں سناتا، ان پہاڑوں کی کہانیاں سناتا جن میں بھاگتے دوڑتے اس کا بچپن گزرا تھا۔

میں اب پور پور اس کی محبت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

میں نے وہاں رہتے ہوئے نویں کا پرائیویٹ امتحان دیا اور اچھے نمبروں سے پاس ہو گئی۔

اس موقعے پر پہلی دفعہ عامر نے مجھے بلایا۔ لاؤنج میں اس وقت بیگم صاحبہ اور یاسر بھی موجود تھے۔

عامر نے مجھے پانچ سو روپے دیتے ہوئے کہا "صائمہ! یہ تمہاری محنت کا انعام ہے۔ اگر تم نے میٹرک بھی اچھے نمبروں سے پاس کر لیا تو میں تمہیں اپنے دفتر میں جاب دے دوں گا۔"

"بیٹا! یہ جوڑے اور کچھ چیزیں میری طرف سے۔" بیگم صاحبہ نے کہا "ہاں، آج سے تمہاری تنخواہ بھی سو روپے ہو گئی ہے۔"

مارے خوشی کے میں رونے لگی۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی یک مشت پانچ سو روپے نہیں دیکھے تھے۔

"رو کیوں رہی ہو بیٹی!" بیگم صاحبہ نے محبت بھرے انداز میں پوچھا۔

"بیگم صاحبہ! مجھے اپنے ابا یاد آ گئے تھے۔ وہ ہوتے تو کتنے خوش ہوتے؟"

"تمہارا باپ واقعی بہت اچھا آدمی تھا صائمہ!" بیگم صاحبہ نے کہا "ورنہ اتنی غربت اور تنگ دستی میں کون اپنی اولاد کو پڑھاتا ہے۔"

اس دن میں مارے خوشی کے علی شیر سے بھی نہیں ملی اور سیدھی گھر پہنچی۔

بیگم صاحبہ کے دیے ہوئے تحائف دیکھ کر اماں بھی خوشی سے نہال ہو گئیں۔ ان تحائف میں دو تین قیمتی جوڑے بھی تھے، بہت خوبصورت سینڈل تھے، ایک چین تھا، سونے کا چھوٹا سا ایک لاکٹ تھا اور ایک لفافے میں پانچ سو روپے تھے۔ مٹھائی کا ایک ڈبا بھی تھا۔

میں نے جلدی سے مٹھائی کا ڈبا کھولا اور مٹھائی کا ایک

ٹکڑا نکال کر اماں کے منہ میں رکھ دیا۔

اماں کو میرے کپڑوں اور جوتوں سے زیادہ اس نقد رقم کی خوشی تھی جو لفافے میں سے نکلی تھی۔

پانچ سو روپے بھی اس وقت بہت بڑی رقم تھی۔ مجھے جو پانچ سو روپے عامر نے دیے تھے، میں نے ان کا تذکرہ اماں سے نہیں کیا تھا۔

رات کو وہ روپے میں نے خاموشی سے بلال کو دے دیے اور کہا "تم اپنے لیے اچھے سے دو چار جوڑے اور جوتے وغیرہ خرید لو۔ اماں کو مت بتانا۔"

زندگی ایک دم ہی خوبصورت ہوگئی تھی۔ گھر میں ڈھنگ کی چیزیں آگئی تھیں۔ روپے پیسے کی بھی اب کوئی تنگی نہیں تھی۔ میں اور بلال دونوں پڑھ بھی رہے تھے۔

☆☆☆

مجھے بیگم صاحبہ کے بنگلے پر کام کرتے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ بیگم صاحبہ اب مجھ پر بہت اعتبار کرنے لگی تھیں۔ میں اب ایک طرح سے ان کی معتمدِ خاص تھی۔

ایک دن انہوں نے مجھ سے سیف کھولنے کو کہا۔ میں نے سیف کھولا تو میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ اس میں زیورات کے کئی سیٹ، چوڑیاں، کڑے اور لاکٹ وغیرہ تھے۔ اس کے علاوہ زیورات کے بہت سے ڈبے بھی تھے۔

ان ہی ڈبوں میں سے بیگم صاحبہ نے زیور کا ایک ڈبا نکالا۔ اس میں بھی خاصا بھاری سیٹ تھا۔ وہ ڈبہ نکال کر انہوں نے سب بند کرادیا اور اس کی چابی اپنے کمر بند میں باندھ دی۔ وہ زیورات کا یہ سیٹ خانساماں کو دینا چاہتی تھیں کیونکہ اس کی بیٹی کی شادی ہو رہی تھی۔

میں نے اس کا تذکرہ علی شیر سے کیا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے کہا "صائمہ! اگر تم ہمت کرو تو وہ ساری دولت اور زیورات ہمارے ہوسکتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"بھئی مطلب صاف ہے۔" اس نے کہا "بڑی بی اتنا زیور اور سونا اپنے ساتھ قبر میں تو نہیں لے جائیں گی۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے دونوں بیٹے اسے بیچ ڈالیں گے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ...؟"

"ہاں صائمہ!" علی شیر نے میری بات کاٹ دی "میرا یہی مطلب ہے۔ زیور لے کر ہم دونوں یہاں سے بہت دور چلے جائیں گے اور شادی کرلیں گے۔"

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اچھی طرح سوچ لو صائمہ! قسمت میں ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔"

میں اس وقت تو خاموشی سے گھر چلی آئی لیکن میری آنکھوں میں ابھی تک تجوری ہی کا منظر تھا۔ اس وقت بھی ان زیورات کی قیمت لاکھوں میں ہوگی۔ اس دولت سے میرے تمام خوابوں کو تعبیر مل سکتی تھی، میری بہت سی خواہشات پوری ہوسکتی تھیں۔ میں جتنا اس پر غور کرتی گئی، میرا ارادہ اتنا ہی پختہ ہوتا گیا۔

انسان کے پاس کئی لاکھ روپے ہوں تو وہ ان سے جو چاہے خرید سکتا ہے۔ میں نے سوچا کہ ہم وہ زیور لے کر ملک بھی چھوڑ دیں گے اور امریکا جا کر وہاں زندگی نئے سرے سے شروع کریں گے۔ ان دنوں امریکا جانا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا آج ہے۔ وہاں کا ویزا بہت آسانی سے مل جاتا تھا۔

اس کے دوسرے ہی دن ایک واقعہ اور ہوا۔ عامر دفتر سے واپسی پر آیا تو اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ اس نے وہ بریف کیس بیگم صاحبہ کے حوالے کر دیا اور بولا "امی! مجھے ایک پارٹی کو پے منٹ کرنا تھی لیکن ان کا آدمی پرسوں آئے گا۔ میں نے بینک سے رقم نکال لی تھی اس لیے اسے گھر لے آیا۔ اسے آپ احتیاط سے سیف میں رکھوا دیں۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

بیگم صاحبہ نے مجھے آواز دی اور بولیں "صائمہ! یہ بیگ ذرا سیف میں رکھ دو۔" انہوں نے اپنے کمر بند سے چابیوں کا گچھا کھول کر میرے حوالے کر دیا۔

میں نے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پایا اور سیف کھول کر بریف کیس اس کے نچلے خانے میں رکھ دیا۔ پھر سیف بند کر کے اس کی چابی بیگم صاحبہ کو لوٹا دی۔

میں گھر جانے سے پہلے علی شیر سے ملی تو نقد رقم کا سن کر تو وہ پاگل ہی ہوگیا۔

"صائمہ! اب تو تمہیں ہمت کرنا ہی ہوگی۔ دیکھو، تقدیر بھی زندگی میں صرف ایک موقع دیتی ہے۔ اگر یہ موقع گنوا دیا جائے تو پھر زندگی بھر کچھ ہاتھ نہیں آتا۔"

"لیکن علی شیر......"

"ذرا سوچو صائمہ! ہمارے پاس بھی اتنی ہی دولت ہوگی جتنی بیگم صاحبہ کے پاس ہے۔ ہمارے پاس بھی بہترین گاڑی اور بنگلہ ہوگا، ہمارے بچے بھی شہر کے بہترین اسکولوں میں پڑھیں گے۔ بیگم صاحبہ کو زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ ان کا نقصان سال بھر میں پورا ہو جائے گا۔"

"میری ایک شرط ہے علی شیر!" میں نے کہا۔ "ہم پھر

اس ملک میں نہیں رہیں گے۔ پکڑے جانے کی صورت میں بیگم صاحبہ سے نظریں نہیں ملا سکوں گی میں۔"

"ارے یہی تو میں بھی چاہتا ہوں جان!" علی شیر پُرجوش لہجے میں بولا "ہم اس وقت تک کہیں چھپے رہیں گے جب تک ہمارے پاسپورٹ وغیرہ کا بندوبست نہیں ہو جاتا۔ لانڈھی مل ایریا کے علاقے میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ ہم کچھ دن اس کے گھر میں رہیں گے پھر ملک سے فرار ہو جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے، کل صبح عامر اور یاسر کے جانے کے بعد میں کسی نہ کسی بہانے سے بیگم صاحبہ سے تجوری کی چابیاں لے لوں گی۔ تم سامنے ہی موجود رہنا۔ میں تمہیں اشارہ کر دوں گی، تم فوراً اندر آجانا۔"

علی شیر کے ساتھ پورا منصوبہ طے کرنے کے بعد میں گھر آگئی۔

رات بھر بے چینی کے باعث مجھے نیند نہیں آئی۔ میرا ضمیر بار بار مجھے ملامت کر رہا تھا کہ جس گھر سے مجھے اتنی محبت ملی ہے، میں اس گھر کو اجاڑنے جا رہی ہوں۔ بیگم صاحبہ مجھے بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھتی ہیں۔ میں ان کے اعتماد کا خون کرنے جا رہی ہوں لیکن دولت کی ہوس اور علی شیر کی محبت، ان سب خیالات پر غالب آگئی اور میں نے علی شیر کے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

میں ان دنوں میٹرک کا امتحان دے چکی تھی اور رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی۔

میں بنگلے پر پہنچی تو ناشتا کرنے کے بعد کام میں مصروف ہوگئی۔

بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا "صائمہ بیٹا! رات کو عامر کہہ رہا تھا کہ صائمہ میٹرک کرلے تو میں اسے اپنی فرم میں ملازمت دے دوں۔ مجھے امید ہے کہ تم وہاں بھی اسی محنت اور دیانت داری سے کام کرو گی۔"

"میں پوری کوشش کروں گی۔" میں نے کہا اور برآمدے میں نکل آئی۔

مجھے گاڑی کے پاس علی شیر نظر آیا۔ وہ اشارے سے پوچھ رہا تھا کہ کیا ہوا؟ میں نے اسے صبر کرنے کا اشارہ کیا اور اندر آگئی۔

میں سوچ رہی تھی کہ چابی مانگنے کے لیے بیگم صاحبہ سے کیا بہانہ بناؤں؟

اچانک علی شیر اندر داخل ہوا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت نہ جانے کیا تھا کہ میں خوف زدہ ہوگئی۔

"کیا بات ہے علی شیر؟" بیگم صاحبہ نے پوچھا "کیا چھٹی چاہیے؟"

"جی بیگم صاحبہ!" علی شیر نے کہا "مجھے چھٹی بھی چاہیے اور تجوری کی چابیاں بھی۔"

"کیا مطلب ...؟" بیگم صاحبہ نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"زر زر مت کر بڑھیا!" علی شیر نے کہا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا۔

اس کے ہاتھوں میں چاقو دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔

"سیدھی طرح چابیاں نکال بڑھیا!" علی شیر نے غرا کر کہا "ورنہ ابھی تجھے کاٹ کر پھینک دوں گا۔"

بیگم صاحبہ کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ وہ بری طرح کانپنے لگیں اور بولیں "دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گی۔"

"چابیاں نکالتی ہے یا نہیں؟" علی شیر نے چاقو ان کی گردن پر رکھ دیا۔

"صائمہ!" وہ شکستہ لہجے میں بولیں "پولیس کو فون کرو۔"

"چابیاں دے دیں بیگم صاحبہ!" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "ورنہ علی شیر آپ کی جان لے لے گا۔"

"صائمہ! تم چابیاں نکالو۔" علی شیر نے کہا۔

بیگم صاحبہ نے ہمت کر کے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن علی شیر نے انہیں دھکا دے کر دوبارہ بیڈ پر گرا دیا۔ وہ دھان پان سی خاتون تھیں۔ اس کے دھکے سے وہ اس بری طرح گریں کہ ان کا سر بیڈ کی پشت سے ٹکرایا اور وہ ایک طرف لڑھک گئیں۔

میں نے جلدی سے چابیاں نکالیں اور سیف کھول لیا۔ زیور بھرنے کے لیے علی شیر نے تکیے کا غلاف اتار لیا اور اس میں جلدی جلدی زیورات بھرنے لگا۔ تکیے کا غلاف لبالب بھر گیا لیکن زیورات اب بھی موجود تھے۔ علی شیر نے دوسرے تکیے کا غلاف بھی اتار لیا اور اس میں زیور بھرنے لگا۔

اسی وقت بڑی بی کو پھر ہوش آگیا۔ وہ بری طرح کراہنے لگیں۔ علی شیر نے چونک کر انہیں دیکھا، پھر جھنجلا کر چاقو ان کے سینے میں اتار دیا۔ انہوں نے ایک ہچکی لی اور ان کی گردن ڈھلک گئی۔

"یہ تم نے کیا، کیا؟" میں نے سہم کر پوچھا "تم نے ... تم نے ..."

"جلدی کرو صائمہ!" علی شیر چیخا "ہمارے پاس

وقت نہیں ہے۔ اس نے جلدی جلدی دوسرا تکیہ غلاف بھی بھرا۔ سیف میں اس بریف کیس کے علاوہ بھی اچھی خاصی نقدی تھی۔

سب کچھ سمیٹنے کے بعد علی شیر وہاں سے نکلا اور ہم لوگ تیزی سے بنگلے سے باہر آ گئے۔

ہم لوگ تیز تیز قدموں سے تھوڑی دیر پیدل چلتے رہے، پھر ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ علی شیر اس میں سوار ہو گیا اور ٹیکسی والے سے صدر چلنے کو کہا۔

صدر پہنچ کر اس نے بوہری بازار سے بڑا سا ایک سوٹ کیس خریدا اور دونوں تکیے کے غلاف اور بریف کیس اس سوٹ کیس میں رکھ دیے۔ پھر اس نے دوسری ٹیکسی پکڑی اور ہم لوگ وہاں سے لانڈھی کے صنعتی علاقے میں آ گئے۔

صنعتی علاقے کی ایک کچی آبادی میں علی شیر کا دوست رہتا تھا۔ ٹیکسی ہم نے روڈ ہی پر چھوڑ دی اور پیدل روانہ ہو گئے۔ یوں بھی ان پتلی پتلی گلیوں میں ٹیکسی داخل..... نہیں سکتی تھی۔

علی شیر کا دوست گل زمان گھر ہی میں موجود تھا۔ شاید علی شیر نے اسے پہلے ہی اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی اس لیے وہ اس وقت گھر میں موجود تھا۔

علی شیر نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے گھر والے بھی راضی نہیں تھے اور میرے مالکان بھی اس لیے میں اسے اپنے ساتھ بھگا کر لے آیا ہوں اور کچھ دن کہیں چھپنا چاہتا ہوں۔

گل زمان کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

سیف سے نکلنے والی نقدی میں سے علی شیر نے چھ سات ہزار روپے اپنی جیب میں رکھ لیے تھے۔ اس نے گل زمان کو پانچ سو روپے دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے لیے بہترین کھانا لے آؤ۔

گل زمان نوٹ لے کر چلا گیا۔ علی شیر نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور پلنگ پر تکیے کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔

گل زمان کے اس مکان میں صرف ایک ہی کمرا تھا۔ اس نے کہا کہ تم لوگ آرام سے یہاں رہو۔ میں اپنے ایک دوست کے گھر جا کر سو جاتا ہوں۔

رات کے کھانے کے بعد گل زمان چلا گیا۔ علی شیر نے مکان کے دروازے کو اچھی طرح بند کیا، پھر کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد زیورات نکال کر سوٹ کیس میں الٹ دیے۔ لالٹین کی زرد روشنی میں بھی وہ زیورات دمک رہے تھے۔ علی شیر ایک ایک زیور کی مالیت کا اندازہ لگا کر اسے الگ رکھتا رہا، پھر اس نے نقد رقم گنی۔ وہ پورے ایک لاکھ چالیس ہزار روپے تھے۔

میں اس رقم اور زیورات کو سانس روکے دیکھ رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔

علی شیر نے کہا "تقریباً چھ لاکھ روپے کا یہ زیور ہے اور ایک لاکھ چالیس ہزار یہ ہو گئے تقریباً سات لاکھ چالیس ہزار!"

میں نے زیورات دوبارہ احتیاط سے تکیے کے غلافوں میں بھر دیے۔ جو زیورات ڈبوں میں تھے، علی شیر نے ان کے ڈبے وہیں چھوڑ دیے تھے اور زیور نکال کر الگ رکھ لیا تھا۔

زیور رکھنے کے بعد علی شیر نے بریف کیس کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ مقفل تھا۔ علی شیر باورچی خانے سے سبزی کاٹنے کی چھری لے آیا اور بریف کیس کا تالا توڑ دیا۔ وہ بریف کیس پانچ پانچ سو کے نوٹوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

وہ نوٹ دیکھ کر میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

وہ پچیس لاکھ روپے تھے۔ علی شیر کے ساتھ ساتھ میری بھی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ اتنا روپیا آج بھی کافی وقعت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں تو لکھ پتی ہونا بہت دولت مندی کی نشانی تھی۔ بڑے بڑے افسروں اور اہل کاروں کی تنخواہیں چار ہندسوں میں ہوا کرتی تھیں۔ وہ بھی ابتدائی چار ہندسے! اتنی نہیں ہوتی تھی کہ اس میں دو چار، یا دس بیس ہزار ملانے سے وہ پانچ ہندسوں میں ہو جائے۔

اس زمانے میں میڈیا بھی اتنا برق رفتار نہیں تھا۔ آج تو کہیں کسی کا معمولی سا جھگڑا بھی ہو جاتا ہے تو خبر فوراً چینل پر آ جاتی ہے۔

ہمیں دوسرے دن کے اخبارات سے علم ہوا کہ ہمارے بعد کیا واقعات پیش آئے تھے۔ وہ اخبارات بھی گل زمان لے کر آیا تھا۔ علی شیر تو زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا اس لیے سارے اخبارات میں نے ہی دیکھے تھے۔ ان میں بڑی بڑی سرخیاں تھیں۔ "مالدار بیوہ کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ دولت نے ایک بوڑھی، نیک دل خاتون کی جان لے لی، وغیرہ وغیرہ۔

خبر کی تفصیل کچھ یوں تھی کہ ناہید بیگم اپنے دو بیٹوں عامر اور یاسر کے ساتھ اس وسیع و عریض بنگلے میں رہتی

تھیں۔ انہیں پہلے زدوکوب کیا گیا پھر چاقو مار کے ہلاک کر دیا گیا۔ مقتولہ کا سیف کھلا ہوا ملا ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ عامر خان کا ایکسپورٹ اور امپورٹ کا خاصا بڑا بزنس ہے، وہ گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس، دوائیں اور مشینری امپورٹ کرتے ہیں۔ انہوں نے پولیس کو بتایا کہ ان کی والدہ کی تجوری میں تقریباً چھ لاکھ روپے مالیت کے زیورات تھے، خاصی نقدی بھی تھی لیکن اس کے بارے میں وہ حتمی طور پر نہیں بتا سکتے۔ گھر کی ملازمہ اور ڈرائیور غائب ہے۔ پولیس کو ان ہی دو افراد پر شک ہے اور ان دونوں ملازمین کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔

ایک دوسرے اخبار کی خبر تھی کہ پولیس نے مبینہ ملزمہ صائمہ کی ماں اور بھائی کو حراست میں لے لیا ہے اور ان سے تفتیش کر رہی ہے۔

یہ خبر پڑھ کر میں بے چین ہو گئی۔ میں نے علی شیر سے کہا "پولیس نے اماں اور بلال کو گرفتار کر لیا ہے...... میں...... میں...... واپس جاؤں گی۔"

"پاگل مت بنو صائمہ!" علی شیر نے کہا "پولیس ان لوگوں کو تو پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ دے گی لیکن تمہیں قتل اور ڈکیتی کے الزام میں گرفتار کرے گی اور پھانسی پر لٹکا دے گی۔"

"بیگم صاحبہ کو میں نے تو قتل نہیں کیا ہے۔" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"تم بھی اس واردات میں برابر کی شریک ہو۔ تمہارے یہ کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ تم نے بیگم صاحبہ کا قتل نہیں کیا ہے۔"

میں نے بری طرح روتے ہوئے کہا "پھر میں...... کیا کروں؟...... کیا کروں میں؟"

"ذرا حوصلے سے کام لو صائمہ!" علی شیر نے کہا "ہم نے جان خطرے میں ڈال کر یہ کام کیا ہے، تمہاری بزدلی سے سب کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں رو دھو کر خاموش ہو گئی۔

"بس، اب تو ہمیں کسی نہ کسی طرح پولیس سے بچنا ہے۔"

"تم پاسپورٹ بنوانے کی کوشش کرو علی شیر!" میں نے کہا "ہم جتنی جلدی یہاں سے نکل جائیں، اتنا ہی اچھا ہے۔"

"پاسپورٹ اتنی آسانی سے نہیں بنتا صائمہ!" علی شیر نے کہا "اگر پیسے خرچ کر کے پاسپورٹ بنوا بھی جائے تو

اس کے لیے ہم دونوں کو باہر نکلنا ہوگا اور باہر نکلنے کا مطلب ہے کہ گرفتاری اور جیل!''

''پھر...... پھر کیا سوچا ہے تم نے؟'' میں نے کہا۔

''جب تک یہ معاملہ گرم ہے، ہمیں اس وقت تک یہیں چھپنا ہوگا۔ پھر موقع ملے گا تو ہم علاقہ غیر کی طرف نکل جائیں گے۔''

''علاقہ غیر کی طرف؟'' میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

میں نے پڑھا تو تھا کہ صوبہ سرحد سے آگے کوئی علاقہ ایسا ہے جو علاقہ غیر کہلاتا ہے لیکن اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔

''ہاں، علاقہ غیر!'' علی شیر نے کہا ''بس ہم ایک دفعہ وہاں پہنچ جائیں، پھر پولیس ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔''

''کیوں، وہ علاقہ پاکستان میں نہیں ہے؟''

''پاکستان میں شامل ہے لیکن وہاں ان کا اپنا قانون چلتا ہے۔ پاکستان کی پولیس وہاں نہیں جا سکتی۔ اس وقت بھی بہت سے ایسے لوگ وہاں موجود ہیں جو قانون سے بچ کر وہاں پہنچے ہیں اور ان لوگوں کو علاقہ غیر میں پناہ مل گئی ہے۔''

''تو کیا ہم زندگی بھر اسی پہاڑی علاقے میں رہیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں بھئی، وہاں جا کر ہم پاسپورٹ بھی آسانی سے بنوا لیں گے اور ہمارا ملک سے فرار ہونا بھی آسان ہوگا۔'' علی شیر نے کہا۔

میں مطمئن ہوگئی۔ وہ سرحدی علاقے کا رہنے والا تھا اور علاقہ غیر کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

دوسرا دن بھی ہمیں وہیں گل زمان کے مکان میں چھپے ہوئے گزر گیا۔ اب علی شیر کے کہنے پر گل زمان گھر میں باہر سے تالا ڈال دیتا تھا تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ ہم بھی بات چیت کرنے اور چلنے پھرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ وہ تو اچھا تھا کہ سردیوں کا زمانہ تھا ورنہ ٹین کی چھت والے اس کمرے میں شاید میں دم گھٹ کر مر جاتی۔ ہمارا مکان بھی کچی آبادی میں تھا لیکن ہمارا علاقہ اس بستی سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ وہاں بجلی و پانی کی سہولت تھی۔ کچھ گھروں میں بجلی کے پنکھے بھی موجود تھے۔ یہ تو کچھ زیادہ ہی پسماندہ بستی تھی۔ کچی پکی تنگ و تاریک گلیاں جن میں تعفن زدہ پانی بہتا رہتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ڈربا نما مکانات تھے جہاں نہ بجلی تھی نہ پانی تھا۔

گل زمان ہماری ہر طرح سے مدد کر رہا تھا۔ وہ ہمیں کھانا پہنچاتا تھا، ہمارے لیے پانی بھر کے لاتا تھا اور اخبارات لاتا تھا۔

اس گھٹن زدہ اور متعفن ماحول میں رہتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں برسوں سے اس تنگ و تاریک کمرے میں قید ہوں۔

میں جب سے فرار ہوئی تھی، میں نے کپڑے نہیں بدلے تھے۔ کپڑے تھے ہی نہیں تو بدلتی کہاں سے؟ کپڑے بدلنا تو دور کی بات ہے، میں تو نہائی بھی نہیں تھی۔

میں نے ایک دن علی شیر سے کہا ''گل زمان سے کہہ کر میرے لیے ریڈی میڈ کپڑوں کا ایک جوڑا تو منگالو۔''

''ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ میرے کپڑے بھی بہت میلے ہو رہے ہیں۔ میں کل ہی گل زمان کو صدر بھیج کر اپنے اور تمہارے لیے کچھ جوڑے منگوا لیتا ہوں۔ ایسا کرو، تمہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہے، گل زمان کو ایک پرچے پر لکھ کر دے دو۔ وہ پڑھا لکھا نہیں ہے لیکن دکاندار تو پڑھنا جانتا ہوگا۔ گل زمان کہہ دے گا کہ میں کسی بنگلے پر ملازم ہوں، وہاں کے لیے یہ سامان لے جا رہا ہوں۔

دوسرے دن میں نے گل زمان کو سامان کی لسٹ دے دی۔ اس میں ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ، کنگھے، صابن، شیمپو، پرفیوم وغیرہ سب کچھ تھا۔ شام تک گل زمان وہ سامان لے آیا۔ اس زمانے میں ریڈی میڈ کپڑے آج کل کی طرح عام نہیں تھے لیکن صدر میں مل جاتے تھے۔ وہ کپڑے میرے جسم پر کچھ ڈھیلے تھے لیکن کام چل سکتا تھا۔ اس دن میں نے خوشامد کر کے گل زمان سے نہانے کے لیے پانی بھی منگوا لیا۔

نہا دھو کر جب میں نے صاف ستھرے کپڑے پہنے تو مجھے ایسا لگا جیسے مجھ میں نئی زندگی آ گئی ہو۔

گل زمان اخبارات بھی لایا تھا۔ بیگم صاحبہ کے قتل کی خبر ابھی تک اخباروں میں تھی۔ کراچی جیسے شہروں میں ایسی واردات بھی کبھار ہی ہوتی تھی اس لیے اخبار والے بھی ایسی خبروں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

پولیس نے علی شیر کے کوارٹر کی تلاشی لی تھی اور اسے وہاں سے کچھ سراغ ملا تھا۔

دوسرے دن کے اخبارات میں ایک اور دھماکا خیز خبر تھی۔ پولیس نے سن رائز انٹر پرائزز کے مالک اور معروف بزنس مین عامر علی کو گرفتار کر لیا تھا۔

پہلے تو میں نے اس خبر پر کوئی خاص توجہ نہیں دی پھر اچانک میری نظر عامر علی کے فوٹو پر پڑی تو میں سکتے میں رہ گئی۔ یہ بیگم صاحبہ کا بڑا بیٹا عامر تھا۔ تفصیلات کے مطابق عامر علی ایکسپورٹ، امپورٹ کی آڑ میں منشیات اور اسلحہ کی اسمگلنگ میں ملوث تھا۔ خبر کے آخر میں تھا کہ واضح رہے کہ یہ وہی عامر علی ہے جس کی والدہ کو ایک ہفتہ پہلے قتل کر دیا گیا تھا۔

میں نے وہ خبر علی شیر کو سنائی تو وہ بھی حیران رہ گیا۔

''اب میں سمجھا!'' علی شیر نے کہا ''عامر صاحب نے نوٹوں سے بھرے ہوئے اس بریف کیس کی رپورٹ کیوں نہیں لکھوائی؟ وہ پیسا ضرور غیر قانونی ہوگا۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا ''وہ سونے کی اسمگلنگ بھی کرتا تھا۔''

''وہ چور ہو یا ڈاکو!'' علی شیر نے کہا ''اس سے ہمیں کیا فرق پڑے گا۔''

''ہاں، اس سے ہمیں کیا فرق پڑنے والا تھا۔''

مزید ایک ہفتہ گزرا تو معاملہ خاصا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اب تو اخباروں میں بھی اس واردات کے بارے میں کچھ شائع نہیں ہو رہا تھا۔

میں نے ایک دن علی شیر کی خوشامد کی کہ تم گل زمان یا کسی اور آدمی کو ہمارے محلے میں بھیج کر اماں اور بلال کی خیریت تو معلوم کر ہی سکتے ہو؟

پہلے تو وہ راضی نہ ہوا لیکن جب میں رونے لگی تو اس کا دل بھی پسیج گیا، اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ میں گل زمان کو تمہارے محلے بھیجوں گا۔ وہ وہاں سے ساری معلومات کر کے لے آئے گا۔

دوسرے دن شام کو گل زمان آیا اور اس نے بتایا کہ پولیس نے اماں اور بلال سے دو دن تفتیش کرنے کے بعد انہیں چھوڑ دیا تھا۔ اماں بے چاری کو تو معلوم ہی نہیں تھا تو وہ پولیس کو کیا بتاتیں۔ پولیس نے بلال پر بہت تشدد کیا تھا لیکن وہ بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ اب اماں اور بلال گھر پر تھے۔

یہ سن کر مجھے بہت سکون ملا۔ میں تو ان کو کچھ پیسے بھی بھیجنا چاہتی تھی لیکن علی شیر نے سختی سے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ ہم بعد میں منی آرڈر کے ذریعے اماں کو پیسے بھیج دیں گے۔ ابھی انہیں پیسے بھیجنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

ایک دن علی شیر نے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے گل زمان سے...... ایک برقع منگوا لیا۔ ہمیں وہاں سے فرار ہوئے چوبیس دن ہو چکے تھے۔ اس دوران میں علی شیر کی شیو اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ پہلی نظر میں پہچانا نہیں جاتا تھا۔ اس نے سیفٹی ریزر لے کر خود ہی اپنا خط بنا لیا تھا اور اب اس کے چہرے پر باقاعدہ داڑھی نظر آ رہی تھی۔

گھیر دار شلوار قمیص اور واسکٹ کے ساتھ سر پر سرحدی علاقے والوں کی مخصوص ٹوپی اور پشاوری چپل پہن کر تو اس کا حلیہ بالکل ہی بدل گیا تھا۔

ہم دونوں رات کے وقت اس آبادی سے باہر نکل آئے۔ علی شیر نے گل زمان کو اس خدمت کے عوض پانچ ہزار روپے دیے تو وہ کھل اٹھا۔ وہ بھی ہمیں باہر تک چھوڑنے آیا تھا اور اس کے ہاتھوں میں وہ سوٹ کیس تھا جس میں ہمارے کپڑوں کے علاوہ تقریباً بتیس لاکھ روپے، زیورات اور نقد رقم کی صورت میں موجود تھے لیکن گل زمان کے فرشتوں کو بھی اس کا علم نہیں تھا ورنہ اس کی نیت خراب ہوتے کتنی دیر لگتی۔ اسے تو صرف یہ معلوم تھا کہ علی شیر مجھے بھگا کر لایا ہے اور اب پولیس کے خوف سے یہاں چھپا ہوا ہے۔ علی شیر نے گل زمان کو بتایا تھا کہ اس نے فرار ہونے سے پہلے اپنی جمع پونجی بھی نکال لی تھی، وہی پیسا اس کے کام آ رہا ہے۔

کچھ راستہ پیدل چلنے کے بعد ہمیں ٹیکسی مل گئی۔ علی شیر، گل زمان سے گلے مل کر ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ میں پہلے سے ٹیکسی میں بیٹھ چکی تھی۔

علی شیر یہاں سے ایک مرتبہ پھر صدر پہنچا اور وہاں ٹیکسی چھوڑنے کے بعد دوسری ٹیکسی پکڑی اور اس سے کینٹ اسٹیشن چلنے کو کہا۔

ٹیکسی والے نے میٹر سے دو روپے زیادہ لے کر ہمیں کینٹ اسٹیشن پہنچا دیا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ پشاور جانے والی گاڑی تو کب کی جا چکی ہے۔ اس وقت پنڈی اور لاہور کے لیے بھی کوئی ٹرین نہیں تھی۔ البتہ ایک پسنجر ٹرین حیدر آباد اور میرپور خاص جا رہی تھی۔ علی شیر نے حیدر آباد ہی کے ٹکٹ خرید لیے اور ہم پلیٹ فارم پر آ گئے۔

ٹرین آنے میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔ ان دنوں ایک اچھی بات یہ تھی کہ سب ٹرینیں وقت پر چلتی تھیں۔ کبھی آدھا، پون گھنٹے کی تاخیر ہو جاتی تھی تو مسافر پریشان ہو جاتے تھے۔

ہم پلیٹ فارم پر آ کر کسی قدر تاریکی میں ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ اس وقت اسٹیشن پر بہت کم مسافر تھے۔ گنتی کے جو چند مسافر تھے، وہ بھی شاید اسی پسنجر ٹرین کے

انتظار میں تھے۔

مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی کیونکہ ہم نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔

میں نے علی شیر سے کھانا لانے کو کہا تو وہ بولا "اسٹیشن پر تو اس وقت چائے بسکٹ اور پیسٹری وغیرہ ہی ملے گی۔ میں وہی لے آتا ہوں۔ کھانے کے لیے مجھے اسٹیشن سے باہر جانا پڑے گا۔ میں تمہیں تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ پھر تمہارے پاس یہ سوٹ کیس بھی تو ہے۔"

"پھر تم یہیں سے کچھ لے آؤ۔" میں نے کہا۔

وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر چائے کا ایک اسٹال تھا۔ علی شیر وہیں سے باسی بسکٹ، کیک پیس اور چائے وغیرہ لے آیا۔ ہر چیز بدمزہ تھی لیکن پیٹ تو بھرنا ہی تھا۔

آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر مسافروں کی تعداد بڑھ رہی تھی لیکن وہ چہل پہل نہیں تھی جو دن کے وقت ہوتی ہے۔

اچانک میں نے دیکھا کہ دو پولیس والے ہر مسافر کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے آرہے ہیں۔

پولیس والوں کو دیکھ کر میرے ہوش اُڑ گئے۔ میں نے علی شیر سے کہا "دو پولیس والے ہماری طرف آرہے ہیں۔"

"ہاں، میں بھی دیکھ رہا ہوں لیکن تم گھبراؤ مت۔ اب تک تو پولیس بھی اس واردات کو بھول چکی ہے۔"

پولیس والے آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھے اور ہمیں دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

اچانک علی شیر مجھ پر پشتو میں چیخنے چلانے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کسی بات پر شدید غصہ آ گیا ہو۔ میں اس کے جواب میں صرف ہوں، ہوں کر رہی تھی، میری سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آرہا تھا۔

"کیا بات ہے خان صاحب!" ایک پولیس والے نے پوچھا "اتنا غصہ کیوں کر رہے ہو؟"

"یہ امارا بی بی اے، ہم غصہ کرے یا پھے، تم لوگ کیوں پوچھتا اے؟" علی شیر نے سرحدی علاقے کی طرح بگڑی اردو میں کہا حالانکہ وہ بہت صاف اور اچھی اردو بولتا تھا۔

"او یارا! تم تو ہم پر ہی ناراض ہونے لگا۔" دوسرا پولیس والا ہنس کر بولا۔

"تو پھر امارے گھر کے معاملے میں دخل مت دیو۔" علی شیر نے اکھڑ مزاجی سے کہا اور ایک مرتبہ پھر مجھ سے پشتو میں مخاطب ہوگیا۔

پولیس والے ہنستے ہوئے چلے گئے۔ ان میں سے ایک بولا "او خدا یارا اے تے بالکل الٹی کھوپڑی کا بندہ ہے۔"

ان کے جانے کے بعد علی شیر ہنس کر بولا "کیسا رہا؟ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس برقع میں ایک خوبصورت لڑکی چھپی ہوئی ہے جو پشتو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتی۔"

میں بھی علی شیر کی ذہانت پر ہنسنے لگی۔

وہ مسکرا کر بولا "بس یہ ترکیب اچانک ہی مجھے سوجھ گئی۔ اگر پولیس والوں کو کسی بھی قسم کا شک ہوگا تو اب دور ہوگیا ہوگا۔"

علی شیر بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ رہا تھا۔

اس نے قریب سے گزرتے ہوئے ریلوے کے ایک ملازم سے پوچھا "بھائی صاحب! یہ ابھی تک حیدرآباد کا گاڑی کیوں نہیں آیا؟"

"گاڑی پندرہ منٹ لیٹ ہے خان صاحب!" اس نے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

ابھی ہم پوری طرح سکون کا سانس لینے بھی نہیں پائے تھے کہ وہاں مجھے اچانک پولیس کا ایک سب انسپکٹر اور دو سپاہی نظر آئے۔ وہ خاص طور پر لوگوں سے کچھ پوچھ رہے تھے۔

اس دفعہ علی شیر بھی پریشان ہوگیا۔ وہ آہستہ سے بولا۔ "صائمہ! لگتا ہے ان لوگوں کو کسی کی تلاش ہے۔"

"پھر.....؟" میں گھبرا کر بولی۔

"پریشان مت ہو۔" اس نے مجھے تسلی دی اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگالی۔

"تم سگریٹ کب سے پینے لگے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ابھی سے۔" وہ مسکرا کر بولا۔

اس وقت تک پولیس والے ہمارے نزدیک پہنچ چکے تھے۔

اتفاق سے پولیس کا سب انسپکٹر بھی سرحدی علاقے کا تھا۔ اس نے علی شیر سے پشتو میں کچھ کہا۔ علی شیر نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا "گل زمان!" شاید انسپکٹر نے اس کا نام پوچھا تھا۔

علی شیر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بخت بی بی!"

انسپکٹر نے براہ راست مجھ سے پشتو میں کچھ پوچھا، میں خاموش رہی۔

علی شیر نے پشتو میں کچھ کہا جو سب انسپکٹر تو سمجھ گیا لیکن اس کے ساتھ آنے والا حوالدار نہیں سمجھا۔

وہ مجھ سے بولا "بی بی! نام کیا ہے تمہارا؟"

"یہ بے چاری گونگی ہے۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

"صاحب جی! وہ بکنگ کلرک تو بتا رہا تھا کہ یہ دونوں میاں بیوی اس کے سامنے باتیں کر رہے تھے۔"

سب انسپکٹر نے چونک کر علی شیر کی طرف دیکھا، پھر پشتو کے بجائے اردو میں بولا "تم کہاں جارہے ہو؟"

"میں حیدرآباد جارہا ہوں۔" علی شیر نے گویا جھلا کر کہا۔

"پہلے تم نے پشاور کی ٹرین کے بارے میں معلوم کیا، پھر پنڈی اور لاہور کی ٹرینوں کے بارے میں پوچھا۔ جب تمہیں یہ معلوم ہوا کہ اس وقت صرف ایک پسنجر ٹرین حیدرآباد جائے گی تو تم نے اس کا ٹکٹ خرید لیا، کیوں؟" سب انسپکٹر کا لہجہ سخت تھا۔

"جناب عالی! کیا حیدرآباد جانا جرم ہے یا دوسری ٹرینوں کا ٹائم پوچھنا جرم ہے؟" علی شیر بہت اعتماد سے بول رہا تھا البتہ سردی کے باوجود میں پسینا پسینا ہورہی تھی۔

"تمہارے انداز سے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم فوری طور پر کراچی سے جانا چاہتے ہو، ایسی کیا ایمرجنسی ہے؟"

"مجھے جانا تو مردان ہے۔" علی شیر نے کہا لیکن حیدرآباد میں میرا ایک دوست رہتا ہے، میں نے سوچا کہ اس سے میں ملاقات کرتا جاؤں۔"

"تم مردان میں رہتے ہو؟" سب انسپکٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں، میں مردان میں رہتا ہوں۔ کراچی اپنے ایک دوست کے پاس آیا تھا۔"

"اس سے پہلے کب کراچی آئے تھے؟" انسپکٹر مسلسل جرح کر رہا تھا۔

"میں تمباکو کی تجارت کرتا ہوں اس لیے اکثر کراچی، حیدرآباد اور لاہور آتا رہتا ہوں۔" علی شیر جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا۔

"اور تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ پشاور کی گاڑی کس وقت یہاں سے جاتی ہے؟"

"معلوم ہے جناب......بس اس دفعہ کچھ دیر ہوگئی۔"

"اس سوٹ کیس میں کیا ہے؟" سب انسپکٹر نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔

"ہمارے کپڑے ہیں صاحب!" علی شیر آہستہ آہستہ اعتماد کھو رہا تھا۔

"اسے کھولو۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

یہ سن کر مجھے چکر سا آگیا۔ سوٹ کیس کھلتے ہی پولیس زیورات ہیں۔

"یہ تمہاری بیوی ہے؟" سب انسپکٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں صاحب!" علی شیر نے جواب دیا لیکن اب اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

"یہ بھی مردان کی رہنے والی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں صاحب! یہ تو کراچی کی رہنے والی ہے؟"

"اس سوٹ کیس کو کھولو۔" اس مرتبہ سب انسپکٹر کا لہجہ بہت درشت تھا۔

"لاؤ چابی دو۔" علی شیر نے شکستہ لہجے میں مجھ سے کہا۔

"چابی تو تمہارے ہی پاس ہے۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

علی شیر نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

اس نے چابی نکال کر سوٹ کیس کھولنے کی کوشش کی لیکن گھبراہٹ میں چابی نہیں لگ رہی تھی۔

سب انسپکٹر نے خود اس سے چابی لے کر سوٹ کیس کھول دیا۔ پھر اس نے اپنے ایک ماتحت سے ٹارچ مانگی کیونکہ روشنی وہاں ناکافی تھی۔ اس نے اوپر کے کپڑے ہٹا کر اندر نظر ڈالی اور چیخ کر بولا "گرفتار کرلو ان دونوں کو۔"

ایک پولیس والے نے جھپٹ کر علی شیر کو پکڑ لیا اور اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی۔ اس نے مجھ سے کہا "بی بی! اگر تم بھاگنے کی کوشش کروگی تو بھاگ نہیں سکوگی۔ ہمارے ساتھ اس وقت لیڈی پولیس نہیں ہے ورنہ تمہیں بھی ہتھکڑی لگادیتے۔ چلو اٹھو۔"

میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے میری ٹانگوں میں جان ہی نہ رہی ہو۔ میں بہ مشکل تمام اٹھ کر کھڑی ہوئی اور گرتی پڑتی ان لوگوں کے ساتھ چلنے لگی۔

سب انسپکٹر علی شیر سے کہہ رہا تھا "تم اگر بکنگ کلرک سے ساری گاڑیوں کے بارے میں نہ پوچھتے تو اسے ذرا بھی شک نہیں ہوتا لیکن تمہاری گھبراہٹ اور جلد بازی دیکھ کر اس نے ہمیں اطلاع دے دی۔ ہم نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ ایسے جوڑوں پر نظر رکھے جو تنہا ہوں یعنی ان دونوں کے سوا ان کے ساتھ کوئی نہ ہو۔"

وہ لوگ ہمیں ٹیکسی میں بٹھا کر پولیس اسٹیشن لے گئے۔ اب پکڑے ہی گئے تھے تو جھوٹ بولنا فضول تھا۔

میں نے پولیس کو اپنا بیان دیا تو شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔

میرا بیان لینے کے فوراً بعد پولیس والوں نے مجھے جیل بھیج دیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ پولیس کی حراست میں عورتوں کو نہیں رکھا جاتا۔ انہیں فوراً جیل بھیج دیا جاتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ پھر پولیس نے علی شیر کا کیا حشر کیا۔

میں نے تو جیل میں تین دن تک شدید اذیت برداشت کی، وہاں کی زنانہ پولیس بھی مردوں سے زیادہ سخت اور بدنام تھی۔

پھر ایک سال تک کیس چلتا رہا۔

مجھ سے ملنے نہ اماں آئیں، نہ بلال آیا۔ میں نے انہیں بلوایا تھا لیکن انہوں نے کہہ دیا کہ میری کوئی بیٹی نہیں ہے، صائمہ تو اسی روز مر گئی تھی جس روز بیگم صاحبہ کا قتل ہوا تھا۔

وکیل بھی مجھے سرکار کی طرف سے مہیا کیا گیا تھا۔ وہ بہت ذہین اور اچھا آدمی تھا۔ اس نے جج کو قائل کر لیا کہ اصل قصوروار علی شیر ہے، اس نے صائمہ کو ورغلایا بلکہ زبردستی اس سے یہ کام کرایا۔ اسی نے بیگم صاحبہ کو قتل بھی کیا، ان کے سینے میں جو چاقو پیوست تھا، اس پر علی شیر کی انگلیوں کے نشانات تھے۔

عدالت نے علی شیر کو عمر قید اور مجھے اعانتِ جرم میں سات سال کی قید با مشقت کی سزا سنا دی۔

اخباروں نے اس خبر کو بھی بہت اچھالا لیکن اماں پھر بھی نہ آئیں۔

میرے فرار ہونے کے بعد میٹرک کا رزلٹ بھی آ گیا تھا۔ میں میٹرک میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو گئی تھی۔

میں قیدی عورتوں میں پڑھی لکھی تھی اس لیے جیل کے عملے نے مجھے لکھنے پڑھنے کی ذمے داری سونپ دی۔ میرا طرزِ عمل بھی جیل میں بہت اچھا رہا تھا اس لیے میں سات سال کی بجائے ساڑھے پانچ سال ہی میں رہا ہو گئی۔

رہا ہونے کے بعد میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں جاؤں؟

پھر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ کسی بنگلے میں جھاڑو، برتن کی نوکری تو مل ہی جائے گی۔

میں پیدل ہی اک طرف روانہ ہو گئی۔

اچانک ایک موٹر سائیکل میرے نزدیک آ کر رکی۔

میں نے حیرت سے موٹر سائیکل سوار کو دیکھا اور پہلی ہی نظر میں اسے پہچان گئی۔۔۔۔ وہ سرکاری وکیل اعجاز احمد تھا جس نے میرا مقدمہ لڑا تھا اور مجھے کم سے کم سزا ہوئی تھی۔

میں نے جلدی سے اسے سلام کیا۔

اس نے پوچھا "مس صائمہ! کیسی ہیں آپ؟"

"مس صائمہ!" میں نے تلخ لہجے میں دہرایا "ایک سزا یافتہ عورت اتنی عزت کے قابل کب ہوتی ہے وکیل صاحب!"

"تم نے جو گناہ کیا تھا، اس کی سزا بھگت چکی ہو، اب تو تم قابلِ عزت ہو، کہاں جا رہی ہو؟"

"کسی ٹھکانے کی تلاش میں۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر مجھ پر اعتبار ہے تو میرے ساتھ چلو۔"

مجھے تو اس وقت معمولی سا سہارا بھی بہت تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہو گئی۔

اعجاز وہاں سے مجھے شاہ فیصل کالونی لے گیا۔ وہ ان دنوں وہیں رہتا تھا۔

اس نے مجھے اپنی ماں سے ملوایا۔ اس کی والدہ بھی مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔

پھر شاید اللہ نے بھی مجھے معاف کر دیا تھا۔ اس کے بعد میری زندگی میں کبھی خزاں نہیں آئی۔

میں آج مسز اعجاز ہوں، ہم اب ڈیفنس کے ایک بنگلے میں رہتے ہیں۔ میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ میں بیٹی کی شادی کر چکی ہوں اور دونوں بیٹے امریکا میں پڑھ رہے ہیں۔

اعجاز نے بعد میں اپنی محنت اور صلاحیت سے اتنی ترقی کی کہ ہائی کورٹ کے جسٹس کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

بس میرے سینے میں ایک ہی خلش ہے کہ اماں نے اس کے بعد کبھی میری شکل نہ دیکھی۔ میں نے ایک دفعہ ان سے ملنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن انہوں نے مجھے بری طرح دھتکار دیا۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ بلال بھی مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتا۔ وہ کسی سرکاری محکمے میں گریڈ سترہ کا ملازم ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے خوش رکھے اور مجھے معاف فرمائے کہ بیگم صاحبہ کا قتل ابھی تک میرے ذہن پر سوار ہے حالانکہ میں نے انہیں قتل نہیں کیا اور ایسا سوچا بھی نہیں تھا، اس کے باوجود میں ان کی امانت میں خیانت کی گناہگار تو ہوں۔

میں نے اپنے دل کا بوجھ کاغذ پر منتقل کر دیا ہے، شاید اس طرح مجھے کچھ قرار آ جائے۔